قرآن وحدیث کی روشنی میں
فقہی احکام ومسائل
www.KitaboSunnat.com
جلد دو
فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان
مترجم/ مولانا فاروق اصغر صارم
تخریج/ مولانا حافظ اقبال صدیق مدنی
دار السلام

قرآن و حدیث کی روشنی میں

فقہی احکام و مسائل

جلد دوم

اشاعت اوّل: 2007

منتظمِ اعلیٰ: عبدالمالک مجاہد

سعودی عرب (ہیڈآفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

• الریاض۔ العلیا۔ فون: 4614483 01 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 01 فیکس: 4735221 • سویلم فون: 2860422 01
• مندوب الریاض: موبائل: 0503459695-0505196736 • قصیم (بریدہ): فون/فیکس: 3696124 06 موبائل: 0503417156
• مکہ مکرمہ: موبائل: 0502839948-0506640175 • مدینہ منورہ فون: 8234446 04 فیکس: 8151121 موبائل: 0503417155
• جدہ فون: 6879254 02 فیکس: 6336270 • الخبر فون: 8692900 03 فیکس: 8691551
• ینبع البحر فون/فیکس: 3908027 04 موبائل: 0500887341 • خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 07 موبائل: 0500710328

شارجہ فون: 5632623 6 00971 امریکہ • ہوسٹن فون: 7220419 713 001 • نیویارک فون: 6255925 718 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون: 4040 9758 2 0061

پاکستان (ہیڈآفس ومرکزی شوروم)

• 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092 فیکس: 7354072
موبائل: 4212174 0321-8484569 0322 • غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

کراچی طارق روڈ بالمقابل فری پورٹ شاپنگ مال فون: 4393936 21 0092 فیکس: 4393937
اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 2281513 51 0092 موبائل: 5370378 0321

ⓒ مکتبة دارالسلام، ١٤٢٨ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الفوزان، صالح بن فوزان
الملخص الفقهي (النص باللغة الاردية) - الرياض، ١٤٢٨ هـ
ص: ٤٠٠ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٦-٦-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (مجموعة)
٠-٨-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (ج ٢)
١. الفقه الحنبلي أ. العنوان
ديوي ٢٥٨,٤ ١٤٢٨/٦٦٨١
رقم الإيداع: ١٤٢٨/٦٦٨١
ردمك: ٠-٨-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (ج ٢)

جلد دوم

تالیف
فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان حفظہ اللہ

مترجم
مولانا فاروق اصغر صارم رحمہ اللہ

تخریج
مولانا حافظ اقبال صدیق مدنی حفظہ اللہ

ریاض • جدہ • شارجہ • لاهور • کراچی
اسلام آباد • لندن • هیوسٹن • نیو یارک

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

مضامین

باب 7

کتاب البیوع

باب 8

شراکت کے احکام و مسائل

باب 9

مزارعت، مساقات اور اجارہ وغیرہ کے احکام

باب 10

غیر آباد زمین آباد کرنے اور جائز ملکیتوں کے احکام

باب 11

وراثت کے مسائل

باب 12

نکاح کے مسائل

باب 13

طلاق کے مسائل

باب 14

قصاص اور جرائم کا بیان

باب 15

حدود اور تعزیرات کے مسائل

باب 16

کھانے پینے کے مسائل

باب 17

قسم کھانے اور نذر ماننے کے مسائل

باب 18

قضا کے مسائل

باب 7
کتاب البیوع

تجارت کے مسائل

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت مطہرہ میں معاملات کے مسائل کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے کیونکہ لوگوں کو ان کی اشد ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً: لوگوں کو غذا کی ضرورت ہے جو ان کے جسموں کو قوت دے۔ اسی طرح انھیں لباس، مکان، سواری وغیرہ کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ یہ اشیاء زندگی کی بنیادی اور تکمیلی ضروریات میں شامل ہیں۔

کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع امت اور قیاس سے بیع کا مشروع ہونا ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ ﴾ ''اور اللہ نے بیع (تجارت) کو حلال کیا ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾

''تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا، فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا»

''خرید و فروخت کرنے والے دونوں آدمیوں کو تب تک اختیار ہے جب تک (مجلس سے اٹھ کر) الگ الگ نہیں ہو جاتے۔ اگر دونوں سچ بولیں اور (سودے کی حقیقت) واضح کر دیں تو دونوں کی بیع میں برکت ہوگی اور اگر دونوں جھوٹ بولیں گے اور (حقیقت کو) چھپائیں گے تو ان کی بیع سے برکت اٹھ جائے گی۔''[3]

خرید و فروخت کی مشروعیت پر علمائے امت کا اجماع ہے۔ باقی رہا قیاس تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ لوگوں کی حاجت و ضرورت بیع کے جواز کی متقاضی ہے کیونکہ انسان کی ضرورت قیمت یا ایسی قیمتی چیز کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے جو کسی دوسرے انسان کی ملکیت و دسترس میں ہے۔ اور وہ اسے کسی چیز کے عوض ہی میں دے گا، لہٰذا حکمت

[1] البقرة 2:275. [2] البقرة 2:198. [3] صحيح البخاري، البيوع، باب إذابين البيعان......، حديث:2079، وصحيح مسلم، البيوع، باب الصدق في البيع والبيان، حديث:1532.

کا تقاضا یہ ہے کہ بیع جائز ہو تا کہ مقصود شے دستیاب ہو سکے۔

◣ بیع قول یا فعل سے منعقد ہوتی ہے۔قول میں ایجاب وقبول ہوتا ہے جو اس وقت ثابت ہوتا ہے جب بیچنے والا کہے: میں نے یہ چیز فروخت کر دی۔ اور خریدنے والا کہے: میں نے یہ چیز خرید لی۔ کسی کے فعل کے ساتھ لین دین یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص بات کیے بغیر سامان یا چیز دے دوسرا اسے اس کی معروف قیمت ادا کر دے۔ اور کبھی بیع قول اور فعل دونوں سے ہوتی ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فعل کے ساتھ بیع (بیع المعاطاة) کرنے کی متعدد صورتیں ہیں:

① بائع (فروخت کرنے والے) کی طرف سے صرف ایجاب لفظی ہو اور مشتری (خریدار) اس چیز کو بولے بغیر لے لے، مثلاً: بائع کہتا ہے: یہ کپڑا ایک دینار کے عوض لے لو اور مشتری اسے لے لیتا ہے۔ اسی طرح اگر قیمت شے (نقدی کے سوا) ہو تو بائع کہتا ہے: یہ کپڑا اپنے کپڑے کے عوض میں لے لو اور مشتری اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے۔

② صرف مشتری لفظ بولتا ہے بائع اس چیز کو ادا کر دیتا ہے، قطع نظر اس سے کہ قیمت معین ہو یا بعد میں ادا کیے جانے کی یقین دہانی ہو۔

③ بائع اور مشتری میں سے کوئی بھی الفاظ کا استعمال نہ کرے بلکہ وہاں کا عام طریقہ یہ ہو کہ مشتری قیمت رکھ دے اور مطلوب چیز پکڑ لے۔

◣ صحت بیع کے لیے چند ایک شرائط ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق بائع اور مشتری کے ساتھ ہے اور کچھ کا تعلق فروخت ہونے والی شے سے ہے۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی کم ہو تو بیع درست نہ ہو گی۔ بائع اور مشتری سے متعلق شرائط یہ ہیں:

① بائع اور مشتری دونوں کی رضامندی سے بیع ہو۔ اگر دونوں میں سے کسی پر ناحق زبردستی اور جبر ہو تو بیع درست نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ﴾

"مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضامندی سے خرید و فروخت ہو۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا الْبَيْعُ عَنْ تَرَاضٍ» "بیع رضامندی ہی سے ہوتی ہے۔"[2]

البتہ جب کبھی جبر و اکراہ درست ہو تو بیع درست قرار پائے گی، مثلاً: کسی حاکم یا قاضی نے کسی شخص کو اس کی چیز

① النسآء 29:4. ② سنن ابن ماجه، التجارات، باب بيع الخيار، حديث: 2185، وصحيح ابن حبان (ابن بلبان)، ◄◄

بیچنے پر، اس لیے مجبور کیا کہ اس کے ذمے قرض ہے جس کی ادائیگی ضروری ہے تو یہ جبر و اکراہ حق اور درست ہے۔

② صحت بیع کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ لین دین کرنے والے دونوں ہی بیع کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، یعنی ہر ایک آزاد، عاقل اور بالغ ہو، لہٰذا بچے، بے وقوف، مجنون اور غلام، جسے اپنے آقا کی اجازت حاصل نہ ہو، کی بیع صحیح اور معتبر نہ ہوگی۔

③ صحت بیع کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ شے کو فروخت کرنے والا اس شے کا مالک ہو یا مالک کے قائم مقام ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ» ''جو شے تیری ملکیت میں نہیں اسے فروخت نہ کر۔''[1]

علامہ وزیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اتفاق ہے کہ کسی ایسی شے کی فروخت جائز نہیں جو اس کے پاس نہیں یا اس کی ملکیت میں نہیں کیونکہ پھر وہ اس غیر مملوکہ چیز کو خریدنے جائے گا (اور ممکن ہے اسے نہ ملے)، اس لیے اس قسم کی بیع باطل ہے۔''

جس چیز کی خرید و فروخت مقصود ہو اس میں درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

① وہ ایسی چیز ہو جس سے نفع و فائدہ حاصل کرنا شرعاً جائز ہو، لہٰذا جس چیز سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہو اس کی خرید و فروخت درست اور جائز نہیں، مثلاً: شراب، خنزیر، لہو و لعب کے آلات یا مردار وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ»

''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، سؤر اور بتوں کی خرید و فروخت حرام قرار دی ہے۔''[2]

ایک روایت میں ہے:

''اللہ تعالیٰ نے شراب اور اس کی قیمت، مردار اور اس کی قیمت، خنزیر اور اس کی قیمت ان سب کو حرام قرار دیا ہے۔''[3]

◄◄ البيوع، باب ذكر العلة التي من أجلها زجر عن هذا البيع، حديث: 4967. ① جامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في كراهية بيع ما ليس عنده، حديث: 1232، وسنن ابن ماجه، التجارات، باب النهي عن بيع ما ليس عندك ......، حديث: 2187. ② صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الميتة والأصنام، حديث: 2236، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم بيع الخمر و الميتة والخنزير والأصنام، حديث: 1581. ③ سنن أبي داود، البيوع، باب في ثمن الخمر ◄◄

«إِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْخَمْرَ وَثَمَنَهَا وَحَرَّمَ الْمَيْتَةَ وَثَمَنَهَا وَحَرَّمَ الْخِنْزِيرَ وَثَمَنَهُ»

اسی طرح نجس تیل اور بدبودار اشیاء کی بیع ناجائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ تَعَالٰى إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ»

''اللہ تعالیٰ نے جب کسی چیز کو حرام کیا تو اس کی قیمت کو بھی حرام قرار دیا۔''[1]

اور رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ مردار کی چربی کے بارے میں کیا حکم ہے جس سے کشتیوں کو چکنا کیا جاتا ہے، چمڑوں کو نرم کیا جاتا ہے اور اس (چربی) کے ساتھ گھروں میں چراغ جلائے جاتے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا:

«لَا! هُوَ حَرَامٌ» ''اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں یہ حرام ہے۔''[2]

② فروخت ہونے والی چیز ایسی صورت میں ہو کہ بائع اسے مشتری کے حوالے کر سکے ورنہ وہ معدوم شے کے حکم میں ہوگی جس کی بیع جائز نہیں، مثلاً: بھاگے ہوئے غلام یا بے قابو اونٹ وغیرہ کی بیع کرنا۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندے کی بیع کرنا، اسی طرح غصب شدہ شے غصب کرنے والے کے سوا کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنا بھی جائز نہیں (کیونکہ اس صورت میں خریدار اس چیز کو حاصل نہیں کر سکتا)، البتہ جو شخص اس سے واپس لینے کی طاقت رکھتا ہو اس کے ہاتھ بیچنا جائز ہے۔

③ صحت بیع کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ فروخت ہونے والی شے اور اس کی قیمت لین دین کرنے والوں کے ہاں واضح اور طے شدہ ہو کیونکہ اس کے بارے میں لاعلمی دھوکا ہے جو ممنوع ہے۔ جس چیز کو دیکھا ہی نہیں یا دیکھ تو لیا ہے لیکن اس کے اچھے یا برے ہونے کا علم نہیں تو اسے خریدنا جائز نہیں، مثلاً: مادہ کے پیٹ میں حمل کی بیع یا جانوروں کے تھنوں میں دودھ کی بیع جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیع مُلامسہ، یعنی جس کپڑے کو تمھارا ہاتھ لگ گیا تجھے اس کی اس قدر قیمت دینا ہوگی اور بیع مُنابذَہ، یعنی تو نے جو کپڑا میری طرف پھینک دیا وہ اتنی قیمت کا ہوگا، جائز نہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ»

''نبی ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔''[3]

◄◄ والميتة، حديث: 3485. ① مسند أحمد: 322/1، وسنن الدارقطني: 7/3، حديث: 2791 واللفظ له. ② صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الميتة والأصنام، حديث: 2236، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم بيع الخمر و الميتة والخنزير والأصنام، حديث: 1581. ③ صحيح البخاري، البيوع، باب بيع المنابذة، حديث: 2147,2146، وصحيح مسلم، البيوع، باب إبطال بيع الملامسة والمنابذة، حديث: 1512,1511.

اسی طرح کنکری پھینکنے سے منعقد ہونے والی بیع جائز نہیں، مثلاً: کسی کو کہا جائے ''تم کنکری پھینکو تو جس کپڑے پر پڑی وہ اس قدر قیمت کے عوض تمھارا ہے۔''

بیع کی ناجائز صورتوں کا بیان

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ اس سے کسی مفید تر اور اہم شرعی حکم کا ترک لازم نہ آئے، مثلاً: جو بیع فرض عبادت کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث بنے یا اس سے دوسرے مسلمان کا نقصان ہوتا ہو تو وہ منع اور ناجائز ہے۔

▲ درج بالا قاعدے کی روشنی میں جس پر جمعہ ادا کرنا فرض ہو اس شخص کا اذان کے بعد خرید وفروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

اے ایمان والو! جمعے کے دن جب نماز کی اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو یہ تمھارے حق میں بہت ہی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نماز جمعہ کی اذان ہوتے ہی خرید وفروخت سے منع کر دیا ہے تاکہ تجارت میں مشغولیت کو جمعہ سے غیر حاضری کا بہانہ وذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ اگرچہ اس وقت دیگر دنیوی امور میں مشغولیت بھی منع ہے لیکن تجارت کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اسباب معیشت میں تجارت ایسی اہم چیز ہے جس میں انسان زیادہ تر مشغول رہتا ہے۔

الغرض آیت میں وارد نہی اذان جمعہ کے بعد کی بیع کو حرام اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

اسی طرح دیگر فرض نمازوں کی اذان کے وقت تجارت میں مصروف رہنا اور مسجد میں حاضر نہ ہونا ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۽ يَخَافُوْنَ

① الجمعة 62:9.

یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾

''ان گھروں میں، جن کے ادب واحترام کا اور اللہ کا نام وہاں لیے جانے کا حکم ہے، وہاں صبح وشام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔ اس ارادے سے کہ اللہ انھیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے بلکہ اپنے فضل سے اور کچھ زیادہ عطا فرمائے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے شمار روزیاں دیتا ہے۔''[1]

کسی چیز کو ایسے شخص کے ہاں بیچنا جو اسے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں اور حرام کام میں استعمال کرتا ہو، ناجائز ہے، مثلاً: کسی پھل کا جوس ایسے شخص کے ہاں فروخت کرنا جو اس کی شراب بناتا ہو، ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ ''ایک دوسرے کی گناہ اور ظلم وزیادتی میں مدد نہ کرو۔''[2]

بلاشبہ درج بالا صورت میں تعاون گناہ اور زیادتی میں تعاون ہے۔

مسلمانوں کے درمیان لڑائی اور فتنہ کے وقت اسلحہ بیچنا ناجائز ہے تاکہ اس کے ذریعے سے کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔ ایسے حالات میں دیگر سامان جنگ فروخت کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی منع فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ ''ایک دوسرے کی گناہ اور ظلم وزیادتی میں مدد نہ کرو۔''[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دلائل شرعیہ اس امر کے حق میں واضح ہیں کہ تجارت میں مقصد کا اعتبار اور لحاظ ضرور ہوتا ہے اور وہ بیع کے جائز یا ناجائز اور حلال وحرام ہونے میں مؤثر ہوتے ہیں، مثلاً: اگر کسی شخص کے بارے میں علم ہو کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے گا، اسے اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ اس میں ظلم وزیادتی میں تعاون ہے۔ اور اگر اس نے ایسے شخص کے ہاں اسلحہ فروخت کیا جس کے بارے میں اسے علم ہو کہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد وقتال کرے گا تو یہ باعث اجر واطاعت ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو اسلحہ بیچنا جو مسلمانوں سے لڑتے ہیں یا ڈاکہ ڈالتے ہیں، حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اس سے معصیت ونافرمانی میں تعاون کرنا لازم آتا ہے۔''[4]

کسی مسلمان غلام کو کافر شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں (سوائے اس کے کہ وہ اس کی ملکیت میں آ کر

---

[1] النور24:36-38. [2] المآئدة 5:2. [3] المآئدة 5:2.

[4] إعلام الموقعين:3/99,100 بتغيير.

قانوناً آزاد ہو رہا ہو)[1] کیونکہ اس صورت میں مسلمان کو کافر کے آگے جھکانا اور ذلیل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ﴾

''اور اللہ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز راہ نہ دے گا۔''[2]

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْإِسْلَامُ يَعْلُو وَلَا يُعْلٰى» ''اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں۔''[3]

◄ مسلمان بھائی کی بیع پر بیع کرنا حرام ہے، مثلاً: ایک شخص نے کسی سے دس روپے کی ایک شے خریدی، دوسرا شخص اسے کہے: تو یہ شے بائع کو واپس کر دے میں تجھے ایسی ہی شے نو روپے میں دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَبِيعُ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ» ''تم میں کوئی ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے۔''[4]

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

«لَا يَبِيعُ الرَّجُلُ عَلٰى بَيْعِ أَخِيهِ» ''کوئی آدمی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے۔''[5]

اسی طرح کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی خریداری پر خریداری نہ کرے، مثلاً: کسی نے نو روپے کی کوئی شے بیچ دی، دوسرا شخص اسے کہے: میں تجھ سے یہ چیز دس روپے میں خریدنے کو تیار ہوں۔

افسوس! کہ آج کل مسلمانوں کے بازاروں میں تجارت اور لین دین کی کتنی ہی حرام صورتیں جاری و ساری ہیں۔ ہر مسلمان کو ان سے اجتناب کرنا چاہیے اور جو کوئی ایسا کرنے پر مجبور کرے اسے صاف انکار کر دینا چاہیے۔

◄ تجارت کی حرام صورتوں میں سے ایک صورت شہری کا دیہاتی کے لیے بیع کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

① اسلامی قانون یہ ہے کہ جب کوئی غلام اپنے محرم رشتے دار کی ملکیت بن جائے، مثلاً: اس کا باپ بھائی وغیرہ خرید لے تو وہ اس کی ملکیت میں آتے ہی آزاد شمار ہوگا۔ (صارم)

② النسآء 141:4. ③ السنن الكبرٰى للبيهقي : 205/6، وصحيح البخاري، الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات ......، بعد حديث: 1353معلقًا. ④ صحيح البخاري، البيوع ، باب النهي عن تلقي الركبان......، حديث : 2165، وصحيح مسلم، البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه، ......، حديث :(7)- 1412. ⑤ صحيح البخاري، البيوع، باب لا يبيع على بيع أخيه، ......، حديث : 2140، وصحيح مسلم، البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه ......، حديث : (8)-1412.

«لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِّبَادٍ» ''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔''①

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے:

''اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا سامان فروخت کرتے وقت ''دلال'' نہ بنے۔''②

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقِ اللهُ بَعْضَهُمْ مِّنْ بَعْضٍ»

''تم لوگوں کو تجارت کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے رزق دیتا ہے۔''③

جس طرح یہ جائز نہیں کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کے سامان کی فروخت میں ''دلال'' بنے اسی طرح سامان کی خریداری میں بھی شہری کو دیہاتی کا دلال نہیں بننا چاہیے، البتہ کوئی دیہاتی کسی شہری کے مال میں دلال بنے تو اس کی ممانعت نہیں۔

◆ ناجائز تجارت کی صورتوں میں ایک صورت بیع عِینہ بھی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک چیز کسی شخص کو ادھار بیچ دے، پھر مشتری سے ادائیگی کے ساتھ کم قیمت پر خرید لے، مثلاً: ایک گاڑی بیس ہزار درہم میں ادھار بیچ کر اس سے پندرہ ہزار درہم نقد میں خرید لے اور بیس ہزار درہم طے شدہ مدت پوری ہونے پر واجب الادا ہوں۔ یہ سودا حرام ہے کیونکہ یہ حصول سود کے لیے ایک حیلہ ہے، گویا کہ اس نے ادھار درہم نقد دراہم کے بدلے تفاضل (زیادتی) کے ساتھ بیچے۔ سود لینے میں گاڑی کو ایک حیلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا ، لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ»

''جب تم بیع عِینہ کرنے لگ جاؤ گے، بیلوں کی دُمیں پکڑ لو گے (زراعت میں مشغول ہو جاؤ گے)، کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت و رسوائی مسلط کر دے گا اور اسے تم سے دور نہیں کرے گا حتی کہ تم اپنے دین کی طرف پلٹ آؤ۔''④

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

① صحيح البخاري، البيوع، باب هل يبيع حاضر لبادٍ بغير أجرٍ؟ ......، حديث: 2158، وصحيح مسلم، البيوع، باب تحريم بيع الحاضر للبادي، حديث: 1525. ② صحيح مسلم، البيوع، باب تحريم بيع الحاضر للبادي، حديث: 1521. ③ صحيح مسلم، البيوع، باب تحريم بيع الحاضر للبادي، حديث: 1522. ④ [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في النهي عن العينة، حديث: 3462.

«يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَسْتَحِلُّونَ الرِّبَا بِاسْمِ الْبَيْعِ»

''لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا جب وہ سود کو بیع کا نام دے کر حلال قرار دیں گے۔''①

بیع میں شرائط کا بیان

بیع میں شرائط کا وقوع اکثر ہوتا ہے۔ بائع اور مشتری دونوں کو یا کسی ایک کو بعض دفعہ بیع میں کوئی شرط عائد کرنی پڑتی ہے، لہٰذا اس ضرورت کے پیش نظر ہم یہاں چند شرائط کا تذکرہ کریں گے۔ اور یہ بھی بیان کریں گے کہ کون سی شرط صحیح اور جائز ہے اور کون سی فاسد اور باطل ہے۔

فقہاء رحمہم اللہ بیع میں شرط کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ بائع یا مشتری میں سے کوئی ایک دوسرے پر دوران بیع ایسی بات لازم کر دے جس میں اس کا ذاتی فائدہ ہو۔ بنا بریں فقہاء کے نزدیک وہ شرط معتبر ہوگی جو لین دین کے وقت ہو۔ اور جو شرط وقت بیع سے قبل یا بعد میں ہو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

بیع میں دو قسم کی شرائط عائد ہوتی ہیں:

▪ شرائط صحیحہ: یہ وہ شرائط ہیں جو صحت بیع کے منافی نہیں ہیں اور ان پر عمل کرنا لازم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ» ''مسلمان باہمی شرائط کے پابند رہیں۔''②

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر شرط جائز ہے سوائے اس کے جسے شارع نے باطل اور ناجائز قرار دیا ہے۔ شرائط صحیحہ کی دو قسمیں ہیں:

① جو شرط ''عقد بیع'' کی مصلحت اور اس کی مضبوطی کا سبب ہو۔ اس شرط کا فائدہ شرط لگانے والے کو ہوتا ہے، مثلاً: گروی شے کے ذریعے سے توثیق کی شرط عائد کرنا یا کسی کو ضامن مقرر کرنے کی شرط لگانا۔ اس شرط کا فائدہ یہ ہے کہ بائع مطمئن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک مقرر مدت تک سودے کی پوری رقم یا اس کے کچھ حصے کی ادائیگی میں ادھار کی شرط لگانا وغیرہ۔

① [ضعيف]غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال و الحرام، حديث : 13، وإغاثة اللهفان من مصائد الشيطان : 486/1. ② جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللهﷺ في الصلح بين الناس، حديث :1352.

اس کا فائدہ مشتری کو ہوتا ہے۔ جب یہ شرط پوری کردی جائے گی تو بیع نافذ ہوگی۔ اسی طرح اگر مشتری نے بیع کے وقت شے میں کوئی شرط لگا دی، مثلاً: فلاں معیار کی ہو یا فلان کمپنی کی بنی ہو یا فلاں ماڈل ہو تو اس شرط میں کوئی حرج نہیں کیونکہ لوگوں کی پسند اور طلب مختلف ہوتی ہے جو ان کا حق ہے۔ اگر وہ شے طے کردہ شرط کے مطابق نہ ہوگی تو مشتری کو اختیار ہے کہ اس بیع کو فسخ قرار دے یا مطلوبہ چیز کی قیمت اور موجود چیز کی قیمت میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھ کر قیمت ادا کرے۔

② بیع میں جائز شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بائع یا مشتری میں سے کوئی ایک فروخت شدہ شے میں ایسی شرط لگا دے جس میں اس کا ذاتی فائدہ ہو، مثلاً: مکان بیچنے والا ایک مقرر مدت تک بیچے ہوئے گھر میں رہائش رکھنے کی شرط عائد کر دے یا جانور یا گاڑی بیچنے والا ایک مقرر جگہ تک اس پر بیٹھ کر جانے کی شرط مقرر کر دے، جیسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا اونٹ بیچا اور مدینہ منورہ تک اس پر بیٹھنے کی شرط لگا دی۔''[1]

یہ حدیث شریف وضاحت کرتی ہے کہ کسی جانور کو فروخت کرتے وقت اس پر مقررہ جگہ تک سواری کرنے کی شرط لگانا جائز ہے۔ آپ اس پر ایسے ہی دیگر مسائل بھی قیاس کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اگر مشتری کی طرف سے کوئی شرط عائد ہو جاتی ہے تو بائع اس کی پاسداری کرے، مثلاً: کوئی لکڑی کا سودا کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے کسی مقرر جگہ تک پہنچانے کی شرط لگا دیتا ہے یا کوئی کپڑا خریدتے وقت اس کی سلائی کی شرط مقرر کر دیتا ہے تو جائز ہے۔

◢ شرائط فاسدہ: اس کی متعدد انواع ہیں۔ ان میں چند ایک یہ ہیں:

① بیع میں ایسی فاسد شرط لگانا جو سرے سے بیع کو باطل قرار دے دے، مثلاً: کوئی شخص بیع کرتے وقت ایک اور بیع یا عقد کی شرط لگا دے، جیسے کوئی کہے: ''میں تجھے فلاں چیز اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اپنا گھر کرائے پر دو۔'' یا کہے: ''میں تجھے یہ چیز اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اپنے فلاں کام یا اپنے گھر میں شریک کرو۔'' یا کہے: ''میں تجھے یہ سامان اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تم مجھے اتنی رقم بطور قرض دو۔'' یہ تمام شرائط فاسدہ ہیں جو بیع کو سرے ہی سے باطل کر دیتی ہیں کیونکہ حدیث میں ہے:

---

[1] صحيح البخاري، الوكالة، باب إذا وكل رجل رجلاً......، حديث: 2309، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تحية المسجد......، حديث: 715، وجامع الترمذي، المناقب باب مناقب جابر بن عبدالله رضي الله عنهما، حديث:3852 واللفظ له.

«نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ»

’’رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع فرمایا۔‘‘ [1]

امام احمد رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کی وہی تشریح کی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔

② وہ شرط جو بنفسہ فاسد ہے لیکن بیع کو فاسد قرار نہیں دیتی، مثلاً: مشتری بائع سے سامان خریدتے وقت یہ شرط عائد کر دے کہ اگر اسے اس مال میں خسارہ ہوا تو اسے واپس کر دے گا یا بائع مشتری پر یہ شرط لگا دے کہ وہ اسے کسی دوسرے شخص کے ہاں فروخت نہیں کر سکتا۔ یہ شرط فاسد ہے کیونکہ یہ مقتضائے عقد کے منافی ہے۔ بیع کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مشتری اپنے خریدے ہوئے مال میں تصرف کا مطلقاً اختیار رکھتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَّيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَّإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ»

’’جس نے ایسی شرط لگائی جو اللہ کی کتاب میں نہیں تو وہ باطل ہے اگرچہ سو شرطیں ہی لگا لے۔‘‘ [2]

اس شرط کے بطلان کے باوجود بیع باطل و فاسد نہیں ہوتی کیونکہ نبی ﷺ نے سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے مالک کی یہ شرط ’’کہ اگر وہ آزاد ہو گئی تو اس کی ولاء اسے ملے گی۔‘‘ باطل قرار دی، البتہ عقد و بیع کو باطل قرار نہیں دیا۔ اور فرمایا:

«إِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ» ’’ولاء اسے ملے گی جو آزاد کرے گا۔‘‘ [3]

مسلمان تاجر کو چاہیے کہ وہ خرید و فروخت کے مسائل کا علم حاصل کرے اور صحیح اور فاسد شرائط سے واقف ہو حتی کہ بیع کے معاملے میں مکمل بصیرت رکھے تاکہ مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا اور تنازعہ پیدا نہ ہو۔ بیع کے معاملے میں عام طور پر جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ان کا سبب بائع اور مشتری دونوں کا یا کسی ایک کا بیع کے مسائل سے ناواقف ہونا اور دوسرے کو فاسد شرائط کا پابند کرنا ہے۔

① جامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في النهي عن بيعتين في بيعة، حديث: 1231، ومسند أحمد: 2/432و475.

② صحيح البخاري، البيوع، باب الشراء والبيع مع النساء، حديث: 2155، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث: 1504. ③ صحيح البخاري، البيوع، باب الشراء والبيع مع النساء، حديث: 2155، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث: 1504.

بیع میں خیار کے احکام

دین اسلام خیر خواہی کا دین ہے جو لوگوں کی مصلحتوں اور فوائد کی حفاظت کرتا ہے اور ان کی تکالیف اور مشقتوں کا ازالہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے لین دین کرنے والے کو بیع میں ایک حد تک اختیار دیا ہے تا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکے اور خریدی ہوئی شے کی مصلحت پر مزید غور وفکر کر لے۔ اگر اسے فائدہ حاصل ہو رہا ہو تو بیع کو قائم رکھے اور اگر نقصان کا اندیشہ ہو تو اسے فسخ کر دے۔

بیع میں اختیار کا مطلب یہ ہے کہ دو صورتوں میں سے بہتر صورت کا انتخاب کرنا، یعنی بیع کو فسخ قرار دینا یا اسے قائم رکھنا۔ بیع میں اختیار کی آٹھ اقسام ہیں جو درج ذیل ہیں:

▲ مجلس میں اختیار: جس مقام پر بیع ہوئی ہے، بائع اور مشتری جب تک اس جگہ میں موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہے کہ بیع کو قائم رکھے یا اسے ختم کر دے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا، وَكَانَا جَمِيعًا»

''جب دو شخص بیع کریں تو ہر ایک کو اس وقت تک بیع میں اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں، یعنی وہ اکٹھے ہوں۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شارع نے بیع کے معاملے میں مجلس میں جو اختیار دیا ہے اس میں بائع اور مشتری دونوں کے حق میں حکمت اور مصلحت پنہاں ہے۔ اور وہ یہ کہ بیع میں بائع اور مشتری دونوں کی مکمل رضامندی ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان: ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ ''تمھاری آپس کی رضامندی سے (خرید و فروخت ہو۔)''[2] میں بیع کے لیے ایک شرط کے طور پر بیان کی ہے۔ عام طور پر بیع غور وفکر کے بغیر ہی جلد بازی میں ہو جاتی ہے، لہٰذا شریعت کاملہ کے محاسن کا تقاضا یہ ہے کہ بیع میں بائع اور مشتری کے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے جس میں دونوں اپنے فیصلے پر خوب غور وفکر کر لیں، اگر کوئی کمی ہو تو اسے پورا کر لیں۔ اس حدیث کے مطابق دونوں کو اس وقت تک اختیار حاصل ہو گیا جب تک وہ بیع کرنے کی جگہ میں موجود رہتے ہیں اور جدا نہیں ہوتے۔

اگر دونوں نے یا کسی ایک نے بیع کرتے وقت اختیار کی شرط ختم کر دی تو دونوں کا یا دونوں میں سے اس کا جس

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب إذا خير أحدهما صاحبه بعد البيع فقد وجب البيع، حديث: 2112. [2] النساء 29:4

نے شرط خیار ختم کر دی تھی، اس کا اختیار ختم ہو جائے گا اور بیع لازم ہو جائے گی۔ اختیار کی شرط لگانا عقد کرنے والے کا حق تھا تو اس کے خود ساقط کرنے سے ساقط ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا . . . أَوْ يُخَيِّرُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ»

''جب تک جدا نہ ہوں، یعنی وہ اکٹھے ہوں یا ایک دوسرے کو اختیار نہ دے دیں۔''[1]

دونوں میں سے ہر شخص پر حرام ہے کہ وہ اپنے بھائی کی مجلس سے اس لیے الگ ہو کہ اسے بیع کے فسخ کرنے کا اختیار نہ رہے جیسا کہ عمرو بن شعیب رحمہ اللہ کی مرفوع روایت میں ہے:

«وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يُفَارِقَ صَاحِبَهُ خَشْيَةَ أَنْ يَسْتَقِيلَهُ»

''کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے بیع کے بعد اس ڈر سے الگ ہو کہ وہ اسے سودا واپس نہ کر دے۔''[2]

- **شرط اختیار:** بائع اور مشتری دونوں اختیار کی مجلس میں بیع کے دوران یا بیع کے بعد ایک مقررہ مدت تک اختیار کی شرط لگائیں تو دونوں کو اس مدت مقررہ کے اندر بیع کے قائم رکھنے یا اسے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ» ''مسلمان باہم طے شدہ شرائط کی پاسداری کریں۔''[3]

نیز اللہ تعالیٰ کا حکم عام ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ ''اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو۔''[4]

اگر اختیار کی شرط ایک فریق کے لیے ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو تو بھی بیع جائز اور درست ہے کیونکہ اختیار کا حق دونوں کے لیے تھا، چنانچہ وہ جیسے بھی راضی ہو جائیں جائز ہے۔

- **اختیار نقصان:** جب کسی شخص کو کسی سودے میں معمول کے خلاف زیادہ نقصان دیا گیا ہو تو اسے بھی اس بیع کو قائم رکھنے یا واپس کرنے کا اختیار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب إذا خير أحدهما صاحبه بعدالبيع فقد وجب البيع، حديث : 2112. [2] سنن أبي دا د، البيوع، باب في خيار المتبايعين، حديث :3456، وجامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء : البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، حديث : 1247. [3] جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، حديث : 1352. [4] المآئدة 1:5. [5] سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه مايضرّ بجاره، حديث:2341، ومسند أحمد :313/1.

نیز ارشاد نبوی ہے:

«وَلَا يَحِلُّ لِامْرِیءٍ مُّسْلِمٍ مِّنْ مَّالِ أَخِيهِ شَيْءٌ إِلَّا بِطِيبَةِ نَفْسٍ مِّنْهُ»

''خبردار! کسی مسلمان آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے مال میں سے کچھ لے مگر جو اس کی خوش دلی کے ساتھ ہو۔''[1]

یہ بات ظاہر ہے کہ نقصان پر نقصان زدہ کا دل خوش نہیں ہوتا، البتہ اگر نقصان معمولی ہو، یعنی عام عادت کے موافق ہو تو اسے اختیار نہ ہوگا۔

نقصان میں اختیار حاصل ہونے کی تین صورتیں ہیں:

① قافلوں سے ملاقات کرنا، یعنی جو قافلے اپنا سامان فروخت کرنے کے لیے شہر (منڈی) میں آتے ہیں ان کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی کسی نے ملاقات کر کے ان سے سامان خرید لیا، پھر بعد میں واضح ہوا کہ انھیں اندھیرے میں رکھ کر بہت زیادہ خسارہ پہنچایا گیا ہے تو انھیں سودا فسخ کر کے اپنا سامان واپس لینے کا اختیار ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ، فَمَنْ تَلَقّٰى فَاشْتَرٰى مِنْهُ، فَإِذَا أَتٰى سَيِّدُهُ السُّوقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ»

''تم قافلوں کو (منڈی میں آنے سے پہلے ہی) نہ ملو جس نے انھیں مل کر کوئی سامان خرید لیا، پھر اس کا مالک منڈی میں آ گیا تو اسے (زیادہ نقصان کی صورت میں) اختیار حاصل ہے (چاہے بیع قائم رکھے اور چاہے تو اسے فسخ قرار دے۔)''[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو لوگ قافلوں کو منڈی میں آنے سے پہلے ہی ملتے ہیں اور ان سے بیع کرتے ہیں، نبی ﷺ نے انھیں اختیار دیا ہے کیونکہ اس میں ایک قسم کا دھوکا اور فراڈ ہے۔''[3] ایسی ہی وضاحت علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی کی ہے۔

② وہ خسارہ جو اس شخص کی بدولت ہوا جو سامان خریدنا نہیں چاہتا تھا بلکہ محض سامان کی قیمت بڑھانے کے لیے ''بولی'' دینے والوں میں شریک ہوا۔ یہ کام حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [وَلَا تَنَاجَشُوا] ''محض

---

① سنن الدارقطني: 25/3، حديث: 2861. ② صحيح مسلم، البيوع، باب تحريم تلقي الجلب، حديث: 1519.

③ مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 28/102 بتصرف.

قیمت بڑھانے کے لیے "بولی" نہ دو۔"[1]

نیز اس میں مشتری کو دھوکا دینا ہوتا ہے جو منع ہے۔

کسی چیز کی قیمت زیادہ وصول کرنے کے لیے بائع کا جھوٹ موٹ یہ کہنا کہ اسے فلاں چیز کی اتنی قیمت ملتی ہے یا میں نے اتنی قیمت کے ساتھ یہ سامان خریدا ہے یا ایک چیز کی قیمت پانچ روپے ہے تو گاہک کو کہے کہ میں اسے دس روپے کی بیچ رہا ہوں تا کہ وہ دس روپے کے قریب قریب خرید لے۔ یہ سب کام حرام ہیں۔ (اور ایسی صورت میں بھی سودا واپس کرنے کا اختیار ہے۔)

③ کسی پر اعتبار کرتے ہوئے معاملہ کرے اور وہ اسے دھوکا دے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حدیث شریف میں ہے: غَبْنُ الْمُسْتَرْسِلِ رِبًا "ناواقف سے دغا کے ذریعے سے جو مال کمایا وہ سود کی طرح حرام ہے۔"[2] جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو قیمت کا علم نہیں اور نہ قیمت کم کرانے کے لیے بائع سے اچھی طرح بات چیت کر سکتا ہے بلکہ وہ مخلص اور سادہ لوح ہونے کی وجہ سے بائع کی بات کو سچ سمجھ لیتا ہے۔ اس صورت میں اگر مشتری کو زیادہ نقصان ہو تو بیع کو قائم رکھنے یا رد کرنے کا اسے اختیار ہے۔"

مسلمانوں کے بازاروں اور منڈیوں میں بعض لوگ یہ چال چلتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنا مال فروخت کرنے کے لیے بازار میں لاتا ہے تو بازار والے اتفاق کر لیتے ہیں کہ اس کے مال کی کوئی قیمت نہ لگائے، نیز وہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھاؤ کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ جب وہ شخص تھک ہار کر محسوس کرتا ہے کہ کوئی بھی اسے اس (تعاقب کرنے والے) شخص سے زیادہ مال کی قیمت نہیں دے رہا یا کوئی اس کا مال خرید نہیں رہا تو وہ مجبور ہو کر سستے داموں اپنا سامان فروخت کر جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد تعاقب کرنے والے خریدار کے نفع میں باقی دوکاندار بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ سراسر دھوکا، فراڈ، ظلم اور حرام کام ہے۔ اگر بائع کو اس کا علم ہو جائے تو اسے ایسی بیع میں اختیار ہے، یعنی وہ اپنا فروخت شدہ مال واپس لے سکتا ہے۔

جو لوگ اس قسم کا دھوکا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ ایسی حرکت کرنا چھوڑ دیں اور توبہ کریں۔ جس شخص کو اس کا علم ہو اس پر لازم ہے کہ ایسا کام کرنے والے پر ناراضی کا اظہار کرے اور ذمے دار لوگوں تک اس کی شکایت کرے تا کہ وہ انھیں اس سے باز کریں۔

اختیار تدلیس: تدلیس کے معنی "کسی کو اندھیرے میں رکھنا" ہیں۔ بیع میں تدلیس کا مطلب ہے کہ "بائع کسی

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب لا يبيع على بيع أخيه ......، حديث: 2140. [2] [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي: 349/5.

عیب دار شے کے عیب کو نہ دکھائے۔ اس کی حقیقت حال واضح نہ کرے اور مشتری کو اندھیرے میں رکھے بلکہ اسے صحیح وسلامت بتا کر فروخت کر دے۔'' اس کی دو صورتیں ہیں:

① کسی شے کے عیب ونقص کو چھپا کر بیچنا۔

② کسی چیز کو ایسے انداز میں بنا سنوار کر فروخت کرنا کہ اس کی قیمت زیادہ ملے۔

تدلیس حرام ہے۔ شریعت اسلامیہ نے مشتری کو تدلیس کی صورت میں خریدا ہوا مال واپس کرنے کا اختیار دیا ہے کیونکہ مشتری نے شے کو بائع کے بیان کے مطابق صحیح سمجھ کر پوری قیمت کے ساتھ خریدا تھا۔ اگر اسے حقیقت حال کا بروقت علم ہو جاتا تو وہ اس قدر قیمت ادا نہ کرتا۔

تدلیس کی ایک صورت یہ ہے کہ بکری، گائے یا اونٹنی کا دودھ تھنوں میں جمع کر کے فروخت کرنا تاکہ مشتری یہ سمجھے کہ یہ جانور ہمیشہ زیادہ دودھ دیتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُصَرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ فَإِنَّهُ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَّحْتَلِبَهَا ، إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعًا مِّنْ تَمْرٍ»

''اونٹ اور بکری کا دودھ بند نہ کرو اگر کوئی اسے خرید لیتا ہے تو اسے دوہنے کے بعد اختیار ہے چاہے تو اسے اپنے پاس رکھے اور چاہے تو واپس کر دے اور اس کے ساتھ ایک صاع کھجور بھی دے۔''[1]

تدلیس کی ایک صورت یہ ہے کہ عیب دار گھر کی بناوٹ وسجاوٹ کر کے مشتری یا کرائے دار کو دھوکا دینا۔ اس طرح مشتری کو دھوکا دینے کے لیے پرانی گاڑیوں کو رنگ روغن کر کے فروخت کے لیے رکھنا کہ غیر مستعمل معلوم ہوں۔ ان کے علاوہ تدلیس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سچائی سے کام لے اور حقیقت کو واضح کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا ، فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا ، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا»

''خرید وفروخت کرنے والے دونوں آدمیوں کو جدا ہونے سے پہلے تک (سودا فسخ کرنے کا) اختیار ہے۔ اگر سچ کہیں گے اور (حقیقت حال) بیان کریں گے تو ان کی بیع میں برکت ہوگی اور اگر جھوٹ بولیں گے اور (حقیقت کو) چھپائیں گے تو ان کی بیع میں برکت ختم کر دی جائے گی''۔[2]

① صحيح البخاري، البيوع، باب النهي للبائع أن لا يحفل الإبل والبقرو الغنم وكل محفلة، حديث : 2148.

② صحيح البخاري، البيوع، باب إذا بين البيعان ولم يكتما ونصحا، حديث : 2079، وصحيح مسلم، البيوع، باب الصدق في البيع والبيان، حديث : 1532.

نبی ﷺ نے امت کو خبردار کیا ہے کہ خرید وفروخت میں سچ بولنا برکت کے اسباب میں سے ہے اور جھوٹ بول کر خرید وفروخت کرنا برکت کو ختم کر دیتا ہے۔ سچ بول کر لیے ہوئے تھوڑے منافع میں بھی اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے اور جھوٹ کے ساتھ حاصل کیا ہوا زیادہ منافع بھی بے برکت ہو جاتا ہے۔

عیب کی وجہ سے اختیار: مشتری کو بیع واپس کرنے کا تب اختیار ہے جب خریدی ہوئی چیز میں عیب ہو اور بائع اس کی خبر نہ دے یا خود بائع کو اس کا علم نہ ہو لیکن واضح ہو جائے کہ یہ چیز بیع کرنے سے پہلے ہی عیب دار تھی۔ وہ عیب جس کی بنا پر مشتری کو اختیار حاصل ہوتا ہے وہ ہے کہ اس کی وجہ سے مبیع کی قیمت کم ہو جاتی ہو یا اس کی ذات میں کمی آتی ہو۔ اور اس کا فیصلہ معتبر تجار ہی کریں گے، وہ جس کو عیب قرار دیں اس میں اختیار ثابت ہوگا اور جسے وہ عیب شمار نہ کریں اس میں اختیار نہیں ہوگا۔ اگر مشتری کو عقد کے بعد عیب کا علم ہوا تو اسے اختیار ہے کہ بیع کو قائم رکھے یا اس کی جائز قیمت اور ادا شدہ قیمت کا فرق وصول کرے۔ اور اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ بیع فسخ کر کے چیز لوٹا دے اور ادا شدہ قیمت واپس لے لے۔

قیمت بتانے میں جھوٹ بولنا: بائع شے فروخت کرتے وقت دعویٰ کرے کہ وہ مشتری سے محض قیمت خرید وصول کر رہا ہے، پھر بعد میں اس کی بات خلاف حقیقت ثابت ہو یا بائع نے کہا کہ میں تجھے اس سامان میں راس المال کے ذریعے سے شریک کر رہا ہوں یا کہا کہ میں نے یہ مال راس المال پر اتنے فی صد نفع پر فروخت کر دیا یا کہا کہ میں نے یہ چیز قیمت خرید سے اتنی رقم کم کر کے دی ہے۔ اگر ان مذکورہ صورتوں میں واضح ہوا کہ اس نے راس المال بتاتے وقت جھوٹ سے کام لیا ہے تو (ایک قول کے مطابق) مشتری کو اختیار ہے کہ بیع قائم رکھے یا اسے لوٹا دے۔ اہل علم کا اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ ان صورتوں میں مشتری کو اختیار حاصل نہ ہوگا۔ مشتری اصل قیمت ادا کرے گا اور زائد قیمت ساقط ہو جائے گی۔ واللہ أعلم.

اختیار بصورت اختلاف: بیع کے بعد اگر بائع اور مشتری کا بعض امور میں اختلاف پیدا ہو گیا تو بیع فسخ ہو جائے گی، مثلاً: مقدار قیمت میں اختلاف واقع ہو یا چیز کی نوعیت میں اختلاف ہو جائے اور کسی کے پاس فیصلہ کن دلیل بھی نہ ہو تو دونوں اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے حلف اٹھائیں گے۔ حلف کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کو فسخ کا حق حاصل ہوگا جبکہ کوئی بھی دوسرے کی بات ماننے کو تیار نہ ہو۔

تبدیلیٔ حالت میں اختیار: مشتری نے ایک ایسی شے کی بیع کی جسے اس نے وقت بیع سے بہت پہلے دیکھا تھا۔ جب اس نے بیع کے بعد اسے وصول کیا تو دیکھا اس کی حالت تبدیل ہو چکی ہے تو مشتری کو اختیار ہے کہ بیع فسخ قرار دے یا اسے قائم رکھے۔ واللہ أعلم.

خریدی ہوئی چیز کی قبضے سے پہلے ہی خرید وفروخت

آئندہ صفحات میں ہم ان مسائل کا ذکر کریں گے جو خریدی ہوئی چیز کو قبضے میں لینے سے پہلے ہی فروخت کرنے سے متعلق ہیں اور بتائیں گے کہ اس میں کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہے اور کس صورت میں قبضہ صحیح شمار ہوگا اور کس میں صحیح شمار نہ ہوگا۔

▲ ائمۂ کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی شے کی بیع کر لینے کے بعد اور اس پر قبضہ کرنے سے پہلے اسے فروخت کرنا جائز نہیں بشرطیکہ اس کا تعلق ماپ، ناپ، وزن اور گنتی سے ہو۔ اسی طرح جو چیزیں ان کے علاوہ ہیں ان کا بھی صحیح اور راجح قول کے مطابق یہی حکم ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتَّى يَسْتَوْفِيَهُ»

''جس نے اناج خریدا وہ اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک (اس کا ناپ اور وزن کر کے) اسے پورا حاصل نہ کر لے۔''[1]

ایک روایت کے الفاظ ہیں: [حَتّٰى يَقْبِضَهُ] ''یہاں تک کہ اسے اپنے قبضے میں کر لے۔''[2] ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: [حَتّٰى يَكْتَالَهُ] ''یہاں تک کہ اس کا ماپ کر لے۔''[3]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وَأَحْسِبُ كُلَّ شَيْءٍ مِثْلَهُ ''(کھانے کی اشیاء کے علاوہ) ہر چیز کا میں یہی حکم سمجھتا ہوں۔''[4]

بلکہ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

«إِذَا اشْتَرَيْتَ بَيْعًا (شَيْئًا) فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَقْبِضَهُ»

''جب بھی کوئی شے خریدو تو اس پر قبضہ کیے بغیر آگے فروخت نہ کرو۔''[5]

---

① صحيح البخاري، البيوع، باب الكيل على البائع والمعطي، حديث: 2126، و صحيح مسلم، البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، حديث: 1525. ② صحيح البخاري، البيوع، باب مايذكر في بيع الطعام والحكرة، حديث: 2133، و صحيح مسلم، البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، حديث: 1525. ③ صحيح مسلم، البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، حديث: 1525. ④ جامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في كراهية بيع الطعام حتى يستوفيه، بعد الحديث: 1291. ⑤ مسند أحمد: 402/3.

امام ابوداود رحمہ اللہ نے یوں روایت بیان کی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ حَتّٰى يَحُوزَهَا التُّجَّارُ إِلٰى رِحَالِهِمْ»

''رسول اللہ ﷺ نے اسی جگہ میں جہاں سے سامان خریدا ہے وہیں پر سامان بیچنے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ تاجر اپنا سودا اپنے اپنے گھروں میں اٹھا کر لے جائیں۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خریدی ہوئی شے کو قبضے میں لینے سے پہلے فروخت کرنے کی نہی کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ مشتری اس شے کو قبضے میں لینے سے عاجز اور بے بس ہے۔ ہوسکتا ہے بائع فروخت شدہ شے اس کے حوالے کرے اور ہوسکتا ہے نہ کرے۔ خاص طور پر جب وہ دیکھ رہا ہو کہ خریدار کو خوب نفع حاصل ہو رہا ہے تو بائع بیع کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا، خواہ انکار کرے یا فسخ بیع کے لیے کوئی حیلہ کرے۔ اس کی تائید اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ آدمی جس چیز کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہو اس کا نفع بھی نہیں لے سکتا۔''[2]

چنانچہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس امر کی پابندی کرے کہ جب وہ کوئی شے خریدے تو اس وقت تک اسے فروخت نہ کرے جب تک مکمل طور پر اس پر قبضہ حاصل نہ کرلے۔

بہت سے لوگ اس مسئلے میں سستی کر جاتے ہیں یا انھیں اس مسئلے کا علم نہیں ہوتا کہ عموماً لوگ سامان خریدتے ہیں اور اس کا مکمل قبضہ لیے بغیر آگے فروخت کر دیتے ہیں، مثلاً: جہاں سامان خریدا وہیں بوریوں، پیکٹوں یا ڈبوں کی گنتی کر لی، پھر گئے اور کسی کے ہاں اسے فروخت کر دیا، حالانکہ اس کا صحیح طور پر قبضہ ہوا ہی نہیں تھا جس کی وجہ سے مشتری کے لیے اسے فروخت کرنا جائز نہ تھا۔

▲ اگر آپ کہیں کہ صحیح قبضہ لینے کی وہ کون سی صورت ہے جس میں مشتری کے لیے خریدی ہوئی اشیاء میں تصرف کرنا جائز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے قبضے کی صورت اس کی نوعیت کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہے، لہٰذا قبضے کے لیے مناسب صورت کو اختیار کیا جائے گا۔ اگر وہ چیز گنتی والی ہے تو اس پر قبضہ گنتی سے ہوگا اور اگر وہ ناپ و پیمائش والی ہے تو اس پر قبضہ ناپ و پیمائش کرنے سے ہوگا۔ علاوہ ازیں مشتری اسے اپنی جگہ میں منتقل اور محفوظ بھی کرے گا۔ اگر وہ کپڑے، جانور یا گاڑیاں ہیں تو مشتری انھیں اپنے ہاں منتقل کرے گا۔ اگر فروخت شدہ

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في بيع الطعام قبل أن يستوفي، حديث:3499. [2] إعلام الموقعين:3/134، والفتاوى الكبرىٰ:5/391.

چیز ہاتھ میں پکڑی جا سکتی ہے، مثلاً: جواہر یا کتابیں وغیرہ تو مشتری اسے جب ہاتھ میں لے گا تو صحیح قبضہ ہوگا۔ اگر فروخت شدہ چیز دوسری جگہ منتقل نہ ہو سکے، مثلاً: مکانات، زمین اور درختوں پر پھل وغیرہ تو اس کا قبضہ ایسے ہوگا کہ مشتری کے زمین پر کنٹرول سنبھالنے اور مالک کی طرح تصرف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اسی طرح مکان ہو تو اس کی چابی حاصل کرنے اور اس کا دروازہ کھول لینے سے قبضہ ہوگا۔

▲ اکثر لوگ سودا کر لینے کے بعد اس کا قبضہ لینے میں سستی کرتے ہیں اور شرعی قبضہ حاصل کیے بغیر اس شے میں تصرف کرتے ہیں اس طرح وہ ایسے کام کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جھگڑوں اور اختلافات میں پڑ جاتے ہیں یا جب سودے کی حقیقت حال واضح ہوتی ہے تو نادم و شرمسار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات لڑائی جھگڑے بلکہ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح جو شخص بھی حکم رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہے تو لازماً اس کا مقدر ندامت اور پریشانی ہے۔

▲ اگر مشتری یا بائع کو بیع کر لینے کے بعد ندامت ہو یا بیع کرنے کے بعد مشتری کو اس چیز کی ضرورت نہ رہے یا اس چیز کی قیمت ادا کرنے میں مشکل پیش آ جائے تو ان صورتوں میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ترغیب یہ ہے کہ بھائی کی مجبوری کا لحاظ رکھتے ہوئے بیع ختم کر دی جائے اور اسے سودا لینے یا دینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''جس نے مسلمان کے ساتھ اقالہ کیا (اس کے مطالبے پر عقد کو ختم کیا) اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی لغزشیں واپس (معاف) کرے گا۔''[1]

اقالہ کا معنی ہے عقد کو ختم کر دینا اور عاقدین میں سے ہر ایک کا اپنی چیز کو کمی بیشی کے بغیر وصول کر لینا اور بوقت حاجت یہ ایک مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی پر حق ہے، حسن معاملہ ہے اور دینی بھائی چارے کا تقاضا ہے۔

سود اور اس کا حکم

سود کا موضوع نہایت اہم اور نازک ہے جس کی حرمت پر تمام سابقہ شریعتیں متفق رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سودی

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في فضل الإقالة، حديث :3460، وسنن ابن ماجه، التجارات، باب الإقالة، حديث: 2199 واللفظ له.

کاروبار کرنے والے کو بہت سخت وعید سنائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے چھو کر خبطی (بدحواس) کر دیا ہو۔''①

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ سودی معاملات کرنے والے قیامت کو اپنی قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ آسیب کی حالت میں کبھی اٹھتا ہے کبھی گرتا ہے، (پھر اٹھتا ہے، پھر گر جاتا ہے) اس لیے کہ دنیا میں سود خوری کی وجہ سے ان کے پیٹ بہت بڑے اور بھاری ہوں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جو سود کی حرمت سے واقف ہونے کے باوجود سودی لین دین کرتا ہے، یہ وعید سنائی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴾

''اور جس نے پھر بھی (سودی کاروبار) کیا تو وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے۔''②

جس مال میں سود کی آمیزش ہو اس میں برکت و خیر ختم ہو جاتی ہے، چاہے جس قدر بھی بڑھ جائے، بے برکت ہی رہے گا۔ اس مال سے سود خور استفادہ نہیں کر پاتا بلکہ وہ مال باعث وبال بن جاتا ہے۔ دنیا میں پریشانی اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا ﴾ ''اللہ سود کو مٹاتا ہے۔''③

اللہ تعالیٰ نے سودی کاروبار کرنے والے کو کفار اور اُثیم (سخت گناہ گار) قرار دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ○ ﴾

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقے کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔''④

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولاً یہ فرمایا کہ وہ سود لینے دینے والے سے محبت نہیں کرتا۔ واضح رہے کہ کسی شخص سے اللہ تعالیٰ کے محبت نہ کرنے کا مطلب ہے کہ وہ اس سے بغض و ناراضی رکھتا ہے، پھر اسے ﴿ كَفَّارٍ ﴾ کہا جس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی نعمت کی انتہائی ناقدری اور کفران کرنے والا ہے لیکن ملت اسلامیہ سے خارج نہیں، لہٰذا

① البقرة 2:275. ② البقرة 2:275. ③ البقرة 2:276. ④ البقرة 2:276.

سود خور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری اور ناسپاسی کرنے والا ہوتا ہے کیونکہ وہ مجبور اور نادار لوگوں پر رحم و ترس نہیں کرتا، غرباء و فقراء کی مدد نہیں کرتا اور تنگ دست کو رعایت و مہلت نہیں دیتا یا پھر ﴿ كَفَّارٍ ﴾ سے مراد دین اسلام سے خارج کرنے والا ''کفر'' بھی ہوسکتا ہے اور یہ تب ہے جب وہ سود کو جائز اور حلال سمجھے، نیز اسے ﴿ أَثِيمٍ ﴾، یعنی نہایت گناہ گار قرار دیا کیونکہ وہ مادی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرے کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اور اپنے رسول کی طرف سے سود خور کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے کیونکہ وہ سود نہ چھوڑنے کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے۔ علاوہ ازیں اسے ''ظالم'' بھی قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ○ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایماندار ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ہاں! اگر توبہ کرلو تو تمھارا اصل مال تمھارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''[1]

سود کے بارے میں قرآن مجید کی زجر و توبیخ کے علاوہ احادیث رسول میں بھی بہت سخت الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سود کو ہلاک کرنے والے کبیرہ گناہوں میں شامل کیا ہے۔[2] سود کھانے اور کھلانے والوں، اس کے گواہوں اور لکھنے والوں پر لعنت کی[3] اور فرمایا: ''سود کا ایک درہم تینتیس یا چھتیس بار زنا کرنے سے بھی برا ہے۔''[4] نیز فرمایا: ''سود کے بہتر درجے ہیں، ان میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرے۔''[5]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سود کی حرمت جوئے کی حرمت سے بڑھ کر ہے کیونکہ سود خور محتاج اور ضرورت مند سے یقینی طور پر مال وصول کرتا ہے جبکہ جوئے باز کو مال کبھی ملتا ہے اور کبھی نہیں ملتا۔ سود یقینی ظلم ہے جس میں مالدار نادار پر تسلط جما لیتا ہے بخلاف جوئے باز کے اس میں کبھی غریب، امیر شخص سے مال حاصل کرتا ہے، کبھی دونوں جوئے باز غریبی و مالداری میں برابر ہوتے ہیں۔ اگرچہ جوئے میں حاصل ہونے والا مال باطل اور

① البقرة 2:278، 279. ② صحيح البخاري، الوصايا، باب قول الله تعالى: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ...... ﴾ (النسآء 4:10)، حديث: 2766. ③ صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، حديث: 1598. ④ مسند أحمد: 5/225. ⑤ المعجم الأوسط للطبراني: 8/74، حديث: 7147.

حرام ہے لیکن محتاج پر وہ ظلم وضرر نہیں جو سود لینے میں ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ محتاج پر ظلم، غیر محتاج کی نسبت زیادہ برا ہے۔''[1]

سود کھانا یہود کا شیوہ تھا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اور مسلسل لعنت کے مستحق قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ﴾

''پھر ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے اور ان کے اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے کچھ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[2]

سود کو حرام قرار دینے میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کا مال ناحق کھایا جاتا ہے کیونکہ سود خور لوگوں سے وہ مال وصول کرتا ہے جس کے عوض میں انھیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ سود خور فقراء اور ناداروں پر کئی گنا قرض چڑھا دیتا ہے جس کی ادائیگی سے وہ عاجز ہو جاتے ہیں۔ سود سے لوگوں کے ساتھ نیکی اور ہمدردی کرنے کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے، قرضِ حسنہ دینے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور قرض کا ایک ایسا برا دروازہ کھلتا ہے جس کا بڑھتا ہوا بوجھ برداشت کرنا غریب آدمی کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ سود کی وجہ سے کمائی کے جائز ذرائع تجارتیں، پیشے اور صنعتیں (جن کے ساتھ لوگوں کی مصلحتیں وابستہ ہیں) ناکارہ اور معطل ہو جاتی ہیں کیونکہ سود خور سود کے ذریعے سے کسی مشقت کے بغیر ہی خوب مال کماتا ہے اور محنت ومشقت والے کمائی کے ذرائع تلاش نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو معیشت کا ایسا نظام دیا ہے کہ ہر ایک دوسرے سے استفادہ کرے۔ ایک محنت کرے، دوسرا اس کو اس کا معقول معاوضہ دے یا ایک شخص ایک چیز دے اور دوسرا اس کے عوض رقم ادا کرے۔ سود اس شکل سے خالی وعاری ہے کیونکہ سود میں کمزور، طاقتور کو کئی گنا مال دیتا جاتا ہے دوسرے فریق کی طرف سے اس کے عوض کوئی چیز وصول نہیں ہوتی نہ اس کے عوض کوئی کام کیا جاتا ہے۔

سود کو عربی زبان میں رِبَا کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ''اضافہ'' کے ہیں شریعت میں ''مخصوص اشیاء میں اضافے'' کا نام ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ① ادھار کا سود اور ② اضافے کا سود۔

---

① مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 20/347,346. ② النسآء 4:160,161.

ادھار کا سود

اس کی دو صورتیں ہیں:

① کسی تنگ دست کے قرض میں تبدیلی کرنا۔ سود کی یہ شکل زمانہ جاہلیت میں تھی۔ ایک شخص مقرر مدت کے لیے کسی سے ادھار رقم لیتا تھا جب مقرر مدت ختم ہو جاتی تو قرض خواہ مقروض سے کہتا کہ میری رقم (قرضہ) ادا کرو (ورنہ میعاد کے عوض) سود ادا کرو۔ اگر مقروض ادائیگی کر دیتا تو ٹھیک ورنہ قرض خواہ ایک مدت کے لیے مزید رقم بڑھا دیتا۔ اس طرح مدت بڑھنے کے ساتھ مقروض پر قرض کی رقم بھی بڑھتی چلی جاتی حتی کہ کچھ مدت بعد اصل قرض سے کئی گنا رقم اس کے ذمے واجب الادا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ﴾

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے۔''[1]

اس آیت کی روشنی میں حکم یہ ہے کہ جب قرضہ واپس کرنے کی مقررہ مدت پوری ہو جائے اور مقروض قرض واپس نہ کر سکے تو تنگ دست کو مہلت دی جائے، قرضے کی مقدار میں اضافہ نہ کیا جائے۔ اور اگر خوشحال ہے تو وہ قرض واپس کر دے، لہٰذا خوشحال مقروض کے قرض میں بھی اضافہ جائز نہیں جیسا کہ تنگ دست مقروض کے قرض میں اضافہ جائز نہیں۔

دو ہم جنس اشیاء کے باہمی تبادلے میں کسی ایک یا دونوں جنسوں کی ادائیگی میں ادھار کرنا، جس کی علت ایک ہو،[2] حرام ہے، جیسے سونے کی سونے کے ساتھ بیع یا چاندی کی چاندی کے ساتھ، گندم کی گندم کے ساتھ جو کی جو کے ساتھ، کھجور کی کھجور کے ساتھ، نمک کی نمک کے ساتھ بیع کرنا۔ اسی طرح ان مذکورہ اشیاء کی بیع جنس کے بدلے جنس سے ادھار ہو اور ان مذکورہ اشیاء کی علت میں جو شے بھی شریک ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اضافے والا سود اس میں سود کی صورت یہ ہے کہ ہم جنس چیزوں میں تبادلے کے وقت کسی جانب سے کمی بیشی ہو یا ادھار ہو۔

شارع نے چھ اشیاء کا نام لے کر ان کی حرمت واضح کی ہے، یعنی سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک۔ جب ان میں سے کسی ایک جنس کا تبادلہ ہم جنس سے ہو تو اس میں کمی و بیشی کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

---

① البقرة 2:280.

② علت کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔ (صارم)

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ»

''سونا، سونے کے بدلے اور چاندی، چاندی کے بدلے اور گندم، گندم کے بدلے اور جو، جو کے بدلے اور کھجور، کھجور کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے برابر برابر اور نقد و نقد بیع ہو۔''[1]

یاد رہے کہ سونے کی بیع ہر قسم کے سونے کے بدلے حرام ہے، اس کا زیور بنا ہو یا نہ بنا ہو مگر برابر برابر اور نقد و نقد اور چاندی کی بیع چاندی کے بدلے بھی حرام ہوگی اگر برابر برابر اور نقد و نقد نہ ہوگی۔ اسی طرح گندم کی بیع گندم کے بدلے، جو کی جو کے بدلے، کھجور کی کھجور کے بدلے اپنی تمام اقسام کے ساتھ اور نمک کی بیع نمک کے بدلے حرام ہوگی مگر جب برابر برابر اور نقد و نقد ہو (تب جائز ہے)۔

ان چھ چیزوں پر ان چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جو علت میں ان کے مساوی اور شریک ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک ان میں بھی کمی وبیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا حرام ہے، البتہ ان کی علت کی تحدید میں علماء کا اختلاف ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ سونے اور چاندی میں حرمت کی علت ''ثمنیت'' ہے، لہٰذا موجودہ دور کی کرنسی کو ان پر قیاس کیا جائے گا۔ ایک ملک کی کرنسی کا اسی ملک کی کرنسی کے ساتھ تبادلہ کرتے وقت کمی بیشی حرام ہے۔

باقی چار اجناس: گندم، جو، کھجور اور نمک میں علت (بقول صحیح) ماپ اور وزن کے ساتھ ان کا خوراک والی شے ہونا ہے، لہٰذا ہر وہ شے جو علت میں ان کے ساتھ شریک ہے، یعنی ان کا وزن اور ماپ ہوتا ہو اور خوراک میں استعمال ہوتی ہو تو اس کا تبادلہ کرتے وقت کمی بیشی کرنا حرام ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم جنس شے کے تبادلے میں کمی بیشی کرنا سود ہے جس کی علت ماپ اور وزن کے ساتھ شے کا قابل خوراک ہونا ہے، چنانچہ اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔''[2]

بحث سابق کی روشنی میں اگر اشیاء کی جنس اور علت کا اتحاد ہو تو اس میں کمی بیشی یا کسی ایک طرف سے جنس کا ادھار حرام اور سود ہے، مثلاً: گندم کی گندم سے بیع کرنا جیسا کہ حدیث نبوی میں بیان ہو چکا ہے۔ اگر علت میں اتحاد ہے لیکن جنس میں اختلاف ہے، مثلاً: گندم کے ساتھ جو کی بیع کرنا (ان کی علت خوراک ہونا ہے) تو اس میں ادھار کرنا حرام ہے۔ وہ ایک فریق کی طرف سے ہو یا دونوں طرف سے، البتہ اس صورت میں کمی بیشی جائز ہے کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحیح مسلم، المساقاة، باب الصرف و بیع الذهب بالورق نقدًا، حدیث: 1587، ومسند أحمد: 50,49/3.

[2] الفتاوی الکبریٰ: 391/5.

«فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ»

''جب یہ اشیاء مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ دست بدست تبادلہ ہو۔''[1]

اگر جنس اور علت دونوں مختلف ہوں تو کمی بیشی جائز ہے اور نقد یا ادھار کرنا بھی جائز ہے، مثلاً: سونا اور گندم کی بیع یا چاندی اور جو کا باہمی تبادلہ و بیع کرنا۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماپ والی چیز کا اپنی جنس کے بدلے ماپنے کے بغیر اور وزن والی چیز کا اپنی جنس کے عوض وزن کیے بغیر فروخت کرنا ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''سونے کی سونے کے ساتھ اور چاندی کی چاندی کے ساتھ خرید و فروخت وزن کر کے کی جائے۔ گندم کی گندم کے بدلے اور جو کی جو کے بدلے خرید و فروخت ماپ کے ساتھ کی جائے۔''[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شرعی معیار کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا تو تبادلے میں دونوں جنسوں کے برابر ہونے کا یقین نہ ہوگا، لہٰذا کسی کیلی چیز کا تبادلہ اسی جنس کے ساتھ اٹکل و تخمینہ سے کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح وزن کردہ چیز کی بیع اسی جنس کے عوض جس میں صرف برابری کا اندازہ و تخمینہ ہو، ناجائز ہے کیونکہ محض اندازے اور اٹکل سے برابر ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔ اور جنسوں کی برابری کا علم نہ ہونا تفاضل و بیشی کا علم ہونے کی طرح ہے۔

بیع صرف، یعنی نقدی کا باہمی تبادلہ کرنا جنس متحد ہو یا مختلف نقدی سونے کی ہو یا چاندی کی یا نوٹوں کی صورت میں سب کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ اس میں علتِ سود (ثمنیت) پائی جاتی ہے۔

بیع صرف کی مختلف صورتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

- جب کسی کرنسی کی بیع (ہم جنس) کرنسی کے ساتھ کی جائے، مثلاً: سونے کی سونے کے ساتھ بیع ہو یا چاندی کی چاندی کے ساتھ یا نقدی نوٹوں کی بیع ہو جو ایک ہی ملک کے ہوں، مثلاً: ڈالر کی بیع ڈالر سے یا سعودی عرب کے کرنسی نوٹ (ریال) کا تبادلہ سعودی ریال سے ہو تو ضروری ہے کہ تبادلے میں دونوں طرف سے مقدار برابر ہو اور مجلس میں لین دین نقد ہو۔
- اگر ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ کسی دوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ ہو یا جنس اور قسم تبدیل ہو گئی، مثلاً: سعودی ریال کا تبادلہ امریکی ڈالروں سے ہو یا سونے کا لین دین چاندی کے عوض میں ہو تو مجلس میں نقد لین دین (قبضہ) ضروری ہے، البتہ جنسوں میں کمی بیشی جائز ہے۔ اسی طرح سونے کے زیورات کی بیع چاندی کے دراہم کے عوض

[1] صحيح مسلم، المساقاة ، باب الصرف و بيع الذهب بالورق نقدًا، حديث: 1587. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 291/5.

یا کاغذی نوٹ کے عوض جائز ہے بشرطیکہ مجلس میں لین دین نقد ہو۔ اسی طرح چاندی کے زیورات سونے کے بدلے میں کمی بیشی کے ساتھ خریدنا جائز ہے۔

▲ جب سونے کے زیورات کی بیع سونے کے عوض ہو یا چاندی کے زیورات کی بیع چاندی کے عوض ہو یا ایک ہی ملک کی کرنسی ہو تو اس میں دو چیزیں، یعنی وزن میں برابری اور بیع کی مجلس میں نقد لین دین ہونا ضروری ہے۔

▲ سود انتہائی خطرناک ہے، اس سے بچنا تبھی ممکن ہے جب اس کے مسائل کا علم ہو۔ جو مسلمان سود کے مسائل کو جاننے کی طاقت نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ اہل علم سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ وہ بیع کا کوئی بھی معاملہ اس وقت تک طے نہ کرے جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ اس میں سود کی آمیزش نہیں تا کہ اس کا دین سلامت رہے اور اللہ تعالیٰ کے اس عذاب سے بچ جائے جس کی اس نے سود خوروں کو دھمکی دے رکھی ہے۔ لوگ بیع کے معاملات میں عقل و بصیرت سے کام لیے بغیر جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کی اندھی تقلید نہ کرے۔ بالخصوص اس دور میں لوگ کمائی کے ذرائع کی پروا اور خیال نہیں رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَأْكُلُونَ الرِّبَا ، فَمَنْ لَّمْ يَأْكُلْهُ أَصَابَهُ مِنْ غُبَارِهِ»

''لوگوں پر ایسا وقت آئے گا کہ وہ سود کھائیں گے تو جس نے سود نہ بھی کھایا اسے اس کا گرد و غبار پہنچے گا۔''[1]

▲ موجودہ دور میں سودی کاروبار کی جو شکلیں ہیں ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ اگر تنگ دست آدمی قرضے کی رقم واپس کرنے سے قاصر ہو تو مدت و مہلت کی مناسبت سے قرضے کی رقم بڑھا دی جاتی ہے۔ سود کی یہ شکل زمانہ جاہلیت سے چلی آ رہی ہے جس کے حرام ہونے پر اہل اسلام کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایماندار ہو۔ اور اگر نہیں کرتے تو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ہاں! اگر توبہ کر لو تو اصل مال تمھارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے۔''[2]

اس آیت کریمہ میں سود کی اس قسم سے متعلق متعدد تنبیہات ذکر ہوئی ہیں:

---

[1] [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في اجتناب الشبهات، حديث: 3331، وسنن النسائي، البيوع، باب اجتناب الشبهات في الكسب، حديث :4460 واللفظ له. [2] البقرة 2:278-280.

① سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اہل ایمان کہہ کر پکارا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سود کا لین دین ایک مومن شخص کے شایان شان نہیں۔

② ﴿ اتَّقُوا اللَّهَ ﴾ کے کلمات اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ سود کا لین دین کرنے والا اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف نہیں رکھتا۔

③ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ﴾ ''جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو'' میں سود چھوڑنے کا حکم ہے جو وجوب کا متقاضی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ سودی معاملہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔

④ جو شخص سودی لین دین ختم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف اعلان جنگ ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ ''اگر تم (سود) نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

⑤ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ ﴾ ''چنانچہ تمھارا اصل مال تمھارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔'' سے صراحت ہوتی ہے کہ سود خور شخص ظالم ہے۔

قرضہ دے کر اس پر منافع لینا بھی سودی معاملات میں شامل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی کو اس شرط پر قرضہ دیا جائے کہ جب وہ قرضہ واپس کرے گا تو قرضے کی رقم سے زیادہ دے گا یا وہ اتنے فیصد بڑھا کر قرضے کی رقم کے ساتھ ادا کرے گا جیسا کہ آج کل بنکوں میں ہو رہا ہے۔

بنک کا وجود اس نظام پر قائم ہے کہ بنک ضرورت مندوں، تاجروں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالکان، ہنرمندوں اور پیشہ وروں کو اس شرط پر قرضے کی رقم دیتا ہے کہ قرضہ لینے والا قرض کی رقم پر اتنے فیصد نفع بھی بنک کو ادا کرے گا۔ اگر مدت معینہ کے اندر وہ قرض کی رقم کی قسط ادا نہ کرے گا تو اتنے فیصد نفع کی رقم مزید بڑھ جائے گی۔ یہ سراسر سود ہے جس میں سود کی دونوں ہی صورتیں (جو پیچھے گزر چکی ہیں) جمع ہو جاتی ہیں۔

بنکوں کے سودی نظام اور معاملات میں سے ایک سودی نظام بچت کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ) بھی ہے، یعنی اگر کوئی شخص اپنی رقم مقررہ مدت کے لیے بنک میں رکھتا ہے تو بنک اسے پوری مدت تک اپنے استعمال میں لاتا ہے اور امانت رکھنے والے (کھاتہ دار) کو دس یا پانچ فیصد نفع (سود) دیتا ہے۔

سودی کاروبار میں سے ایک صورت ''بیع عینہ'' کی ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنی چیز ادھار بیچ دیتا ہے، پھر اس کو کم رقم دے کر نقد خرید لیتا ہے تو اس معاملے (خرید و فروخت) کو ''بیع عینہ'' کہتے ہیں کیونکہ ادھار سامان خریدنے والا اس کے بدلے میں عین (نقد) مال وصول کر لیتا ہے اس طرح کی بیع صرف سود کمانے کا ایک حیلہ ہے جبکہ بہت زیادہ احادیث میں اس کی نہی وارد ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب تم ''بیع عینہ'' کرنے لگ جاؤ گے اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لو گے (زراعت میں مشغول ہو جاؤ گے) اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت و رسوائی مسلط کر دے گا حتی کہ تم اپنے دین کی طرف پلٹ آؤ۔''[1] نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا جب وہ بیع کا نام دے کر سود کو حلال قرار دیں گے۔''[2]

مسلمانو! اپنے معاملات میں سود کو داخل نہ ہونے دو۔ اپنے مال کو سود کی ملاوٹ سے بچاؤ کیونکہ سود لینا اور دینا کبیرہ گناہ ہے۔ جس قوم میں سود اور زنا ظاہر ہوتے ہیں ان میں فقر و محتاجی اور مختلف ناقابل علاج بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر ظالم حکمران مسلط کر دیتا ہے۔ سود مال کو تباہ کرتا ہے اور خیر و برکت کو مٹا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کھانے پر سخت وعید بیان فرمائی ہے اور سود کھانے کو شرمناک اور کبیرہ گناہ شمار کیا ہے۔ سود کھانے والے کی سزا دنیا اور آخرت میں بیان کر دی ہے، نیز سود خور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ اسی سود کی وجہ سے مال کی برکت اٹھ جاتی ہے اور سود کا مال عموماً ہلاک اور برباد ہوتا رہتا ہے۔ کتنے ہی واقعات ایسے ہیں کہ سود خوروں کا بڑا بڑا مال جل جاتا ہے، تباہ ہو جاتا ہے یا سمندروں اور سیلابوں کی نذر ہو جاتا ہے اور سود خور کنگال ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ مال سود خوروں کے پاس رہے تو بھی اس میں کوئی خیر و برکت نہیں ہوتی۔ اس سے تو وہ کوئی فائدہ نہیں حاصل کر پاتا جبکہ وہ اس کے حساب و کتاب میں پھنسا رہتا ہے اور اسی کے دکھ میں مبتلا رہتا ہے۔

سودی کاروبار کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں اور اس کی مخلوق کے ہاں ناپسندیدہ ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ لوگوں سے مال چھینتے ہیں ان کو دیتے نہیں، جمع کر کے اپنے پاس روکے رکھتے ہیں، نہ تو اس سے صدقہ و خیرات کرتے ہیں اور نہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ انتہائی حریص اور لالچی ہوتے ہیں، بہت زیادہ مال کو جمع کرنے والے اور بہت زیادہ روکنے والے ہوتے ہیں۔ دل ان سے متنفر ہیں جبکہ یہ لوگ معاشرے کے دھتکارے ہوتے ہیں۔ یہ تو ان کی دنیاوی سزا ہے جبکہ اخروی سزا تو بہت سخت اور دائمی ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في النهي عن العينة، حديث :3462. [2] [ضعيف]غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال والحرام، حديث : 13، و إغاثة اللهفان من مصائد الشيطان:1/486.

قرآن کریم میں کر دی ہے۔ اور یہ صرف اس لیے ہے کہ سود کی کمائی ناپاک، حرام اور نقصان وہ ہوتی ہے اور یہ انسانی معاشرے پر ایک بھاری بوجھ ہے۔

اصول کی بیع کے احکام

اصول سے مراد مکانات، زمینیں اور درختوں کی بیع ہے۔ ان چیزوں کی خرید وفروخت کے وقت جو اشیاء ان سے ملحق ہوں گی وہ بھی مشتری کو ملیں گی اور جو اشیاء ملحق نہ ہوں گی وہ (بیع کے بعد بھی) بائع کی ملکیت میں رہیں گی۔ اس باب میں مشتری اور بائع ہر ایک کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا حق کیا ہے اور کیا نہیں تاکہ ان کے مابین کوئی اختلاف اور جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

واضح رہے جن امور میں ہمارے لیے کوئی مصلحت یا نقصان ہے، دین اسلام نے ہمیں ان سے متعلق اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ وضاحت کے ساتھ ان میں ہماری راہنمائی کر دی ہے۔ جب کوئی قوم اسلامی احکام پر عمل پیرا ہوگی تو ان کے جھگڑے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ ان احکامات میں سے بیع کے احکام بھی ہیں۔

بسا اوقات انسان ایک چیز فروخت کرتا ہے تو کچھ اشیاء اس میں شامل نہیں ہوتیں، بائع اور مشتری میں ان متعلقات کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جو لڑائی جھگڑے کا سبب بنتا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں فقہائے کرام ''اسلامی فقہ'' میں ''اصول کی بیع کے مسائل'' کے عنوان سے ایک باب مقرر کرتے ہیں جن میں اس اختلاف کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ ہم یہاں ان مسائل کا خلاصہ آپ کے سامنے رکھیں گے۔

▲ اگر کوئی شخص گھر بیچتا ہے تو اس بیع میں دیواریں اور چھت شامل ہے کیونکہ انھی چیزوں کو گھر کہا جاتا ہے۔ گھر میں وہ اشیاء بھی شامل ہیں جن سے گھر کی تکمیل ہوتی ہے، مثلاً: لگے ہوئے دروازے، سیڑھیاں، میخوں کے ساتھ لگائی ہوئی شیلفیں۔ اسی طرح گھر کا ضروری سامان، مثلاً: بجلی کی لگی ہوئیں اشیاء، لٹکتے ہوئے فانوس، پانی کی ٹینکی اور پانی پہنچانے والے پائپ، ایگزاسٹ فین، گیزر، گھر میں لگے ہوئے درخت، پودے، سایہ حاصل کرنے کے لیے بنی ہوئی اشیاء وغیرہ۔ علاوہ ازیں گھر کی زمین کے نیچے اگر معدنیات جامدہ ہوں تو وہ بھی مشتری کی ملکیت میں آجائیں گی۔

جو اشیاء گھر میں شامل نہیں بلکہ الگ سمجھی جاتی ہیں وہ گھر کی بیع میں شامل نہ ہوں گی، مثلاً: پڑی ہوئی لکڑی، رسیاں، برتن، قالین کارپٹ اور گھر کی جس چیز کو زمین میں حفاظت کی خاطر دفن کیا گیا ہو، مثلاً: قیمتی پتھر، خزانہ

وغیرہ، البتہ چابی تالا بیع میں شامل ہوگا۔

جب کسی نے زمین فروخت کی تو جو اشیاء زمین سے متصل ہوتی ہیں وہ بھی بیع میں شامل ہوں گی، مثلاً: پودے، درخت اور عمارت۔ اسی طرح اگر کسی نے باغ فروخت کیا تو یہ بیع باغ کی زمین، درختوں، باڑوں اور اس میں موجود کمروں کو بھی شامل ہوگی۔

اگر کسی نے زمین فروخت کی جس میں ایسی فصل ہو جس کی سال میں ایک مرتبہ کٹائی ہوتی ہے، مثلاً: گندم، جو وغیرہ تو وہ فصل بائع کی ہوگی، لہٰذا بیع کا اطلاق فصل پر نہ ہوگا۔ اور اگر ایسی فصل ہو جو سال میں ایک سے زائد مرتبہ کاٹی جاتی ہو، مثلاً: سبز چارہ یا اس کا سال میں کئی مرتبہ چناؤ ہوتا ہو، مثلاً: ککڑیاں، بینگن وغیرہ تو زمین کے ساتھ ہی وہ فصل بھی مشتری کی ہوگی، البتہ جو سبزی وغیرہ بیع کے وقت چنے جانے کے قابل ہے وہ ایک بار بیچنے والا چنے گا۔ اس کے بعد خریدنے والے کی ہوگی۔

گزشتہ تفصیل میں ہم نے جو ذکر کیا ہے کہ بعض اشیاء بائع کے پاس رہیں گی اور بعض مشتری کے حوالے ہوں گی، یہ تب ہے جب بائع اور مشتری کے مابین کوئی شرط طے نہ ہو۔ اگر ان اشیاء کے بارے میں کوئی شرط طے ہوئی تو وہ چیز اسے ملے گی جس کو دینے کی شرط لگائی گئی ہے، دوسرے کو نہیں ملے گی۔ اس شرط کو پورا کرنا لازم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ» ''مسلمان اپنی مقررہ شرائط کی پاسداری کریں۔''[1]

جو شخص کھجور کا درخت فروخت کرتا ہے اور اس کی تأبیر[2] بھی ہو چکی ہے تو پھل ''بائع'' کو ملے گا الا یہ کہ مشتری شرط کر لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنِ ابْتَاعَ نَخْلاً بَعْدَ أَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُهَا لِلَّذِي بَاعَهَا إِلَّا أَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ»

''جس نے تأبیر کے بعد کھجور کے درخت کی بیع کی تو اس کا پھل بائع کے لیے ہے الا یہ کہ مشتری اس کی شرط کر لے۔''[3]

---

① جامع الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول اللهﷺ في الصلح بين الناس، حديث: 1352.

② کھجوروں میں ایک درخت نر ہوتا ہے ایک مادہ، نر کے پھول (بار آور ہونے کی غرض سے) مادہ پر چڑھانے (چھڑکنے) کو تأبیر کہتے ہیں (اردو لغت کراچی۔)

③ صحيح البخاري، المساقاة، باب الرجل يكون له ممرّ أو شرب في حائط أوفي نخل، حديث: 2379، وصحيح مسلم، البيوع، باب من باع نخلاً عليها تمر، حديث: 1543 واللفظ له.

انگور، شہتوت اور انار کے درختوں کا پھل پک جائے تو ان کا حکم بھی وہی ہے جو کھجور کے درخت کا ہے، یعنی وہ بائع ہی کا ہے۔ اگر کھجور کے درخت کی تأبیر اور انگور وغیرہ کی بیل پر پھل کے ظہور سے قبل بیع ہوئی تو پھل مشتری کا ہے۔ کھجور کے درخت کے بارے میں جو روایت گزر چکی ہے اس کا یہی مفہوم ہے، نیز قیاس بھی اس کا متقاضی ہے۔

اس گزشتہ تفصیل کو دیکھ کر شریعت اسلامیہ کا کمال سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں لوگوں کی مشکلات کا کس قدر حل ہے۔ شریعت ہر حق والے کو اس کا حق اس طرح دیتی ہے کہ دوسروں پر ظلم وزیادتی بھی نہیں ہوتی۔ اس میں ہر مشکل کا ایسا حل ہے جو مصلحت وحکمت پر مبنی ہے کیونکہ یہ شریعت ایسی ذات کی طرف سے ہے جو حکیم وحمید ہے اور اسے خوب معلوم ہے کہ ہر زمان ومکان میں اس کے بندوں کا نفع اور ان کا نقصان کس صورت میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سچ فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور تم میں سے اختیار والوں کی، پھر اگر کسی چیز میں اختلاف (ونزاع) کرو تو اسے لوٹاؤ اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف اگر تمھارا اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام بہت اچھا ہے۔''[1]

لوگوں کے درمیان اختلاف ونزاع کا خاتمہ، مصالح کا تحقق اور ایمان دار نفوس کا اطمینان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم وفیصلے پر عمل کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ انسانی نظام انسانی مسائل کے حل سے قاصر ہے، اس میں خواہشات اور نزاعات کا دخل ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾

''اگر حق ہی ان کی خواہشوں کا پیروکار ہو جائے تو زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درہم برہم ہو جائے۔''[2]

ان اذہان وقلوب کے لیے تباہی وبربادی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون کو چھوڑ کر انسانوں کا بنایا ہوا قانون اختیار کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] النسآء 59:4. [2] المؤمنون 71:23.

﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ ﴾

''کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟''[1]

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کی مدد فرمائے اور اپنے کلمے کو بلند کرے۔ مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے مکر وفریب سے محفوظ رکھے۔ بے شک وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

پھلوں وغیرہ کی بیع

پھلوں سے مراد وہ پھل ہیں جو درختوں پر لگے ہوں اور کھائے جاتے ہوں۔ ان کے احکام درج ذیل ہیں:

جب درختوں پر لگا ہوا صرف پھل ہی بیچا جائے (درخت شامل نہ ہوں) تو اس عقد کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس پھل کی صلاحیت ظاہر ہو چکی ہو ورنہ بیع جائز نہ ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل اس کی بیع سے منع فرمایا ہے، (اس سے) بائع اور مشتری دونوں کو منع کر دیا ہے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے بائع کو منع فرمایا کہ وہ درختوں پر پھل کی صلاحیت ظاہر ہوئے بغیر فروخت کرے تاکہ وہ لوگوں کا مال حرام اور باطل طریقے سے نہ کھائے۔ اسی طرح آپ نے مشتری کو بھی منع کیا کیونکہ وہ باطل طریقے سے مال کھلانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ صحیحین میں روایت ہے:

«أَنَّهُ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الثَّمَرَةِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا وَعَنِ النَّخْلِ حَتّٰى يَزْهُوَ، قِيلَ: وَمَا يَزْهُو؟ قَالَ: يَحْمَارُّ أَوْ يَصْفَارُّ»

''نبی ﷺ نے پھل کی درستی ظاہر ہونے تک اور کھجور کے بڑھنے تک سودا کرنے سے منع کیا۔ پوچھا گیا: بڑھنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ سرخ یا زرد ہو جائے۔''[3]

درج بالا دونوں حدیثوں میں جو نہی وارد ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ درستی ظاہر ہونے سے پہلے پھل کی

---

[1] المآئدة 5:50. [2] صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، حديث: 2194، وصحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها بغير شرط القطع، حديث: 1534. [3] صحيح البخاري، البيوع، باب بيع النخل قبل أن يبدو صلاحها، حديث: 2197، وصحيح مسلم، البيوع، باب وضع الجوائح، حديث: 1555.

بیع کرنا درست نہیں۔

اسی طرح کھیتی کی بیع دانہ سخت ہونے سے پہلے جائز نہیں کیونکہ صحیح مسلم میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ النَّخْلِ حَتّٰى يَزْهُوَ، وَعَنْ بَيْعِ السُّنْبُلِ حَتّٰى يَبْيَضَّ وَيَأْمَنَ الْعَاهَةَ، وَنَهَى الْبَائِعَ وَالْمُشْتَرِيَ»

''رسول اللہ ﷺ نے درختوں پر لگی ہوئی کھجوروں کی بیع سے منع فرمایا الا یہ کہ وہ بڑی ہو جائیں اور گندم وغیرہ کی بالیوں کی بیع سے منع کیا الا یہ کہ وہ سفید ہو جائیں اور ان پر آفت آنے کا خطرہ نہ رہے۔ اس بارے میں آپ نے بائع اور مشتری دونوں کو منع کیا۔''[1]

درخت پر پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے یا کھیتی میں دانہ سخت ہونے سے قبل بیع کی نہی میں حکمت یہ ہے کہ اس دوران میں عموماً آندھیاں اور آفتیں آتی ہیں جن کے سبب اکثر پھل ضائع ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

«أَرَأَيْتَ إِذَا مَنَعَ اللهُ الثَّمَرَةَ بِمَ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ مَّالَ أَخِيهِ؟»

''بتاؤ تو سہی! اگر اللہ تعالیٰ نے پھل روک دیا تو تم میں سے کوئی کس چیز کے بدلے اپنے بھائی کا مال لے گا؟''[2]

درج بالا ارشاد نبوی میں لوگوں کے ساتھ انتہائی ہمدردی اور شفقت ہے۔ ان کے اموال کو محفوظ کرنا ہے اور لوگوں کے درمیان اس اختلاف ونزاع کو ختم کرنا ہے جو باہمی عداوت اور بغض وعناد تک پہنچا دیتا ہے۔

درج بالا روایت میں ان لوگوں کے لیے زجر وتنبیہ ہے جو مختلف حیلوں سے لوگوں کے مال پر قبضہ کرتے ہیں، نیز اس حدیث میں مسلمان کو رغبت دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے مال کی حفاظت کرے اور اسے ضائع نہ ہونے دے۔ اس لیے کہ اگر مشتری نے درختوں پر پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل ہی خرید لیا اور آفت کی صورت میں اس کا مال ضائع ہو گیا تو بائع سے اس کی واپسی نہایت مشکل ہو گی۔

اس حدیث شریف سے اصول فقہ کا ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ حکم کا دارومدار اکثری وعمومی حالات پر ہوتا ہے کیونکہ پھل درستی ظاہر ہونے سے پہلے زیادہ تر ضائع ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کی فروخت جائز نہیں اور درستی ظاہر ہونے کے بعد عام طور پر پھل سلامت رہتا ہے، اس لیے اس صورت میں بیع جائز ہے، نیز اس حدیث سے یہ

[1] صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها بغير شرط القطع، حديث 1535. [2] صحيح البخاري، البيوع، باب إذا باع الثمار قبل أن يبدو صلاحها ......، حديث 2198.

بھی معلوم ہوا کہ مال کو خطرے میں ڈالنا جائز نہیں، اگرچہ مال کے بدلے مال ہی کی صورت کیوں نہ ہو، جب اس کا نتیجہ غیر یقینی ہو۔

گزشتہ بحث سے ہمیں معلوم ہوا کہ جب تک درختوں پر پھل کی درستی ظاہر نہ ہو اس کی بیع جائز نہیں لیکن یہ تب ہے جب صرف درختوں پر لگے ہوئے پھل کی بیع ہو اور اس میں یہ شرط ہو کہ پھل ابھی نہیں اتارا جائے گا، البتہ جب پھل کی بیع درخت سمیت ہو یا مذکورہ بالا شرط نہ ہو تو (پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل بھی) جائز ہے۔ فقہائے کرام نے اس کی تین صورتیں بیان کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

① درخت پر پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل درخت سمیت پھل کی بیع جائز ہے کیونکہ اس میں پھل درخت کے ضمن میں فروخت ہو جائے گا۔ اسی طرح جب کوئی سرسبز کھیتی بمع زمین فروخت کرے تو جائز ہے، اس صورت میں سرسبز کھیتی زمین کے ضمن ہی میں فروخت ہوگی۔

② اگر درخت پر پھل کی درستی ظاہر ہونے یا سرسبز کھیتی میں دانہ پڑنے سے قبل ہی وہ درخت یا کھیتی اصل (درخت، زمین) کے مالک کو فروخت کی گئی تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ جب یہ دونوں چیزیں اصل کے مالک کو فروخت کی گئیں تو خریدار کو چیز کی ادائیگی مکمل طور پر ہوگئی کیونکہ وہ اصل (درخت یا کھیتی) کا مالک ہو گیا اور موجود چیز (پھل اور غلہ کا بھی)، لہٰذا بیع صحیح ہوگی۔ واضح رہے اس صورت کے جواز یا عدم جواز میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض علماء اس صورت کو اسی منع کردہ صورت ہی میں شامل کرتے ہیں کیونکہ درخت پر پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل فروخت کرنے کی نہی میں عموم ہے۔

③ درخت پر پھل کی درستی ظاہر ہونے سے قبل یا کھیت کے پودوں میں دانہ سخت ہونے سے پہلے اس شرط پر فروخت کرنا کہ پھل بیع کے فوراً بعد کاٹ یا اتار لیا جائے گا تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن یہ تب ہے جب کٹائی کے فوراً بعد پھل سے یا دانے سے کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو کیونکہ بیع کے منع کی وجہ پھل کے تلف ہونے کا خوف تھا، جب فوراً کٹائی یا چناؤ کر لینے سے اندیشہ ختم ہو گیا تو یہ صورت جائز ہوئی، البتہ جب معلوم ہو کہ فوراً کٹائی یا چناؤ کے بعد پھل فائدہ مند نہیں ہوگا تو بیع ناجائز ہوگی کیونکہ اس صورت میں مال کے ضائع اور برباد ہونے کا اندیشہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مال کو ضائع کرنے سے منع کیا ہے۔

جو پھل سال میں متعدد بار کاٹا یا چنا جاتا ہو اس کی موجودہ اور آئندہ چنائی کو (بیک وقت) فروخت کرنا جائز ہے، مثلاً: ترکاری، ککڑی، بینگن وغیرہ۔ اس میں اگرچہ علماء کا اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک صحیح قول جواز کا

ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ دونوں بزرگ اس کے جواز کے قائل ہیں۔[1]

آسمانی آفت کے سبب پھلوں کا نقصان

اگر بیع کی جائز صورت میں درخت پر لگا ہوا پھل فروخت کر دیا گیا، پھر مشتری کے اتار لینے سے پہلے کسی آسمانی آفت نے جس میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں ہوتا، اسے ضائع کر دیا، مثلاً: آندھی، شدید گرمی، خشک سالی، کثرت بارش، شدید سردی یا ٹڈی دل کا حملہ وغیرہ، جس نے اس قدر پھل ضائع کر دیا کہ مشتری کچھ حاصل نہ کر سکا تو مشتری بائع کے پاس جا کر اپنی قیمت کی واپسی کا مطالبہ کرے گا کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ»

''نبی ﷺ نے آسمانی آفت کے سبب نقصان معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔''[2]

اس روایت سے واضح ہوا کہ ضائع ہونے والا پھل بائع کی ملکیت میں ہے، لہٰذا اس کی قیمت مشتری کے ذمے نہیں۔ اگر سارا پھل تلف ہو تو مشتری سے لی گئی پوری قیمت واپس کی جائے اور اگر کچھ پھل تلف ہوا ہو تو جس قدر تلف ہوا مشتری اتنی رقم بائع سے واپس لے کیونکہ حدیث نبوی میں عموم ہے، نیز اس عموم کا تقاضا ہے کہ پھل کی درستی ظاہر ہونے کے بعد بیع ہوئی ہو یا اس سے پہلے، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيكَ بِغَيْرِ حَقٍّ؟» ''تم اپنے بھائی کا مال ناحق کیوں لیتے ہو؟''[3]

▲ اگر معمولی نقصان ہو تو وہ بائع کی بجائے مشتری کے ذمے ہوگا کیونکہ ایسا عموماً ہوتا رہتا ہے جس سے بچنا ممکن نہیں۔ اسے عرف میں آفت بھی نہیں کہا جاتا، مثلاً: پرندوں کا پھل کھا جانا یا اس کا زمین پر گر جانا وغیرہ۔ بعض علماء نے معمولی نقصان کی حد ''تہائی سے کم ہونا'' مقرر کی ہے لیکن مناسب اور صحیح یہی ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کا اعتبار عرف پر ہوگا جبکہ تحدید کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو وارد نہیں۔

▲ کسی آسمانی آفت میں پھل کے نقصان کی ذمے داری جو بائع پر ہے بعض علماء کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے پھل پر مشتری کا قبضہ ناقص ہے۔ یہ ایسے ہے گویا اس کا قبضہ ہوا ہی نہیں، اس لیے وہ

[1] مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیہ 484/29، وإعلام الموقعین: 29/2. [2] صحیح مسلم، المساقاة، باب وضع الجوائح، حدیث 1554، بعد حدیث: 1555. [3] صحیح مسلم، المساقاة، باب وضع الجوائح، حدیث: 1554.

نقصان کا ذمہ دار بھی نہیں۔

◄ درج بالا صورت میں پھل کے ضیاع کا تعلق آسمانی آفت سے ہے۔ اگر پھل کا ضیاع کسی آدمی کے عمل یا کوتاہی کی وجہ سے ہو، مثلاً: آگ لگانا تو مشتری کو اختیار ہوگا، چاہے تو بیع کو فسخ قرار دے کر بائع سے اپنی رقم کا مطالبہ کرے، بائع نقصان پہنچانے والے انسان سے نقصان کا معاوضہ مانگے۔ اور یہ صورت بھی درست ہے کہ مشتری بیع کو قائم رکھے اور نقصان پہنچانے والے سے خود معاوضہ طلب کرے۔

◄ کھجور کے درخت کے علاوہ دیگر پھلوں کے صحیح طور پر تیار ہونے کی علامت (جسے رسول اللہ ﷺ نے بیع کے جواز یا عدم جواز کے لیے معیار قرار دیا ہے) مختلف درختوں میں مختلف ہے، مثلاً: انگور کا تیار ہونا یہ ہے کہ پکنے کے لیے تیار ہو کر رس میں مٹھاس شروع ہو جائے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْعِنَبِ حَتّٰى يَسْوَدَّ»

''نبی ﷺ نے انگوروں کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ سیاہ ہو جائیں۔''[1]

سیب، تربوز، انار، خوبانی، اخروٹ کا تیار ہونا، اس کا پک جانا اور ذائقے کا درست ہونا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

«نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثَّمَرِ حَتّٰى يَطِيبَ»

''آپ ﷺ نے پھل بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ خوش ذائقہ ہو جائے۔''[2]

ککڑیوں کا تیار ہونا ان کا کھانے کے قابل ہونا ہے۔ اناج کا تیار ہونا یہ ہے کہ دانہ سخت و سفید ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اناج کی بیع کی صحت کے لیے یہی معیار قرار دیا ہے۔

فروخت شدہ مال سے ملحق اشیاء

یہاں ہم ان اشیاء کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو فروخت شدہ شے کے ساتھ ملحق ہوتی ہیں، یعنی ان پر مشتری ہی کا حق ہوتا ہے الا یہ کہ بائع شرط لگا کر اسے مستثنیٰ قرار دے۔

جس نے غلام یا جانور فروخت کیا تو غلام کی بیع کے ساتھ اس کے جسم کے وہ کپڑے شامل ہوں گے جو عادۃً

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في بيع الثمار قبل أن يبد و صلاحها، حديث 3371، ومسند أحمد: 221/3. [2] صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الثمر على رؤوس النخل بالذهب أو الفضة، حديث: 2189، وصحيح مسلم، ◄◄

پہنے جاتے ہیں۔اسی طرح جانور کی بیع میں اس کی لگام،نکیل اور اسے لگی ہوئی کھریاں بھی شامل ہوں گی کیونکہ عرف میں یہ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔اور جو چیز عرف میں بکنے والی چیز کے ساتھ ملحق نہ ہواور بکنے والی چیز کی ضرورت میں سے نہ ہوتو وہ فروخت شدہ چیز کے ساتھ شامل بھی نہیں ہوگی، مثلاً: غلام کا مال یا غلام کی خوبصورتی کے کپڑے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنِ ابْتَاعَ عَبْدًا وَّلَهُ مَالٌ، فَمَالُهُ لِلَّذِي بَاعَهُ إِلَّا أَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ»

''جس نے ایسا غلام خریدا جس کے پاس مال ہے تو اس کا مال بائع کے لیے ہوگا الا یہ کہ مشتری اس کی شرط کرلے۔''[1]

واضح رہے کہ مال غلام سے زائد چیز ہے،لہٰذا وہ غلام کی بیع میں شامل نہ ہوگا۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کے پاس دوغلام ہوں اوران میں سے ایک فروخت کردے، نیز غلام اور مال آقا کا ہوتا ہے جب اس نے غلام کو بیچ دیا تو مال آقا کے پاس باقی رہے گا۔

▲ اگر مشتری نے بیع میں غلام کے ساتھ مال کی بھی شرط لگادی تو غلام کی بیع میں مال بھی شامل ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِلَّا أَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ» ''اگر خریدار شرط لگادے تو درست ہے۔''[2]

بیع سلم کا بیان

بیع سلم کو بیع سلف بھی کہتے ہیں جس میں قیمت نقد اور شے ادھار ہوتی ہے۔فقہائے کرام نے بیع سلم کی تعریف یوں کی ہے:

«هُوَ عَقْدٌ عَلٰى مَوْصُوفٍ فِي الذِّمَّةِ مُؤَجَّلٌ بِثَمَنٍ مَّقْبُوضٍ فِي مَجْلِسِ الْعَقْدِ»

◂◂ البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بد و صلاحها بغير شرط القطع، حديث: 1536. [1] صحيح البخاري، المساقاة، باب الرجل يكون له ممرّ أوشرب في حائط أو في نخل، حديث: 2379، وصحيح مسلم، البيوع، باب من باع نخلاً عليها تمر، حديث: 1543. [2] صحيح البخاري، المساقاة، باب الرجل يكون له ممرّ أوشرب في حائط أو في نخل، حديث: 2379، وصحيح مسلم، البيوع، باب من باع نخلاً عليها تمر، حديث: 1543.

''یہ مجلس عقد میں نقد ادا کردہ رقم کے عوض ایک ایسی چیز پر عقد ہے جس کے اوصاف طے، بائع کے ذمہ میں ہے اور مدت معلوم ومقرر ہے۔''

قرآن وسنت اور اجماع کی روشنی میں بیع سلم جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے ''میں شہادت دیتا ہوں کہ بیع سلف (سلم)، جس کی ذمے داری ایک مقررہ مدت کے لیے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن مجید میں) حلال قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے، پھر وہ (درج بالا) آیت تلاوت کرتے۔''[2]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ (اہل مدینہ) دوسال اور تین سال کی میعاد پر پھلوں کی ''بیع سلم'' کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَفِي كَيْلٍ مَّعْلُومٍ وَّوَزْنٍ مَّعْلُومٍ إِلٰى أَجَلٍ مَّعْلُومٍ»

''جو شخص کسی سامان میں بیع سلم کرتا ہے تو وہ معین ناپ اور مقرر وزن میں ایک متعین مدت تک کے لیے ''بیع سلم'' کرے۔''[3]

اس روایت سے واضح ہوا کہ بیع سلم مذکورہ شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کے جواز پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے، نیز لوگوں کو اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے کیونکہ اس میں بائع کو قیمت اور مشتری کو سامان بوقت ضرورت مل جاتا ہے۔

بیع سلم درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

① مجلس معاہدہ میں مبیع (فروخت ہونے والی) شے کا تعین صفات کے ساتھ اس طرح ہو کہ اس کی جنس، نوع اور مقدار واضح ہو جائے تاکہ بعد میں فریقین کے مابین کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو جو جھگڑے کی صورت اختیار کر جائے، جس چیز کی صفات مختلف فیہ ہوں ان میں بیع سلم جائز نہیں، مثلاً: ترکاریاں، چمڑے، مختلف برتن اور جواہر وغیرہ۔

① البقرة 2:282. ② تفسير الطبري: 3/117، حديث: 4947، والمستدرك للحاكم: 2/314، حديث: 3130. ③ صحيح البخاري، السلم، باب السلم في وزن معلوم، حديث: 2240.

② شے کی جنس اور اس کی نوع کا ذکر ہو، مثلاً: جنس چاول ہوگی اور اس کی قسم ''باسمتی'' ہوگی۔

③ شے کا ماپ، وزن اور پیمائش کا تذکرہ ہو جیسا کہ اوپر روایت میں گزر چکا ہے۔ اگر چیز کی مقدار معلوم و متعین نہ ہوگی تو اس کی وصولی مشکل ہوگی۔

④ شے کی ادائیگی کی مدت متعین ہو۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان: إِلٰى أَجَلٍ مَّعْلُومٍ ہے، یعنی اس کی مدت متعین ہو۔[1]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ﴾

''جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''[2]

⑤ مدت ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت شے کی جنس کا پایا جانا ممکن ہو تا کہ بائع وقت مقرر پر اسے مشتری کے حوالے کر سکے ورنہ بیع سلم جائز نہ ہوگی، مثلاً: تازہ انگور کی ادائیگی کا وقت موسم سرما مقرر نہ کیا جائے کیونکہ اس میں ادائیگی ممکن نہیں۔

⑥ بیع سلم میں مجلس میں مقرر قیمت مکمل طور پر نقد ادا کر دی جائے جیسا کہ گزشتہ روایت میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو بیع سلم (سلف) کرے وہ معلوم ماپ کے ساتھ کرے۔''[3] [فَلْيُسْلِفْ] کا مطلب ہے ادائیگی کر دے۔

اس کی وجہ امام شافعی رحمہ اللہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ''اس عقد کو بیع سلم اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک مشتری بیع کی مجلس میں اٹھنے سے پہلے تمام رقم ادا نہ کر دے کیونکہ اگر بائع مجلس میں رقم وصول نہ کرے گا تو دین (قرض) کی بیع دین (قرض) ادھار کے ساتھ ہوگی جو ناجائز ہے۔

⑦ جس شے میں بیع سلم ہو وہ متعین بالذات نہ ہو بلکہ بائع کے ذمہ میں ہو، اسی وجہ سے متعین گھر اور درخت میں سلم جائز نہیں کیونکہ متعین چیز ادائیگی سے قبل تلف بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا مقصد فوت ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اگر ممکن ہو تو ''مُسلَم فیہ'' (جس سامان میں بیع سلم ہوئی ہے) کی ادائیگی ''محل عقد'' (جہاں معاہدہ طے پایا ہے) میں کی جائے اور اگر ممکن نہ ہو، مثلاً: انھوں نے کسی جنگل یا سمندر میں معاہدہ کیا ہو تو چیز کی ادائیگی کی جگہ کا

---

① صحيح البخاري، السلم، باب السلم في كيل معلوم، حديث: 2240، وجامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والثمر، حديث: 1311. ② البقرة 2:282. ③ صحيح البخاري، السلم، باب السلم في كيل معلوم، حديث: 2240، وجامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والثمر، حديث: 1311.

ذکر اور تعین کرنا ضروری ہے۔ جس جگہ ادائیگی پر دونوں متفق ہوں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر دونوں میں اختلاف ہو تو ''محل معاہدہ'' ہی ادائیگی کی جگہ طے پائے گا بشرطیکہ وہاں ادائیگی ممکن ہو۔

- بیع سلم کے احکام میں یہ بھی ہے کہ جس چیز میں بیع سلم ہوئی ہو خریدار اسے وصول کرنے سے پہلے کسی اور ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا کیونکہ حدیث میں ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰی عَنْ بَيْعِ الطَّعَامِ قَبْلَ أَنْ يُّقْبَضَ»

''رسول اللہ ﷺ نے کھانے والی شے کی بیع کرنے سے اس وقت تک منع فرمایا جب تک وہ قبضہ میں نہ آجائے۔''[1]

بیع سلم میں حوالہ جائز نہیں، یعنی فروخت کرنے والا خریدار کو کہے کہ یہ چیز مجھ سے وصول کرنے کے بجائے فلاں شخص سے وصول کرلینا۔ یہ منع ہے کیونکہ حوالہ ایک ثابت قرض کے بارے میں ہوسکتا ہے جبکہ سلم میں فسخ کا امکان ہے۔

- بیع سلم کا ایک حکم یہ ہے کہ جب وقت مقرر پر مُسلَم فیہ (سامان یا چیز) میسر نہ ہو، مثلاً: کسی پھل کی ادائیگی کے بارے میں بیع سلم ہوئی تھی لیکن اس سال درختوں پر پھل نہ لگا تو مشتری ایک سال صبر کرے حتی کہ بائع کو پھل حاصل ہوجائے، پھر اس کا مطالبہ کرے یا بیع کو فسخ قرار دے کر اپنی رقم کا مطالبہ کرے کیونکہ جب معاہدہ قائم نہ رہا تو رقم کی واپسی ضروری ہے۔ اگر رقم ضائع یا خرچ ہوگئی تو اس کے بدلے میں اور رقم ادا کرے۔

''بیع سلم'' کے معاملے کی اباحت و جواز شریعت اسلامیہ کی طرف سے لوگوں کے لیے سہولت و آسانی ہے اور ان کے لیے خیر و مصلحت ہے، نیز بیع کی یہ صورت سود اور ممنوعات سے منزہ و مبرا ہے۔

قرض کے احکام

قرض کے لغوی معنی ''کاٹنے'' کے ہیں۔ چونکہ قرض دینے والا اپنے مال میں سے کچھ حصہ کاٹ کر قرض مانگنے والے کو دیتا ہے، اس لیے اسے ''قرض'' کہتے ہیں۔ قرض کے شرعی معنی ہیں: ''کسی شخص کو مال دینا تاکہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرے اور مقرر وقت میں اس کا متبادل لوٹا دے۔''

قرض تعاون اور ہمدردی کرنے کا نام ہے۔ نبی ﷺ نے اسے ''عطیہ'' قرار دیا ہے جسے مقروض فائدہ اٹھا کر

[1] المعجم الكبير للطبراني: 12/11، حديث: 10875.

قرض خواہ کو واپس کر دیتا ہے۔

▲ کسی کو قرض دینا مستحب ہے اس میں اجر عظیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

«مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُّقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَّرَّتَيْنِ إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهَا مَرَّةً»

''کوئی مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دیتا ہے تو (اللہ تعالیٰ کے ہاں) وہ ایک بار کے صدقے کے برابر شمار ہوتا ہے۔''[1]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرض صدقہ کرنے سے بھی افضل ہے کیونکہ قرض ہمیشہ محتاج شخص ہی لیتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ نَّفَّسَ عَنْ مُّؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''جس شخص نے کسی کی دنیاوی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور کی تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی پریشانیوں میں سے بڑی پریشانی دور کرے گا۔''[2]

قرض دینا نیکی کا کام ہے کیونکہ اس سے مقصود کسی مسلمان کی تنگی اور تکلیف کو دور کرنا ہے اور اس کی حاجت و ضرورت کو پورا کرنا مطلوب ہے۔ جہاں تک قرض لینے کا تعلق ہے تو قرض لینا جائز ہے، شرعاً مکروہ نہیں اس لیے کہ خود نبی ﷺ نے قرض لیا تھا۔

▲ قرض کے درست اور صحیح ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ قرض وہ شخص دے جو اس مال کو صدقے کے طور پر دینے کی اہلیت رکھتا ہو، لہٰذا یتیم کے سرپرست کے لیے جائز نہیں کہ وہ یتیم کے مال میں سے کسی کو قرض دے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قرض کے مال کی مقدار اور اس کی صفت معلوم ہو تاکہ مقروض ویسی ہی چیز یا مال قرض خواہ کو واپس کر سکے، چنانچہ قرض مقروض کے ذمہ دَین بن جاتا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ جب واپسی کی طاقت ہو بلا تاخیر ادا کرے۔

▲ قرض خواہ کا مقروض پر یہ شرط عائد کرنا حرام ہے کہ وہ ادائیگی کے وقت اصل قرض سے زیادہ رقم ادا کرے گا۔ علمائے کرام نے بالاتفاق اسے ''سود'' قرار دیا ہے۔

لہٰذا آج کل بنک والے جو قرضہ کی رقم دیتے ہیں وہ قرضہ کسی ذاتی کام میں خرچ کے لیے ہو یا کسی نفع بخش کام

[1] سنن ابن ماجه، الصدقات، باب القرض، حديث: 2430. [2] صحيح مسلم، الذكر و الدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، حديث: 2699.

میں لگایا جائے تو مقروض سے زیادہ رقم لینے کی شرط پر دیتے ہیں یہ سراسر سود ہے۔ یہ شرط بنک کی طرف سے ہو یا کسی فرد یا کسی کمپنی کی طرف سے ہو، یہ سود ہی ہے چاہے اس کا نام کوئی بھی رکھ دیا جائے، مثلاً: منافع (PROFIT) فائدہ یا ہدیہ وغیرہ۔ حدیث میں ہے:

«كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا» ”جو قرض نفع لائے وہ سود ہے۔“[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا أَقْرَضَ أَحَدُكُمْ قَرْضًا فَأَهْدٰى لَهُ أَوْ حَمَلَهُ عَلَى الدَّابَّةِ، فَلَا يَرْكَبْهَا وَلَا يَقْبَلْهُ إِلَّا أَنْ يَّكُونَ جَرٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ قَبْلَ ذٰلِكَ»

”جب کوئی کسی کو قرض دے تو اس کے بدلے میں اگر مقروض قرض خواہ کو کوئی ہدیہ دے یا اسے جانور پر سوار کرے تو (قرض خواہ) سوار نہ ہو اور ہدیہ قبول نہ کرے الا یہ کہ ان دونوں کے درمیان قرض سے پہلے ایسا معاملہ چلتا ہو۔“[2]

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِذَا كَانَ لَكَ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَأَهْدٰى إِلَيْكَ حِمْلَ تِبْنٍ فَلَا تَأْخُذْهُ فَإِنَّهُ رِبًا»

”جب کسی آدمی پر آپ کا حق ہو تو اگر وہ تجھے بھوسے کی ایک گٹھڑی بطور ہدیہ دے تو مت لو کیونکہ وہ سود ہے۔“[3]

یہ روایت مرفوع کے حکم میں ہے۔

ان روایات کی روشنی میں قرض خواہ کو چاہیے کہ مقروض سے (قرضہ دینے کے سبب) کسی قسم کا ہدیہ یا نفع وغیرہ قبول نہ کرے کیونکہ اس کی ممانعت ہے، نیز قرضہ دینے کا مقصد مقروض کے ساتھ تعاون کرنا اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب حاصل کرنا ہے۔ اگر کسی نے قرض کی رقم سے زیادہ وصول کرنے کی شرط لگا دی یا زیادہ لینے کی کوشش کی یا اس کی حرص رکھی تو قرض دینے کا (درج بالا) مقصد ختم ہو گیا بلکہ وہ قرض بھی نہ رہا۔

ہر مسلمان کو حرام کاموں سے بچنا چاہیے۔ قرض دیتے وقت ثواب کی خالص نیت ہونی چاہیے کیونکہ قرض دینے کا مقصد مال بڑھانا نہیں بلکہ محتاج کی حاجت کو پورا کرنے اور رأس المال واپس لینے کے ذریعے سے اجر وثواب

[1] كنز العمال: 238/6، حديث: 15516. یہ حدیث ضعیف ہے۔ دیکھیے إرواء الغليل: 236,235/5، حديث: 1398.
[2] سنن ابن ماجه، الصدقات، باب القرض، حديث: 2432. [3] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب مناقب عبدالله بن سلام رضی اللہ عنہ، حديث: 3814.

اور قرب الٰہی حاصل کرنا ہے۔ اگر یہ مقاصد پیش نظر رہیں تو اللہ تعالیٰ قرض خواہ کے مال میں برکت کرے گا اور اسے بڑھائے گا۔

◄ واضح رہے کہ قرض کی واپسی کے وقت زیادہ مال لینا ممنوع ہے جبکہ قرض دیتے وقت شرط رکھی جائے، مثلاً: کوئی کہے: ''میں تجھے اس شرط پر قرضہ دیتا ہوں کہ میرا قرض واپس کرتے وقت تمھیں اس قدر رقم زیادہ دینا ہوگی یا قرضہ واپس کرنے تک اپنا گھر رہائش کے لیے مجھے دینا ہوگا یا دوکان دینا ہوگی یا مجھے فلاں چیز ہدیہ میں دینا ہوگی یا اس قسم کی شرط جو زبان سے تو کہی نہ جائے لیکن اس کی خواہش یا حرص رکھے۔ یہ سب کام حرام ہیں۔

اگر مقروض محض جذبۂ احسان وتشکر کے طور پر اپنی طرف سے قرض سے زیادہ رقم لوٹاتا ہے تب کوئی حرج نہیں بلکہ یہ عمل حسنِ ادائیگی میں شامل ہوگا کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ ادھار خرید لیا تو اس کی ادائیگی اس سے بہتر اونٹ کی شکل میں کی تھی۔ اور فرمایا:

«خَيْرُكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً» ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو سب سے اچھی ادائیگی کرے۔''[1]

علاوہ ازیں یہ برتاؤ عرفاً اور شرعاً اچھے اور اعلیٰ اخلاق میں شمار ہوتا ہے اور یہ سود بھی نہیں کیونکہ قرض خواہ کی طرف سے یہ شرط نہ تھی، نہ ان میں یہ بات باہم اتفاق سے طے پائی تھی بلکہ یہ زیادہ مال مقروض نے خوش دلی کے ساتھ دیا ہے۔

اسی طرح اگر مقروض قرض خواہ کو قرضہ لینے سے پہلے کوئی تحفہ دیتا یا کوئی نفع مہیا کرتا ہو تو قرض دینے کے بعد قرض خواہ حسب معمول اس کا تحفہ یا نفع قبول کرسکتا ہے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔

◄ مقروض شخص پر لازم ہے کہ استطاعت کے وقت قرض خواہ کو اس کا قرض اچھے طریقے سے لوٹا دے اور اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے۔''[2]

◄ بعض لوگ حقوق العباد میں عموماً اور قرض کے معاملہ میں خصوصاً سستی وکوتاہی کر جاتے ہیں جو کہ نہایت مذموم خصلت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہت سے لوگ قرض دینے سے کتراتے ہیں۔ محتاجوں کے ساتھ وسعت ظرفی سے پیش نہیں آتے۔ جب محتاجوں کو قرضہ دینے والا کوئی نہیں ملتا تو یہ لوگ سودی بنکوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان سے حرام لین دین کرتے ہیں کیونکہ ضرورت مند کو کوئی قرض حسنہ دینے پر تیار نہیں ہوتا اور

---

[1] صحيح البخاري، الاستقراض، باب استقراض الإبل، حديث: 2390، وصحيح مسلم، المساقاة، باب جواز اقتراض الحيوان......، حديث:(122)-1600. [2] الرحمٰن 60:55.

قرض دینے والے کو اچھے انداز سے واپس کرنے والا قرض دار نہیں ملتا، اس لیے لوگوں میں ایک دوسرے سے حسن سلوک کا رواج ختم ہو گیا ہے۔

رہن (گروی شے) کے احکام

رہن کے لغوی معنی ''ثابت اور پختہ'' کے ہیں جبکہ شرعی مفہوم یہ ہے کہ ''قرض کی پختگی کے لیے کوئی چیز قرض خواہ کے پاس رکھنا تاکہ وہ عدم ادائیگی کی صورت میں اس چیز سے یا اس کی قیمت سے اپنا قرض مہیا کر سکے۔''

رہن کا جواز قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو کوئی چیز گروی (رہن کے طور پر) قبضے میں رکھ لی جائے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ جب فوت ہوئے تو آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس (قرض کے عوض میں) گروی تھی۔

سفر میں رہن کے جواز پر علماء کا اجماع ہے جب کہ جمہور علماء نے حضر میں بھی رہن کو جائز قرار دیا ہے۔[2]

رہن کی مشروعیت میں شاید حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے اموال کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا اور بچانا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرض کی توثیق کے لیے اولاً لکھنے کا حکم دیا اور کاتب کے میسر نہ آنے کی صورت میں رہن رکھنے کی تاکید کی جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ط وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ص وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ج وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ط فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ط وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ج فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

[1] البقرة 283:2.

[2] رسول اللہ ﷺ کا یہودی کے ہاں اپنی زرہ گروی رکھنا حضر میں رہن کے جواز کی واضح دلیل ہے۔ صحیح البخاري، الجهاد والسير، باب ماقيل في درع النبي ﷺ......، حديث: 2916.

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ○ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمھارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے۔ کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے، پس اسے بھی لکھ دینا چاہیے۔ اور جس کے ذمے حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں کچھ گھٹائے نہیں، ہاں جس شخص کے ذمے حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلا دے۔ اور گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔ اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا لکھنے میں کاہلی نہ کرو، اللہ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی اور شک وشبہے سے بھی زیادہ بچانے والی ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ معاملہ نقد تجارت کی شکل میں ہو جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو تو تم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خرید وفروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کر لیا کرو۔ اور (یاد رکھو کہ) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو اور اگر تم یہ کرو تو یہ تمھاری کھلی نافرمانی ہے، اللہ سے ڈرو، اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو کوئی چیز گروی (رہن کے طور پر) قبضے میں رکھ لی جائے۔''[1]

بلاشبہ اس حکم کے نزول میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت ہے۔ اور ایسی راہنمائی ہے جس میں لوگوں کی سراسر بھلائی ہے۔

◣ رہن کی شے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مقدار، جنس اور صفت کا علم ہو، نیز راہن (رہن رکھنے والا) عاقل، بالغ اور آزاد انسان ہو۔ اس شے کا مالک ہو یا اسے اس کے تصرف کی مکمل اجازت ہو۔ ہر انسان کے لیے جائز ہے

[1] البقرۃ 2:282، 283.

کہ اپنی ذاتی چیز رہن رکھ کر کسی دوسرے کو قرض دلوا دے۔

- رہن کی شے ایسی ہونی چاہیے جو فروخت ہو سکے تاکہ اگر مرتہن (جس کے ہاں گروی شے موجود ہے) کو وقت مقرر پر قرضہ واپس نہ مل سکے تو اسے فروخت کر کے اپنے قرض کی رقم پوری کر لے۔
- رہن رکھنے کی شرط دوران عقد ہو یا عقد کے بعد، دونوں صورتیں درست ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو کوئی چیز گروی (رہن کے طور پر) قبضے میں رکھ لی جائے۔''[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رہن کو کتابت کا متبادل قرار دیا ہے اور کتابت تو حق واجب ہونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

رہن صرف راہن کی جانب سے لازم ہوتا ہے کیونکہ اس میں حق و فائدہ مرتہن کا ہوتا ہے (جس کی حفاظت کے لیے رہن رکھا جاتا ہے)۔ مرتہن کی طرف سے رہن لازم نہیں ہوتا بلکہ اسے شرط رہن فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے کیونکہ رہن میں صرف اس کا فائدہ ملحوظ ہوتا ہے اور اسے اپنے فائدے سے دست بردار ہونے کا حق حاصل ہے۔

اگر راہن کے پاس کوئی مشترک چیز ہو، جس میں غیر کا حق ہو تو اس چیز میں اپنا حصہ مرتہن کے پاس بطور رہن رکھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ وصولیٔ قرضہ کے وقت مرتہن اس چیز میں راہن کا حصہ فروخت کر کے اپنے قرضے کی رقم وصول کر سکتا ہے۔

ادھار خریدی ہوئی شے اپنی طے شدہ قیمت کے بدلے بطور رہن رکھی جا سکتی ہے کیونکہ اس کی قیمت مشتری کے ذمے ہے اور اسے اس چیز کی ملکیت حاصل ہو چکی ہے، لہٰذا اسے اپنی قیمت کے بدلے گروی رکھنا جائز ہے، مثلاً: کسی نے مکان یا کار ادھار خریدی یا نقد خریدی لیکن پیسے ابھی وصول نہیں کیے تو وہ قیمت کی ادائیگی تک رہن کے طور پر رکھی جا سکتی ہے۔

راہن اور مرتہن میں سے کسی ایک کے لیے بھی جائز نہیں کہ دوسرے کی اجازت کے بغیر شے میں تصرف کرے کیونکہ اگر راہن (مقروض) اس میں کوئی تصرف کرے گا تو مرتہن (قرض خواہ) کا حق توثیق و اعتماد متاثر ہو گا۔ اور اگر مرتہن (قرض خواہ) اس میں تصرف کرے گا تو یہ دوسرے کی مملوکہ چیز میں تصرف ہو گا (جو جائز نہیں۔)

- جہاں تک رہن سے فائدہ حاصل کرنے کا تعلق ہے تو راہن اور مرتہن جس بات پر متفق ہو جائیں، درست ہے، مثلاً: اگر دونوں اسے کرایہ پر دینے پر متفق ہوں تو ٹھیک ورنہ وہ شے بے کار پڑی رہے گی حتی کہ راہن ادھار ادا کر

[1] البقرة 2:283.

دے، البتہ اگر رہن کی شے کو صحیح رکھنے کے لیے کسی عمل دخل کی ضرورت ہو تو راہن کو اس کی اجازت ضرور ملنی چاہیے، مثلاً: درختوں کو پانی دینا، ان کی کانٹ چھانٹ کرنا یا رہن شدہ جانور کا علاج معالجہ کرنا وغیرہ راہن کی ذمے داری ہے کیونکہ اس میں رہن کی اصلاح و مصلحت ہے۔

رہن کی متصل بڑھوتری، مثلاً: کسی جانور کا موٹا ہونا یا غلام کا کوئی صنعت سیکھنا اور اس کی منفصل بڑھوتری مثلاً: بچوں کی پیدائش، درخت کا پھل دینا، حیوان کی اون، غلام کی کمائی وغیرہ رہن کے ساتھ ملحق ہو گی، لہٰذا قرضہ پورا کرنے کے لیے رہن کے ساتھ اسے بھی بیع میں شامل کیا جائے گا۔ اسی طرح شے کی اجرت یا کوئی فائدہ حاصل ہو تو وہ اس کے تابع ہو گا۔ اور غلام پر زیادتی ہو جانے کی صورت میں ملنے والا تاوان یا دیت رہن کے ساتھ ملحق ہو گی کیونکہ وہ اس کے ایک حصے کا عوض ہے۔

رہن کو کھانا کھلانے یا چارہ ڈالنے یا اس کی اصلاح کرنے کا خرچہ راہن کے ذمے ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ الرَّهْنَ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ، لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ»

''جس نے کوئی شے ''رہن'' رکھی ہو وہ اس کے مالک سے نہ روکی جائے، اس کا فائدہ بھی اسی کے لیے ہے اور اسی پر اس کا تاوان (نقصان) بھی ہے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ راہن گروی شے کا مالک ہے، لہٰذا اس کا خرچ اسی کے ذمہ ہے۔ اسی طرح اگر رہن کا مال کسی سیف (الماری) یا کمرے میں رکھا گیا ہو تو اس کا کرایہ، اس کی حفاظت و نگرانی پر مامور شخص کی اجرت، مرہون ریوڑ کے چروانے کی اجرت یہ سب کچھ راہن (مقروض) کے ذمے ہے کیونکہ اس شے پر ہونے والے اخراجات میں یہ خرچ بھی شامل ہے۔

اگر رہن کا کچھ حصہ تلف ہو گیا اور کچھ بچ گیا تو باقی حصہ ہی (قرض کے عوض میں) بطور رہن ہو گا۔ واضح رہے کہ رہن کا کل قرضہ رہن کے کل اجزاء سے متعلق ہے۔ جب رہن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تو رہن کا باقی حصہ کل قرضہ کے عوض میں ہو گیا۔

اگر راہن نے قرض کا کچھ حصہ ادا کیا اور کچھ باقی ہے تو وہ رہن کی شے اس وقت تک واپس نہیں لے سکتا جب تک تمام قرض ادا نہ کر دے۔

[1] كتاب الأم للشافعي: 60/4، والسنن الكبرى للبيهقي: 39/6، وسنن ابن ماجه، الرهون، باب لا يغلق الرهن، حديث:2441، وسنن الدارقطني: 32/3، حديث:2899.

▲ رہن کے عوض لیے ہوئے قرض کی ادائیگی کا مقرر وقت آ جائے تو مقروض پر لازم ہے کہ فوراً قرض ادا کرے، جیسے بلا رہن قرض وقت پر ادا کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی عقد کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾

''جسے امانت دی گئی ہے وہ اسے ادا کر دے اور اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے۔''[1]

اگر اس نے قرض ادا نہ کیا تو سمجھا جائے گا کہ وہ ٹال مٹول کر رہا ہے اس وقت قاضی اسے قرض ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اگر وہ پھر بھی آمادہ نہ ہوا تو اسے قید یا کوئی اور سزا دی جائے گی حتی کہ وہ مکمل قرض ادا کر دے یا رہن کی شے کو فروخت کر کے مرتہن کو اس کے قرض کی رقم کے مطابق دے دے۔ یہ قرض خواہ کا حق ہے کیونکہ رہن کا مقصد بھی یہی تھا کہ قرض محفوظ ہو اور بوقت ضرورت رہن کو فروخت کر کے قرض کی رقم ادا کی جا سکے۔ اگر قرض کی رقم ادا کر کے کچھ مال بچ گیا تو وہ راہن (مقروض) کو لوٹا دیا جائے گا کیونکہ وہ اس کا مالک ہے۔ اور اگر فروخت شدہ رہن سے قرض پورا نہ ہو سکا تو باقی قرض کی ادائیگی راہن کے ذمے رہے گی۔

''مرتہن'' (قرض خواہ) رہن رکھے ہوئے جانور پر خرچہ کرنے کے بدلے میں اس پر سواری کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ سواری کے قابل ہو اور اس کا دودھ پی سکتا ہے نفقہ کے بدلے میں۔ اس بارے میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے

«اَلظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا، وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا، وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ»

''مرہون'' جانور پر خرچ کے عوض سواری کی جا سکتی ہے اور اس دودھ دینے والے ''مرہون'' جانور کا دودھ پیا جا سکتا ہے۔ اور جو سوار ہو گا اور دودھ پیے گا، وہ خرچ ادا کرے گا۔''[2]

واضح رہے کہ اگر مرتہن خرچ سے زائد نفع حاصل کرے گا تو یہ درست نہیں بلکہ اس کا کرایہ یا اجرت راہن کو واپس کرے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات جو شریعت کے اصولوں سے ثابت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہے وہ ہے کہ بے شک گروی جانور اللہ کے حق کی بنا پر بذاتِ خود محترم ہے جبکہ مالک کے لیے اس میں حق ملکیت ہے اور مرتہن (قرض خواہ) کے لیے اس میں حق توثیق واعتماد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گروی شے قرض خواہ

[1] البقرة 2:283. [2] صحيح البخاري، الرهن في الحضر، باب الرهن مركوب و محلوب، حديث 2512.

(مرتہن) کے قبضے میں رکھی ہے۔ جب گروی شے قرض خواہ کے پاس رہے اور وہ اس کا دودھ نہ دوہے تو اس کا فائدہ ضائع ہوگیا۔ عدل و انصاف اور قیاس اور راہن و مرتہن اور (گروی) حیوان کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ قرض خواہ سواری اور دودھ کا فائدہ حاصل کرے۔ یہ فائدہ اس کے عوض میں ہوگا جو اس نے چارہ وغیرہ ڈالا ہے۔ اس میں راہن اور مرتہن دونوں کی مصلحتوں کو جمع کیا گیا ہے اور دونوں کو ان کا حق پہنچا دیا گیا ہے۔''[1]

بعض فقہائے کرام کی رائے ہے کہ رہن شے دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ قسم جس پر خرچ ہوتا ہے اور دوسری وہ قسم جس پر خرچ نہیں ہوتا۔ جن اشیاء پر خرچ ہوتا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

① جاندار جو دودھ دوہنے اور سواری کرنے کے قابل ہو، اس کا حکم تو اوپر بیان ہو چکا ہے۔

② جو دودھ دوہنے اور سواری کے لائق نہ ہو، مثلاً: غلام یا لونڈی یہ نوع ایسی ہے جس سے انتفاع واستفادہ مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، ہاں اگر مالک اجازت دے کہ اس پر خرچ کیا جائے اور اس کے عوض فائدہ اٹھائے تو مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

رہن اشیاء کی دوسری قسم کہ جس پر کچھ خرچ نہیں آتا، مثلاً: مکان، سامان وغیرہ اس میں بھی راہن کی اجازت کے بغیر فائدہ اٹھانا جائز نہیں، البتہ جب رہن کی شے قرض کی رقم کے عوض میں لی گئی ہو تو انتفاع بالکل جائز نہ ہوگا، جیسا کہ پچھلے باب میں گزر چکا ہے تاکہ وہ ایسا قرض نہ بن جائے جو نفع لانے والا ہو اور وہ سود بن جائے۔

ضمان (ضمانت) کے احکام

ضمان (ضمانت) قرض کی شرعی توثیق کی ایک صورت ہے۔ ضمان کا شرعی معنی ''کسی دوسرے پر ثابت شدہ حق کی ذمے داری قبول کر لینا'' ہے، مثلاً: ضامن کہے: ''جو کچھ تم نے فلاں شخص سے لینا ہے وہ میں تمھیں ادا کروں گا۔'' ضمان کے باوجود اگر ضامن ادائیگی نہیں کرتا تو مضمون عنہ (جس شخص کی طرف سے ذمے داری قبول کی گئی ہے) ادائیگی کا ذمے دار ہوگا۔

قرآن مجید، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ضمان کا جواز ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ○﴾

''جو اسے لے آئے اسے ایک اونٹ کے بوجھ کا غلہ ملے گا اور اس (وعدے) کا میں ضامن ہوں۔''[2]

① إعلام الموقعين: 38/2 بتصرف، ومسند أحمد: 267/5، وسنن أبي داود، حديث: 3565. ② يوسف 72:12.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [اَلزَّعِیمُ غَارِمٌ] ''ضامن ادائیگی کرے گا۔''[1]

علاوہ ازیں ضمان کے جواز میں علماء کا اجماع ہے کیونکہ مصلحت اسی کی متقاضی ہے اور لوگوں کو اس کی اشد حاجت اور ضرورت پڑتی ہے، نیز اس کا تعلق نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنے، مسلمان کی ضرورت پوری کرنے اور اسے مشکل سے نکالنے سے ہے۔

ضامن کے لیے عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے، لہٰذا بے وقوف اور بچے کا ضمان درست نہ ہوگا، نیز ضامن کا ضمانت پر رضامند ہونا ضروری ہے۔ جبر و اکراہ کی صورت میں ضمان صحیح نہ ہوگا کیونکہ ضمان تبرع اور احسان کے ساتھ کسی کا حق قبول کرنے کا نام ہے اور تبرع میں رضامندی ضروری ہوتی ہے۔

ضمان ایک ایسا عقد ہے جس میں مضمون عنہ کے ساتھ تعاون کرنا مقصود ہوتا ہے، لہٰذا اس کام میں معاوضہ لینا جائز نہیں۔ ضمان کے عوض معاوضہ لینا ایسے ہی حرام ہے جیسے قرض دے کر نفع حاصل کرنا، لہٰذا ضامن کو چاہیے کہ قرض خواہ کے مطالبے پر اس کی رقم یا مال ادا کر دے اور معاوضہ لینے سے بہرصورت اجتناب کرے۔ لوگوں کے ساتھ تعاون و ہمدردی کرے۔ ظلم و زیادتی کر کے محتاج کو مشکل میں ڈالنا نیکی اور اعانت نہیں۔

ضمانت قبول کرتے وقت کوئی بھی کلمات کہے جا سکتے ہیں جن سے ضمانت کا مفہوم ادا ہو جائے، مثلاً: أَنَا ضَمِینٌ یا أَنَاقَبِیلٌ یاأَنَا حَمِیلٌ یا أَنَا زَعِیمٌ ''میں ضامن ہوں یا میں قبول کرتا ہوں یا میں (اس کو) اٹھاتا ہوں یا میں (اس کا) ذمے دار ہوں۔'' یا یوں کہے کہ میں تیرے قرض کو اٹھاتا ہوں یا وہ میرے پاس ہے وغیرہ۔ الغرض جس لفظ سے بھی ضمانت کا مفہوم ادا ہوتا ہو جائز ہے کیونکہ کسی حدیث میں کوئی مخصوص اور متعین کلمات وارد نہیں ہوئے، لہٰذا اس میں عرف کا اعتبار ہوگا۔

صاحب حق اپنے حق کا مطالبہ ضامن یا مضمون عنہ کسی سے بھی کر سکتا ہے کیونکہ اس کا حق دونوں کے ذمے ہے، لہٰذا جس سے چاہے اپنا حق طلب کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [اَلزَّعِیمُ غَارِمٌ] ''ضامن حق ادا کرے گا۔''[2] ''زعیم'' ضامن کو کہتے ہیں اور ''غارم'' جس کے ذمے کوئی حق لازم ہو۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ صاحب حق کا ضامن سے مطالبہ کرنا جائز نہیں الا یہ کہ مضمون عنہ سے مطالبہ کرنے

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث: 3565، وجامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في أن العارية مؤداة، حديث: 1265. [2] سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث: 3565، وجامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في أن العارية مؤداة، حديث: 1265.

میں کوئی مشکل ہو کیونکہ ضمان فرع ہے اصل نہیں اور فرع کو تب اختیار کیا جاتا ہے جب اصل تک رسائی مشکل ہو، نیز ضمان کسی کے حق کی توثیق کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ رہن ہے۔ اور رہن سے اپنا حق تبھی پورا کیا جائے گا جب راہن سے مال ملنا مشکل ہو۔ یہی صورت ضمان میں ہوگی۔ مزید یہ کہ مضمون عنہ کی موجودگی میں اور اس سے مال ملنے کی صورت میں ضامن سے مطالبہ کرنا لوگوں کے ہاں بھی بری چیز ہے کیونکہ لوگوں کے ہاں معروف یہی ہے کہ ضامن سے مطالبہ تب ہو جب مضمون عنہ سے مال حاصل کرنا دشوار ہو۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے، اس کے بارے میں انھوں نے فرمایا: یہ قول کافی قوی ہے۔

اگر ''مضمون عنہ'' ادائیگی یا معافی کے ذریعے سے بری ہو گیا تو ضامن بھی ضمان سے بری ہوگا کیونکہ ضامن کی ذمہ داری مضمون عنہ کی ذمہ داری کے تابع ہے۔

ایک ہی چیز میں دو یا زیادہ افراد بھی ضامن ہو سکتے ہیں، یعنی یہ بھی جائز ہے کہ دو افراد مکمل چیز کے ضامن بن جائیں یا اس کے جز کے ضامن بن جائیں۔ اس صورت میں کوئی ایک تب بری ہوگا جب دوسرا بری ہوگا۔ مضمون عنہ کے بری ہونے کی صورت میں سب بری ہو جائیں گے۔

صحت ضمان کے لیے مضمون عنہ یا مضمون لہ کی پہچان اور تعارف شرط نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس کو ایک شخص جانتا نہیں اس کی ضمان نہیں دے سکتا۔

ضمان کا مال معلوم ہو یا مجہول دونوں صورتوں میں ضمان درست ہے بشرطیکہ مجہول بعد میں معلوم کی حیثیت اختیار کرنے والا ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلِمَن جَآءَ بِهِۦ حِمۡلُ بَعِيرٖ وَأَنَا۠ بِهِۦ زَعِيمٞ ۝ ﴾

''جو اسے لے آئے اسے ایک اونٹ کے بوجھ کا غلہ ملے گا اور اس (وعدے) کا میں ضامن ہوں۔''[1]

ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اگرچہ اس کی مقدار مجہول ہے لیکن نتیجۃً اس کا علم حاصل ہو جائے گا، لہٰذا آیت اس کے جواز کی دلیل ہے۔

فروخت شدہ چیز کے صحیح ہونے کی ضمانت دینا درست ہے، یعنی اگر بعد میں ثابت ہو کہ فروخت کرنے والا اس چیز کا جائز مالک نہیں تھا تو قیمت واپس کرنے کا میں ضامن ہوں۔

کسی شخص پر مستقبل میں واجب الادا ہونے والے قرض کی پیشگی ضمانت دینا جائز ہے۔

[1] یوسف 72:12.

کفالت (شخصی ضمانت) کے احکام

کفالت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے آدمی کے بارے میں یہ ذمہ داری اٹھائے کہ اپنے آپ پر یہ لازم کرلے کہ اگر فلاں پر کوئی مالی حق ثابت ہو گیا تو میں اسے عدالت میں پیش کر دوں گا۔ اسے آج کل کے عرف میں ''شخصی ضمانت'' کہا جاتا ہے۔

''عقد کفالت'' مکفول (جس کی شخصی ضمانت دی جائے) کے وجود سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا ہر اس انسان کی کفالت درست ہے جس پر کوئی مالی حق ہو یا اسے کسی عدالت میں حاضر کرنا ہو، مثلاً: قرض وغیرہ کی ادائیگی میں کفالت۔

جس شخص پر کسی جرم کی وجہ سے حد لگائی جانی ہو اس کے بدن کی کفالت صحیح نہیں کیونکہ کفالت کا مقصد مطلوب شخص کی حاضری کو یقینی بنانا ہے اور حدود شبہے کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، لہٰذا ان میں حاضری کو یقینی بنانا ممکن نہیں۔ اسی طرح ایسے بدن کی کفالت بھی درست نہیں جس پر قصاص دینا لازم ہو کیونکہ قصور وار کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کفیل مجرم کو حاضر نہ کر سکے تو مجرم کے جرم کی سزا کفیل کو نہیں دی جا سکتی۔

کفالت کے درست ہونے کے لیے کفیل کا رضا مند ہونا شرط ہے کیونکہ اس کی رضا کے بغیر اس پر کوئی حق مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی کو حاضر کرنے کی کفالت میں ''مکفول'' مر جائے تو اس پر کچھ لازم نہیں آتا کیونکہ اس صورت میں وہ اسے عدالت میں حاضر کرنے سے معذور ہے۔

اسی طرح اگر مکفول نے اپنے آپ کو خود ہی مالک کے حوالے کر دیا تو کفیل بری ہو گا کیونکہ کفیل نے جس کی ذمے داری اٹھائی تھی وہ موقع پر خود ہی حاضر ہو گیا ہے۔

مالی کفالت کی صورت میں اگر مکفول زندہ ہے اور اس کے حاضر ہونے کا وقت آ گیا لیکن اس کو حاضر کرنا مشکل ہے یا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے اور ایک عرصہ بیت گیا تو کفیل اپنے مکفول کے قرض کا ضامن ہو گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ضامن ادائیگی کرے گا۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث: 3565، وجامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في أن العارية مؤداة، حديث: 1265.

کفالت کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی شخص کی جان پہچان کی ضمانت دینا جائز ہے، مثلاً: کوئی شخص کسی کے پاس قرض لینے کے لیے آیا تو اس نے کہا: ''میں تجھے جانتا نہیں ہوں، اس لیے تجھے قرض نہیں دے سکتا۔'' تو ایک دوسرے شخص نے کہا: اس کی جان پہچان کی ضمانت میں دیتا ہوں اور اس کا نام اور اس کی جائے رہائش کی پہچان کرا دوں گا، چنانچہ اس کے کہنے پر اس شخص کو قرض دے دیا گیا۔ اب اگر مقروض غائب ہو گیا اور اس نے وقت پر قرض نہ لوٹایا تو کفیل کی ذمہ داری ہے کہ اسے حاضر کرے، محض اس کا نام پتہ بتا دینا کافی نہ ہو گا۔ اور اگر وہ مقروض کو (زندہ ہونے کی صورت میں) حاضر نہ کر سکا تو ضامن اس کے قرض کا ذمہ دار ہو گا کیونکہ اس کے تعارف کروانے کی وجہ ہی سے اسے قرض دیا گیا تھا تو گویا وہ پہچان کروانے سے مقروض کا ضامن و کفیل قرار پا گیا۔

حوالہ کے احکام

ایک شخص کے ذمے سے قرض تبدیل کر کے دوسرے کے ذمے کر دینا حوالہ ہے، مثلاً: ایک شخص نے قرضہ دینا ہے اور اس نے کسی سے قرضہ لینا بھی ہے تو قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہتا ہے میں نے فلاں سے قرض لینا ہے تو اس سے وصول کر لے۔ اگر یہ تسلیم کر لے تو مقروض بری الذمہ ہو جائے گا۔[1]

''حوالہ'' سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

«إِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ»

''جب تم میں سے کسی (کے قرض) کو غنی کے حوالے کیا جائے تو وہ اسے قبول کرے۔''[2]

متعدد علمائے کرام نے ''حوالہ'' کے جواز و ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔

[1] ''حوالہ'' کی مزید وضاحت یوں ہے کہ مثلاً: اشرف کا اکرم کے ذمے کچھ قرض ہے۔ اکرم کہتا ہے کہ میں نے اسلم سے رقم وصول کرنی ہے، اس لیے تم مجھ سے وصول کرنے کے بجائے اسلم سے وصول کر لو۔ اس مثال میں اکرم (مقروض) محیل، اشرف (قرض خواہ) محال اور اسلم (مقروض کا مقروض) محال علیہ ہے۔ اگر اسلم ادائیگی کر دے تو اکرم بری الذمہ ہو جائے گا۔ اس عمل کو حوالہ کہتے ہیں۔ (صارم)۔

[2] صحيح البخاري، الحوالات، باب الحوالة وهل يرجع في الحوالة ؟ حديث:2288,2287، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم مطل الغني ...... ، حديث: 1564.

''حوالہ'' میں لوگوں کے ساتھ نرمی ہے اور یہ ان کے معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے میں تعاون کی ایک آسان اور اچھی صورت ہے تاکہ ان کے قرضے ادا ہوں اور انھیں راحت وسکون حاصل ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''حوالہ'' خلاف قیاس ہے کیونکہ یہ قرض کی قرض کے ساتھ بیع ہے جو کہ ممنوع ہے لیکن حوالہ میں یہ خلاف قیاس جائز ہے۔ لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ان لوگوں کا رد کیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حوالہ قیاس سے موافقت اور مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اس کا تعلق بیع کے مسائل سے نہیں بلکہ اس کا تعلق حق کی ادائیگی سے ہے۔

نیز وہ فرماتے ہیں: ''اگر اسے (حوالہ کو) قرض کی قرض کے ساتھ بیع مان بھی لیا جائے تو یہ قسم ممنوع صورت میں شامل نہیں کیونکہ قواعد شرعیہ اس کے جواز کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایک شخص کا قرضہ تبدیل کرکے دوسرے کے ذمے کیا جائے تاکہ اسے اپنا مال کسی صورت میں مل جائے۔''[1]

▲ درج ذیل شرائط کے بغیر ''حوالہ'' درست نہیں۔

① مقروض اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے جس شخص کا حوالہ دے اس پر یہ قرضہ ثابت شدہ ہو کیونکہ حوالے کا تقاضا محال علیہ پر قرض کو لازم کرنا ہے اور جب قرض محال علیہ کے ذمہ ثابت شدہ نہ ہو تو اس کا ساقط ہونا ممکن ہو گا، لہٰذا ''حوالہ'' اس کے ذمے ثابت نہیں ہو گا، لہٰذا کسی ایسی فروخت شدہ چیز کی قیمت پر حوالہ درست نہیں جو مدت خیار میں ہو۔ اسی طرح بیٹے کا باپ کی طرف حوالہ درست نہیں الا یہ کہ باپ راضی ہو۔

② محال (قرض خواہ) اور محال علیہ (جس سے قرض وصول کرنے کے لیے کہا گیا ہے) دونوں کے قرضے جنس، تعداد و مقدار، صفت اور ادائیگی کی میعاد میں برابر اور متماثل ہوں۔ جنسی تماثل جیسے دونوں قرضے دراہم کی صورت میں ہوں، تعداد و مقدار میں مماثلت کہ دونوں قرضوں کی رقم یکساں ہو، سو ریال کے قرض کا حوالہ نوے ریال کے قرض پر جائز نہیں کیونکہ حوالہ قرض کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہمدردی ہے۔ کمی بیشی کی صورت میں حوالہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ یہ زیادہ رقم طلب کرنے کی صورت ہے جو قرض میں نفع حاصل کرنے کی طرح حرام ہے، البتہ اگر کسی نے ایک شخص کو جسے سو ریال قرض لوٹانا تھا ایسے شخص کے حوالے کیا جس سے اس نے دو سو ریال قرض واپس لینا تھا تو یہ صورت جائز ہے باقی سو ریال صاحب حق خود وصول کر لے گا۔ صفت میں یکسانیت جیسے دونوں طرف سے سعودی عرب کی کرنسی کا ہونا ہے۔ وقت میں مطابقت جیسے ایک قرض کی مدت ایک ماہ ہو تو

---

[1] دیکھیے: إعلام الموقعين: 2/11,10.

دوسرے کی بھی ایک ماہ مدت ہو، کمی بیشی نہ ہو۔

③ محیل (حوالہ کرنے والا) رضامند ہو، اس لیے کہ حوالہ کرنے والے نے اگرچہ قرض دینا ہے مگر اس پر یہ لازم نہیں کہ حوالہ ہی کی صورت میں ادا کرے۔ محال علیہ کی رضامندی شرط نہیں جیسا کہ محال (جس کے حوالے کیا جا رہا ہے) کا راضی ہونا شرط نہیں جبکہ اسے ایسے غنی کے حوالے کیا جا رہا ہو جو ٹال مٹول نہیں کرتا بلکہ اسے حوالہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ محال علیہ سے اپنا حق خود طلب کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ»

''قرض کی ادائیگی میں غنی کا تاخیر کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی (کے قرض) کو غنی کے حوالے کیا جائے تو وہ اسے قبول کر لے۔''[1]

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«وَمَنْ أُحِيلَ عَلٰى مَلِيءٍ فَلْيَحْتَلْ»

''جس کو کسی مال دار کے حوالے کیا جائے تو وہ اس حوالے کو قبول کر لے۔''[2]

اگر محال علیہ مالدار نہیں تو محال پر لازم نہیں کہ وہ حوالہ کو ضرور قبول کرلے اور نہ اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں اس کا نقصان ہے۔

جن حضرات کے ذمے لوگوں کے حقوق ہیں اور ان میں انھیں ادا کرنے کی قدرت بھی ہے تو چاہیے کہ وہ حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے انھیں جلد ادا کریں۔ اگر کسی حوالہ کو قبول کریں تو ٹال مٹول کیے بغیر اسے پورا کریں۔

حدیث کے لفظ: مليء سے مراد ہے جو قرض ادا کرنے پر قادر ہو اور ٹال مٹول سے کام نہ لیتا ہو۔ بعض لوگ ادائیگی حقوق میں قدرت و طاقت کے باوجود بغیر کسی شرعی عذر کے تاخیر اور سستی کر جاتے ہیں۔ محال کو ٹال مٹول کے ذریعے سے اس قدر پریشان کرتے ہیں کہ لوگ حوالہ کو خوفناک یا بے کار شے سمجھنے لگے ہیں بلکہ لوگوں کے ظلم کے سبب اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

جب حوالہ درست ہو، یعنی اس میں مذکورہ تمام شرائط موجود ہوں تو محیل کا ذمہ محال علیہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور محیل اس حق کی ادائیگی سے بری ہو جاتا ہے، لہٰذا محال کے لیے مناسب نہیں کہ وہ محیل کی طرف دوبارہ رجوع

① صحيح البخاري، الحوالات، باب الحوالة وهل يرجع في الحوالة ؟ حديث:2288,2287، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم مطل الغني ...... ، حديث 1564. ② مسند أحمد:2/463.

کرے کیونکہ اس کا حق دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔ وہ محال علیہ سے مطالبہ کرتا رہے حتی کہ اس سے اپنی رقم حاصل کر لے یا وصولی کے لیے کسی مناسب صورت پر اس سے صلح و مصالحت کر لے۔

شرعی حوالہ اپنا مال واپس لینے کا آسان اور صحیح طریقہ ہے اس میں لوگوں کے لیے نہایت سہولت ہے بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح اور اچھی طرح ہو اور اس میں کسی قسم کا فریب اور دھوکا شامل نہ ہو۔

وکالت کے احکام

وکالت کے لغوی معنی ''سپرد کرنے'' کے ہیں، جیسے وَكَّلْتُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ کے معنی ہیں: ''میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔''

اور شرعی معنی ہیں: ''کسی ایسے معاملے میں جس میں شرعاً نیابت ہو سکتی ہو، کسی جائز التصرف شخص کا اپنے جیسے شخص کا نائب ہونا۔''

کتاب وسنت اور اجماع سے وکالت کا جواز ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ ﴾

''چنانچہ اب تم اپنے میں سے کسی کو اپنی یہ چاندی (کے سکے) دے کر شہر بھیجو۔''[1]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ﴾

''(یوسف نے) کہا: آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجیے۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا ﴾ ''اور ان (صدقات) کو وصول کرنے والوں کے لیے۔''[3]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بکری کی خریداری کے لیے سیدنا عروہ بن جعد رضی اللہ عنہ کو وکیل بنایا۔[4] نیز آپ ﷺ نے اپنے غلام ابورافع رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنھوں نے آپ ﷺ کا نکاح سیدہ میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا۔[5]

---

① الكهف 19:18. ② يوسف 55:12. ③ التوبة 60:9. ④ صحيح البخاري، المناقب، باب: 28، حديث: 3642. ⑤ [ضعيف] مسند أحمد:393,392/6، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في كراهية تزويج المحرم، حديث:841.

علاوہ ازیں آپ ﷺ زکاۃ وصول کرنے والے عمال کو اپنا وکیل بنا کر روانہ کیا کرتے تھے۔[1]

وکالت کے جواز پر امت کا اجماع ہے نیز لوگوں کی حاجت وضرورت اس کے جواز کی متقاضی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی ضروریات کا ہر کام خود نہیں کر سکتا۔

وکیل کے تقرر کے لیے کلمات: جس لفظ کے ذریعے سے کسی کام کے کرنے کی اجازت معلوم ہو اس سے ''وکالت'' کا انعقاد ہو جاتا ہے، مثلاً: ''فلاں کام کر دو۔'' یا ''میں تمھیں فلاں کام کرنے کی اجازت دیتا ہو۔'' الغرض اس کے لیے کسی مخصوص لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔

وکالت کو قبول کرنا فوراً یا تاخیر سے درست ہے ہر اس فعل اور قول کے ذریعے سے جو قبولیت پر دلالت کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے وکلاء کا وکالت قبول کرنا ان کے وکیل بنائے جانے کے بعد ہوتا تھا۔

وکالت میں وقت کی تعیین کرنا یا کسی شرط کا مقرر کرنا بھی درست ہے، مثلاً: کوئی کہے: ''تم ایک ماہ تک میرے وکیل ہو۔'' یا کوئی کہے: ''جب میرے اس مکان کے کرایہ کی مدت پوری ہو جائے تو تم میرا یہ مکان فروخت کر دینا۔''

وکیل کی تعیین اور تخصیص ضروری ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے ان دو شخصوں میں سے ایک کو وکیل مقرر کیا یا کوئی ایسے شخص کو وکیل بنا دے جسے وہ جانتا پہچانتا نہیں تو یہ درست نہ ہوگا۔

شرائط وکالت: جن شخصی حقوق میں کسی کی نیابت ہو سکتی ہو، ان میں وکالت درست ہے، چنانچہ کسی امر کے انعقاد، مثلاً: بیع، خریداری، اجارہ، قرض، مضاربت وغیرہ یا فسخ، مثلاً: طلاق، خلع، عتق اور اقالہ وغیرہ۔ اسی طرح عبادات میں سے اللہ تعالیٰ کے جن حقوق میں نیابت ہو سکتی ہے ان میں وکالت درست ہے، مثلاً: صدقہ کی تقسیم، زکاۃ نکالنا، نذر، کفارہ، حج اور عمرہ کی ادائیگی کیونکہ اس کے بارے میں شرعی دلائل موجود ہیں۔

عبادات میں سے اللہ تعالیٰ کے جن حقوق میں نیابت نہیں ہو سکتی، مثلاً: عبادات بدنیہ، جیسے نماز، روزہ اور طہارت وغیرہ میں کوئی شخص اپنا وکیل مقرر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عبادات اسی کے بدن سے متعلق ہیں جس پر فرض ہیں۔

حدود ثابت کرنے اور اس کے نفاذ میں بھی وکالت درست ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا انیس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا:

«وَاغْدُ يَاأُنَيْسُ ! إِلَى امْرَأَةِ هٰذَا ، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا»

''اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کر لے تو اسے سنگسار کر دینا۔''[2]

---

[1] جامع الترمذي، الزكاة، باب ماجاء في زكاة البقر، حديث: 623. [2] صحيح البخاري، الوكالة، باب الوكالة في الحدود، حديث: 2315,2314، وصحيح مسلم، الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا، حديث: 1697و1698.

▲ اگر کسی کو وکیل مقرر کیا گیا ہو تو وہ وکیل ان امور میں کسی دوسرے شخص کو وکیل نہ بنائے مگر چند صورتوں میں جو درج ذیل ہیں:

① اگر مؤکل خود اجازت دے دے تو وکیل آگے کسی اور کو بھی اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے، مثلاً: مؤکل وکیل کو اجازت دیتے وقت کہے: ''تم چاہو تو کسی کو وکیل مقرر کر سکتے ہو۔'' یا وکیل کو کہے: ''جو چاہو کرو۔''

② جب کوئی کام وکیل کے شایان شان نہ ہو، مثلاً: وکیل کا شماران معززین میں ہوتا ہو جو اس جیسے معمولی کام کرنے سے بالاتر ہیں۔

③ وکیل مؤکل کا مذکورہ کام کرنے سے عاجز ہو۔

④ جب وکیل مؤکل کے کام کو بہتر انداز سے نہ کر سکتا ہو۔

ان مذکورہ احوال میں وکیل کو چاہیے کہ کسی دوسرے امانت دار شخص کو وکیل مقرر کرے کیونکہ اسے غیر امین شخص کو وکیل مقرر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

وکیل مقرر کرنا اور وکیل بننا دونوں جائز ہیں کیونکہ وکالت مؤکل کی طرف سے اجازت کا نام ہے اور وکیل کی طرف سے نفع پہنچانے کا نام ہے۔ اور یہ دونوں لازم نہیں، لہٰذا وکیل اور مؤکل میں سے جو بھی چاہے وکالت فسخ کر سکتا ہے۔

فسخ وکالت وکیل یا مؤکل کوئی بھی وکالت فسخ قرار دے سکتا ہے یا دونوں میں سے ایک کی موت سے یا جنون سے وکالت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وکالت کا دارو مدار زندگی اور عقل پر ہوتا ہے۔ جب دونوں نہ رہیں تو وکالت بھی قائم نہ رہی۔ اسی طرح مؤکل وکیل کو معزول کر دے تو وکالت ختم ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو اس کی عقل کی کمزوری کی وجہ سے مالی تصرفات سے روک دیا گیا ہو، وہ وکیل ہو یا مؤکل تو وکالت ختم ہو جائے گی کیونکہ اس میں تصرف کی اہلیت باقی نہیں رہی۔

وکیل بننا یا وکیل بنانا جو شخص ایک کام کرنے کا قانونی اختیار رکھتا ہو وہی وکیل بنا سکتا ہے یا بن سکتا ہے۔ جس شخص کے لیے خود تصرف جائز نہیں، اس کے نائب کے لیے بالا ولی جائز نہیں۔

▲ وکیل درج ذیل افراد سے خرید و فروخت نہیں کر سکتا

① وہ اپنے آپ سے کوئی شے خرید سکتا ہے نہ فروخت کر سکتا ہے کیونکہ عرف میں بیع اسے کہتے ہیں جب کسی غیر کو شے فروخت کی جائے۔ مزید یہ کہ اس طرح اس پر الزام بھی لگنے کا اندیشہ ہے۔

② اسی طرح وہ اپنی اولاد، باپ، بیوی کو اوران افراد کو جن کی اس کے حق میں شہادت معتبر نہیں، کوئی شے فروخت کرسکتا ہے نہ خرید سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اس پر قرابت داروں کو نوازنے کی تہمت لگ سکتی ہے جس طرح کہ اپنی ذات کے حق میں بیع کرنے سے وہ متہم ہوسکتا ہے۔

مؤکل اور وکیل کے اختیارات تصرف عقد وکالت میں جو کام مؤکل سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

① شے کی قیمت ادا کرنا۔

② خریدی ہوئی شے کو قبضے میں لینا۔

③ شے میں عیب ہو تو اسے واپس کرنا اور اس کے تاوان کو پورا کرنا۔

وکیل بیع کے وقت (خریدار کو) فروخت شدہ شے حوالے کردے گا لیکن مؤکل کی اجازت یا اجازت کے قرینے کے بغیر اس کی قیمت وصول نہیں کرے گا۔ اگر اس نے کسی ایسی جگہ شے فروخت کی کہ اگر اس پر قبضہ نہ کرے گا تو قیمت ضائع ہوسکتی ہے تو اس صورت میں وہ مؤکل کی اجازت کے بغیر اسے وصول کرسکتا ہے جبکہ وکیل خریداری کے وقت قیمت ادا کرے گا کیونکہ یہ وکیل کے حقوق میں شامل ہے۔

جس شخص کو کسی متنازعہ فیہ شے کے بارے میں بحث ومجادلہ کے لیے وکیل بنایا گیا ہو، اسے وہ چیز قبضے میں لینے کا اختیار نہیں لیکن جسے قبضہ اور وصولی کے لیے وکیل بنایا گیا ہے، وہ بحث وتکرار کرنے کا حق رکھتا ہے کیونکہ اس (بحث وتکرار) کے بغیر وہ قبضہ نہیں لے سکتا۔

وکیل کس نقصان کا ذمہ دار ہوگا اور کس کا نہیں وکیل امین ہوتا ہے۔ وکیل سے اگر نقصان ہوجائے اور اس میں کوتاہی نہ ہو تو وہ ''ضامن'' نہیں ہے، یعنی نقصان پورا کرنے کا ذمہ دار نہیں لیکن اگر نقصان میں اس کی سستی یا زیادتی کو دخل ہو یا اس سے مال طلب کیا جو اس نے بلا عذر نہ دیا تو وہ ذمہ دار ہوگا۔

بیع اور اجارہ وغیرہ میں قیمت اور اجرت کی وصولی یا ان کے نقصان یا ان کی مقدار سے متعلق وکیل کی بات قابل قبول ہوگی۔ واللہ أعلم.

حجر کے احکام

دین اسلام لوگوں کے اموال اور ان کے حقوق کا محافظ ہے، اسی لیے اس میں پابندی کے مستحق شخص پر

حجر (تصرفات پر پابندی) کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔

حجر (حاء کے کسرہ کے ساتھ) کے لغوی معنی ''روکنا'' ہیں۔حرام شے کو ''حجر'' کہتے ہیں کیونکہ وہ ممنوع ہوتی ہے۔ارشادِ ربانی ہے

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ ﴾ ''اور وہ (فرشتے) کہیں گے (تم پر جنت) ممنوع ہے، حرام کی گئی ہے۔''[1]

''حجر'' عقل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو برے اور ضرر رساں کاموں سے روکتی ہے۔فرمان الٰہی ہے:

﴿ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ ﴾ ''یقیناً ان (چیزوں) میں عقل مند کے لیے معتبر قسم ہے۔''[2]

''حجر'' کے شرعی معنی ہیں: ''کسی انسان کو (کم عمری، کم عقلی، جنون یا افلاس کی وجہ سے) تصرفات مالی سے روک دینا۔''

قرآن مجید میں حجر کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾

''بے وقوف لوگوں کو اپنا وہ مال نہ دے دو جس مال کو اللہ نے تمھاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ انھیں اس مال سے کھلاؤ پلاؤ، پہناؤ اور اوڑھاؤ اور انھیں معقولیت سے نرم بات کہو۔اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزماتے رہو، پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انھیں ان کے مال سونپ دو۔''[3]

نبی کریم ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر ان کے قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے مالی تصرف کی پابندی لگا دی تھی جب وہ مقروض ہو گئے تھے۔[4]

حجر کی اقسام

▲ حجر کی دو قسمیں ہیں:

---

① الفرقان 22:25. ② الفجر 5:89. ③ النسآء 6,5:4.

④ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب مقروض ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان پر مالی تصرف کی پابندی عائد کر دی تھی اور پھر آپ ﷺ نے ان کے مال میں سے پورا قرض ادا کر دیا۔ سنن الدار قطني: 230/4، حديث: 4505، والمستدرك للحاكم: 58/2، حديث:2348. (صارم)

① کسی انسان کو مالی تصرف سے اس لیے روک دینا کہ اس کے مال میں کسی دوسرے کا حق ہے، جیسے مفلس کے مال کو اس کے قرض خواہوں کی وجہ سے روکنا یا کسی مریض کو (اس کے مال میں ورثاء کے حق کی وجہ سے) تہائی مال سے زائد کی وصیت کرنے سے روکنا۔

② کسی انسان کو خود اس کی ذاتی مصلحت اور فائدے کے لیے مالی تصرفات سے روکنا تاکہ وہ اپنا مال ضائع اور برباد نہ کرلے، جیسے کوئی کم عمر یا کم عقل یا مجنون ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ ﴾ ''بے عقل لوگوں کو اپنا مال نہ دے دو۔''[1]

بعض علمائے کرام کے نزدیک ﴿ السُّفَهَاءَ ﴾ سے مراد بچے اور عورتیں ہیں۔ اور بعض علماء کے نزدیک بے وقوف، چھوٹے بچے اور دیوانے (پاگل) مراد ہیں، ان کو مال نہ دیا جائے تاکہ مال خراب نہ ہو۔ آیت میں یہ حکم ولی اور سرپرست کو دیا ہے کیونکہ وہی ان کی نگرانی کرنے والے ہیں اور وہی ان کے محافظ ہیں۔

پہلی قسم کا تعلق مفلس کے ساتھ ہے۔ مفلس وہ ہے جس پر فوری ادائیگی والا قرض اتنا ہو کہ اس کی ملکیت کی تمام اشیاء دے دی جائیں تو بھی سارے قرض ادا نہ ہوسکیں۔ ایسے شخص کو مالی تصرف سے روک دیا جائے گا تاکہ قرض خواہوں کا نقصان نہ ہو۔

تنگ دست مقروض جو اپنا قرض اتارنے پر قادر نہیں، قرض خواہ وصولیٔ قرض کے لیے اس سے شدید مطالبہ نہ کرے بلکہ وہ اسے ضرور مہلت دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ﴾

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے۔''[2]

تنگ دست مقروض کو مہلت دینے کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُّظِلَّهُ اللهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ فَلْيُيَسِّرْ عَلَى مُعْسِرٍ»

''جسے یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس دن سائے میں رکھے جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا تو اسے چاہیے کہ وہ تنگ دست پر آسانی کرے۔''[3]

افضل یہ ہے کہ تنگدست مقروض کا قرض معاف کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾

① النسآء 5:4. ② البقرة 280:2. ③ المعجم الكبير للطبراني: 304/1، حديث: 899.

''اور تمھارا صدقہ کرنا (قرض معاف کر دینا) تو تمھارے لیے بہت ہی بہتر ہے، اگر تم علم رکھتے ہو۔''[1]

جو شخص قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اسے مالی تصرفات سے روکنا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں حجر کی ضرورت نہیں، البتہ جب قرض خواہ اس سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرے، تب اسے ادائیگی کا حکم دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ» ''غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حقوق العباد کی ادائیگی اس پر لازم تھی، وہ ان میں بلاوجہ تاخیر کر رہا ہے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اسے جیل کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''جو شخص اپنا قرض ادا کرنے پر قادر ہو لیکن ادا نہ کرے تو اس کو مار پیٹ کر یا قید کر کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اصحاب مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔'' شیخ موصوف فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں کوئی نزاع معلوم نہیں ہے۔''[3]

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَيُّ الْوَاجِدِ ظُلْمٌ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ»

''مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ ایسے شخص کی بے عزتی کرنا (اس کی شکایت کرنا) اور اسے سزا دینا (قید کرنا) جائز ہے۔''[4]

چنانچہ مقروض مالدار شخص جب ٹال مٹول کا رویہ اپنائے رکھے گا تو اسے جیل وغیرہ میں بند رکھا جائے حتی کہ وہ تمام قرض ادا کر دے۔ اور اگر تاخیری حربوں پر مصر ہو تو حاکم وقت دخل اندازی کر کے اس کا مال فروخت کرے اور اس کے قرضے ادا کرے۔ اس کاروائی میں حاکم انکار کرنے والے مقروض کا قائم مقام ہوگا تاکہ قرض خواہوں کو نقصان سے بچایا جاسکے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ نقصان پہنچایا جائے اور نہ نقصان اٹھایا جائے۔''[5]

---

① البقرة 2:280. ② صحيح البخاري، الحوالات، باب الحوالة وهل يرجع في الحوالة؟ حديث:2288,2287، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم مطل الغني...... ، حديث 1564. ③مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 402/35. ④ سنن أبي داود، القضاء، باب في الدين هل يحبس به؟ حديث: 3628، ومسند أحمد: 222/4و389,388، وتلخيص الحبير: 39/3، حديث: 1237واللفظ له. ⑤ سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضرّ بجاره، حديث:2340.

گزشتہ بحث سے واضح ہوا کہ مقروض کی دو حالتیں ہیں:

① جس کے قرض کی مدت باقی ہو۔ اس شخص سے مدت مقررہ سے قبل ادائیگی قرض کا مطالبہ نہ کیا جائے گا کیونکہ وقت سے پہلے اس کی ادائیگی اس پر واجب نہیں۔ اور اگر اس کا مال قرض کی رقم سے کم ہے تو مدت سے پہلے اسے مال میں تصرف کرنے سے روکا نہیں جائے گا۔

② جب قرض کی مدت پوری ہو چکی ہو اور اس کی ادائیگی کا وقت ہو تو ایسے مقروض کی دو صورتیں ہیں

▲ اس کے قرض کی نسبت موجود مال بہت زیادہ ہو۔ ایسے شخص کے مال پر تصرف کی پابندی نہیں لگائی جائے گی، البتہ اسے حکم دیا جائے گا کہ وہ قرض خواہ کا قرض ادا کرے۔ اگر وہ قرض ادا نہ کرے تو اسے قید کیا جائے گا اور سزا دی جائے گی حتی کہ اس کے مال سے قرضوں کی ادائیگی ہو جائے اگر وہ قید اور سزا برداشت کر جائے اور قرض ادا نہ کرے تو حاکم دخل اندازی کر کے اس کا سامان فروخت کر کے ادائیگی کرے گا۔

▲ اس کے قرض کی نسبت موجود مال بہت کم ہو۔ ایسے شخص کو قرض خواہوں کے مطالبے کی صورت میں مالی تصرف سے روک دیا جائے گا تا کہ ان کا نقصان نہ ہو جیسا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر مال میں تصرف نہ کرنے کی پابندی لگا دی تھی، پھر ان کا مال فروخت کر کے پورا قرض ادا کیا۔''[1] امام ابن صلاح فرماتے ہیں: یہ حدیث ثابت ہے۔

جب کسی شخص پر مال میں تصرف نہ کرنے کی پابندی عائد کی جائے تو اسے مشتہر کیا جائے، یعنی اس کا اعلان کیا جائے کہ ''فلاں شخص پر اس کے مال میں تصرف پر پابندی لگا دی گئی ہے۔'' تا کہ لوگ دھوکا نہ کھائیں اور اس سے مالی معاملہ کر کے نقصان نہ اٹھائیں۔

محجور مال سے متعلق چار احکام ہیں:

پہلا حکم | کسی مفلس شخص کے پاس مالی تصرف کی پابندی لگنے سے پہلے جو مال موجود تھا اس پر قرض خواہوں کا حق ہے، نیز اگر کچھ مال مذکورہ پابندی کے بعد وراثت، دیت، ہبہ یا وصیت وغیرہ کے سبب حاصل ہوا تو پابندی کا اطلاق اس مال پر بھی ہو گا، لہٰذا محجور علیہ کے لیے اجازت نہیں کہ وہ پابندی لگنے کے بعد حاصل ہونے والے مال میں کسی قسم کا تصرف کرے۔ اسی طرح اپنے مال میں کسی اور شخص کے حق کا اقرار کرے گا تو اس کا اقرار تسلیم نہ ہو گا کیونکہ قرض خواہوں کے حقوق اس کے سارے مال سے متعلق ہیں، لہٰذا کسی اور شخص کے حق کے بارے میں اس کا

① [حسن] المستدرك للحاكم: 58/2، حديث: 2348، وسنن الدارقطني: 230/4، حديث: 4505.

قول واقرار معتبر نہ ہوگا۔ الغرض سارے مال میں کسی قسم کا مالی تصرف کرنا اس پر حرام ہے تاکہ قرض خواہوں کا نقصان نہ ہو۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر اس کا سارا مال قرض میں گھرا ہو تو اپنا مال خرچ نہ کرے کیونکہ اس سے قرض خواہوں کو ضرر پہنچتا ہے، خواہ قاضی نے اس پر مال خرچ کرنے کی پابندی لگائی ہو یا نہ لگائی ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایسا شخص حاکم کی پابندی سے قبل مال میں تصرف کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول اصول شرع کے موافق ہونے کی وجہ سے زیادہ راجح اور صحیح ہے، اس لیے کہ اس مال کے ساتھ قرض خواہوں کا حق وابستہ ہے تبھی تو قاضی اس پر پابندی لگائے گا۔ اور اگر اس کے مال کے ساتھ قرض خواہوں کا حق وابستہ نہ ہو تو قاضی اس پر پابندی نہیں لگا سکتا تھا اس قسم کے قرض خواہ کی مثال اس مریض کی سی ہے جو قریب المرگ ہو کہ جب اس کے مال کے ساتھ وارثوں کا حق وابستہ ہے تو شریعت نے اسے تہائی مال سے زیادہ خرچ کرنے سے روک دیا ہے کیونکہ اگر اس کو اس مال میں تصرف کا حق دے دیا جائے تو اس سے ورثاء کی حق تلفی ہوگی۔ اسی طرح اس مقروض کو اس کے اپنے مال میں تصرف کا حق دینے سے قرض خواہوں کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ شریعت نے اس طرح حقوق پامال نہیں کیے بلکہ شریعت تو دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور مال کے ضیاع کا سد باب کرنے کا درس دیتی ہے۔''[1]

دوسرا حکم: اگر کسی نے محجور علیہ کے پاس اپنا وہ سامان بعینہٖ موجود پایا جو اس نے پابندی لگنے سے پہلے اسے فروخت کیا تھا یا بطور قرض یا اجرت پر دیا تھا تو اسے وہ مال یا سامان لینے کا حق حاصل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مَالَهُ بِعَيْنِهِ عِنْدَ رَجُلٍ أَوْ إِنْسَانٍ قَدْ أَفْلَسَ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ»

''جس نے مفلس کے ہاں اپنا مال (سامان) بعینہٖ موجود پایا، وہی اسے واپس لینے کا دوسرے کی نسبت زیادہ حقدار ہے۔''[2]

جس کا مال مفلس کے پاس ہو اسے بعینہٖ واپس لینے کے بارے میں فقہائے کرام نے چھ شرائط مقرر کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

① مال واپس لیتے وقت مفلس زندہ ہو، یعنی فوت نہ ہو چکا ہو، چنانچہ ابوداود کی روایت میں ہے:

«وَإِنْ مَّاتَ الْمُشْتَرِي فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ أُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ»

① إعلام الموقعين: 9/4 بتصرف. ② صحيح البخاري، الاستقراض، باب إذا وجد ماله عند مفلس ......، حديث: 2402، وصحيح مسلم، المساقاة، باب من أدرك ما باعه عندالمشتري ......، حديث: 1559.

''اگر (مفلس) مشتری فوت ہو گیا تو سامان کا مالک دوسرے قرض خواہوں کی طرح ہوگا۔''[1]

② اس شے کی پوری قیمت مفلس کے ذمے ہو۔ اگر صاحب مال نے اپنی شے کی کچھ قیمت وصول کر لی تو اب اپنی شے واپس لینے کا مستحق نہیں۔

③ متعین شے مکمل طور پر مفلس کی ملکیت میں ہو۔ اگر اس کا کچھ حصہ مفلس کے پاس ہے اور باقی حصہ اس کے پاس نہیں تو وہ اسے واپس نہ لے گا کیونکہ مالک نے اپنی مکمل شے اس کے پاس نہیں پائی۔

④ وہ شے اپنی سابقہ حالت میں قائم ہو، یعنی اس کی کوئی صفت تبدیل نہ ہوئی ہو۔

⑤ اس شے کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا حق وابستہ نہ ہو، مثلاً: مفلس نے اسے کسی کے پاس گروی نہ رکھ دیا ہو۔

⑥ اس شے میں کوئی متصل اضافہ نہ ہو چکا ہو، مثلاً: شے کا موٹا یا بڑا ہو جانا۔

جب یہ چھ شرائط کسی شے میں موجود ہوں تو درج بالا روایت کے مطابق صاحب سامان اپنی شے مفلس سے واپس لے سکتا ہے۔

تیسرا حکم: کسی نے مفلس شخص پر پابندی لگنے سے لے کر پابندی اٹھنے تک کی مدت کے دوران میں مفلس کو کوئی شے فروخت کی یا اسے بطور قرض دی تو وہ پابندی اٹھنے سے پہلے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا بلکہ پابندی اٹھنے کے بعد اپنی شے کا مطالبہ کرے گا، یعنی وہ پابندی لگنے سے پہلے کے قرض خواہوں میں شامل نہ ہوگا۔

چوتھا حکم: حاکم مفلس کا موجود مال فروخت کرے گا اور اس کی قیمت قرض خواہوں کے درمیان ان کے فوری واجب الادا قرضوں کے تناسب سے تقسیم کرے گا کیونکہ حجر کا مقصد یہی تھا۔ اس میں تاخیر کرنا یا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، البتہ حاکم مفلس کی بنیادی ضروریات کا سامان، یعنی گھر، برتن اور آلات وغیرہ فروخت نہیں کرے گا۔ وہ قرض جس کی ادائیگی کچھ مدت کے بعد ہونی ہے، دیوالیہ قرار پانے کی صورت میں اس کی فوری ادائیگی کے مطالبے پر عمل نہ ہوگا، یعنی وہ ان قرضوں کے حکم میں نہیں ہوگا جن کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہے کیونکہ مقررہ مدت تک مہلت مفلس کا حق ہے جو دوسرے حقوق کی طرح ساقط نہ ہوگا۔ مفلس کا روکا ہوا مال موجود قرض خواہوں پر تقسیم ہوگا۔ اگر قرضے مکمل طور پر ادا ہو جائیں تو حاکم کے حکم کے بغیر ہی ''حجر'' کی پابندی ختم ہو جائے گی کیونکہ حجر کی پابندی کا سبب ختم ہو گیا ہے۔ اگر قرضے مکمل ادا نہ ہوں بلکہ مفلس پر کچھ قرضے باقی رہیں تو حجر قائم رہے گا، البتہ حاکم چاہے تو حجر ختم کر سکتا ہے کیونکہ حجر کا حکم اسی نے جاری کیا تھا۔

◣ دوسری قسم، یعنی کسی انسان کو اس کے اپنے فائدے کے لیے مالی تصرف سے روک دینا تاکہ اس کا مال محفوظ رہے۔

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يفلس فيجد الرجل متاعه بعينه عنده، حديث: 3520.

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہمارا دین دینِ رحمت ہے۔ اس نے ہر اس چیز کو اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں انسان کی کوئی مصلحت ہو۔ اور ہر وہ کام جس میں کسی کا نقصان تھا اس پر تنبیہ کر دی اور منع فرما دیا ہے۔ علاوہ ازیں جس انسان میں جائز اور کسب حلال کی حدود کے اندر رہ کر مالی تصرف اور تجارت کرنے کی اہلیت ہے، اس کے لیے معاشی میدان کھلا چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس میں انفرادی اور اجتماعی مصلحت پنہاں ہے۔ اور اگر کسی انسان میں کم عمری، بے وقوفی یا فقدان عقل کی وجہ سے مالی تصرف اور تجارت کرنے کی اہلیت نہیں تو اسلام انھیں ہر قسم کے مالی تصرفات سے روکتا ہے اور اس پر ایسا نگران مقرر کرنے کی تلقین کرتا ہے جو اس کے مال کی حفاظت کرے اور اسے بڑھانے کی منصوبہ بندی کرے حتی کہ جب اس میں اہلیت پیدا ہو جائے تو نگران اسے سارا مال لوٹا دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾

"بے وقوف لوگوں کو اپنا مال نہ دے دو جس مال کو اللہ نے تمھاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ انھیں اس مال سے کھلاؤ پلاؤ، پہناؤ اور اوڑھاؤ اور انھیں معقولیت سے نرم بات کہو۔ اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزماتے رہو، پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انھیں ان کے مال سونپ دو۔"[1]

پابندی کی اس قسم کا تعلق ذمہ اور مال دونوں کو شامل ہے۔ جس شخص پر یہ پابندی عائد ہو وہ اپنے مال میں بیع، صدقہ یا ہدیہ وغیرہ کی صورت میں تصرف نہ کرے۔ کسی قسم کا قرض، کسی کی ضمانت یا کفالت وغیرہ کی ذمے داری نہ اٹھائے کیونکہ اس طرح سے لوگوں کا مال ضائع ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایسے افراد کے ساتھ کسی عاقل، بالغ انسان کو کوئی مالی معاملہ کرنا صحیح نہیں، مثلاً: ان سے بیع کریں یا قرض یا امانتاً اور عاریتاً مال دیں۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ اپنا دیا ہوا مال واپس لے بشرطیکہ اس کے پاس وہی مال بعینہ موجود ہو۔ اگر وہ مال یا سامان مذکورہ افراد کے ہاں خود تلف ہو گیا یا انھوں نے تلف کر دیا تو اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ان پر کوئی جرمانہ و تاوان ہو گا کیونکہ اس نے اپنی رضا و رغبت سے اپنا مال ایسے لوگوں کے حوالے کر کے خود ہی کوتاہی کی ہے، لہٰذا اس کا خمیازہ اسے خود ہی بھگتنا ہو گا۔

[1] النسآء 4:5، 6.

اگر کسی شخص نے، جس کو اس کی صغر سنی وغیرہ کی وجہ سے ہر قسم کے مالی تصرفات سے روک دیا گیا ہے کسی کی جان یا کسی کے مال کے بارے میں جنایت کا مرتکب ہوا تو وہ ضامن ہوگا اور اس جنایت پر مرتب ہونے والے نقصان و تاوان کو برداشت کرے گا کیونکہ جسے نقصان پہنچایا گیا ہے اس کا نہ قصور ہے نہ اجازت۔ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ ''مال و جان تلف ہونے کی صورت میں نقصان پورا کرنے کی ذمے داری میں اہل اور نا اہل برابر ہیں۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بچہ، مجنون یا سویا ہوا شخص کسی کا مالی نقصان کر دے تو وہ ضامن ہوگا۔ یہ شریعت کا عمومی قانون ہے جس میں امت کی مصلحتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر ان کے ہاتھوں سے سرزد ہونے والی غلطیوں میں انھیں قصوروار نہ ٹھہرایا جائے تو کئی لوگ ایک دوسرے کے مال کا نقصان کریں گے اور دعوی کریں گے کہ ہم سے بغیر ارادے کے غلطی ہوگئی۔''[1]

دو صورتوں میں بچے کا ''حجر'' ختم ہو جاتا ہے

پہلی صورت جب وہ بالغ ہو جائے۔ بلوغت کی پہچان کے لیے متعدد علامات ہیں جو درج ذیل ہیں

① سوتے یا جاگتے ہوئے منی کا انزال ہونا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا ﴾

''اور تمھارے بچے جب بلوغت کو پہنچ جائیں تو انھیں اجازت مانگ کر آنا چاہیے۔''[2]

واضح رہے کہ حُلُم کا مطلب یہ ہے کہ طفل خواب میں ایسی کیفیت دیکھے جس سے منی دافق (اچھلنے والی) کا انزال ہو جائے۔

② شرمگاہ کے اردگرد (سخت) بالوں کا اگنا۔[3]

③ بچے کی عمر پندرہ برس ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''غزوۂ احد کے موقع پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے غزوے میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جبکہ غزوہ خندق میں مجھے اجازت مل گئی کیونکہ اس وقت میں پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔''[4]

اس روایت سے واضح ہوا کہ پندرہ سال کی عمر میں بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔

---

① إعلام الموقعين: 150/2. ② النور 59:24. ③ سنن أبي داود، الحدود، باب في الغلام يصيب الحد، حديث: 4405,4404. ④ صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان وشهادتهم، حديث: 2664، وصحيح مسلم، الإمارة، باب بيان سن البلوغ، حديث: 1868، وسنن ابن ماجه، الحدود، باب من لا يجب عليه الحد، حديث: 2543 واللفظ له.

④ لڑکی کے بالغ ہونے کی ایک مزید علامت اسے حیض کا آنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ»

''اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز سر پر بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔''[1]

دوسری صورت مال کی اصلاح اور اسے سنبھالنے کی صلاحیت کا پیدا ہونا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾

''اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزماتے رہو، پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انھیں ان کے مال سونپ دو۔''[2]

اس صلاحیت کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے مالی تصرف پر تھوڑا سا اختیار دے دیا جائے، جب وہ متعدد بار مال کو اس انداز سے خرچ کرے کہ وہ کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہے، علاوہ ازیں وہ حرام اور بے مقصد جگہ پر مال خرچ نہ کرے تو یہ اس کے سمجھ دار اور باصلاحیت ہونے کی علامت ہے۔

مجنون شخص کا ''حجر'' تب ختم ہو گا جب اس کا جنون ختم ہو جائے اور تصرفات مالیہ صحیح طور پر انجام دے سکے۔

بیوقوف شخص کا ''حجر'' تب ختم ہو گا جب اس کی کم عقلی ختم ہو جائے اور تصرفات مالیہ صحیح طور پر انجام دے سکے۔

حالت حجر میں بچہ ہو یا مجنون یا کم عقل ہر شخص کے مال کا نگران اس کا والد ہو گا بشرطیکہ وہ عادل وسمجھ دار ہو کیونکہ اس میں کمال درجہ کی شفقت ہوتی ہے۔ والد کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جس کو والد نے وصیت کے ذریعے سے متعین کیا ہو کیونکہ وہ اس کا نائب ہے، جیسے زندگی میں وکیل کسی کا نائب ہوتا ہے۔

متولی کے لیے ضروری ہے کہ ان (تینوں) کا مال وہاں خرچ کرے جہاں ان کی مصلحت اور فائدہ زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

''اور تم یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے۔''[3]

یہ آیت اگرچہ یتیم کے بارے میں نص ہے تاہم کم عقل اور مجنون کو بھی قیاس کے ذریعے سے شامل ہو جاتی ہے۔

یتیم کا نگران اس کے مال کی اچھی طرح حفاظت کرے۔ ظلم وزیادتی کر کے اپنی ذات پر استعمال نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① سنن أبي داود، الصلاة، باب المرأة تصلي بغير خمارٍ، حديث: 641. ② النسآء 4:6. ③ الأنعام 6:152.

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾

''بے شک جو لوگ ناحق (ظلم) سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ میں جائیں گے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے یتیم کے اولیاء کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ یتیموں کے مال کی اس طرح نگہداشت اور خیال رکھیں جیسا کہ اپنی اولاد کے مال کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ احسان و بھلائی کا سلوک کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴾

''اور لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے (ننھے ننھے) ناتواں بچے چھوڑ جائیں جن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے (تو انھیں ان کے بارے میں کتنی فکر ہوگی)، چنانچہ اللہ سے ڈر کر ٹھیک بات کہا کریں۔''[2]

یہ بچے چونکہ اپنے مال کی خود حفاظت نہیں کر سکتے اور نہ اس میں ایسا تصرف کرنا جانتے ہیں جس سے ان کا مال بڑھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نگران مقرر فرما دیے جو ان کی اور ان کے مالوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان نگرانوں کو نگرانی کے دوران میں توجیہات ارشاد فرمائیں جس پر چل کر وہ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے اولیاء (سرپرستوں) کو منع کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو قبل از وقت مال دے دیں تاکہ وہ ضائع نہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ﴾

''بے وقوف لوگوں کو اپنا مال نہ دے دو جس مال کو اللہ نے تمھاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے۔''[3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے بے وقوفوں کو مال میں تصرف کرنے کی اجازت دینے سے روکا ہے جس میں لوگوں کے لیے گزران ہے، یعنی ان کی معیشت و تجارت وغیرہ قائم ہے اور اسی سے بے وقوفوں وغیرہ پر ''حجر'' کا حکم اخذ کیا جاتا ہے۔''[4]

جیسے اللہ تعالیٰ نے کم عقلوں کو ان کا مال ان کے سپرد کرنے سے روکا ہے اور اسے اہل نظر اور اصلاح کرنے والوں کے سپرد کر دیا ہے، ایسے ہی اولیاء کو تنبیہ کی ہے کہ اس میں ایسا تصرف نہ کریں جس سے ان کے مالوں میں فائدہ اور اصلاح نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] النسآء 4:10۔ [2] النسآء 4:9۔ [3] النسآء 4:5۔ [4] تفسیر ابن کثیر: 1/601، النسآء: 4:10۔

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾

''اور تم یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے۔''[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ آیت:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

''اور تم یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے۔''[2]

اور یہ آیت:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ﴾

''جو لوگ ناحق (ظلم) سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔''[3]

نازل ہوئی تو جس شخص کے پاس یتیم تھا اس نے گھر جا کر فوراً یتیم کا کھانا پینا اپنے کھانے پینے سے الگ کر لیا۔ اور اگر یتیم کا کھانا بچ جاتا تو اسے الگ رکھ دیا جاتا حتی کہ یتیم خود کھا لیتا یا پڑا پڑا خراب ہو جاتا۔ یہ صورت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر گراں گزری، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ﴾

''اور آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔''[4]

''تب انھوں نے ان کا کھانا پینا اپنے کھانے پینے کے ساتھ شامل کر لیا۔''[5]

یتیموں کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کی بہترین صورت یہ ہے کہ ان کے اموال نفع بخش تجارت کے کاموں میں لگائے جائیں یا ولی اور نگران خود اس سے تجارت کرے یا کسی شخص کو بطور مضاربت ان کا مال دے دے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا مال تجارت پر لگا دیا تھا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

«اِتَّجِرُوا فِي أَمْوَالِ الْيَتَامٰى، لَا تَأْكُلُهَا الصَّدَقَةُ»

''تم یتیموں کے مال تجارت میں لگاؤ ایسا نہ ہو کہ زکاۃ انھیں ختم کر دے۔''[6]

[1] الأنعام 152:6. [2] الأنعام 152:6. [3] النسآء 10:4. [4] البقرة 220:2. [5] تفسير ابن كثير: 346/1، البقرة: 220:2. [6] السنن الكبرٰى للبيهقي: 107/4، والمعجم الأوسط للطبراني: 90/5، حديث: 4164 واللفظ له.

▲ اسی طرح یتیم کا ولی اس کے جملہ اخراجات اچھے طریقے سے پورے کرے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''یتیم کی عزت کرنا، اس کو خوشی دینا اور پریشانی سے بچانا مستحب ہے اور اس کی دل جوئی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔''

اگر یتیم مالدار ہو تو اس کا سرپرست اس کے مال میں سے قربانی کا جانور خرید سکتا ہے کیونکہ عید کا دن خوشی کا دن ہے۔ اسی طرح سرپرست یتیم کو اس کا مال خرچ کر کے تعلیم دلوا سکتا ہے کیونکہ اس میں اس کا فائدہ ہے۔

اگر یتیم کا ولی فقیر ہو تو وہ یتیم کا مال سنبھالنے کی مناسب اجرت لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾

''ہاں (جو) مسکین محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ آیت یتیم کے والی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو یتیم اور اس کے مال کی نگرانی اور اصلاح کرتا ہے تو اگر وہ ضرورت مند ہو تو اس کے مال سے کھا سکتا ہے۔''[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آیت:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾

''مال داروں کو چاہیے کہ (ان کے مال سے) بچتے رہیں، ہاں! جو مسکین محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔''[3]

یتیم کے ولی کے بارے میں نازل ہوئی کہ (وہ یتیم کے مال سے) بقدر نگرانی لے سکتا ہے۔[4]

فقہائے کرام نے کہا ہے کہ یتیم کا ولی معروف اجرت یا بقدر حاجت ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں کم رقم بنتی ہو وہ وصول کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: میری کفالت میں ایک ایسا یتیم ہے جس کے پاس مال ہے، البتہ میرے پاس مال نہیں تو کیا میں اس کے مال میں سے لے سکتا ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كُلْ مِنْ مَّالِ يَتِيمِكَ غَيْرَ مُسْرِفٍ» ''زیادتی کیے بغیر اپنے یتیم کے مال میں سے کھا لو۔''[5]

---

① النسآء 4:6. ② تفسير ابن كثير: 602/1، النسآء: 4:6. ③ النسآء 4:6. ④ تفسير ابن كثير: 602/1، النسآء: 4:6. ⑤ سنن أبي داود، الوصايا، باب ما جاء فيما لولي اليتيم أن ينال من مال اليتيم، حديث: 2872، وسنن النسائي، الوصايا، باب ما للوصي من مال اليتيم إذا قام عليه؟ حديث: 3698، وسنن ابن ماجه، الوصايا، باب قوله: ﴿ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ النسآء 4:6، حديث: 2718.

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رخصت کی حد عبور نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں نہایت سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ﴾

''اوران کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کرو۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝ ﴾

''اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر کھا نہ جاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلْيَتَٰمَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِى بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ ﴾

''بے شک جو لوگ ناحق (ظلم) سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ میں جائیں گے۔''[3]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ، قَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: الشِّرْكُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ»

''سات تباہ کن گناہوں سے بچ کر رہو۔'' عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! وہ کون کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، (کفار سے) جنگ کے موقع پر پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا اور پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر (بدکاری کی) تہمت لگانا۔''[4]

◄ جب یتیم کی یتیمی کا دور ختم ہو جائے (جو سن بلوغت ہے) اور وہ مال میں تصرف کرنے کا اہل ہو جائے تو گواہوں کی موجودگی میں اس کا مکمل مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] النسآء 4:6. [2] النسآء 4:2. [3] النسآء 4:10. [4] صحيح البخاري، الوصايا، باب قول الله تعالى: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ...... ﴾، حديث: 2766، و صحيح مسلم، الإيمان، باب الكبائر وأكبرها، حديث: 89.

﴿ وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ ﴾ ’’اور یتیموں کو ان کے مال دے دو۔‘‘[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾

’’اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزماتے رہو، پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انھیں ان کے مال سونپ دو۔‘‘[2]

نیز فرمایا:

﴿ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ ﴾

’’پھر جب انھیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنالو اور حساب لینے والا اللہ ہی کافی ہے۔‘‘[3]

یعنی جب سرپرست یتیموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، پھر ان کے مال ان کے سپرد کرتے ہیں تو اس وقت اللہ ہی کافی محاسب اور گواہ ہے۔ اور وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ یتیموں کو ان کے پورے کے پورے مال حوالے کرتے ہیں یا ان میں کمی کرتے (اور خیانت کا ارتکاب کرتے) ہیں۔

صلح کے احکام

صلح کے لغوی معنی ’’جھگڑا ختم کرنا‘‘ کے ہیں جبکہ شریعت کی اصطلاح میں ’’دو جھگڑنے والے افراد کے درمیان پیدا شدہ اختلافات ختم کرنے کے معاہدے کو صلح کہتے ہیں۔‘‘ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ صلح سے مراد وہ معاہدہ ہے جس سے دو افراد کا باہمی نزاع ختم ہو جائے۔

صلح ایک ایسا معاہدہ ہے جس کے بہت سے فائدے ہیں، اسی لیے بوقت ضرورت اس میں جھوٹ کی آمیزش کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

صلح کی مشروعیت قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ﴾ ’’اور صلح بہت بہتر چیز ہے۔‘‘[4]

ایک اور مقام پر فرمایا:

[1] النسآء 4:2. [2] النسآء 4:6. [3] النسآء 4:6. [4] النسآء 4:128.

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ ﴾

''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرا دیا کرو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسری (جماعت) پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر (اللہ کے حکم کی طرف) لوٹ آئے تو عدل کے ساتھ ان میں صلح کرا دو اور انصاف کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ ﴾

''ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں مگر جو شخص خیرات کا یا نیک بات کا یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم کرے اور جو شخص صرف اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے ارادے سے یہ کام کرے تو ہم اسے یقیناً بہت بڑا ثواب دیں گے۔''[2]

نیز فرمایا:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ ''سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا»

''مسلمانوں میں صلح جائز (نافذ ہونے والی) ہے الا یہ کہ جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال بنا دے۔''[4]

نیز خود رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان صلح کروانے میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔

جائز صلح کی بنیاد عدل و انصاف پر ہوتی ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے۔ اس کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اس کے بعد دونوں کو راضی کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔

لوگوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو جھگڑے کے حالات و

[1] الحجرات 49:9. [2] النسآء 4:114. [3] الأنفال 8:1. [4] سنن أبي داود، القضاء، باب في الصلح، حديث :3594، وجامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، حديث:1352.

واقعات سے واقف ہو، نیز واجب اور ذمہ داری کو سمجھتا ہو اور عدل کرنا اس کا مقصد ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان صلح کروانے والے شخص کا مقام و مرتبہ اس شخص سے کہیں بڑھ کر ہے جو مسلسل روزے رکھنے والا اور قیام کرنے والا ہے۔[1] واضح رہے جو صلح عدل وانصاف سے عاری ہوگی وہ ظلم اور حق تلفی ہوگی۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص طاقتور ظالم اور کمزور مظلوم کے درمیان اس طرح صلح کروادے کہ وہ طاقتور ظالم کو خوش کرے، ظالم کے ظلم کو برقرار رکھے، ضعیف کو اس کا حق نہ دلائے یا اسے واپس دلانے کی جرأت و کوشش نہ کرے۔

واضح رہے صلح مخلوق کے ان حقوق کے بارے میں ہوتی ہے جس کا تعلق ایک دوسرے سے ہے اور جنھیں معاف کیا جاسکتا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کے حقوق، مثلاً: حدود اور عبادات وغیرہ میں صلح کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ ان میں صلح یہی ہے کہ انھیں مکمل طور پر ادا کیا جائے۔

▲ صلح کی پانچ صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

① مسلمانوں اور حربیوں (کافروں) کے درمیان صلح کروانا۔

② مسلمانوں میں سے اہل عدل اور باغیوں کے درمیان صلح کروانا۔

③ خاوند اور بیوی میں، جب اختلاف بڑھنے کا اندیشہ ہو، صلح کروانا۔

④ مال کے علاوہ کسی اور چیز میں دو جھگڑنے والوں کے درمیان صلح کروانا۔

⑤ مال کے بارے میں جھگڑنے والے فریقین کے درمیان صلح کروانا۔

واضح رہے اس بحث میں یہی آخری قسم مقصود ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

▲ اقرار پر مبنی صلح۔

▲ انکار پر مبنی صلح۔

▲ اقرار پر مبنی صلح کی دو صورتیں ہیں:

① متنازعہ چیز کا کچھ حصہ معاف کرنے پر صلح کرنا۔

② متنازعہ چیز کے علاوہ کوئی اور شے دینے پر صلح کرنا۔

اگر صاحب حق صلح کے لیے متنازعہ چیز میں سے کچھ حصہ خود معاف کرنے پر آمادہ ہو جائے تو یہ صلح درست ہے، مثلاً: ایک شخص دوسرے کے کسی مقرر قرض کا اعتراف کرتا ہے یا کسی ایسی مالی شے کا اقرار کرتا ہے جو اس کے

① صحیح ابن حبان: 489/11، حدیث: 5092.

پاس موجود ہے، پھر صاحب حق اپنے قرض کی کچھ رقم لینے اور کچھ رقم معاف کرنے پر صلح کر لے یا اس چیز کا کچھ ہبہ کر دے اور باقی وصول کر لے تو جائز ہے۔ صلح کی اس صورت کے جواز کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

- ایک شخص دوسرے کے حق کا اعتراف کرتا ہے مگر یہ شرط لگاتا ہے کہ ''میں کچھ لے کر ہی اس کی ادائیگی کروں گا'' تو یہ اس کے لیے جائز نہیں۔ یا صاحب حق کہے: ''میں تجھے اس شرط پر بری قرار دیتا ہوں یا فلاں شے ہبہ کرتا ہوں کہ تو مجھے اس قدر رقم ادا کر دے۔'' تو اس قسم کی شرط بھی درست نہیں کیونکہ صاحب حق کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مکمل حق کا مطالبہ کرے۔
- اس قسم کی صلح کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ وہ حق کی ادائیگی کو صلح کے ساتھ مشروط نہ کرے کیونکہ یہ دوسرے کے مال کو ناحق کھانا ہے جو حرام ہے، نیز حق والے کو اس کا حق بغیر کسی قید و شرط کے ادا کرنا واجب ہے۔
- صاحب حق ایسا شخص ہو جو ہبہ کر سکتا ہو۔ اگر ہبہ کرنے کا حق نہ رکھتا ہو تو ایسی صلح جائز نہیں، مثلاً: کوئی یتیم یا مجنون کے مال کا ولی ہے تو وہ یتیم و مجنون کے مال کا مالک نہیں، اس لیے وہ صلح کی خاطر کسی کو یہ مال بھی نہیں دے سکتا۔

الغرض صلح کی مذکورہ بالا صورت بیان کردہ شرائط کے ساتھ جائز ہے کیونکہ اس کا تعلق رضامندی اور خوشی سے ہے۔ کسی انسان کو اپنے حق میں سے کچھ حصہ معاف کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا جس طرح کہ اسے سارا حق وصول کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ نبی ﷺ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے قرض خواہوں سے بات چیت کی کہ اس کے قرضے کا کچھ حصہ معاف کر دیں۔[1]

اقرار پر مبنی صلح کی دوسری صورت یہ ہے کہ صاحب حق کو متنازعہ چیز کے علاوہ کوئی اور چیز دینے پر مصالحت کر لے، مثلاً: ایک شخص دوسرے کے قرض کا یا کسی متعین چیز کا اعتراف کرے، پھر صاحب حق کو متنازعہ چیز کے عوض میں کوئی اور چیز دینے پر صلح کر لے۔ اگر ایک شخص نقد رقم کے عوض میں نقد رقم سے صلح کرتا ہے تو یہ ''بیع صرف'' کے حکم میں ہے جو جائز ہے۔ اور اگر کوئی نقد رقم کے عوض میں کوئی اور چیز دینے کی شرط پر صلح کرتا ہے تو یہ بیع بن جائے گی اور اس پر بیع کے احکام جاری ہوں گے۔ اور اگر کسی نے کسی مال کے عوض میں اپنے گھر میں رہائش کی سہولت دینے پر صلح کی تو یہ اجارہ (کرایہ پر دینا) ہے، اس پر کرائے کے احکام جاری ہوں گے۔ اگر کسی نے نقدی کے سوا کسی اور چیز کے عوض کوئی دوسری مالی چیز دینے پر صلح کی، مثلاً: بھینس کے عوض گائے دینے پر صلح کی تو یہ صلح بیع کے

[1] صحیح البخاري، البیوع، باب الکیل علی البائع والمعطي، حدیث: 2127.

حکم میں ہوگی۔

انکار پر مبنی صلح کی صورت:

یعنی ایک شخص دوسرے پر اپنے حق کا دعویٰ کرتا ہے اور ''مدعا علیہ'' خاموش رہتا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ دعویٰ کس چیز کا کیا گیا ہے، پھر مدعی، مدعا علیہ کے خاموش رہنے کی وجہ سے اپنے دعوے کی چیز کے عوض مدعا علیہ سے نقد رقم لے یا ادھار شے لینے کا وعدہ لے کر مصالحت کر لیتا ہے تو اکثر اہل علم کے نزدیک ایسی صورت میں صلح جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا»

''مسلمانوں کے درمیان صلح جائز (نافذ ہونے والی) ہے، البتہ ایسی صلح جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دے، ناجائز ہے۔''[1]

صلح کی اس قسم کا مدعا علیہ کو فائدہ یہ ہے کہ وہ خصومت اور حلف سے بچ جاتا ہے جبکہ مدعی کو گواہ پیش کرنے کی تکلیف نہیں ہوتی اور اسے اپنے حق کی وصولی میں جو تاخیر ہو سکتی تھی اس سے بچ جاتا ہے۔

انکار پر صلح مدعی کے حق میں بیع کی طرح ہوتی ہے کیونکہ وہ اسے اپنے مال کا معاوضہ تصور کرتا ہے، لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے یقین کے مطابق عمل کرے۔ یہ صورت ایسے ہوگی گویا مدعا علیہ نے اس سے یہ چیز خرید لی ہے، لہٰذا مدعی کے لیے اس کے احکام بیع والے ہوں گے، مثلاً: وصول شدہ چیز عیب کی وجہ سے واپس کرنا اور اگر شفعہ والی چیز ہو تو شفعہ کے حق کا حاصل ہونا۔

مدعا علیہ کے حق میں اس صلح کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دعویٰ سے بری الذمہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے مال کی ادائیگی اپنی قسم کے بدلے کی ہے تاکہ خود سے ضرر کو دور کرے، جھگڑا ختم کرے اور مقدمہ بازی کی پریشانی سے بچ جائے۔ چونکہ عزت دار افراد ایسی چیزوں سے بچ کر رہنا پسند کرتے ہیں، لہٰذا وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے مال ادا کر دیتے ہیں۔ اگر صلح کے نتیجے میں حاصل ہونے والی چیز میں کوئی عیب ہو تو مدعا علیہ اسے خیار عیب کی بنیاد پر واپس کرنے کا حق نہیں رکھتا اور اگر وہ شفعہ والی چیز ہو تو شفعہ کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اسے کسی چیز کا عوض سمجھ کر وصول نہیں کر رہا۔

اگر مبنی بر انکار کی مصالحت میں فریقین میں سے کسی نے جھوٹ سے کام لیا، مثلاً: مدعی نے کسی شے کے بارے

[1] سنن أبي داود، القضاء، باب في الصلح، حديث: 3594، وجامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، حديث: 1352.

میں جھوٹا دعویٰ کیا یا مدعا علیہ نے انکار دعویٰ میں جھوٹ سے کام لیا باوجود یہ کہ اسے اپنے جھوٹ پر یقین ہے تو جس جھوٹے فریق کو یہ شے یا مال مل گیا اس کے حق میں یہ صلح باطل ہے کیونکہ وہ حقیقت اور سچائی کو جانتا ہے اور صاحب حق کو اس کا حق دینے پر قادر ہے، لہٰذا اس صلح کے بموجب وہ جو کچھ لے رہا ہے اس پر حرام ہے کیونکہ اس نے یہ مال ظلم اور زیادتی کرتے ہوئے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ ﴾ ''اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو۔''[1]

اگرچہ یہ صلح لوگوں کے ہاں درست ہوگی کیونکہ انھیں مخفی حالات کا علم نہیں ہوتا لیکن یہ صلح اس ذات کے ہاں حقیقت کو بدل نہیں سکتی جس سے آسمانوں اور زمینوں کی کوئی شے مخفی نہیں، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ایسے برے کاموں اور باطل حیلوں سے گریز کرے۔

مبنی بر انکار صلح کے مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ اگر کسی اجنبی شخص نے مدعا علیہ کی اجازت کے بغیر مدعی سے مصالحت کر لی تو یہ صلح درست قرار پائے گی کیونکہ اجنبی شخص کا اس سے مقصد مدعا علیہ کو قسم سے بچانا اور مخاصمت کو ختم کرنا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی اجنبی شخص نے کسی کا قرض ادا کر دیا، البتہ اس اجنبی نے مدعی کو جو کچھ دیا اس کا مدعا علیہ سے مطالبہ نہ کر سکے گا کیونکہ اس نے جو کچھ دیا ہے تبرعًا (خوشی سے) دیا ہے۔

نامعلوم حق کے بارے میں صلح جائز ہے، خواہ یہ حق دونوں فریقوں کا ایک دوسرے پر ہو یا صرف ایک فریق کا ہو بشرطیکہ اس نامعلوم کو معلوم کرنا ناممکن ہو، جیسے دونوں کا آپس کا حساب جس پر طویل عرصہ گزر چکا ہو اور دونوں کو ایک دوسرے کے ذمے حق کا علم نہیں (کہ کتنا تھا) جیسا کہ نبی ﷺ نے دو آدمیوں کو، جن کا قدیم میراث کے بارے میں اختلاف ہوا تھا، فرمایا:

«اِسْتَهِمَا ثُمَّ تَوَخَّيَا الْحَقَّ ثُمَّ لْيَحْلُلْ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْكُمَا صَاحِبَهُ»

''قرعہ ڈال لو اور حق کے مطابق طے کرنے کی کوشش کرو اور ہر ایک دوسرے کو کمی بیشی معاف کر دے۔''[2]

کیونکہ یہ اپنے حق سے دست برداری ہے تو مجبوری کی وجہ سے نامعلوم میں بھی جائز ہے تاکہ مال ضائع نہ ہو جائے یا کسی کے ذمے دوسرے کا حق باقی نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کمی بیشی معاف کرنے کا حکم اس لیے دیا تاکہ پوری طرح بری الذمہ ہو سکیں کیونکہ یہ مخلوق کا حق ہے اور مخلوق کا حق عظیم ہے۔

قصاص کے معاملے میں شریعت کی مقرر کردہ دیت کے ساتھ صلح یا کمی بیشی کر کے فریقین کے درمیان صلح ہو سکتی

[1] البقرة 2:188. [2] سنن أبي داود، القضاء، باب في قضاء القاضي إذا أخطأ، حديث: 3584، والمصنف لابن أبي شيبة: 5/27، حديث: 2338 واللفظ له.

ہے کیونکہ اس میں مال کی مقدار متعین نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے بدلے معاوضہ واقع نہیں ہوتا۔

حدود شرعیہ کے نفاذ میں مصالحت درست نہیں کیونکہ ان کی مشروعیت میں یہ حکمت ہے کہ دوسرے لوگ ان جرائم سے باز رہیں، نیز اس میں اللہ تعالیٰ اور معاشرے کا حق ہے جب کہ صلح اسے ختم کر دیتی ہے، معاشرے کو خیر و فلاح کے فوائد سے محروم کر دیتی ہے اور فتنہ وفساد برپا کرنے والے اور ناکارہ لوگوں کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنتی ہے، لہٰذا حدود شرعیہ میں مصالحت جائز نہیں ہے۔

پڑوس اور راستوں کے احکام

فقہائے کرام نے کتب فقہ میں پڑوسیوں اور راستوں کے احکام تفصیل سے بیان کیے ہیں کیونکہ اس موضوع کی بہت اہمیت اور ضرورت ہے۔

عام طور پر پڑوسیوں کے درمیان مسائل اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا حل اور علاج نہایت ضروری ہے تاکہ اختلافات کے نتیجے میں عداوت ونزاع تک نوبت نہ پہنچنے پائے۔ اس کے حل کے لیے جو متعدد اصول وضوابط ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

① عدل وانصاف کو پیش نظر رکھ کر ان میں صلح کرا دی جائے۔

② اگر کسی کو اپنے پڑوسی کی زمین کے ساتھ ساتھ یا اس کی سطح پر پانی چلانے اور جاری کرنے کی ضرورت ہو تو اس بارے میں کسی معاوضے پر دونوں صلح کر لیں تو جائز ہے کیونکہ ضرورت اس کی متقاضی ہے۔ اگر یہ معاوضہ کسی فائدے کے مقابلے میں ہے جبکہ صاحب زمین کی ملکیت برقرار رہے تو یہ عقد ''اجارہ'' کے حکم میں ہے اور اگر صاحب زمین کی ملکیت ختم ہوگئی تو یہ بیع کی صورت ہوگی۔

③ اگر کسی کو اپنے پڑوسی کی زمین میں سے گزرگاہ کی ضرورت ہو تو وہ پڑوسی سے صلح کر لے یا راستے کی ضرورت کے مطابق جگہ خرید لے، دونوں طرح جائز ہے کیونکہ ضرورت وحاجت اسی کی متقاضی ہے۔ مالک زمین کے لیے لائق نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کو گزرگاہ کے استعمال سے منع کرے یا اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھائے یا اسے اس کے فائدے سے محروم کر دے۔

④ اگر درخت کی کوئی شاخ بڑھ کر پڑوسی کی زمین پر اس کی فضا میں چلی گئی تو درخت کے مالک کو چاہیے کہ اسے

کاٹ دے یا اپنی زمین کی طرف موڑ لے تاکہ پڑوسی کی زمین کی جگہ یا فضا خالی اور صاف رہے۔ اگر شاخ کا مالک ایسا کرنے سے انکار کر دے تو مالک زمین خود ہی اسے ختم کر سکتا ہے کیونکہ وہ حملہ آور سے مشابہ ہے جسے کم سے کم نقصان پہنچانے والے طریقے سے ہٹانا اس کا حق ہے، البتہ اگر دونوں ہی شاخ کو اسی حالت میں قائم رکھنے پر صلح کر لیں تو جائز ہے، خواہ یہ صلح صحیح قول کے مطابق بامعاوضہ ہو یا شاخ کا پھل باہم تقسیم کرنے پر ہو، دونوں طرح درست ہے۔

⑤ اگر پڑوسی کی زمین میں درخت کی جڑ چلی گئی تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو شاخ والا تھا جس کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

⑥ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی ملکیت کی زمین یا مکان وغیرہ میں ایسی تبدیلی کرے جو اس کے پڑوسی کے لیے تکلیف یا نقصان کا باعث ہو، مثلاً: حمام بنانا یا تنور لگانا یا قہوہ خانہ بنانا یا کارخانہ وفیکٹری لگانا، جس کی حرکت یا آواز باعث تکلیف ہو، یا روشن دان یا کھڑکی کھولنا جس کے ذریعے سے پڑوسی کے گھر نظر پڑ سکتی ہو وغیرہ۔

⑦ کسی کے گھر کی وہ دیوار جو اس کے اور اس کے پڑوسی کے درمیان مشترک ہے، اس میں پڑوسی کی اجازت کے بغیر کھڑکی کھولنا یا بڑی میخ ٹھونکنا ناجائز ہے۔ اسی طرح مشترک دیوار پر یا پڑوسی کی ملکیتی دیوار پر بلاضرورت لکڑی رکھنا یا کوئی اور بھاری بھرکم شے رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر چھت ڈالنے کی خاطر شہتیر وغیرہ رکھنا ہو جس کا وزن دیوار اٹھا سکے تو اس میں پڑوسی کو رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَمْنَعْ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشَبَةً فِي جِدَارِهِ»

''کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار پر لکڑی رکھنے سے نہ روکے۔''[1]

اس حدیث کو بیان کر کے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''تعجب ہے کہ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم (اس حکم کو ماننے سے) گریز کر رہے ہو، اللہ کی قسم! میں ضرور اس کو تمھارے کندھوں کے درمیان ماروں گا۔''[2]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ کسی کے لائق نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار پر لکڑی رکھنے سے منع کرے۔ اگر کوئی رکاوٹ بنے تو حاکم اس پر زبردستی بھی کر سکتا ہے کیونکہ پڑوسی کو یہ حق شرعاً حاصل ہے۔

▲ راستوں سے متعلق اہم شرعی احکام یہ ہیں:

① صحيح البخاري، المظالم، باب لايمنع جار جاره أن يغرز خشبة في جداره، حديث: 2463، وصحيح مسلم، المساقاة، باب غرز الخشبه في جدار الجار، حديث: 1609. ② صحيح البخاري، المظالم، باب لا يمنع جار جاره أن يغرز خشبة في جداره، حديث: 2463، وصحيح مسلم، المساقاة، باب غرز الخشبة في جدار الجار، حديث: 1609.

① راستوں کے سلسلے میں مسلمانوں کو تنگ کرنا جائز نہیں بلکہ ضروری ہے کہ راستوں کو کھلا رکھا جائے اور تکلیف دہ چیز کو دور کیا جائے کیونکہ فرمان نبوی کے مطابق یہ عمل ایمان کا حصہ ہے۔

② کسی کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اپنی ملکیت کی جگہ میں ردو بدل کر کے راستے کو تنگ کرے، مثلاً: راستے کے اوپر چھت ڈال دے تاکہ سوار یا بوجھ اٹھانے والے وہاں سے گزر نہ سکیں یا راستے میں بیٹھنے کے لیے کوئی چبوترہ بنالے۔

③ اسی طرح راستے میں جانور باندھنا یا گزرگاہ میں گاڑی کھڑی کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے راستہ تنگ ہوتا ہے، نیز یہ چیز حادثات کا سبب بنتی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی عمارت کا کوئی حصہ مسلمانوں کی گزرگاہوں کی طرف باہر نکالے حتی کہ دیوار کو سیمنٹ کرنا بھی جائز نہیں مگر اس صورت میں جائز ہے کہ دیوار کو اپنی حدود میں اتنا اندر کی طرف بنایا جائے جتنی سیمنٹ کی تہہ کی موٹائی ہے۔''[1]

④ راستے میں کوئی پودا لگانا یا عمارت کھڑی کرنا، گڑھا کھودنا، ایندھن کا ڈھیر لگانا، جانور ذبح کرنا، کوڑا کرکٹ یا راکھ وغیرہ پھینکنا جو گزرنے والوں کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہو، ممنوع ہے۔

شہر کی بلدیہ کے ذمے داروں پر لازم ہے کہ لوگوں کو مذکورہ اشیاء راستوں میں پھینکنے سے روکیں جو باز نہ آئے اسے سخت سزا دیں کیونکہ اس کے بارے میں لوگ نہایت سستی اور کوتاہی کر جاتے ہیں۔ اپنے فوائد کے حصول کی خاطر راستے تنگ کرتے ہیں، گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں، عمارت کے لیے اینٹیں، لوہا، سیمنٹ وغیرہ راستوں میں ڈال دیتے ہیں۔ گڑھے کھودتے ہیں بلکہ بعض لوگ سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں تکلیف دہ اور بے کار اشیاء، نجاستیں اور کوڑا کرکٹ وغیرہ پھینک دیتے ہیں اور اس بات کی قطعاً پروا نہیں کرتے کہ اس سے مسلمانوں کو تکلیف ہوگی، حالانکہ یہ سراسر حرام اور ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾

''جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیں بغیر کسی جرم کے جو ان سے سرزد ہوا، وہ (بڑے ہی) بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔''[2]

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ»

① مجموع الفتاویٰ: 30/10. ② الأحزاب 58:33.

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''[1]

نیز فرمان نبوی ہے:

«اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُونَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيمَانِ»

''ایمان کے ستر سے کچھ زیادہ شعبے ہیں جن میں سب سے افضل و اعلیٰ ''لا الہ الا اللہ'' کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کا ایک حصہ (شعبہ) ہے۔''[2]

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی روایات ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کا احترام کرنے کی رغبت دلاتی ہیں اور انھیں تکلیف دینے سے روکتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ ان کے عام راستے بند یا تنگ کیے جائیں اور ان میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں کہ لوگوں کا گزرنا مشکل ہو جائے۔

شفعہ کے احکام

شُفعة شَفعٌ سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنیٰ ''جفت'' کے ہیں۔ چونکہ شفعہ کرنے والا مبیعہ کو جو کہ منفرد تھا، شفعہ کے ذریعے سے اپنی ملکیت میں ملاتا ہے، چنانچہ اسے شفعہ کہا جاتا ہے۔

شفعہ سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شفعے کے ذریعے سے فساد و نقصان کا وہ دروازہ بند کیا ہے جو شراکت سے تعلق رکھتا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بندوں کی مصلحتوں کے بارے میں اسلامی شریعت کی خوبیوں اور اس کے عدل و انصاف پر مبنی قوانین میں سے ایک چیز شفعہ بھی ہے۔ شارع علیہ السلام کے احکامات کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مکلفینِ شرع کا نقصان نہ ہو جبکہ شراکت عموماً نقصان ہی کا باعث بنتی ہے۔ شریعت نے اس نقصان کو کبھی تقسیم سے اور کبھی شفعے سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مشترک چیز میں سے اپنا حصہ فروخت کر کے قیمت لینا چاہتا ہے تو اجنبی شخص کی نسبت اس کا شریک (وہ حصہ خریدنے کا) زیادہ حقدار ہے۔

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، حديث : 10. [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان عدد شعب الإيمان......، حديث : 35.

اس طرح وہ اپنے شریک کو ضرر سے بچا سکتا ہے۔ اس میں بائع کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ اپنا حق قیمت کی صورت میں وصول کر رہا ہے۔ شفعہ عدل وانصاف کی عظیم اور بہترین شکل ہے۔ انسانی عقل وفطرت کے عین مطابق ہے اور بندوں کی مصلحتوں کے موافق ہے۔''[1]

شیخ موصوف کی عبارت سے واضح ہوا کہ حیلہ جوئی کر کے کسی کو حق شفعہ سے محروم کرنا شارع علیہ السلام کی مطلوب حکمتوں کی مخالفت ہے بلکہ ان کے اعلیٰ مقاصد کو نقصان پہنچانا ہے۔

▲ عربوں کے ہاں عہد جاہلیت میں شفعہ معروف ومشہور امر تھا۔ اگر کوئی شخص اپنا گھر یا باغ فروخت کرنا چاہتا تو اس کے پاس اس کا پڑوسی یا شریک آتا اور فروخت ہونے والے حصے کو اپنے حصے میں شامل کرنے کے لیے خریدار بنتا اور اس کی خریداری میں خود کو دوسروں سے زیادہ حقدار قرار دیتا۔ اس کا نام شفعہ تھا۔ شفعے کا مطالبہ کرنے والے کو (شفیع یا) شافع کہا جاتا ہے۔

▲ فقہائے اسلام کی اصطلاح میں شفعے کا مفہوم یہ ہے کہ ''ایک شخص نے مشترکہ چیز میں سے اپنا حصہ فروخت کر دیا تو دوسرے شریک کا یہ حق ہے کہ وہ چیز جس کے قبضے میں چلی گئی ہے اسے اتنی ہی قیمت ادا کر کے اس سے وہ چیز حاصل کر لے۔''

▲ اگر مشترک چیز کا ایک حصہ شریک کے علاوہ کسی اجنبی شخص نے خرید لیا تو اس خریدار پر لازم ہے کہ وہ حصہ شافع (شفعے کا مطالبہ کرنے والے) کو قیمت خرید پر فروخت کر دے کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضٰى بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَا لَمْ يُقْسَمْ، فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ»

''نبی ﷺ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہر اس چیز میں شفعے کا حق ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو۔ اگر حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ الگ ہو جائیں تو شفعے کا حق باقی نہیں رہتا۔''[2]

حدیث مذکورہ شریک کے حق میں شفعے کو ثابت کرتی ہے۔ شفعہ ان چیزوں میں ثابت ہوتا ہے جو تقسیم ہو سکیں، مثلاً: زمین، پلاٹ، باغ وغیرہ۔ اگر چیز تقسیم کے قابل نہیں جیسا کہ گھر کا سامان، حیوان وغیرہ تو ان میں شفعہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَبِيعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيكَهُ»

---

① إعلام الموقعين: 123/2. ② صحيح البخاري، الشفعة، باب الشفعة فيما لم يقسم......، حديث: 2257، ومسند أحمد: 296/3و399.

''کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے شریک کو اطلاع دیے بغیر (مشترک شے) فروخت کرے۔''[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسی بھی شخص کے لیے حرام ہے کہ وہ مشترک شے اپنے شریک کو اطلاع دیے بغیر فروخت کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو شفیع خریدنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اگر شفیع کو بوقت بیع اطلاع کر دی گئی لیکن اس نے کہا کہ مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں تو بعد از بیع وہ حق شفعہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ یہی حکمت شرعیہ کا تقاضا ہے جس کا کوئی معارض نہیں اور یہی بات درست ہے۔''[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے جو کچھ کہا ہے بعض علماء کی یہی رائے ہے، البتہ جمہور علماء کے نزدیک شفیع کا حق شفعہ بیع کی اجازت دینے سے ساقط نہیں ہوتا۔ واللہ أعلم.

◣ شفعہ شرعی حق ہے جس کا احترام واجب ہے اور اسے حیلہ سازی سے ساقط کرنا حرام ہے کیونکہ اس کا مقصد شریک کو ضرر و نقصان سے بچانا ہے جبکہ شفعے کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ سازی اس کے جائز حق پر تعدی اور ظلم ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسی مسلمان کا حق شفعہ وغیرہ ساقط کرنے کے لیے حیلہ سازی کرنا حرام ہے۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ»

''ان اعمال کا ارتکاب نہ کرو جن کا ارتکاب یہودیوں نے کیا، کہ تم مختلف حیلوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال قرار دینے لگو۔''[4]

◣ حق شفعہ کو ساقط کرنے کا ایک حیلہ یہ ہے کہ کوئی یہ ظاہر کرے کہ اس نے فلاں کو اپنا حصہ ہبہ کر دیا ہے جبکہ حقیقت میں اسے فروخت کیا ہو۔ اسی طرح اسقاط شفعہ کی ایک اور صورت یہ ہے کہ چیز کی قیمت بظاہر اس قدر بڑھا دی جائے کہ شریک کی قوت خرید سے باہر ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حق شفعہ کو ختم کرنے کے لیے حیلہ کرنا ناجائز ہے۔ الفاظ کی تبدیلی سے معاملے کی حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی۔''[5]

◣ شفعہ غیر منقسم زمین میں ہوتا ہے۔ اس زمین کے پودے، گھاس اور وہاں موجود عمارت وغیرہ اشیاء بھی شفعے میں شامل ہوں گی۔ اگر زمین کی تقسیم ہو گئی لیکن پڑوسیوں کے درمیان مرافق مشترک رہیں، مثلاً: راستہ، پانی وغیرہ تو صحیح قول کے مطابق حق شفعہ موجود رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث کا یہی مفہوم ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

---

① صحيح مسلم، المساقاة، باب الشفعة، حديث: 1608. ② إعلام الموقعين: 2/123. ③ إعلام الموقعين: 3/260. ④ تفسير ابن كثير، الأعراف: 7:163. ⑤ مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 30/386.

«فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ»

''جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ الگ ہو جائیں تو شفعے کا حق باقی نہیں رہتا۔''[1]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جب حدود واقع ہو جائیں لیکن راستے مختلف نہ ہوں تو شفعہ کا حق باقی ہے۔

امام احمد، ابن قیم اور تقی الدین رحمہم اللہ وغیرہ نے یہی رائے درست قرار دی ہے۔[2]

شیخ تقی الدین فرماتے ہیں: پڑوس کا شفعہ حقوق میں شراکت کی بنا پر ثابت ہو جاتا ہے، جیسے پانی یا راستہ وغیرہ ایک ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے اور ابن عقیل اور ابو محمد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام حارثی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مختلف احادیث جمع کرنے سے یہی خلاصہ نکلتا ہے، نیز صرف پڑوس کی وجہ سے شفعہ نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ جب راستہ وغیرہ مشترک ہو کیونکہ شفعہ تو ضرر رفع کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ضرر اکثر کسی ملکیتی چیز میں اشتراک کی بنا پر یا راستے وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

▲ اگر شفیع کو بیع کا علم ہو تو فوراً شفعے کا مطالبہ کرنے سے اس کا حق ثابت اور قائم رہے گا، اور اگر وہ شفعے کا مطالبہ نہیں کرتا تو اس کا حق شفعہ ساقط ہو جائے گا۔ اگر اسے بیع کا علم نہ ہو تو اس کا حق شفعہ قائم رہے گا اگرچہ کئی برس گزر جائیں۔

ابن ہبیرہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ''علماء کا اتفاق ہے کہ صاحب حق اگر غائب ہے تو وہ جب بھی آئے گا اسے شفعے کے مطالبے کا حق حاصل ہوگا۔''

شریکوں کے شفعے کا حق ان کے حصوں کے مطابق ہوگا۔ اگر ایک شریک شفعے کے مطالبے سے دست بردار ہو جائے تو دوسرا شریک وہ پوری جائیداد خریدے یا پوری چھوڑ دے کیونکہ کچھ حصہ لینے میں مشتری کا نقصان ہے۔ اور ایک شخص کے نقصان کے ازالے کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانا درست نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، الشفعة، باب الشفعة فيما لم يقسم ......، حديث: 2257. [2] إعلام الموقعين: 2/132.

باب 8

شراکت کے احکام ومسائل

شراکت اوراس کی اقسام

شراکت کے مسائل سے واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ تجارت میں لوگوں کو اکثر طور پر ان سے واسطہ پڑتا ہے۔شراکت مالی فوائد حاصل کرنے اور اسے بڑھانے میں باہمی تعاون کا نام ہے۔اس طرح ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

تجارت وغیرہ میں شراکت کے جواز کے دلائل کتاب وسنت میں موجود ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾

''اور بلاشبہ اکثر حصے دار (شریک ایسے ہوتے ہیں کہ) ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔''[1]

درج بالا آیت کریمہ شراکت کے جواز پر دلالت کرتی ہے، نیز شریک کو دوسرے شریک پر ظلم کرنے سے روکتی ہے۔

شراکت کے جواز پر سنت رسول اللہ ﷺ میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ نے فرمایا:

«يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مَالَمْ يَخُنْ أَحُدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَإِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا»

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں دو حصے داروں میں تیسرا ہوں جب تک ان میں ایک شخص دوسرے کی خیانت نہیں کرتا۔اگر ایک شخص خیانت کرے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں''[2]

اس حدیث میں جہاں شراکت کے جواز کا بیان ہے، وہاں ایک دوسرے کی خیانت نہ کرنے کی بھی تاکید ہے۔شراکت میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون مقصود ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کے ساتھ تعاون کرتا رہتا ہے۔''[3]

- کاروباری اشتراک میں حلال اور پاک مال شامل ہونا چاہیے۔حرام یا حرام کی آمیزش سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔
- اگر شراکت میں خرید وفروخت کی نگرانی واشراف مسلمان کے ہاتھ میں ہے تو شراکت میں کافر کے حصے دار

---

[1] صٓ 24:38. [2] [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في الشركة، حديث: 3383، وسنن الدارقطني: 31/3، حديث: 2910، والسنن الكبرى للبيهقي: 78/6 واللفظ لهما. [3] صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، حديث: 2699.

ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں سودی کاروبار یا حرام مال کے شامل ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔

شراکت کی دو قسمیں ہیں: ① شراکت املاک ② شراکت عقود۔

شراکت املاک، یعنی استحقاق میں اشتراک، مثلاً: زمین یا فیکٹری یا گاڑیوں وغیرہ کی ملکیت میں اشتراک کا ہونا۔

شراکت عقود، یعنی تصرف میں اشتراک، مثلاً: شے کی خرید وفروخت یا اسے کرائے پر دینے میں ہر ایک کو اختیار حاصل ہو۔ اور یہ اشتراک یا تو مال اور محنت دونوں کو شامل ہو یا صرف محنت میں اشتراک ہو مال میں نہ ہو، اس کی پانچ قسمیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

① دونوں حصہ داروں کا مال اور محنت کرنے میں اشتراک۔ اسے ''شرکت عنان'' کہتے ہیں۔

② ایک کا مال مہیا کرنا اور دوسرے کا محنت کرنا۔ اسے ''مضاربت'' کہا جاتا ہے۔

③ بغیر مال کے ذمے داری اٹھانے میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اس کا نام ''شرکت وجوہ'' ہے۔

④ بدنی محنت میں دونوں کا اشتراک ہو۔ یہ قسم ''شرکت ابدان'' کے نام سے مشہور ہے۔

⑤ مذکورہ تمام چیزوں میں شریک ہونا، یعنی جس میں ہر حصے دار دوسرے کو مالی اور بدنی اشتراک کے جملہ اختیارات تفویض کر دیتا ہے اور ہر شریک خرید وفروخت کے اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ قسم شرکت عنان، وجوہ اور ابدان کے علاوہ مضاربت کو بھی شامل ہے۔ اس قسم کا نام ''شرکت مُفاوضہ'' ہے۔

یہ مذکورہ بیان شراکت کی انواع کا مجمل خاکہ تھا۔ ان کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اب ہم آپ کو ہر ایک کی تفصیل سے آگاہ کریں گے۔

شراکت عنان

دو یا زیادہ شریکوں کا مال اور تصرف میں برابر ہونے کو ''شراکت عنان'' کہتے ہیں۔ شراکت عنان میں دونوں شریک اپنا مال اور محنت برابر پیش کرتے ہیں۔

دو شخص (یا زیادہ) اپنا اپنا مال ایک مال کی طرح یکجا کر لیں اور معاہدہ کریں کہ سب مل کر کاروبار کریں گے یا ایک کاروبار کرے گا تو اسے دوسرے کی نسبت زیادہ نفع ملے گا۔

مذکورہ اعتبار سے ''شراکت عنان'' بالاجماع جائز ہے جیسا کہ ابن منذر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے، البتہ اس قسم کی

شراکت کی بعض شرائط میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

▲ فریقین میں سے ہر ایک اس اجتماعی مال میں اصالتاً اور وکالتاً تصرف کر سکتا ہے۔ کسی کو دوسرے سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

▲ علماء کا اتفاق ہے کہ شراکت کے کاروبار میں ہر ایک کا اصل مال سونے چاندی کے سکوں (کرنسی) کی شکل میں ہو کیونکہ نبی ﷺ سے لے کر اب تک لوگ بلا اعتراض اس کے ساتھ ہی شراکت کا کاروبار کرتے آ رہے ہیں اور کسی عالم نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

▲ شراکت عنان میں اصل مال سامان کی شکل میں ہو تو اس میں شراکت کے جواز یا عدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ عدم جواز کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ ایک کے سامان کی قیمت میں کمی بیشی کا امکان ہے، لہٰذا ہر حصے دار میں نفع برابر تقسیم نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک شخص کے مال میں اضافہ ہوا اور دوسرا اس منافع میں بلا وجہ شریک ہو گیا، نیز حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ اور باطل ذریعے سے مال کھانے کا امکان بھی ہے۔

جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ شراکت کا مقصد تمام حصے داروں کا پورے مال میں تصرف ہے اور پورے نفع کو آپس میں تقسیم کرنا ہے اور وہ نقدی کی طرح مال سامان سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور یہی قول صحیح ہے۔

▲ شراکت عنان کے جواز کے لیے یہ شرط ہے کہ حصے داروں میں منافع کی تقسیم ان کے حصص کے مطابق ہو، مثلاً: تہائی یا چوتھائی حصہ وغیرہ کیونکہ نفع ان کے درمیان مشترک ہے۔ ہر ایک کا حصہ طے شدہ شرط کے مطابق ہی ممتاز ہو سکے گا۔ اگر نفع میں سے ہر ایک کا حصہ مجہول ہو یا کسی کے لیے کسی مخصوص مال کا نفع لینے کی شرط لگائی گئی ہو یا کسی محدود وقت یا مخصوص سفر کے نفع کی شرط مقرر کی گئی ہو تو ان تمام صورتوں میں شراکت عنان جائز نہیں ہے کیونکہ کسی مخصوص حصے میں کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح کبھی متعین نفع سے زائد حاصل ہوتا ہے۔

الغرض یہ صورت نزاع و اختلاف کا باعث ہے۔ اسی طرح ایک فریق کی محنت ضائع ہونے کا اندیشہ بھی ہے، لہٰذا شریعت اسلامی ہمیں اس سے منع کرتی ہے اور وہ دھوکے اور نقصان سے لوگوں کو بچانے کے لیے ہی نازل ہوئی ہے۔

مضاربت کا بیان

''مضاربت'' ضرب سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی زمین میں (تجارت کی خاطر) سفر کرنے کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾

''اور بعض دوسرے زمین میں چل پھر کر اللہ کا فضل (روزی بھی) تلاش کریں گے۔''[1]

مضاربت کے شرعی معنی ہیں: ''ایک شخص مال فراہم کرے اور دوسرا اس میں کاروبار کرے جبکہ منافع طے شدہ حصوں کے مطابق دونوں میں تقسیم ہو۔'' واضح رہے کہ مضاربت کی صحت کی شرط یہ ہے کہ کام کرنے والے کا نفع میں حصہ مقرر ہو کیونکہ وہ شرط کی وجہ سے اس کو وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔

▲ کاروبار کی یہ صورت بالا جماع جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مضاربت ہوتی تھی اور آپ ﷺ نے اسے قائم رکھا۔ سیدنا عمر، عثمان، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے اس کے بارے میں روایات وارد ہوئی ہیں، نیز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔

(قیاس اور) حکمت بیع مضاربت کے جواز کی متقاضی ہے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، نیز درہم و دینار تجارت اور کاروبار کرنے ہی سے تو بڑھتے ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مضاربت میں کاروبار کرنے والا شخص امانت دار، مزدور، وکیل اور حصے دار ہوتا ہے۔ اس اجمال کی وضاحت یوں ہے کہ جب وہ مال قبضے میں لیتا ہے تو وہ امین ہے۔ جب وہ مال میں تصرف کرتا ہے تو وکیل ہے۔ اور بعض اعمال خود انجام دینے کی وجہ سے مزدور ہے، جبکہ نفع حاصل ہونے کی صورت میں مال مہیا کرنے والے کا حصے دار اور شریک ہے۔ مضاربت کے صحیح ہونے کی یہ شرط ہے کہ عامل (محنت کرنے والے) کا حصہ مقرر ہو کیونکہ وہ اس حصے کا شرط کے ساتھ ہی مستحق ہوگا۔''[2]

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''علمائے کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کاروبار کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مالکِ مال سے تہائی یا چوتھائی نفع لینے کی شرط طے کر لے یا دونوں کی رضا سے نفع کی تقسیم میں جو معاہدہ بھی ہو جائے درست ہے۔ اگر صاحب مال نے کاروبار کرنے والے کے لیے سارا نفع مقرر کر دیا یا نفع دینے کی رقم متعین کر دی (مثلاً ہزار روپے) یا مجہول حصہ طے رکھا تو یہ معاہدہ فاسد ہوگا۔''[3]

▲ کاروبار کرنے والے شخص کے نفع کی تعیین دونوں کی رضامندی سے ہوگی۔ اگر صاحب مال نے محنت کرنے والے سے کہا کہ تم تجارت کرو، نفع ہم دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا تو ہر ایک کو نفع کا نصف نصف حصہ ملے گا کیونکہ اس کے جملے کا یہی واضح مطلب ہے، جیسے ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے: یہ گھر میرے اور تمھارے درمیان مشترک ہے تو دونوں کا نصف نصف استحقاق ہوگا۔

[1] المزمل 20:73. [2] زاد المعاد: 161/1. [3] المغني والشرح الكبير: 140/5.

اگر صاحبِ مال نے کاروبار کرنے والے سے کہا: تم تجارت کرو اور نفع میں میرا حصہ تین چوتھائی یا تہائی ہوگا یا تجھے تین چوتھائی یا تہائی ملے گا تو یہ بھی درست ہے۔ جب ایک فریق کا حصہ طے ہوگیا تو وہ لے لے گا اور باقی حصہ دوسرے فریق کا ہوگا کیونکہ نفع میں دونوں کا استحقاق ہے۔ اور الفاظ کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب ایک فریق اپنا مقرر حصہ وصول کرلے تو باقی دوسرے فریق کا ہوگا (صاحب مال کی بات کا یہی مفہوم ہے۔)

اگر ان میں اختلاف ہو جائے کہ طے شدہ حصہ (مثلاً: ایک تہائی) کس کے لیے طے ہوا تھا تو وہ کارکن کے لیے سمجھا جائے گا، خواہ کم ہو یا زیادہ کیونکہ کارکن اپنے کام کی وجہ سے اس حصے کا حقدار قرار پایا ہے اور وہ کم یا زیادہ مقرر ہوسکتا ہے۔ بعض اوقات کام آسان ہوتا ہے تو عامل کا حصہ کم مقرر کر دیا جاتا ہے، بعض اوقات کام مشکل ہوتا ہے تو عامل کا حصہ زیادہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی کام کرنے والے دو کارکنوں کا حصہ ایک دوسرے سے مختلف متعین ہوسکتا ہے کیونکہ ایک آدمی کام میں ماہر ہوتا ہے، ایک نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ عامل کا حصہ شرط کی بنیاد پر طے ہوتا ہے جبکہ صاحب مال اپنے مال کی وجہ سے نفع کا مستحق ہے، شرط کی وجہ سے نہیں۔

اگر مضاربت فاسد ہو جائے تو مال کا نفع مال کے مالک کو ملے گا کیونکہ نفع اسی کے مال سے حاصل ہوا ہے۔ کام کرنے والے کے لیے مزدوری کی وہ اجرت ہے جو اس جیسے کام کرنے والے عام شخص کو ملتی ہے کیونکہ اس کا استحقاق شرط کے ساتھ تھا جو مضاربت میں فساد کی وجہ سے فاسد ہوگئی۔

ایک محدود وقت کے لیے بھی مضاربت ہوسکتی ہے، مثلاً: مالکِ مال کہے: میں تجھے یہ درہم ایک سال تک مضاربت کے لیے دیتا ہوں۔ اسی طرح مضاربت کسی جائز شرط سے معلق بھی ہوسکتی ہے، مثلاً: صاحبِ مال کہے: جب فلاں مہینہ آئے تو اس مال سے مضاربت کیجیے یا وہ کہے: جب تم زید سے میرا مال وصول کرلو تو وہ مضاربت کے لیے تمھارے پاس ہی رہے گا۔ اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ مضاربت مال میں تصرف کرنے کی اجازت کا نام ہے، لہٰذا اسے ایسی شرط سے معلق کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔

مضاربت میں کاروبار کرنے والے کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کا بھی مال لے کر مضاربت شروع کرے الا یہ کہ مضارب اول اس کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دوسرے مضارب کا مال زیادہ ہوا جو اسے سارا وقت مشغول رکھے گا تو پہلے کی تجارت متاثر ہوگی۔ اگر پہلے مضارب کا مال زیادہ ہے جو اسے ہر وقت مصروف رکھتا ہے تو بھی دوسرے مضارب کا کاروبار کرنے سے پہلے شخص کے کاروبار میں تعطل پیدا ہوگا اور یہ غلط ہے، البتہ اگر مضارب اول اجازت دے دے یا اس سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو عامل کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی مضاربت کرسکتا ہے۔

اگر عامل نے پہلے مضارب کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص سے مضاربت کر لی جس سے پہلے کا نقصان ہے تو دوسرے مضاربت والے کے نفع میں سے اس کا حصہ دیا جائے گا، پھر عامل کا حصہ پہلے مضاربت والے کے نفع میں ملا کر یہ مجموعی رقم ان دونوں (عامل اور پہلے مضاربت والے) میں طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم ہوگی کیونکہ دوسرے مضارب سے حاصل ہونے والے عامل کے نفع میں پہلے مضارب کا حق شامل ہے۔

- عامل (کاروبار کرنے والا) مضاربت کے مال میں سے اپنے سفر اور خوراک کا الگ خرچہ نہ کرے، البتہ اگر مالک کے ساتھ شرط طے ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ نفع کا ایک مخصوص حصہ معاہدے کے مطابق وصول کر رہا ہے، لہٰذا اسے بلا شرط زیادہ لینے کا حق نہیں الّا یہ کہ ایسا کرنا وہاں کے باسیوں میں معروف و معمول ہو۔
- جب تک عقد مضاربت قائم رہے، منافع تقسیم نہ کیا جائے الّا یہ کہ دونوں تقسیم پر رضامند ہوں کیونکہ نفع کی وجہ ہی سے رأس المال محفوظ رہتا ہے اور کسی تجارتی معاملے میں نقصان بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ اگر کسی سودے میں نقصان ہو گیا تو وہ کمی حاصل نفع سے پوری کر لی جائے گی۔ اگر عقد مضاربت کے دوران نفع تقسیم کر لیا جائے تو نقصان پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ چونکہ نفع سے اصل سرمائے کو کمی سے بچایا جاتا ہے، لہٰذا عامل تب ہی معاوضے کا مستحق ہوگا جب اصل سرمایہ پورا رہے گا۔
- عامل ایک امانت کا نگہبان ہے اسے اپنی ذمے داری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ مال کے نقصان یا تلف ہونے کی صورت میں اس کی بات معتبر ہوگی۔ اگر اختلاف ہو جائے کہ عامل نے فلاں شے ذاتی طور پر خریدی ہے یا مضاربت میں خریدی ہے تو عامل کے بیان کو سچ سمجھا جائے گا کیونکہ اسے امین، یعنی قابل اعتماد سمجھا گیا تھا۔

شراکتِ وجوہ، ابدان اور مفاوضہ کا بیان

شراکت وجوہ: دو یا زیادہ اشخاص ایک چیز مشترکہ ذمہ داری پر خریدتے ہیں، پھر جب اسے فروخت کرتے ہیں تو اس میں جو نفع حاصل ہو اسے طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم کر لیتے ہیں (اس طرح نقصان سے بھی دونوں متاثر ہو سکتے ہیں)۔ اس عقد کو ''شراکت وجوہ'' اس لیے کہتے ہیں کہ اس کاروبار میں دونوں کا اصل سرمایہ نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کی ذمہ داری، مارکیٹ میں اثر و رسوخ اور لوگوں کا اس پر اعتماد وغیرہ کام آتا ہے۔ دونوں شخص انھی اوصاف کی بنیاد پر سامان خریدتے اور فروخت کرتے ہیں۔ اور جو نفع حاصل ہو حسب شرائط تقسیم کر لیتے ہیں (یہ عقد درست ہے۔)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ» ''مسلمان طے شدہ شرائط کی پاسداری کریں۔''[1]

شراکت کی یہ قسم ''شراکت عنان'' سے مشابہت رکھتی ہے اسی لیے اس کا حکم بھی وہی ہے۔

▲ شراکت کی اس قسم میں ہر حصے دار اپنے ساتھی کا وکیل اور قیمت میں کفیل ہوتا ہے، لہٰذا اس شراکت کا تعلق وکالت اور کفالت سے بھی ہے۔

▲ دونوں کے درمیان نفع کی تقسیم حسب شرط اور شے کی ملکیت کے حساب سے ہوگی، مثلاً: نصف یا کمی وبیشی کے ساتھ۔ اسی طرح ہر ایک شراکت میں شے کی ملکیت کے حساب ہی سے خسارہ برداشت کرے گا، یعنی شراکت کی شے میں کوئی نصف کا مالک ہے تو وہ نصف خسارہ برداشت کرے گا۔ خلاصہ یہ کہ ہر شریک کو اس کا نفع حسب شرائط ملے گا، مثلاً: نصف، چوتھائی یا تہائی حصہ کیونکہ کوئی دوسرے کی نسبت مارکیٹ میں زیادہ بااعتماد ہوتا ہے یا تجارت کا زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی کی زیادہ محنت یا زیادہ کردار ہوتا ہے، لہٰذا وہ زیادہ نفع لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس میں باہم طے شدہ شرائط کی پاسداری کی جائے گی۔

▲ شراکت وجوہ میں ہر شریک کی صلاحیت و قابلیت کا لحاظ ضرور کیا جائے گا جیسا کہ ''شراکت عنان'' میں ہوتا ہے۔

<u>شراکت ابدان:</u> اس میں دو یا زیادہ اشخاص باہمی سمجھوتہ کرتے ہیں کہ وہ بدن کے ذریعے سے کام کریں گے اور جو بھی حاصل کریں گے اس آمدن میں سب برابر کے حصے دار ہوں گے یا جس نسبت سے طے کرلیں۔ اس کے جواز کی دلیل درج ذیل حدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں:

''میں، سعد اور عمار رضی اللہ عنہم نے بدر کے دن سمجھوتہ کیا کہ آج جو ہمیں مال غنیمت حاصل ہوگا، اس میں ہم سب برابر کے حصے دار ہوں گے، چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ دو قیدی لے آئے جب کہ میں (عبداللہ) اور عمار رضی اللہ عنہ کوئی چیز نہ لائے۔''[2]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی (عبداللہ بن مسعود، سعد اور عمار رضی اللہ عنہم) مشارکت کو بحال رکھا۔''[3]

▲ شرکاء کے اتفاق اور معاہدہ کرلینے کے بعد اگر ان میں سے کسی ایک نے کسی کام کو کرنے کی ذمہ داری اٹھالی تو باقی شرکاء کو چاہیے کہ وہ بھی اس کام کو انجام دیں کیونکہ اس معاہدے کا یہی تقاضا ہے۔

---

[1] جامع الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول اللهﷺ في الصلح بين الناس، حديث: 1352. [2] [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في الشركة على غير رأس مالٍ، حديث: 3388، وسنن النسائي، البيوع، باب الشركة بغير مال، حديث: 4701. [3] المغني والشرح الكبير: 111/5.

- اگر شرکاء کے ہنر اور کام مختلف ہوں تو بھی شراکت ابدان جائز ہے، مثلاً: ایک کپڑے کی سلائی کرتا ہے اور دوسرا لوہے کا کام کرتا ہے، نیز آجر سے اپنے کام کی اجرت طلب کرنے اور لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے۔ اسی طرح آجر کام کی اجرت کسی بھی ایک شخص کو دے سکتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کا وکیل ہے، چنانچہ حاصل شدہ اجرت تمام شرکاء میں برابر برابر تقسیم ہوگی۔
- مباح چیزوں میں شرکت ابدان (کئی آدمیوں کی شرکت) درست ہے، مثلاً: لکڑیاں جمع کرنا، پہاڑوں سے پھل چننا، کان (معدن) سے کچھ نکالنا۔
- اگر کوئی ایک شریک بیمار ہو گیا تو دوسرے کو جو محنت و مزدوری ملے گی وہ دونوں میں تقسیم ہوگی جیسا کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے دو قیدیوں میں اس کے دوسرے دو ساتھی حصے دار ہوئے تھے۔[1]

اگر تندرست نے مریض (شریک) سے اپنا نائب مقرر کرنے کا مطالبہ کیا تو اسے پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ دونوں شراکت کے دائرہ میں کام کرنے کے معاہدے کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ اگر مریض وہ کام کرنے سے معذور ہو اور اپنا نائب بھی مقرر نہیں کرتا تو اس کے دوسرے شریک کو معاہدہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

- اگر دو یا زیادہ اشخاص (جن کے پاس اپنا اپنا جانور یا گاڑی ہے) معاہدہ کرلیں کہ ہم اپنے اپنے جانور یا گاڑی پر بوجھ کو یا لوگوں کو کرایہ لے کے سوار کریں گے اور ہر ایک جو کچھ آمدن حاصل کرے گا وہ سب میں برابر تقسیم ہوگی تو یہ شراکت بھی درست ہے کیونکہ یہ بھی کمائی کی ایک نوعیت ہے۔ اس طرح کسی کو جانور یا گاڑی دینا تاکہ وہ اس سے کام لے کر مال کمائے، پھر وہ آمدن کو باہم تقسیم کرلیں تو جائز ہے۔

اگر تین افراد مل جاتے ہیں، ایک کا گھوڑا ہے، دوسرے کا تانگہ اور تیسرا کوچوان بن کر محنت کرتا ہے تو حاصل شدہ آمدن تینوں برابر تقسیم کرلیں تو درست اور جائز ہے۔

- اگر دو یا زیادہ اشخاص دلالی میں شراکت کرلیں، مثلاً: سامان بیچنے کے لیے دونوں آواز لگائیں یا گاہک تلاش کریں تو بھی جائز ہے اور حاصل ہونے والا مال دونوں میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔

شراکت مفاوضہ: اس میں ہر حصے دار دوسرے کو مالی اور بدنی اشتراک کے جملہ اختیارات تفویض کرتا ہے۔ یہ شراکت عنان، مضاربت، وجوہ اور ابدان سب شراکتوں کو محیط ہے، یعنی سب شرکاء تمام حقوق اور فرائض میں برابر شریک ہوں گے۔

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في الشركة على غير رأس مالٍ، حديث: 3388.

- شراکت کی یہ نوع جائز ہے کیونکہ یہ شراکت کی تمام ان انواع پر مشتمل ہے جو فرداً فرداً جائز ہیں، لہٰذا اگر ایک قسم دوسری کے ساتھ جمع ہو جائے تو بھی جائز ہے، ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔
- منافع کی شرح کا جو وہ باہم طے کر لیں گے، اسی کے مطابق نفاذ ہوگا، البتہ خسارہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے سرمائے کی نسبت سے برداشت کریں گے۔

شریعت اسلامیہ نے مباح کی حدود میں رہ کر کسب و کمائی کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور مباح قرار دیا ہے کہ انسان انفرادی طور پر کمائی کرے یا دوسرے کا شریک بن جائے، البتہ لوگ طے شدہ شرائط کی پاسداری کرتے ہوئے عمل کریں الا یہ کہ کوئی ناجائز اور حرام شرط شامل ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت ہر زمانے کے لیے قابل عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی شریعت پر چلائے اور اس پر قائم رکھے، اتباع اور عمل صالح کی توفیق دے۔ بے شک وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

باب 9

مزارعت، مساقات اور اجارہ وغیرہ کے احکام

مزارعت اور مساقات کے احکام

مساقات اور مزارعت ان کاموں میں سے ہے جو لوگوں میں زمانہ قدیم سے جاری وساری ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کچھ درختوں کا مالک ہوتا ہے لیکن ان کا پھل لینے کے لیے ان کی مناسب دیکھ بھال اور محنت نہیں کرسکتا یا کسی کے پاس زرعی زمین ہوتی ہے لیکن اس سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے کما حقہ محنت اور رکھوالی نہیں کرسکتا جبکہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں نہ درخت ہوتے ہیں اور نہ زمین کا کوئی ٹکڑا، البتہ اگر اسے درخت یا زمین مہیا ہو جائے تو اس پر محنت کر کے ان کا پھل یا زمین سے پیداوار حاصل کرسکتا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر شریعت نے فریقین کو مزارعت اور مساقات کی اجازت دے دی کیونکہ اس میں دونوں کی مصلحت اور فائدہ ہے، نیز نقصان سے بچاؤ ہے۔ درحقیقت شریعت کے ہر حکم کی بنیاد عدل وانصاف اور مصلحت کے حصول اور نقصان سے بچاؤ پر ہے۔

▲ فقہاء نے مساقات کی یوں تعریف کی ہے: ”کسی کام کرنے والے کو پھلدار درختوں کا قبضہ دینا اور اسے کہنا کہ ان کی دیکھ بھال کر، پانی لگا حتی کہ یہ پھل دینے لگیں تو اس کی آمدنی میں سے اتنا حصہ تیرا اور باقی مالک کا ہوگا۔“

▲ ایک شخص اپنی زمین دوسرے کو دیتا ہے کہ وہ اس میں کاشت کرے یا زمین اور بیج دونوں کاشت کرنے والے کو دے تاکہ وہ اس زمین میں بیج ڈالے اور اس کی نگرانی کرے تو آمدن میں سے ایک (غیر مخصوص) حصے کا وہ مستحق ہوگا باقی آمدن مالک کی ہوگی۔ یہ ”مزارعت“ کے نام سے معروف ہے۔

مساقات ومزارعت میں یہ بھی درست ہے کہ پیداوار میں مالک کا حصہ مشروط کرلیا جائے، اس صورت میں باقی پیداوار عامل کو ملتی ہے۔

▲ مساقات ومزارعت کے جواز کی دلیل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَامَلَ أَهْلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ»

”بے شک رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے طے کیا تھا کہ جو پھل اور غلہ ان کی زمینوں اور باغات سے حاصل ہوگا، نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔“[1]

[1] صحيح البخاري، الحرث والمزارعة، باب المزارعة بالشطر ونحوه، حديث: 2328، وصحيح مسلم، المساقاة، باب المساقاة والمعاملة ......، حديث: 1551 واللفظ له.

صحیح مسلم میں ہے:

«أَنَّهُ دَفَعَ إِلٰى يَهُودِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا عَلٰى أَنْ يَّعْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَلِرَسُولِ اللهِ ﷺ شَطْرُ ثَمَرِهَا»

''نبی ﷺ نے خیبر کی کھجوروں کے درخت اور زمین یہودیوں کے حوالے کر کے نصف حصہ بٹائی پر معاملہ طے کر لیا۔''[1] اس مضمون کی ایک روایت امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اپنی مسند میں بیان کی ہے۔[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''خیبر کا قصہ مساقات اور مزارعت کے جواز پر دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک یہ معاہدہ قائم رہا، منسوخ نہیں ہوا، پھر آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کا اس پر تعامل رہا۔ اس معاہدے کی بنیاد اجرت پر نہ تھی بلکہ اس کا تعلق مشارکت سے تھا اور مضاربت کے مثل معاملہ تھا۔''[3]

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسی پر خلفائے راشدین نے اپنی اپنی خلافت میں عمل کیا اور کسی سے اس کا انکار بھی ثابت نہیں''[4] تو یہ اجماع ہے۔

نیز امام موصوف فرماتے ہیں: ''جو بات حدیث اور اجماع کے مخالف ہو اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ کھجور یا دیگر درختوں کے اکثر مالکان ان کو پانی دینے سے قاصر ہوتے ہیں اور نہ کسی کو اجرت پر رکھ سکتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان کے پاس درخت نہیں لیکن وہ پھلوں کے ضرورت مند ہوتے ہیں تو اس مزارعت کی مشروعیت میں دونوں کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور دونوں فریقوں کو فائدہ ہو جاتا ہے۔''[5]

* فقہائے کرام نے مساقات کی درستی کے لیے لازم قرار دیا ہے کہ وہ درخت پھل دار ہوں، نیز ان کا پھل کھانے کے قابل ہو، لہٰذا جو درخت پھلدار نہ ہو یا اس کا پھل کھایا نہ جاتا ہو، اس میں عقد مساقات درست نہیں کیونکہ اس پر کوئی شرعی نص نہیں۔

* مالک یا عامل کو پھل کا جو حصہ دیا جائے وہ طے شدہ اور معلوم ہو اگرچہ وہ کم ہو یا زیادہ، مثلاً: تہائی یا چوتھائی وغیرہ اگر دونوں نے یہ شرط عائد کی کہ سارا پھل صرف ایک فریق کو ملے گا دوسرے کو نہیں تو یہ معاہدہ ناجائز ہے کیونکہ اس میں ایک فریق کو غلّہ کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔ اگر عامل یا مالک کو مخصوص صاع (مثلاً: دس یا بیس صاع) دینے کا معاہدہ ہو تو بھی جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ سارا پھل اتنی ہی مقدار میں ہو۔ اسی طرح اگر مساقات میں عامل کے لیے متعین دراہم مقرر کیے گئے تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے غلے کی مقدار مقررہ دراہم کے

[1] صحيح مسلم، المساقاة، باب المساقاة والمعاملة ......، حديث :1551. [2] مسند أحمد:250/1. [3] زاد المعاد: 345/3. [4] المغني والشرح الكبير:554/5. [5] المغني والشرح الكبير:555/5.

مساوی نہ ہو۔ اسی طرح کسی فریق کے لیے ایک یا زیادہ مخصوص درختوں کا پھل ملنے کی شرط لگائی گئی تو مساقات درست نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے ان درختوں پر پھل ہی نہ لگے یا صرف انھی پر پھل لگے اور کوئی ایک فریق آمدن سے محروم ہو جائے، نیز اس میں دھوکے اور نقصان کا پہلو بھی ہے۔

- اور صحیح بات جس پر جمہور علماء قائم ہیں، یہ ہے کہ مساقات ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس پر عمل کرنا لازمی ہے اور اس کا فسخ دوسرے فریق کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں۔
- مدت معاہدے کی تعیین ضروری ہے اگرچہ وہ مدت لمبی ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ درخت اتنا عرصہ باقی رہیں۔
- عامل کے ذمے وہ سب کام ہیں جو عرفاً کھجوروں اور دیگر درختوں کی درستی و آبادی اور پھلوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہیں، مثلاً: زمین کی اصلاح اور اسے پانی دینا اسی طرح پھلوں کو خشک کرنا، پانی کی نالیوں کو صاف کرنا اور انھیں درست رکھنا اور پانی درختوں تک پہنچانا وغیرہ۔
- مالک پر لازم ہے کہ وہ اصل مال (درختوں) کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری چیزوں کا بندوبست کرے، مثلاً: کنواں بنوانا، باغ کی چار دیواری کروانا اور درختوں کو مضبوط اور بہتر کرنے کے لیے کھاد وغیرہ مہیا کرنا۔

مزارعت کی درستی کے لیے یہ شرط نہیں کہ مالک عامل کو بیج بھی مہیا کرے۔ اگر مالک نے صرف زمین عامل کے حوالے کر دی تاکہ وہ خود بیج ڈالے تو عقد مزارعت درست ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کی رائے تھی، نیز آج تک لوگوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ مزارعت کے جواز میں قصۂ خیبر کی جو دلیل پیش کی جاتی ہے اس میں قطعاً یہ ذکر نہیں کہ بیج مہیا کرنا مسلمانوں کے ذمے تھا۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جن لوگوں نے مزارعت میں بیج مہیا کرنے کی ذمے داری مالک پر شرط قرار دی ہے انھوں نے اسے مضاربت پر قیاس کیا ہے، حالانکہ یہ قیاس سنت صحیحہ اور اقوال صحابہ کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس فاسد ہے کیونکہ مضاربت میں مال مالک کو واپس مل جاتا ہے اور نفع دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مزارعت میں زمین مالک کو واپس مل جاتی ہے لیکن بیج اسے اسی حالت میں واپس نہیں ملتا بلکہ وہ زمین کے نفع (پیداوار) کی صورت میں دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، لہٰذا بیج کو نفع میں شامل کرنا زمین کے ساتھ شامل کرنے کی نسبت زیادہ درست ہے۔ (الغرض مزارعت کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے)۔''[1]

- مزارعت کو مخابرہ اور مواکرہ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ عامل کو مزارع، مخابر اور مواکر کا نام دیا جاتا ہے۔
- مزارعت کے جواز کی نقلی اور عقلی دلیل اس باب کے شروع میں بیان ہو چکی ہے۔

[1] إعلام الموقعين: 9/2.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مزارعت اجارے (اجرت) سے زیادہ اصلیت رکھتا ہے کیونکہ نفع یا نقصان کی تقسیم میں دونوں مشترک ہیں۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''انسان مزارعت میں ظلم ونقصان سے اجارے کی نسبت زیادہ دور رہتا ہے کیونکہ اجارے میں ایک کو فائدہ یقینی ہے جبکہ مزارعت میں اگر پیداوار ہوئی تو اس میں دونوں شریک ہوں گے وگرنہ دونوں محروم ہوں گے۔''[1]

◄ مزارعت کی درستی کے لیے شرط ہے کہ عامل یا مالک کے لیے غلے کی مقدار متعین بطریق مشاع ہو، مثلاً: زمین کی پیداوار کا تہائی یا چوتھائی حصہ کیونکہ نبی ﷺ نے خیبر والوں سے نصف پیداوار کا معاہدہ کیا تھا۔[2] اگر ایک فریق کا حصہ معلوم ہو جائے تو باقی مال دوسرے فریق کا حصہ ہوگا کیونکہ غلہ دونوں کا ہے۔

اگر ایک فریق کے حصے کی تعیین یوں ہوئی کہ اسے مقررہ دس صاع یا زمین کے مخصوص حصے کی آمدن ملے گی اور باقی دوسرے فریق کا حصہ ہوگا تو یہ مزارعت درست نہیں یا مالک زمین نے شرط عائد کی کہ وہ بیج کا خرچہ غلے کی صورت میں الگ وصول کرے گا اور باقی پیداوار دونوں میں تقسیم ہوگی تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ کبھی بیج کے خرچ کے مساوی پیداوار ہو سکتی ہے تو دوسرا فریق محروم رہے گا۔ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«سَأَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ عَنْ كِرَاءِ الْأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ، فَقَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُونَ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ وَأَشْيَاءَ مِنَ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هٰذَا، وَيَسْلَمُ هٰذَا، وَيَسْلَمُ هٰذَا، وَيَهْلِكُ هٰذَا، فَلَمْ يَكُنْ لِّلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلَّا هٰذَا، فَلِذٰلِكَ زَجَرَ عَنْهُ»

''(حضرت حنظلہ بن قیس کہتے ہیں:) میں نے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے زمین کو سونے، چاندی (درہم و دینار) کے عوض کرائے پر دینے سے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ لوگ عہد نبوی میں اپنے کھیتوں کو اس شرط پر کاشت کے لیے دیتے تھے کہ پانی کی گزرگاہ کے قریب کا حصہ یا جس سمت سے پانی آتا ہے ادھر کا حصہ یا مخصوص حصے کی پیداوار ہماری ہوگی، چنانچہ کبھی اس حصے کی پیداوار تباہ ہو جاتی اور دوسرے حصے کی سلامت رہتی اور کبھی اس کی پیداوار سلامت رہتی اور اس حصے کی تباہ ہو جاتی۔ لوگوں میں یہی مزارعت معروف اور رائج تھی، اس لیے اس سے منع فرما دیا۔''[3]

---

[1] إعلام الموقعين :8/2. [2] صحيح مسلم، المساقاة، باب المساقاة والمعاملة......، حديث: 1551. [3] صحيح مسلم، البيوع، باب كراء الأرض بالذهب والورق، حديث :1547.

یہ روایت مزارعت کی ایسی صورت کو حرام قرار دیتی ہے جس میں نقصان اور جہالت ہو اور لوگوں کے درمیان نزاع و اختلاف پیدا کرے۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے متعدد روایات مروی ہیں اور ان میں وہ علل موجود ہیں جو اس وقت موجود تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علل کی بنیاد پر زمین کو کرائے پر دینے سے منع کر دیا تھا، چنانچہ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''ہم زمین کو کرائے پر دیتے تھے اس شرط پر کہ زمین کے فلاں حصے کی پیداوار ہمارے لیے اور فلاں حصے کی پیداوار تمھارے لیے ہوگی، چنانچہ کبھی اس ایک حصے میں پیداوار ہوتی اور اس دوسرے حصے میں پیداوار نہ ہوتی۔''[1]

اجارہ کے احکام

اجارہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی ضرورت تقریباً ہر انسان کو مختلف مصلحتوں اور فوائد کے حصول کے لیے بار بار پیش آتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے کے ساتھ روزانہ، ماہانہ یا سالانہ اجرت کا معاملہ طے کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بارے میں اسلامی احکام کی معرفت انتہائی ضروری ہے کیونکہ مختلف مقامات اور اوقات میں جو معاملہ بھی لوگوں کے درمیان اسلامی اصولوں کے مطابق طے ہوگا، اس میں فوائد کا حصول زیادہ اور نقصانات کا اندیشہ نہایت کم ہوگا۔

لغوی تعریف: لغوی اعتبار سے اجارہ ''اجر'' سے مشتق ہے جس کے معنی ''معاوضہ'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ ﴾

''موسیٰ کہنے لگے: اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔''[2]

شریعت اسلامی میں ''معلوم مدت یا عمل کے لیے کسی متعین یا واجب الادا ایسی چیز سے، جس کی ذات یا صفات معلوم ہوں، فائدہ حاصل کرنے اور نقد رقم کی صورت میں اس کی اجرت ادا کرنے کے معاہدے کا نام ''اجارہ'' ہے۔''

درج بالا تعریف اجارے کی اہم شرائط اور اس کی انواع پر مشتمل ہے، یعنی درج بالا تعریف کی روشنی میں ثابت ہوا:

[1] صحیح مسلم، البیوع، باب کراء الأرض بالذهب والورق، حدیث: 1547. [2] الکهف 18:77.

① ''فائدہ حاصل کرنے کا معاہدہ'' ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ذات کے بارے میں معاہدہ اجارہ نہیں بلکہ بیع ہے۔

② ''منفعت کا مباح ہونا (ضروری ہے)''، لہٰذا حرام منفعت پر عقد اجارہ ناجائز ہے بلکہ ایسا معاہدہ اجارہ نہیں کہلاتا، مثلاً: زنا وغیرہ۔

③ ''منفعت کا متعین ہونا ضروری ہے۔'' لہٰذا مجہول منفعت پر عقد ناجائز ہوگا۔

④ ''کام کی مدت متعین ہو''، مثلاً: ایک دن یا ایک مہینہ۔

⑤ اجرت متعین ہو۔

معین ذات یا موصوف فی الذمہ یا معلوم عمل جیسے الفاظ سے اجارے کی دو قسمیں سامنے آتی ہیں:

① کسی معین چیز سے نفع حاصل کرنے کا معاہدہ ہو، مثلاً: ''میں نے تجھے یہ گھر اجرت (کرایہ) پر دیا۔'' یا کسی ایسی شے کا معاہدہ ہو جس کے اوصاف کا تذکرہ ہو، مثلاً: ''میں نے تجھے بار برداری کے لیے ایک ایسا اونٹ دیا جس میں فلاں فلاں وصف ہیں۔''

② اجارہ کسی متعین عمل پر ہو، مثلاً: وہ اسے فلاں جگہ تک سوار کر کے لے جائے گا یا اس کی یہ دیوار بنائے گا۔

اجارہ قرآن مجید، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ﴾

''پھر اگر وہی (مائیں بچے کو) دودھ پلائیں تو تم انھیں ان کی اجرت دے دو۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴾

''موسیٰ کہنے لگے: اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے سفر ہجرت میں راستے کی راہنمائی کے لیے ایک آدمی کو اجرت پر ساتھ لیا تھا۔

ابن منذر رحمہ اللہ نے اجارے کے جواز پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں لوگوں کی حاجت وضرورت اس کے جواز کی متقاضی ہے، یعنی جس طرح انھیں اشیاء کی ضرورت ہے اسی طرح منافع کی حاجت وضرورت بھی ہے۔

کسی آدمی کو اجرت دے کر اس سے کوئی متعین کام لینا جائز ہے، مثلاً: کسی سے کپڑا سلوانا، دیوار بنوانا یا کسی سے

① الطلاق 65:6. ② الکھف 18:77.

راستے کی راہنمائی لینا جیسا کہ سفر ہجرت کے بارے میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث صحیح بخاری میں ہے، وہ فرماتی ہیں:

«اِسْتَأْجَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُوبَكْرٍ رَّجُلاً مِّنْ بَنِي الدِّيلِ هَادِيًا خِرِّيتًا»

''رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنو دِیل سے راستوں کا ماہر آدمی (عبداللہ بن اریقط) اجرت پر لیا۔''[1]

- گھروں، دکانوں اور جگہوں کو معصیت کے کاموں کے لیے کرائے پر دینا جائز نہیں، مثلاً: شراب کی بیع کے لیے یا حرام مال، مثلاً: سگریٹ، تمباکو، ناجائز تصاویر وغیرہ کی خرید وفروخت کے لیے کیونکہ اس میں گناہ اور معصیت پر تعاون پایا جاتا ہے۔
- جس نے کوئی شے کرائے پر حاصل کی، پھر وہ شخص وہی شے کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دے سکتا ہے جو اس کا قائم مقام ہو کر فائدہ حاصل کرے کیونکہ یہ فائدہ اس کی ملکیت ہے، خواہ وہ بذات خود اس سے مستفید ہو یا نیابتًا مستفید ہو، جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مستاجر ثانی کا فائدہ مستاجر اول کے فائدے کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو، یعنی مالک شے کو زیادہ نقصان نہ پہنچایا جائے، مثلاً: ایک شخص نے رہائش کے لیے کسی سے کرائے پر مکان لیا تو وہ کسی دوسرے کو بھی رہائش کے لیے وہی مکان دے سکتا ہے، البتہ یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کو وہی جگہ، کارخانے یا فیکٹری وغیرہ کے لیے دے دے۔
- قربت الٰہی اور عبادت کے اعمال پر اجرت لینا دینا جائز نہیں، مثلاً: حج یا اذان وغیرہ کیونکہ یہ اعمال اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ادا کیے جاتے ہیں، لہٰذا اجرت لینے سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، البتہ اگر کسی کے نیک اعمال (اذان دینے، امامت کروانے اور کتاب وسنت کی تعلیم دینے) سے دوسروں کو فائدہ پہنچ رہا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بیت المال سے ضروریات زندگی کے لیے تنخواہ وصول کرے۔ واضح رہے کہ یہ معاوضہ نہیں ہے بلکہ یہ نیکی اور اطاعت کے کاموں میں اعانت ہے، اس سے نہ اجر وثواب متاثر ہوگا اور نہ خلوص میں خلل سمجھا جائے گا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے۔
- مالک پر لازم ہے کہ جو شے اجرت پر دے رہا ہے وہ بالکل درست ہو، یعنی مطلوب نفع دینے کے قابل ہو، مثلاً: کرائے پر دی گئی گاڑی کا سفر اور بوجھ اٹھانے کے قابل ہونا، مکان کا ٹھیک حالت میں ہونا۔ اور اگر اس کی کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ گئی ہو تو اس کی مرمت کرنا مالک کی ذمے داری ہے تاکہ مستاجر اس سے مکمل فائدہ حاصل کر سکے۔

[1] صحيح البخاري، الإجارة، باب إذا استأجر أجيراً ليعمل له بعد ثلاثة أيام ......، حديث:2264.

- جس نے کوئی شے اجرت پر لی اس پر لازم ہے کہ وہ اسی حالت میں مالک کو واپس کرے جس حالت میں کرائے پر لی تھی۔ دوران استعمال میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تو کرایہ دار اسے دور کرے۔
- اجارہ فریقین (مالک اور مستاجر) کے درمیان ایک معاہدے کا نام ہے جو بیع ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس کا حکم بھی بیع والا ہے۔ کسی فریق کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کی رضامندی کے بغیر یہ معاہدہ فسخ قرار دے، البتہ اگر معاہدے کے بعد اس چیز میں کسی عیب کا علم ہوا تو مستاجر کو فسخ کا حق حاصل ہے۔
- مالک کو چاہیے کہ وہ مستاجر کو متعین شے حوالے کرے اور اسے اس سے مکمل طور پر نفع اٹھانے کا اختیار دے۔ اگر ایک شخص نے کوئی چیز کرائے پر دی مگر مستاجر کو اس سے فائدہ حاصل کرنے سے روک دیا تو جتنی رکاوٹ رہے گی اس کا کرایہ ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر مستاجر خود اس سے فائدہ حاصل نہیں کر رہا تب اس کو پورا کرایہ دینا ہوگا کیونکہ اجارہ ایک معاہدہ تھا جس کی پابندی ہر ایک پر لازم ہے اور وہ یہ کہ مالک اجرت لے اور مستاجر فائدہ حاصل کرے۔
- درج ذیل امور کی وجہ سے اجارے کا معاہدہ ختم ہو جائے گا:

① کرائے پر دی ہوئی چیز تلف اور ضائع ہو جائے، مثلاً: اگر اجرت پر جانور دیا تھا تو وہ ہلاک ہو گیا یا گھر کرائے پر دیا تھا لیکن وہ منہدم ہو گیا یا کاشت کے لیے زمین اجرت پر لی تھی لیکن اس کا پانی خشک یا منقطع ہو گیا۔

② ایک مقصد کے حصول کی خاطر اجارہ ہوا لیکن معاہدۂ اجارہ پر عمل سے قبل ہی مقصد حاصل ہو گیا، مثلاً: کسی ڈاکٹر سے ایک مریض کے علاج کی خاطر اجرت طے کی گئی لیکن علاج شروع کرنے سے پہلے مریض ٹھیک ہو گیا، لہٰذا اب معاہدے کو پورا کرنے کی ضرورت نہیں۔

- کسی نے اپنے پاس ایک متعین کام کے لیے مزدور رکھا جو دوران کام میں بیمار ہو گیا تو مزدور کو چاہیے کہ کوئی اپنا قائم مقام مقرر کرے جسے طے شدہ اجرت کے تحت معاوضہ ادا کیا جائے گا، البتہ اگر اسی سے کام لینے کی شرط طے ہوئی تھی تو نائب سے کام لینے سے مقصد حاصل نہ ہوگا، لہٰذا آجر پر لازم نہیں کہ وہ دوسرے مزدور کے کام کو قبول کرے بلکہ اسے اختیار ہے کہ وہ صبر کرے اور مزدور کے تندرست ہونے کا انتظار کرے یا اپنا حق وصول نہ ہونے کی وجہ سے معاہدۂ اجارہ فسخ قرار دے۔
- مزدور دو قسم کا ہوتا ہے ① خاص ② مشترک۔

خاص مزدور وہ ہے جسے ایک مقررہ مدت کے لیے مزدور رکھا گیا ہو، وہ مقررہ کام کرے گا اور آجر ہی اکیلا فائدہ

لینے کا مستحق ہوگا۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا۔ اگر اس سے کوئی کام غلطی سے بگڑ گیا یا کوئی نقصان ہو گیا تو یہ ضامن نہ ہوگا، مثلاً: جس آلے سے کام کر رہا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ عدم ضمان کی وجہ یہ ہے کہ وہ وکیل کی طرح مالک کا نائب ہے، ہاں! اگر اس نے خود تعدی و زیادتی کی تو نقصان کا ضامن ہوگا۔

مشترک مزدور وہ ہے جس کے لیے کام کی اجرت طے ہوئی تھی لیکن وہ صرف اسی کا کام نہیں کرتا بلکہ اس نے بیک وقت متعدد افراد کے کام کی ذمے داری قبول کی ہوئی ہے۔ اجیر مشترک نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ وہ کام کیے بغیر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے کام کی ذمے داری اسی پر ہے۔

▲ اجرت "عقد" کے ساتھ ہی لازم ہو جاتی ہے، البتہ ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب وہ اپنا کام مکمل کرے گا یا آجر منفعت حاصل کرے گا یا کرائے پر دی ہوئی شے واپس کرے گا، نیز مدت معاہدہ گزر جائے اور مانع بھی کوئی نہ ہو کیونکہ اجیر اجرت تب لے گا جب وہ اپنا کام مکمل کر لے گا۔ واضح رہے اجرت ایک معاوضہ ہے اور معاوضہ تبھی ملتا ہے جب کام مکمل ہو۔

▲ اجیر (مزدور) پر لازم ہے کہ وہ کام کو اچھی طرح مکمل کرے۔ اس پر حرام ہے کہ کام میں دھوکہ دے یا خیانت کرے جیسا کہ اس پر واجب ہے کہ طے شدہ مدت کے اندر اندر تسلسل سے کام کرے اور وقت ضائع نہ کرے۔ اپنے کام کی ادائیگی میں خوف خدا رکھے۔

▲ مستاجر (مالک) پر لازم ہے کہ وہ کام مکمل ہونے پر مکمل اجرت ادا کر دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَعْطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ»

"مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔"[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَالَ اللهُ: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطٰى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ»

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین آدمی ایسے ہوں گے کہ میں روز قیامت ان سے جھگڑوں گا (اور جس کے ساتھ میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا تو غالب آ جاؤں گا): ① وہ شخص جس نے مجھ سے عہد و پیمان کیا، پھر دھوکا دے دیا۔ ② وہ آدمی جس نے آزاد آدمی کو (غلام قرار دے کر) بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا ③ وہ آدمی جس نے کسی کو مزدور رکھا اس سے کام پورا لیا لیکن اس کی مزدوری نہ دی۔"[2]

① [ضعیف] سنن ابن ماجه، الرهون، باب أجر الأجراء، حديث:2443. ② صحيح البخاري، البيوع، باب إثم ◄◄

کام ''اجیر'' کے ذمے امانت ہے، لہٰذا اس کا خیال رکھنا، اسے مکمل کرنا اور خیر خواہی کرنا اجیر پر لازم ہے۔ اسی طرح اجیر کی اجرت آجر (مالک) کے ذمے قرض ہے اور حق ہے جسے کسی ٹال مٹول اور کمی کے بغیر ادا کر دینا واجب ہے۔

مقابلہ بازی کے احکام

مقابلہ بازی سے مراد جانوروں کی دوڑ لگانا یا تیر اندازی جیسے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔

مقابلہ بازی کا جواز کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾

''اور تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی مقدور بھر قوت تیار رکھو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ» ''خبردار! قوت تیر اندازی سے ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ ﴾ ''ہم تو آپس میں دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔''[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا سَبَقَ إِلَّا فِي خُفٍّ أَوْ حَافِرٍ أَوْ نَصْلٍ»

''صرف اونٹ، گھوڑے اور تیر میں مقابلہ بازی (اور انعام) جائز ہے۔''[4]

علماء نے بالاتفاق اس کے فی الجملہ جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''گھوڑوں کی دوڑ یا تیر اندازی اور جنگی آلات کے ذریعے سے وہ مقابلے جن کے جواز کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم صادر فرمایا ہے، ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں

◄◄ من باع حرا، حدیث: 2227، البتہ قوسین والے الفاظ: سنن ابن ماجه، الرهون، باب أجر الأجراء، حديث: 2442 کے ہیں۔ [1] الأنفال 8:60. [2] صحيح مسلم، الإمارة، باب فضل الرمي والحث عليه......، حديث: 1917. [3] يوسف 12:17. [4] سنن أبي داود، الجهاد، باب في السبق، حديث: 2574.

جہادی قوت کی استعداد حاصل کرنا ہے۔''

نیز فرمایا: ''دوڑ اور کشتی کے مقابلے وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے بشرطیکہ ان کا مقصد دین اسلام کی مدد و نصرت ہو۔ اس طرح ان میں انعامات دینا یا وصول کرنا جائز ہے۔ مزید برآں ایسا کھیل اور شغل جس میں نقصان کی بجائے فائدہ ہو، جائز ہے، البتہ ارجوحہ کے ذریعے کھیلنا مکروہ ہے۔''

آگے چل کر شیخ موصوف فرماتے ہیں: ''جو کھیل یا کام اللہ تعالیٰ کے اوامر سے روکنے اور مشغول رکھنے کا باعث ہو، ممنوع ہے اگرچہ وہ بذات خود حرام نہ بھی ہو، مثلاً: بیع، تجارت وغیرہ۔ اسی طرح ایسے کھیل اور مقابلے اور ان کے آلات جن سے دین اسلام کو یا انسانی وجود کو کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ احکام الٰہی کی پیروی سے غافل کریں، بالاتفاق حرام ہیں۔''

◄ علمائے کرام نے اس باب کے مسائل کو فَرُوسِیَّۃ کا عنوان دیا ہے اور اس کے احکام بیان کرنے میں دلچسپی لی ہے بلکہ اس موضوع پر ان کی مشہور تصانیف بھی ہیں۔

◄ فَرُوسِیَّۃ کی چار اقسام ہیں:

① گھوڑے کی سواری کرنا، اسے دوڑانا اور حملہ کرنے کی ٹریننگ دینا وغیرہ۔

② تیر اندازی کرنا اور وقت کے جدید اسلحہ سے آگہی حاصل کرنا۔

③ نیزہ زنی میں مہارت حاصل کرنا۔

④ تلوار کے استعمال میں تربیت لینا۔

جس شخص نے یہ چار مراحل طے کر لیے اس نے ''فروسیہ'' میں کمال حاصل کر لیا۔[1]

◄ انسانوں، جانوروں اور گاڑیوں وغیرہ میں دوڑ کا مقابلہ کرانا (اور انھیں انعام دینا) جائز ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''گھوڑوں وغیرہ میں دوڑ لگانا یا لوگوں کے درمیان دوڑ میں مقابلہ کرانا جائز ہے۔ اسی طرح تیر اندازی یا دیگر اسلحہ میں مقابلہ بازی درست ہے کیونکہ اس میں جنگ و جہاد کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگائی تھی۔''[2]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے رکانہ سے کشتی لڑی جو آپ ﷺ نے اسے پچھاڑ کر جیت لی۔[3]

---

① جدید دور کے اعتبار سے جنگی طیاروں، ٹینکوں، توپوں اور میزائلوں کی تربیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

② سنن ابن ماجه، النكاح، باب حسن معاشرة النساء، حديث: 1979. ③ [ضعيف] سنن أبي داود، اللباس، باب في العمائم، حديث: 4078.

نیز رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری شخص سے دوڑ میں مقابلہ کیا تھا۔[1]

▲ اونٹ، گھوڑے اور تیراندازی میں مقابلہ جیتنے پر انعام دیا جاسکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا سَبَقَ إِلَّا فِي خُفٍّ أَوْ حَافِرٍ أَوْ نَصْلٍ»

''صرف اونٹ، گھوڑے اور تیر میں مقابلہ بازی (اور انعام) جائز ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں آلات حرب میں شامل ہیں، لہٰذا ان کا سیکھنا اور ان کے استعمال میں مہارت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کی جہادی قوت واستعداد بڑھ سکے۔

واضح رہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق اور رکانہ رضی اللہ عنہما کے قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس مقابلے میں انعام رکھنا جائز ہے جس سے دین اسلام کو نفع حاصل ہو۔[3] حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے کہ ''ہر اس مقابلہ بازی میں انعام رکھنا جس میں اسلام کی شان وشوکت کے دلائل اور براہین کا ظہور ہو وہ گھڑ دوڑ اور تیراندازی کے مقابلے سے زیادہ اولی بالجواز ہے۔''

▲ انعامی مقابلہ بازی کی درستی کے لیے پانچ شرائط ہیں:

① اونٹ، گھوڑا وغیرہ جانور متعین ہو، مثلاً: فلاں فلاں گھوڑا مقابلے میں شریک ہوگا۔

② جن کے مابین مقابلہ ہو وہ اونٹ یا گھوڑا وغیرہ ایک ہی جنس کے ہوں۔ اسی طرح تیرانداز متعین ہوں کیونکہ مقابلے کا مقصد شرکاء کی قابلیت اور مہارت کا اندازہ کرنا ہے۔

③ وہ مسافت جہاں تک دوڑنا ہے محدود ہو تاکہ آگے بڑھنے والے کا علم ہو سکے۔

④ انعام جائز اور متعین ہو۔

⑤ مقابلہ جوئے کے شائبے سے پاک ہو۔ انعام مقابلے میں شریک فریقین کے علاوہ تیسرے فریق یا شخص کی جانب سے ہو، البتہ اگر مقابلہ کرنے والوں میں سے کوئی ایک فریق یا فرد انعام لگا دے تو بالاتفاق جائز ہے۔[3] اگر دونوں فریق انعام مقرر کرتے ہیں تو علماء کا اس کے جواز میں اختلاف ہے۔ بعض علماء اس کے جواز کے قائل ہیں جبکہ بعض کے نزدیک اس کے جواز کی ایک شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک تیسرا فریق بھی مقابلہ میں شریک ہو

---

① صحيح مسلم، الجهاد، باب غزوة ذي قرد وغيرها، حديث:1807. ② سنن أبي داود، الجهاد، باب في السبق، حديث:2574.

③ مثلاً: ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی سے کہتا ہے کہ اس مقابلے میں اگر تو مجھ پر غالب آ جائے تو میں تجھے سو روپے انعام دوں گا، یہ جائز ہے۔ (صارم)

جو انعام دینے والوں میں سے نہ ہو، البتہ اگر وہ غالب آ جائے تو انعام کا مستحق ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تیسرے شخص کی دخل اندازی کو شرط قرار نہیں دیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''تیسرے فریق کی دخل اندازی کے بغیر مقابلہ ہونا زیادہ انصاف کی بات ہے اور وہ اسی طرح کہ انعام دونوں میں سے ایک کی طرف سے ہو۔ اس سے مقابلے کا مقصود بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے، یعنی دوسرے کی شکست واضح ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں انعام لینا حلال کمائی ہے۔ نیز انھوں نے فرمایا: میرے علم کے مطابق تیسرے فریق کی دخل اندازی کا قائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی نہ تھا، البتہ معروف تابعی حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ اس کے قائل تھے۔ بعض نے ان کی رائے کو قبول کر لیا۔''

گزشتہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ دو قسم کی مقابلہ بازی جائز ہے:

① جس میں دین اسلام کو قوت اور فائدہ حاصل ہو، مثلاً: جہاد و قتال کے لیے ٹریننگ لینا یا دینی معلومات و مسائل میں پختگی حاصل کرنا۔ اس قسم میں انعام لینا اور دینا جائز ہے۔

② ایسا مقابلہ جس سے مقصود صرف کھیل ہو جو نقصان دہ نہیں ہے ایسا مقابلہ جائز ہے بشرطیکہ اسلامی عبادات اور دینی فرائض و واجبات کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث نہ ہو۔ اس قسم کے مقابلے میں انعام لینا اور دینا درست نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس دوسری قسم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں اور بھاری رقوم کا انعام دیتے ہیں۔ بہت زیادہ قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔

مستعار چیزوں کے احکام

''مستعار'' وہ چیز ہے جو کسی کو محدود وقت کے لیے جائز فائدہ حاصل کرنے کی خاطر دی جائے اور فائدہ حاصل کر لینے کے بعد مالک کو واپس کر دی جائے۔

اس تعریف کی روشنی میں جس چیز سے فائدہ حاصل کرنا ناجائز ہو، وہ مستعار نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح جو چیز فائدہ حاصل کرنے سے ختم ہو جاتی ہو وہ چیز بھی کسی کو عاریتاً دینے میں شامل نہیں اور اسے عاریت نہیں کہتے، مثلاً: کھانے پینے کی اشیاء۔

اشیاء عاریتاً دینے کی مشروعیت کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ○ ﴾ ''اور برتنے کی چیز روکتے ہیں۔''[1]

اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دوسروں کو عام استعمال کی اشیاء عاریتاً نہیں دیتے۔ علاوہ ازیں علماء نے اس آیت سے عاریتاً چیز دینے کا ''وجوب'' ثابت کیا ہے بشرطیکہ مالک مالدار اور مستغنی ہو۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے گھوڑا عاریتاً لیا تھا۔[2] اسی طرح صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے زرہیں عاریتاً لی تھیں۔[3]

- کسی ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی اشیاء عاریتاً دینا بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہے کیونکہ نیکی اور تقوے میں تعاون کے عموم میں یہ کام بھی شامل ہے۔
- کسی چیز کا عاریتاً دینا تب جائز ہے جب درج ذیل شرائط کا لحاظ ہو:

① عاریتاً شے دینے والا رضا ورغبت سے شے دینے کی اہلیت رکھتا ہو اور بااختیار ہو، لہٰذا بچہ، مجنون اور کم عقل کسی چیز کو عاریتاً دینے کے اہل نہیں ہیں۔

② مستعیر (عاریتاً حاصل کرنے والا) بااختیار ہو کہ اس کا قبول کرنا درست ہو، یعنی اس میں بھی درج بالا اوصاف موجود ہوں۔

③ عاریتاً دی گئی چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہو، لہٰذا مسلمان غلام کسی کافر شخص کو عاریتاً دینا جائز نہیں یا کسی کو ایسا ہتھیار دینا جس سے وہ کسی کو قتل کر سکے جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ ''گناہ اور ظلم وزیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''[4]

④ جو چیز عاریتاً دی جائے اس سے فائدہ لینا ممکن ہو، نیز وہ اپنی حالت پر قائم بھی رہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

- جس شخص نے کوئی شے عاریتاً دی ہے وہ جب چاہے اسے واپس لے سکتا ہے الا یہ کہ جب مستعیر کا نقصان ہو رہا ہو تو درست نہیں، مثلاً: کسی کو کشتی عاریتاً دی گئی تاکہ اس سے باربرداری کا کام لیا جائے تو جب تک کشتی سمندر میں ہے تب تک مُعیر ''عاریتاً دینے والا'' واپس نہیں لے سکتا۔ اسی طرح اگر ایک انسان نے شہتیر رکھنے کے لیے عاریتاً دیوار دے دی تو جب تک لکڑی دیوار پر رہے، مُعیر رجوع نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں مستعیر کا نقصان ہے۔

① الماعون 107:7. ② صحيح البخاري، الهبة وفضلها، باب من استعار من الناس الفرس، حديث: 2627. ③ سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث: 3562، ومسند أحمد: 401/3 و465/6. ④ المآئدة 2:5.

٭ مستعیر کا فرض ہے کہ عاریتاً چیز کی حفاظت اپنے ذاتی مال سے بڑھ کر کرے تاکہ اسے مالک کی طرف صحیح سالم حالت میں لوٹا سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾

''اللہ تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انھیں پہنچاؤ۔''[1]

اس آیت کا اطلاق جس طرح امانت کو واپس کرنے پر ہوتا ہے اسی طرح مستعار شے کو لوٹانے پر بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذَتْ حَتَّى تُؤَدِّيَهُ» ''جو کوئی شے لیتا ہے اس کی ادائیگی اسی کے ذمے ہے۔''[2]

اور ارشاد نبوی ہے:

«أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ» ''جس کی امانت ہے اسے (عندالطلب) لوٹا دے۔''[3]

ان احادیث کا اطلاق جہاں امانتوں کو لوٹانے پر ہوتا ہے وہیں مستعار اشیاء کو واپس کرنے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ مستعار شے بھی ایک قسم کی امانت ہی ہوتی ہے۔ اگر اس سے استفادہ کرنا جائز قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی معروف حدود کے اندر اندر ہے۔ اس کے استعمال میں اس حد تک اسراف و زیادتی کرنا کہ وہ ضائع ہو جائے قطعاً جائز نہیں، نیز اس کا استعمال ناجائز مقام پر بھی نہ کیا جائے کیونکہ مالک نے اسے ایسی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝﴾ ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے؟''[4]

اگر مستعیر نے شے کا ناجائز استعمال کیا اور وہ ضائع ہو گئی تو وہ اس کا ضامن ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذَتْ حَتَّى تُؤَدِّيَهُ» ''جو کوئی شے لیتا ہے اس کی ادائیگی اسی کے ذمے ہے۔''[5]

اگر وہ شے معروف طریقے سے استعمال کرتے ہوئے تلف ہو گئی تو وہ ضامن نہ ہوگا کیونکہ مُعیر نے اسے استعمال میں لانے کے لیے ہی اجازت دی تھی تو جب وہ اجازت والے کام میں استعمال کرتے ہوئے تلف ہو گئی تو اس کی ضمانت نہیں ہے۔

① النسآء 4:58. ② [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث:3561، وجامع الترمذي، البيوع، باب ما جاء في أن العارية مؤداة، حديث:1266، وسنن ابن ماجه، الصدقات، باب العارية، حديث:2400 واللفظ له. ③ سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده، حديث:3534، 3535. ④ الرّحمٰن 55:60. ⑤ [ضعيف] سنن أبي داود، البيوع، باب في تضمين العارية، حديث :3561، وجامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في أن العارية مؤداة، حديث :1266، وسنن ابن ماجه، الصدقات، باب العارية، حديث:2400 واللفظ له.

▲ عاریتاً لی ہوئی چیز کسی دوسرے کو عاریتاً نہیں دی جاسکتی کیونکہ جو شے ایک شخص کے لیے بطور استعمال مباح قرار دی گئی، اسے نہیں چاہیے کہ وہ آگے کسی دوسرے کے لیے مباح قرار دے۔ اس صورت میں شے کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہے۔

▲ اگر عاریتاً لینے والے نے چیز کو، جس مقصد کے لیے لی تھی، اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا کہ جس کی وجہ سے وہ ضائع ہوگئی تو اس میں علمائے کرام کی دو رائے ہیں۔ علماء کے ایک فریق کا کہنا ہے کہ اس شے کے تلف ہونے میں کوتاہی یا زیادتی ہوئی ہو یا نہ ہو بہر صورت وہ ضامن ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذَتْ حَتَّى تُؤَدِّيَهُ» ''جوکوئی شے لیتا ہے اس کی ادائیگی اسی کے ذمے ہے۔''[1]

مثلاً: کسی نے ایک شخص سے جانور عاریتاً لیا جو دوران انتفاع مر گیا یا کپڑا لیا جو جل گیا یا چوری ہوگیا۔ اس میں مستعیر مالک کو اس کی مثل یا قیمت ادا کرے گا۔

فریق ثانی کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر اس کے استعمال میں کوتاہی و زیادتی نہ ہوئی تو ضامن نہیں کیونکہ ضمانت تو کوتاہی کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ عاریتاً شے امانت کے حکم میں ہوتی ہے۔

▲ مستعیر پر لازم ہے کہ وہ عاریتاً لی ہوئی شے کی حفاظت کرے اور استفادے کے بعد مالک کو جلد لوٹا دے۔ اس کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر نہ کرے کہ وہ ضائع ہو جائے یا اس میں نقص پیدا ہو جائے کیونکہ یہ شے اس کے پاس ایک امانت ہے، نیز مالک نے اسے دے کر احسان کیا ہے، لہٰذا احسان کا بدلہ احسان سے دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝﴾ ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے؟''[2]

غصب کے احکام

''غصب'' کے لغوی معنی ''کسی شے پر ظالمانہ قبضہ کرنے'' کے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں ''غصب'' کسی کے حق پر زبردستی ناحق قبضہ جمانے کا نام ہے۔

[1] [ضعيف] سنن أبي داود، باب في تضمين العارية، حديث: 3561، وجامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في أن العارية مؤداة، حديث:1266، وسنن ابن ماجه، الصدقات،باب العارية، حديث:2400واللفظ له. [2] الرحمٰن 60:55.

غصب کے حرام ہونے پر اہل اسلام کا اجماع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ ﴾ ''اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو۔''①

''غصب'' باطل طریقے سے مال کھانے کا بہت بڑا اور برا حربہ ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ»

''تمھارے خون، تمھارے اموال اور تمھاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔''②

نیز فرمایا:

«لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسِهِ»

''کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی کے بغیر حلال نہیں ہے۔''③

▲ مغصوب (غصب کیا گیا) مال ''غیر منقول''، یعنی زمین، مکان وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور ''منقول'' (رقم، جانور وغیرہ) بھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِّنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ»

''جو شخص کسی کی زمین میں سے ایک بالشت کے برابر ناجائز قبضہ کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں کا طوق پہنائے گا۔''④

▲ غاصب پر لازم ہے کہ وہ طلب معافی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور غصب کردہ شے مالک کو لوٹائے اور اس سے بھی معافی مانگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لِّأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لَّا يَكُونَ دِينَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ، إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ - وَفِي لَفْظٍ: فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ - وَفِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ: فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»

''اگر کسی شخص پر اس کے مسلمان بھائی کا کوئی حق ہے جو اس نے اس پر اس کی عزت یا کسی بھی حوالے سے

① البقرة 188:2. ② صحيح البخاري، العلم، باب ليبلغ العلم الشاهد الغائب، حديث: 105. ③ [ضعيف] سنن الدارقطني: 22/3، حديث: 2862. ④ صحيح البخاري، المظالم، باب إثم من ظلم شيئًا من الأرض، حديث: 2453,2452، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، حديث: 1610، ومسند أحمد: 432/2 واللفظ لمسلم.

کیا ہے تو اسے اسی دنیا میں ادا کر دے (یا معاف کروا لے) اس دن کے آنے سے پہلے پہلے جس دن اس کے پاس کوئی دینار و درہم نہ ہو گا۔ اگر اس کی نیکیاں ہوں گی تو اس سے لے کر مظلوم کو اس پر ظلم کے بقدر دے دی جائیں گی اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ ظالم پر لاد دیے جائیں گے۔'' ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''اس پر ڈال دیے جائیں گے''[1] صحیح مسلم کے الفاظ ہیں: ''(گناہ) اس پر ڈالے جائیں گے بالآخر اسے بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''[2]

- اگر مغصوب شے موجود ہو تو اسے اسی حالت میں واپس کرے اور اگر وہ ضائع ہوگئی ہو تو اس کا مثل دے (اگر اس کی مثل نہیں تو قیمت ادا کرے) ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ اگر مغصوب شے اپنی حالت پر ہو تو اس کا لوٹانا واجب ہے۔
- اگر مغصوب شے سے کوئی آمدن یا اضافہ ہوا ہے تو وہ بھی واپس کرے، وہ متصل اضافہ ہو (جیسے درختوں کا پھل یا جانوروں کی اون وغیرہ) یا منفصل ہو (جیسے جانور کا بچہ) اصل مال کی طرح یہ اضافہ بھی مالک ہی کا ہے۔
- اگر کسی نے مغصوب زمین پر کوئی عمارت تعمیر کر لی یا اس میں باغ لگا دیا۔ اگر مالک کا مطالبہ ہو تو غاصب عمارت منہدم کرے اور درخت ہوں تو انھیں کاٹ لے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَيْسَ لِعِرْقِ ظَالِمٍ حَقٌّ» ''اس میں ظالم کی رگ (کھیتی وغیرہ) کا کوئی حق نہیں ہے۔''[3]

اگر زمین متاثر ہوئی ہو تو غاصب پر حسب نقص تاوان ادا کرنا لازم ہے، نیز اس پر لازم ہے کہ وہاں سے درختوں یا عمارت کا ملبہ اٹھا کر مالک کو اصلی حالت میں زمین واپس کرے۔[4]

- غاصب پر لازم ہے کہ شے کے غصب سے لے کر مالک کو لوٹانے تک جتنا عرصہ گزرا ہے اس قدر مغصوب شے کا کرایہ و اجرت ادا کرے کیونکہ اس نے اس دوران میں مالک کو فائدہ اٹھانے سے ناحق روک رکھا تھا۔
- اگر غاصب نے غصب شدہ چیز کو اتنا عرصہ روک کر رکھا کہ بازار میں اس کی قیمت کم ہوگئی تو درست بات یہی ہے کہ غاصب اس نقصان کا ذمہ دار ہے۔
- اگر مغصوب شے کسی دوسری ایسی جنس سے مخلوط ہوگئی جو الگ ہو سکتی ہو، جیسے گندم میں جو کی ملاوٹ تو غاصب پر

[1] صحيح البخاري، المظالم، باب من كانت له مظلمة عند الرجل ......، حديث: 2449و6534. [2] صحيح مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم، حديث: 2581. [3] صحيح البخاري، الحرث والمزارعة، باب من أحيا أرضاً مواتاً، بعد حديث: 2334 معلقًا. وجامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر في إحياء أرض الموات، حديث: 1378.

[4] اگر مالکِ زمین عمارت یا باغ کو بحال رکھنا چاہتا ہے تو غاصب کو اس کی معروف قیمت ادا کر دے۔ (صارم)

لازم ہے کہ اسے الگ کر کے مالک کو اس کی شے واپس کرے۔ اگر وہ ہم جنس کے ساتھ مخلوط ہوئی جو الگ نہیں ہوسکتی، مثلاً: ایک قسم کی گندم میں دوسری قسم کی گندم ملا دی تو مغصوب شے کی مثل (وزن یا ماپ میں) واپس لوٹانا لازم ہے۔ اور اگر ایسی جنس کے ساتھ مل گئی جو قیمت میں اس سے کم یا زیادہ ہو یا اس میں دوسری جنس کی ملاوٹ کر دی جو الگ نہیں ہوسکتی تو غاصب اس مخلوط شے کو فروخت کرے اور مالک کو اس کی شے کی صحیح قیمت ادا کرے۔ اگر مغصوب کی قیمت کم ملی تو غاصب اس کمی کو تاوان کی صورت میں پورا کرے۔

- فقہائے کرام کا کہنا ہے: ''غصب شدہ شے جن جن ہاتھوں میں گئی ہے اس کے تلف ہونے کی صورت میں سب ضامن ہوں گے۔'' (بشرطیکہ انھیں غصب کا علم ہو وگرنہ غاصب اول ہی ضامن ہوگا۔)
- اگر مغصوب شے ان اشیاء میں سے ہو جو عموماً کرایہ و اجرت پر دی جاتی ہوں تو وہ شے جتنی مدت غاصب کے پاس رہی ہو وہ اس کی اجرت و کرایہ سمیت اصل شے واپس کرے کیونکہ اشیاء کے منافع کی قیمت لگائی جاسکتی ہے، لہٰذا اصل شے کی طرح اس کے کرائے کی ذمے داری بھی غاصب پر ہوگی۔
- غاصب کے مغصوب شے میں جملہ تصرفات باطل اور ناجائز ہیں کیونکہ اس میں مالک کی اجازت شامل نہیں۔
- اگر غاصب نے کوئی شے چھین لی اب اسے معلوم نہیں کہ اس کا اصل مالک کون ہے اور اسے مالک کو واپس کرنا ممکن نہیں تو غاصب وہ شے حاکم و قاضی کے حوالے کر دے جو اسے کسی صحیح مصرف میں استعمال کر لے یا اس کا صدقہ کر دے۔ صدقہ کرنے کی صورت میں اجر و ثواب مالک کو ملے گا اور غاصب بری ہو جائے گا۔
- اموال کا غصب صرف قوت سے ناجائز قبضہ کرنے ہی سے نہیں بلکہ ناجائز طور پر دعویٰ کر کے یا زبان کی تیزی کے بل بوتے پر یا جھوٹی قسم کے ذریعے سے حاصل کردہ مال بھی غصب ہی میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا۟ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ ﴾

''اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو اور انھیں حاکموں کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ تم لوگوں کے مالوں میں سے کچھ مال گناہ کے ساتھ کھاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ ٱللَّهِ وَأَيْمَٰنِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُو۟لَٰٓئِكَ لَا خَلَٰقَ لَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ﴾

---

[1] البقرة 2:188.

’’بے شک جولوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ نہ تو ان سے بات چیت کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘[1]

فرمان نبوی ہے:

«مَنْ غَصَبَ شِبْرًا مِّنْ أَرْضٍ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

’’جس شخص نے کسی کی ایک بالشت زمین پر (ناجائز) قبضہ کیا قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔‘‘[2]

نیز فرمایا ہے:

«مَنْ قَضَيْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْهُ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ»

’’اگر میں کسی کو (اس کی زبان کی تیزی کی وجہ سے فیصلے میں) اس کے بھائی کا کچھ حق دے دوں تو اسے نہ لے کیونکہ میں اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔‘‘[3]

نقصانات کے احکام

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اموال میں ظلم وزیادتی کرنے اور انھیں ناحق ضائع کرنے سے منع کیا ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی کا مال ناجائز ضائع کر دیا تو اسے ضمان وتاوان دینے کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ یہ ضیاع خطا کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔

جس شخص نے کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر ضائع کر دیا تو اس پر شرعاً ضمانت واجب ہے۔

شیخ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’ہمیں علم نہیں کہ کسی نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو (تو گویا تمام علمائے کرام کا اتفاق ہے) کہ نقصان کسی نے قصداً کیا ہو یا سہواً، نیز نقصان کرنے والا، خواہ عاقل و بالغ ہو یا غیر عاقل اور بچہ وغیرہ۔‘‘

[1] آل عمران 3:77. [2] صحيح البخاري، المظالم، باب إثم من ظلم شيئًا من الأرض، حديث:2452، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم الظلم و غصب الأرض وغيرها، حديث : 1610 وتلخيص الحبير : 53/3، حديث: 1269 واللفظ له. [3] مسند أحمد:307/6.

▲ جو شخص کسی کے مال کو ضائع کرنے کا سبب بنا، اس پر بھی ضمان ہے، مثلاً: کسی نے بند دروازہ کھول دیا تو جو پرندہ اس میں تھا وہ ہاتھوں سے نکل گیا، یا کسی نے بند مشکیزے کا منہ کھول کر اس میں موجود شے بہا کر ضائع کر دی تو وہ ضامن ہوگا۔ اسی طرح کسی نے جانور کی رسی یا زنجیر کھول دی اور وہ جانور بھاگ گیا یا گم ہوگیا یا کسی نے تنگ گلی یا راستے میں جانور باندھ دیا اور اس کی گوبر گندگی سے کوئی انسان پھسل گیا یا جانور نے ٹانگ مار کر نقصان پہنچا دیا تو جانور باندھنے والا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے راستے میں جانور باندھ کر زیادتی کی ہے۔ کسی نے راستے میں گاڑی کھڑی کر دی جس کے نتیجے میں اس سے کوئی دوسری کار یا کوئی شخص ٹکرا گیا تو نقصان کی صورت میں گاڑی کا مالک ضامن ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَوْقَفَ دَابَّةً فِي سَبِيلٍ مِّنْ سُبُلِ الْمُسْلِمِينَ أَوْ فِي سُوقٍ مِّنْ أَسْوَاقِهِمْ، فَأَوْطَأَتْ بِيَدٍ أَوْ رِجْلٍ فَهُوَ ضَامِنٌ»

''جس شخص نے مسلمانوں کے عام راستے میں یا بازار میں جانور کھڑا کیا اور اس نے کسی کو اپنے ہاتھ یا پاؤں تلے روند دیا تو مالک ضامن ہوگا۔''[1]

اگر کسی نے راستے میں مٹی، لکڑی یا پتھر پھینک دیا یا گڑھا کھودا جس کی وجہ سے راستے سے گزرنے والے کو نقصان پہنچا یا کسی نے راستے میں خربوزے وغیرہ کا چھلکا پھینک دیا یا راستے میں پانی ڈال کر کیچڑ کر دیا جس سے کوئی پھسل گیا اور اسے نقصان پہنچا تو ان تمام صورتوں میں کام کرنے والا نقصان کا ذمہ دار ہوگا کیونکہ یہ سراسر اس کی زیادتی ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگ آج کے دور میں مندرجہ بالا امور میں انتہائی سستی اور لاپروائی کر رہے ہیں، چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ راستوں میں گہرے گڑھے کھود دیتے ہیں۔ مختلف اشیاء یا سامان رکھ کر راستے بند کر دیتے ہیں۔ مختلف مواقع پر اپنے مقاصد کے لیے سڑکیں بلاک کر دیتے ہیں اور گزرنے والوں کو تنگی و تکلیف میں ڈالتے ہیں، ان کا نقصان کرتے ہیں اور انھیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہوتی کہ وہ کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

▲ اگر کسی کے کاٹنے والے کتے نے کسی راہ گزر شخص کو کاٹ کر نقصان پہنچایا تو مالک نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے ایسے کتے کو کیوں رکھا ہے۔

▲ کسی نے کسی مقصد کے لیے اپنی زمین میں کنواں کھودا تو اگر کسی کا نقصان ہوگیا تو کنواں کھودنے والا ذمے دار

[1] [ضعيف] سنن الدارقطني :3/178، حديث: 3352، والسنن الكبرى للبيهقي:8/344.

ہو گا کیونکہ اس نے اس کی حفاظت کے لیے دیوار وغیرہ بنا کر اسے محفوظ نہیں کیا، لہٰذا یہ اس کی کوتاہی ہے جس وجہ سے وہ ضامن ہے۔

جانور رات کے وقت کھول دیا گیا اور اس نے کسی کے کھیت کا نقصان کر دیا تو مالک ضامن ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ عَلٰى أَهْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظَهَا بِالنَّهَارِ، وَإِنَّ مَا أَفْسَدَتِ الْمَوَاشِي بِاللَّيْلِ ضَامِنٌ عَلٰى أَهْلِهَا»

''دن کو کھیت والے حفاظت کریں اور رات کو جانور جو نقصان کر جائیں تو ان کے مالک ذمے دار ہیں۔''[1]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر ایک شخص کا جانور دوسرے کے کھیت کو دن کے وقت نقصان پہنچا دے تو اس پر ضمان نہیں، البتہ اگر کسی نے قصداً جانور کھول کر چھوڑ دیا جس سے کسی کے نقصان کا واضح امکان تھا تو جانور کا مالک ذمے دار ہو گا۔

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کی یہ رائے ہے کہ اگر کسی کے جانور نے دن کے وقت کسی کھیت کا نقصان کر دیا تو مالک ضامن نہ ہو گا۔ اور اگر رات کو نقصان کیا تو مالک ذمے دار ہو گا کیونکہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کھیت یا باغ کے مالک دن کے وقت اپنے کھیت و باغ کی حفاظت کرتے ہیں جبکہ جانوروں کے مالک جانوروں کی حفاظت رات کو کرتے ہیں۔ جس نے ایسی عادت و معمول کی خلاف ورزی کی، زیادتی کی صورت میں ذمے داری اسی پر ہو گی۔ واضح رہے یہ تب ہے جب جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو گا وگرنہ جانور کا مالک نقصان کا ذمے دار ہو گا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے سیدنا داود علیہ السلام کا ایک قصہ یوں بیان کیا:

﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾

''اور داود اور سلیمان کو یاد کیجیے جب وہ کھیت کے معاملے میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر چگ گئی تھیں اور ان کے فیصلے کے ہم شاہد تھے۔ ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا، اور ہر ایک کو ہم نے حکم و علم دے رکھا تھا۔''[3]

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب المواشي تفسد زرع قوم، حديث: 3569، ومسند أحمد: 436,435/5، والموطأ للإمام مالك، الأقضية، باب القضاء في الضواري والحريسة: 311/2، حديث: 1500 واللفظ له. [2] تفسير البغوي: 299,298/3. [3] الأنبيآء: 79,78/21.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کی ضمان بالمثل (ہلاک شدہ شے کی مثل تاوان) کے فیصلے کی تعریف فرمائی ہے۔ قرآن کے لفظ: ﴿ نَفَشَتْ ﴾ کے معنی رات کو بکریاں چرانا ہے۔ جس جگہ بکریوں نے نقصان کیا تھا وہ انگوروں کا باغ تھا۔ سیدنا داود علیہ السلام نے ہلاک شدہ کھیتی کی قیمت ادا کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ جب بکریوں کی قیمت کا اندازہ لگایا تو وہ ہلاک شدہ کھیتی کی قیمت کے بقدر تھا تو بکریاں کھیت والے کو دے دیں، البتہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ضمان بالمثل (تباہ شدہ چیز کی مثل تاوان) کا فیصلہ دیا وہ اس طرح کہ بکریوں والے باغ کی اصلاح کریں یہاں تک کہ وہ پہلی حالت میں لوٹ آئے، اس طرح کھیت کے خراب ہونے سے لے کر اس کے درست ہونے تک کا اس کا فائدہ ضائع نہیں ہوا بلکہ باغ والے کو بکریاں دے دیں تاکہ وہ ان کے اضافے سے کھیت کے اضافے کے بقدر حاصل کر لے اور اس کے کھیت کا جو نقصان ہوا ہے اس کا تاوان بکریوں کے اضافے سے پورا کر لے۔ ان دونوں تاوانوں کا جب اندازہ لگایا تو وہ دونوں برابر تھے۔ یہ وہی علم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں خاص کیا ہے اور اس کی تعریف فرمائی ہے۔''[1]

٭ اگر جانور کی لگام یا نکیل سوار یا کوچوان کے ہاتھ میں ہو تو جانور کے اگلے حصے (پاؤں یا منہ) کے ذریعے سے پہنچنے والے نقصان کا ذمے دار جانور کا مالک ہوگا، البتہ جانور کے پچھلے پاؤں کا نقصان ضائع ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''بے زبان جانور کے (پچھلے) پاؤں کا نقصان ضائع ہے۔''[2] جانور کو ''عجماء'' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر جانور عَجْمَاء کلام نہ کرنے والا ہوتا ہے جیسے گائے، بکری وغیرہ۔ ان جانوروں کے نقصان کی ضمانت نہیں ہے جب یہ خود کوئی غلط کام کر لیں جیسا کہ یہ جانور اپنے مالک کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کسی کا نقصان کر دے تو اس کی ذمے داری کسی پر نہیں، ہاں! اگر جانور زخمی کرنے والا (ہڑکایا) ہو تو اس کے مالک کی ذمے داری بنتی ہے کہ نہ تو وہ رات کو اس کی حفاظت میں کمی کرے اور نہ بازار میں چلتے ہوئے اس سے غافل رہے۔ اسی طرح جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہو وہاں بھی اس کی حفاظت کرے۔ یہی مسئلہ کئی علماء نے بیان کیا ہے۔ ان جانوروں کے نقصان کی ضمانت نہیں ہے جب یہ خود ہی مالک کے ہاتھ سے چھوٹ جائیں اور سیدھے ہی بھاگتے جائیں نہ ان کو کوئی پکڑنے والا ہو نہ کوئی چلانے والا ہو، سوائے کاٹنے والے کے۔''

اگر ایک شخص پر کسی آدمی یا جانور نے حملہ کیا جس سے اس کی جان کو خطرہ ہوا تو اگر اس شخص نے دفاع کرتے

[1] مجموع الفتاوی: 485/15 باختلاف يسير. [2] [ضعيف] سنن أبي داود، الديات، باب في الدابة تنفح برجلها، حديث: 4592، وسنن الدارقطني: 152/3، حديث: 3275 و3280 و3350.

ہوئے حملہ آوروں کو قتل کر دیا تو اس پر ضمان چٹی نہیں کیونکہ اس نے اسے دفاع کرتے ہوئے قتل کیا ہے جو اس کا جائز حق تھا، لہٰذا وہ شخص اس حملے کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات کا ذمے دار نہ ہوگا، نیز اس نے یہ قتل دفع شر کے لیے کیا ہے، گویا حملہ آور اپنے آپ کو خود ہی قتل کرنے والا ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آدمی کو چاہیے کہ وہ حملہ آور کو روکے اگرچہ اس کو قتل کرنا پڑے اور یہ فقہاء کا متفقہ مسئلہ ہے۔''

اگر ایک شخص نے کسی کے لغو ولھو کے آلات، صلیب، شراب کے برتن توڑ دیے یا گمراہی اور بے حیائی پھیلانے والی کتب ضائع کر دیں تو اس میں ضمان (تاوان) نہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أَمَرَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ آتِيَهُ بِمُدْيَةٍ وَّهِيَ الشُّفْرَةُ، فَأَتَيْتُهُ بِهَا ... فَخَرَجَ بِأَصْحَابِهِ إِلٰى أَسْوَاقِ الْمَدِينَةِ وَفِيهَا زِقَاقُ خَمْرٍ قَدْ جُلِبَتْ مِنَ الشَّامِ ... فَشَقَّ مَا كَانَ مِنْ تِلْكَ الزِّقَاقِ بِحَضْرَتِهِ ... وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ»

''نبی ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کے پاس چھری لاؤں، (جب) میں چھری لایا...... تو آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ کے بازاروں میں گئے وہاں علاقہ شام سے شراب کے بھرے مشکیزے لائے گئے تھے......، چنانچہ آپ ﷺ نے خود بنفس نفیس انھیں پھاڑا...... اور آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔''[1]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ لغو، بے ہودہ اور حرام اشیاء کو ضائع کرنا درست ہے اور اس میں تاوان اور ضمان بھی کوئی نہیں، البتہ ضروری ہے کہ اس قسم کی اشیاء کا ضیاع حکومت کی طرف سے ہو تاکہ اس عمل کے فوائد حاصل ہوں اور اس کے نتیجے میں خرابی پیدا نہ ہو۔

امانتوں کے احکام

امانت اس شے کو کہتے ہیں جو کسی کے پاس رکھی جائے اور وہ اس کی بلا معاوضہ حفاظت کرے، نیز مالک جب چاہے اسے واپس لے سکے۔

مال کی حفاظت کرنے میں امانت دار کی حیثیت ایک وکیل کی سی ہوتی ہے، اس لیے اس کا عاقل و بالغ اور سمجھ دار

[1] مسند أحمد :2/133,132.

ہونا ضروری ہے۔

امانت کی حفاظت کی ذمے داری وہی شخص قبول کرے جسے اپنے بارے میں یقین اور اعتماد ہو کہ اس کی حفاظت کر سکے گا۔ واضح رہے یہ انتہائی درجے کا ثواب کا کام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ»

''اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرنے میں مصروف رہتا ہے۔''[1]

نیز یہ لوگوں کی حاجت اور ضرورت بھی ہے جس شخص کو اپنے بارے میں علم ہو کہ وہ امانت کی حفاظت کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اسے ایسی ذمے داری ہرگز قبول نہیں کرنی چاہیے۔

▲ امانت کے ضائع ہونے کی صورت میں مودَع (جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے) ضامن نہیں ہوگا بشرطیکہ اس نے ذمے داری میں کوتاہی نہ کی ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اس کا اپنا مال ضائع ہو جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أُودِعَ وَدِيعَةً فَلَا ضَمَانَ عَلَيْهِ» ''امانت جس کے حوالے کی گئی اس پر ضمان نہیں۔''[2]

ایک روایت میں ہے:

«لَا ضَمَانَ عَلٰى مُؤْتَمَنٍ» ''امین پر (امانت ضائع ہونے کی) ذمے داری نہیں۔''[3]

ایک اور روایت میں ہے:

«لَا عَلَى الْمُسْتَوْدِعِ غَيْرِ الْمُغِلِّ ضَمَانٌ» ''خیانت نہ کرنے والے امین پر تاوان نہیں۔''[4]

اس میں حکمت یہ ہے کہ امانت دار شخص اجر و ثواب کی خاطر امانت کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر بلاوجہ اس پر امانت کے ضیاع کا تاوان ڈال دیا جائے تو لوگ اس ذمے داری کو قبول کرنے میں پس و پیش کریں گے جس سے کئی لوگوں کا نقصان ہوگا، نیز فوائد کے حصول کے لیے یہ باعث رکاوٹ ہے۔

اگر امانت دار نے امانت کے تحفظ میں کوتاہی سے کام لیا تو تاوان اس پر ڈالا جائے گا کیونکہ اس نے اپنی غلطی سے کسی کا مال ضائع کیا ہے۔

① صحیح مسلم، الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر، حدیث:2699، ومسند أحمد: 296/2. ② [ضعیف] سنن ابن ماجه، الصدقات، باب الودیعة، حدیث :2401. ③ [ضعیف] سنن الدارقطني: 40/3، حدیث:2938. ④ [ضعیف] سنن الدارقطني:40/3، حدیث:2939.

امانت دار کو چاہیے کہ امانت کو کسی محفوظ جگہ میں اس طرح سنبھال کر رکھے جس طرح وہ اپنا مال رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے (عندالطلب) ادا کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ﴾

''بے شک اللہ (تاکیدی) حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں پہنچاؤ۔''[1]

ظاہر بات ہے کہ امانت کی صحیح صحیح ادائیگی تبھی ممکن ہے جب اسے سنبھال کر رکھا جائے گا۔ علاوہ ازیں جب امانت دار نے ایک امانت کو رکھنا قبول کر لیا تو اس پر لازم ہے کہ اس کی حفاظت میں پورا پورا التزام واہتمام کرے۔

▲ اگر امانت جانور کی صورت میں ہے تو امانت دار پر لازم ہے کہ اسے چارہ وغیرہ ڈالے۔ اگر اس نے اسے چارہ وغیرہ نہ ڈالا حتی کہ وہ جانور مر گیا یا بیمار پڑ گیا تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ (مالک کا حکم ہو یا نہ ہو) جانور کو چارہ ڈالنا اس کی ذمے داری میں شامل تھا، لہٰذا وہ نہ صرف ضامن ہوگا بلکہ اسے کھلانے پلانے میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے عنداللہ گناہ گار بھی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانور کا اس پر حق تھا۔

▲ امانت دار کسی کی امانت کو (عادت ومعمول کے مطابق) آگے کسی ایسے شخص کے پاس حفاظت کے لیے رکھ سکتا ہے جس کے پاس امانت رکھنے کا اس کا عام معمول ہے، مثلاً: اس کی اپنی بیوی، غلام، خزانچی یا خادم۔ اگر ان مذکورہ اشخاص میں سے کسی کے ہاں امانت ضائع ہوگئی تو وہ ضامن نہ ہوگا بشرطیکہ یہ نقصان اس کی کوتاہی اور سستی سے نہ ہوا ہو کیونکہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ خود مال کی حفاظت کرے یا کسی اور پر ذمے داری ڈال دے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔

▲ اگر اس نے کسی کی امانت کسی اجنبی شخص کے حوالے کر دی جو اس سے ضائع ہوگئی تو پہلا امانت دار ادائیگی کا ضامن ہوگا کیونکہ بلاوجہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، البتہ اگر امانت کو اجنبی شخص کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ ہو، مثلاً: کسی کا وقت موت آ گیا یا اس نے سفر کا ارادہ کر لیا اور وہ امانت اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ تلف ہونے کی صورت میں وہ ضامن نہ ہوگا۔

▲ اگر کوئی خوف ہو یا کوئی امانت دار سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ اسے مالک یا وکیل کے حوالے کر جائے وگرنہ اپنے ساتھ لے جائے بشرطیکہ کوئی خطرہ نہ ہو اگر سفر میں امانت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو حاکم کے حوالے کر جائے۔ اگر دیانت دار اور امین حاکم میسر نہ ہو تو کسی بااعتماد، ثقہ شخص کے حوالے کر دے جو اصل مالک تک پہنچا دے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے موقع پر لوگوں کی امانتیں ام ایمن رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دی تھیں

[1] النسآء 4:58.

اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ان کے مالکوں کے حوالے کر دے۔[1]

▲ اس طرح جس کو موت آ جائے اور اس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ ان کے مالکوں کو واپس کرے اگر مالک نہ مل رہے ہوں تو حاکم کے پاس یا جس پر اس کو اعتماد ہو اس کے پاس رکھ دے۔

▲ اگر کسی نے امانت کی حفاظت میں کوتاہی یا تعدی سے کام لیا جس کے نتیجے میں امانت ضائع ہوگئی تو امین شخص پر ضمان لازم ہے، مثلاً: کسی نے جانور بطور امانت اپنے ہاں رکھ لیا اور اس پر چارہ کھلانے اور پانی پلانے کے علاوہ کے لیے سواری کی یا امانت کے طور پر رکھا ہوا کپڑا خرابی سے بچانے کے علاوہ کے لیے پہن لیا یا دراہم جو تھیلی میں محفوظ تھے انھیں باہر نکال لیا یا تھیلی کا تسمہ کھول لیا۔ ان احوال میں اگر امانت ضائع ہوگئی تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ اس نقصان میں اس کی تعدی کو دخل ہے۔

▲ امانت دار دعویٰ کرے کہ اس نے امانت اس کے مالک یا اس کے قائم مقام کو لوٹا دی ہے یا امانت دار دعویٰ کرے کہ اس کے ہاں جو امانت تھی اس کے ضائع ہونے میں اس کی کوتاہی نہ تھی تو دونوں صورتوں میں امانت دار کی بات کا اعتبار قسم کے ساتھ ہوگا کیونکہ وہ امین ہے۔ اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ﴾

''بے شک اللہ تمھیں (تاکیدی) حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انھیں پہنچاؤ۔''[2]

کے مطابق ''امانت'' تھی، نیز اصل یہ ہے کہ کسی انسان کو سچا ہی سمجھا جاتا ہے الا یہ کہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل مل جائے۔

اسی طرح اگر امانت دار نے دعویٰ کیا کہ ''امانت'' آگ لگنے سے یا کسی اور حادثے میں ضائع ہوگئی ہے تو اس کی بات تب قبول ہوگی جب وہ اس حادثے کے واقعہ کے گواہ پیش کرے گا۔

▲ صاحب مال جب بھی امانت دار سے اپنی امانت کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اسے فوراً ادا کر دی جائے۔ اگر اس نے ٹال مٹول کی اور امانت رکھی ہوئی چیز ضائع ہوگئی تو امانت دار ضامن ہوگا کیونکہ اس نے بوقت مطالبہ ادا نہ کر کے حرام کام کا ارتکاب کیا ہے۔ واللہ أعلم.

[1] المغني والشرح الكبير: 280/7. [2] النسآء 58:4.

باب 10

غیر آباد زمین آباد کرنے اور جائز ملکیتوں کے احکام

غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے احکام

غیر آباد اراضی کی آبادی یہ ہے کہ مسلمان ایسی زمینوں کو جو کسی کی ملکیت میں نہ ہوں اور کسی اجتماعی مقصد کے لیے بھی مخصوص نہیں، درخت لگا کر یا مکان تعمیر کر کے یا کنواں لگوا کر آباد کرے۔ اس طرح وہ اس کا مستحق اور مالک بن جائے گا۔

اس تعریف کی رو سے دو باتیں واضح ہوئیں:

① اگر کوئی زمین مسلمان یا کافر کی قانونی ملکیت ہے (وہ خریدنے سے ہو یا عطیہ وغیرہ سے) تو اسے آباد کرنے سے کوئی مالک نہ ہوگا۔

② اگر اس زمین سے اجتماعی مصلحت و مفاد وابستہ ہو، مثلاً: عام راستہ ہو، لوگوں کے بیٹھنے کا ڈیرا ہو، پانی کے چشمے کی جگہ ہو یا بارش وغیرہ کے پانی بہنے کی جگہ ہو یا اس کی آبادی سے اہل شہر کی اجتماعی مصلحت پر زد پڑتی ہو، جیسے قبرستان یا کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے جگہ یا عید گاہ یا لوگوں کے لیے لکڑیاں جمع کرنے کی جگہ یا لوگوں کی چراگاہ ہو تو ان تمام جگہوں پر درخت لگا کر یا تعمیر کر کے کوئی شخص مالک نہیں ہوسکتا، البتہ اگر زمین کا کوئی ویران ٹکڑا کسی کی ملکیت میں نہیں اور اسے کسی شخص نے آباد کر لیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَّيْتَةً فَهِيَ لَهُ» ''جس نے کسی ویران زمین کو آباد کر لیا وہ اسی کی ہے۔''[1]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن میں بعض صحیح بخاری میں بھی ہیں۔

فقہائے اسلام ویران زمینوں کو آباد کرنے والے کو مالک قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی شرائط میں اختلاف ہے، البتہ حرم یا عرفات کے بارے میں فقہائے کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان اراضی پر درخت لگانے یا تعمیر کرنے والا مالک نہ ہوگا کیونکہ اس میں مناسک حج ادا کرنے میں لوگوں کے لیے مشقت و تکلیف ہوگی اور ایسی جگہوں پر سب کا حق یکساں ہوتا ہے۔

▲ غیر آباد جگہ کی آبادی درج ذیل صورتوں سے واضح ہوگی:

① جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر في إحياء أرض الموات، حديث: 1379، ومسند أحمد: 381/3.

① جب کسی نے ویران زمین کو درخت لگا کر یا باڑ لگا کر گھیر لیا ہو تو گویا اس نے اسے آباد کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى الْأَرْضِ فَهِيَ لَهُ»

''جس نے کسی ویران زمین پر دیوار کر لی یا باڑ لگا دی وہ اس کا مالک قرار پائے گا۔''[1]

ویران زمین کو آباد کرنے سے ملکیت تب ثابت ہو گی جب اس نے واقعتاً اس کو آباد کیا ہو، درخت لگائے ہوں یا مکانات تعمیر کیے ہوں یا پانی کے لیے کنویں کھودے ہوں۔

واضح رہے زمین کی آبادی اور ملکیت صرف ظاہری علامات لگانے اور مٹی یا اینٹوں کی چھوٹی سی چار دیواری کرنے سے جو ادھر ادھر سے رکاوٹ نہ بنے، یا ارد گرد کھدائی کر دینے سے ثابت نہ ہو گی، البتہ اس سے اس کا حق دوسروں سے فائق ضرور ہو گا۔ اور وہ اس زمین کو فروخت بھی نہیں کر سکتا جب تک اسے صحیح اور حقیقی طور پر آباد نہ کر لے۔

② جس نے ویران زمین میں کنواں کھودا کہ اس سے پانی تک رسائی ہو گئی تو گویا اس نے اسے آباد کر دیا ورنہ وہ مالک نہ ہو گا، البتہ اس سے اس کا حق دوسرے پر مقدم ہو گا کیونکہ اس نے اس کی آباد کاری میں پہل کی ہے۔

③ اگر کسی نے ویران زمین تک چشمے یا نہر کے پانی کا اجرا کر دیا تو بھی اس نے اسے آباد کر لیا کیونکہ دیوار کرنے کی نسبت پانی پہنچانے سے زمین کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

④ اگر کوئی جگہ پانی جمع ہونے کی وجہ سے ناقابل کاشت اور غیر آباد تھی تو کسی نے وہ پانی نکال کر اسے قابل کاشت بنا لیا تو گویا اس نے اسے آباد کر لیا، لہٰذا وہ اس کا مالک ہو گا کیونکہ پانی مہیا کرنا یا ٹھہرے ہوئے پانی کو نکالنا محض دیوار کر لینے سے، جس کا ذکر حدیث میں ہے، زیادہ فائدے والا عمل ہے کیونکہ وہ یہاں اقامت کر کے اس کا مالک بنا ہے۔

بعض علمائے کرام کی یہ رائے ہے کہ غیر آباد زمین کی آبادی کے لیے کوئی متعین علامات و شرائط نہیں بلکہ اس کا دارومدار وہاں کے لوگوں کے عرف پر ہے، یعنی جن صورتوں میں لوگ زمین کو آباد سمجھتے ہوں وہ صورت و علامت ہو گی تو زمین کو آباد کہا جائے اور وہ اس کا مالک ہو گا ورنہ نہیں۔ اکثر علمائے حنابلہ وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شریعت نے ملکیت کے لیے کوئی شرائط متعین نہیں کیں، لہٰذا زمین کی آبادی کے حکم کا دارومدار عرف عام پر ہو گا۔

حاکم کو حق حاصل ہے کہ ویران و غیر آباد اراضی ان لوگوں میں تقسیم کر دے جو انھیں آباد کر سکتے ہوں۔

[1] سنن أبي داود، الخراج، باب في إحياء الموات، حديث: 3077، ومسند أحمد: 381/3.

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو (اَلْقَبَلِیَّة) کے معادن الاٹ کیے تھے[1] اور سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو ''حضرموت'' کی اراضی الاٹ کی تھی۔[2] اسی طرح سیدنا عمر، سیدنا عثمان اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی کچھ اراضی الاٹ کی تھی۔

جس شخص کے حق میں الاٹ منٹ ہوئی اگر وہ اسے آباد کرلے گا تو وہ اس کا مالک ہوگا وگرنہ حاکم کو چاہیے کہ اس سے زمین واپس لے کر ایسے شخص کو دے دے جو اس کو آباد کرنے پر قدرت رکھتا ہو کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے زمینیں واپس لے لی تھیں جو انھیں آباد نہ کرسکے۔

▲ غیر آباد زمین کے سوا کسی اور مباح چیز، مثلاً: شکار کیا جانے والا جانور یا ایندھن کی لکڑی وغیرہ کے بارے میں یہ حکم ہے کہ جو شخص اسے پہلے حاصل کرے وہی اس کا حقدار ہے۔

▲ اگر لوگوں کی املاک کے پاس سے نہر یا وادی کا پانی گزرتا ہو تو پہلے اوپر والا فائدہ حاصل کرے اور ٹخنوں تک کھیت میں پانی کھڑا کرے، پھر اپنے قریب والے کو دے۔ کھیتوں کے اختتام تک اسی پر عمل کیا جائے الّا یہ کہ پانی پہلے ہی ختم ہوجائے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِسْقِ يَازُبَيْرُ! ثُمَّ احْبِسِ الْمَاءَ حَتَّى يَرْجِعَ إِلَى الْجَدْرِ ثُمَّ أَرْسِلِ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ»

''زبیر! (اپنے کھیت کو) پانی پلاؤ حتی کہ منڈیروں تک پہنچ جائے، پھر اپنے ہمسائے کی طرف چھوڑ دینا۔''[3]

امام زہری فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان: ''پانی کو روک رکھ حتی کہ منڈیروں تک پہنچ جائے۔'' پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ کھیت میں پانی کی بلندی ٹخنوں تک بنتی تھی، یعنی لوگوں نے بھی اس قصے کا اندازہ کیا تو انھوں نے اپنے ٹخنوں تک پایا۔ اب اسی کو استحقاق کا معیار بنالیا کہ پانی کا حق پہلے اسی کا ہے جس کا کھیت پہلے ہے، پھر اس کے بعد جس کا کھیت ہے۔''

اس روایت سے واضح ہے کہ کھیت کو پانی دینے میں اول شخص کا استحقاق ٹخنوں تک پانی جمع کرنے کا ہے۔ اسی طرح پھر بعد والوں کا استحقاق ہے۔

سیدنا عمرو بن شعیب رحمہ اللہ سے روایت ہے:

[1] سنن أبي داود، الخراج والفيء والإمارة، باب في إقطاع الأرضين، حديث:3061. [2] سنن أبي داود، الخراج والفيء والإمارة، باب في إقطاع الأرضين، حديث:3059,3058. [3] صحيح البخاري، المساقاة، باب سكور الأنهار، حديث:2360,2359، وصحيح مسلم، الفضائل، باب وجوب اتباعه ﷺ، حديث:2357.

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَضٰى فِي السَّيْلِ الْمَهْرُوزِ أَنْ يُمْسَكَ حَتَّى يَبْلُغَ الْكَعْبَيْنِ، ثُمَّ يُرْسِلَ الْأَعْلٰى عَلَى الْأَسْفَلِ»

''رسول اللہ ﷺ نے ''مہروز'' (مدینہ منورہ کی مشہور وادی) کے سیلابی پانی کے بارے میں فیصلہ دیا کہ پہلے (قریب اور اوپر والا شخص) پانی روک کر فائدہ حاصل کرے یہاں تک کہ پانی ٹخنوں تک جمع ہو جائے، پھر اوپر کی زمین والا نیچے والی زمین کے لیے پانی چھوڑ دے۔''[1]

◣ اگر پانی پر ایک سے زیادہ افراد کی ملکیت ہے تو ملکیت کے حساب سے باہم تقسیم کر لیں اور ہر ایک اپنے حصے کا پانی باہمی رضامندی سے حاصل کرے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔

◣ حاکم کو حق حاصل ہے کہ وہ بیت المال کے مویشیوں کی چراگاہوں کی حفاظت کرے، مثلاً: جہاد میں کام آنے والے گھوڑے اور جانور یا صدقے کے اونٹ وغیرہ، البتہ وہ مسلمانوں کو تنگ و پریشان کر کے تکلیف نہ دے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَمَى النَّقِيعَ لِلْخَيْلِ (أَيْ) لِخَيْلِ الْمُسْلِمِينَ»

''نبی ﷺ نے ''نقیع'' (چراگاہ) مسلمانوں کے گھوڑوں کے لیے مختص کر دی تھی۔''[2]

اسی طرح حاکم کو چاہیے کہ ویران جگہوں پر اگنے والی گھاس پھوس کو صدقے کے اونٹوں' مجاہدین کے گھوڑوں' جزیہ اور عام گم شدہ گھوڑوں اور اونٹوں وغیرہ کے لیے محفوظ کرا دے بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو اور عام مسلمانوں کو کوئی تنگی اور تکلیف نہ دے۔

جُعالہ کے احکام

لغت میں جُعَالَہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو کوئی کام کرنے کے بدلے میں دی جائے جبکہ شرعاً جُعَالَہ اس متعین مال کو کہتے ہیں جو ایک خاص کام انجام دینے والے غیر معین فرد کے لیے مقرر کیا جائے، مثلاً: ایک شخص کہتا ہے: ''جو مجھے یہ دیوار بنا کر دے گا میں اس کو اتنی رقم دوں گا۔'' اب جو شخص بھی یہ دیوار بنائے گا وہ اس مال کا مستحق ہو جائے گا۔

[1] سنن أبي داود، القضاء، باب في القضاء، حديث: 3639، والموطأ للإمام مالك، الأقضية، باب القضاء في المياه، حديث: 1491. [2] مسند أحمد: 2/155.

▲ جُعَالَہ کے جواز کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ۝﴾

''اور جو اسے لے آئے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ غلہ ہے اور اس وعدے کا میں ضامن ہوں۔''[1]

سنت رسول اللہ ﷺ سے جُعَالَہ کے جواز کی دلیل سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتے:

«اِنْطَلَقَ نَفَرٌ مِّنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفْرَةٍ سَافَرُوهَا حَتّٰى نَزَلُوا عَلٰى حَيٍّ مِّنْ أَحْيَاءِ الْعَرَبِ، فَاسْتَضَافُوهُمْ، فَأَبَوْا أَنْ يُّضَيِّفُوهُمْ، فَلُدِغَ سَيِّدُ ذٰلِكَ الْحَيِّ، فَسَعَوْا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ لَّا يَنْفَعُهُ شَيْءٌ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَوْ أَتَيْتُمْ هٰؤُلَاءِ الرَّهْطَ الَّذِينَ نَزَلُوا لَعَلَّهُ أَنْ يَّكُونَ عِنْدَ بَعْضِهِمْ شَيْءٌ، فَأَتَوْهُمْ فَقَالُوا: يٰأَيُّهَا الرَّهْطُ! إِنَّ سَيِّدَنَا لُدِغَ وَسَعَيْنَا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ لَّا يَنْفَعُهُ، فَهَلْ عِنْدَ أَحَدٍ مِّنْكُمْ مِّنْ شَيْءٍ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: نَعَمْ، وَاللهِ! إِنِّي لَأَرْقِي وَلٰكِنْ وَّاللهِ! لَقَدِ اسْتَضَفْنَاكُمْ فَلَمْ تُضَيِّفُونَا، فَمَا أَنَا بِرَاقٍ لَّكُمْ حَتّٰى تَجْعَلُوا لَنَا جُعْلاً، فَصَالَحُوهُمْ عَلٰى قَطِيعٍ مِّنَ الْغَنَمِ، فَانْطَلَقَ يَتْفِلُ عَلَيْهِ وَيَقْرَأُ: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ فَكَأَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ فَانْطَلَقَ يَمْشِي وَمَا بِهِ قَلَبَةٌ، قَالَ: فَأَوْفَوْهُمْ جُعْلَهُمُ الَّذِي صَالَحُوهُمْ عَلَيْهِ . . . فَقَدِمُوا عَلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَذَكَرُوا لَهُ، فَقَالَ: وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟ ثُمَّ قَالَ: قَدْ أَصَبْتُمْ اقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ سَهْمًا»

''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت ایک سفر میں عرب کے ایک قبیلے کے پاس سے گزری، اہل قبیلہ سے کھانا طلب کیا لیکن انھوں نے کھانے پینے کے لیے کچھ دینے سے انکار کر دیا، اتفاق سے قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈسا، انھوں نے اس کے علاج کے لیے بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی شے فائدہ نہ دے رہی تھی۔ کسی نے کہا: اگر تم ان لوگوں کے پاس جاؤ جو یہاں پڑاو ڈالے ہوئے ہیں شاید ان کے پاس کچھ ہو تو وہ ان (صحابۂ کرام) کے پاس آئے اور کہا: اے لوگو! ہمارے سردار کو سانپ نے ڈسا ہے اور ہم نے ہر ممکن کوشش کر لی ہے لیکن کوئی شے فائدہ نہیں دے رہی۔ کیا (ہمارے سردار کے علاج کے لیے) تم میں سے کسی

[1] یوسف 72:12.

کے پاس کوئی چیز ہے؟ ایک نے کہا: اللہ کی قسم! میں دم کرنا جانتا ہوں لیکن تم نے ہماری مہمانی نہیں کی، اس لیے میں بھی اس کا علاج نہیں کروں گا الّا یہ کہ تم ہمیں کوئی معاوضہ دو۔ الغرض بکریوں کا ایک ریوڑ دینے کے معاوضے پر مصالحت ہوگئی۔ صحابیٔ رسول سورۂ فاتحہ پڑھ کر تھوکنے لگا اور وہ (سردار) اس طرح تندرست ہوگیا گویا کوئی بیماری نہ تھی۔ اور انھوں نے حسب وعدہ بکریاں دے دیں...... جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے اس سارے واقعے کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تجھے کس نے بتایا کہ یہ (سورت) ''دم'' ہے؟ پھر فرمایا: تم نے درست کیا ہے، اسے باہم تقسیم کرلو اور اس میں سے میرا حصہ بھی مقرر کرو۔''[1]

- اگر کسی شخص نے علم ہو جانے کے بعد وہ کام کیا جس پر یہ خاص اجرت مقرر تھی تو کام کرنے والا کام مکمل کرنے کی صورت میں اجرت کا مستحق ہوگا اور اگر ایک جماعت مقرر کردہ کام کرنے لگ جائے تو اجرت کی رقم ان میں برابر برابر تقسیم ہوگی۔ اگر کوئی شخص از خود کام کرنے لگ جاتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں کہ اس پر اجرت مقرر ہو چکی ہے تو وہ اجرت کا مستحق نہیں ہے کیونکہ اس نے ایسا کام کیا جس کے کرنے کی اسے اجازت نہ تھی، البتہ اگر کام کرنے کے دوران اسے علم ہوا تو علم ہو جانے کے بعد کے عمل کا مستحق ہوگا۔

- جُعَالَہ ایک عقد ہے، لہٰذا دونوں فریق اسے فسخ کر سکتے ہیں۔ اگر عامل (کام کرنے والے) کی طرف سے عقد فسخ ہوا تو وہ اجرت کا مستحق نہیں ہوگا کیونکہ اس نے خود ہی اپنا استحقاق ترک کیا ہے۔ اگر کام کروانے والے کی طرف سے فسخ ہوا تو اگر یہ فسخ کام شروع کرنے سے قبل ہوگیا تو عامل کو اس کے کام کے مطابق صرف اس کی معروف مزدوری ملے گی۔

- جُعَالَہ اور اجارہ (کسی کو اجرت پر رکھنا) درج ذیل امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

① جُعَالَہ کی درستی کے لیے ضروری نہیں کہ جس کام پر جعالہ مقرر کیا گیا ہو اسے عامل کے علم میں لایا جائے بخلاف اجارے کے۔ اس میں شرط ہے کہ جس کام کی اجرت طے ہوئی ہو وہ عامل کے علم میں بھی ہو۔

② جُعَالَہ میں کام کی مدت متعین نہیں ہوتی جبکہ اجارے میں مدت عمل متعین ہوتی ہے۔

③ جُعَالَہ میں مدت اور کام دونوں کو جمع کرنا جائز ہے، مثلاً: کوئی کہے: ''جس نے اس کپڑے کی سلائی ایک دن میں کر دی تو اسے اتنے روپے ملیں گے تو اگر اس نے اس مقرر دن میں سلائی کر دی تو وہ انعام کا مستحق ہوگا ورنہ

---

[1] صحيح البخاري، الإجارة، باب ما يعطى في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب، حديث :2276، وصحيح مسلم، السلام، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية بالقرآن والأذكار، حديث :2201.

نہیں، بخلاف اجرت کے کہ اس میں عمل اور مدت دونوں کو جمع کرنا درست نہیں۔

④ جُعَالَہ میں عامل کام پورا کرنے کی ذمے داری نہیں لیتا جبکہ اجارے میں عامل ایک کام کو سرانجام دینا خود اپنے آپ پر لازم کر لیتا ہے۔

⑤ جُعَالَہ میں عامل کی تعیین شرط نہیں جب کہ اجارے میں یہ شرط ہے۔

⑥ جُعَالَہ ایسا عقد ہے جسے دونوں فریق ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر بھی فسخ کر سکتے ہیں بخلاف اجارے کے کیونکہ یہ عقد ہر فریق پر لازم ہوتا ہے، لہٰذا ایک فریق دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ نہیں کر سکتا۔

فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے کہ جو شخص کسی کا کام کسی مقررہ انعام کے بغیر اور مالک سے اجازت لیے بغیر کرتا ہے وہ کسی معاوضے یا انعام کا مستحق نہیں، اس لیے کہ اس نے کام کی ابتدا تبرعاً (خوشی سے) کی تھی، لہٰذا یہ انعام کا مستحق نہیں ہے کیونکہ جس چیز کو آدمی نے اپنے لیے لازم نہیں کیا وہ اس کو نہیں ملتی، البتہ اس سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:

① جب کسی کام کرنے والے یا مزدور نے خود کو اجرت پر کام کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار کر رکھا ہے، جیسے دلال یا مزدور وغیرہ۔ جب ہر ایک مالک کی اجازت سے کام کرے گا تو اجرت کا حقدار ہوگا۔ اگر اس نے اپنے آپ کو مزدوری کے لیے تیار نہیں رکھا ہوا تو وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا، خواہ مالک کی اجازت سے کام کیا ہو، البتہ اگر ان کے درمیان کام کرنے سے پہلے معاوضہ طے پایا ہو تو اسے معاوضہ دیا جائے گا۔

② جو شخص خود کو خطرات میں ڈال کر کسی انسان کو یا اس کے سامان کو ہلاکت و تباہی سے بچاتا ہے، مثلاً: کسی کو دریا میں ڈوبنے سے یا آگ میں جلنے سے یا کسی اور پرخطر صورت حال سے نکال کر بچا لیتا ہے تو معروف اجرت کا مستحق ہے اگرچہ اس نے یہ کام مالک کی اجازت سے نہ کیا ہو کیونکہ اگر وہ یہ کام نہ کرتا تو وہ شے یا سامان مالک سے ضائع ہو جاتا اور مالک کو کچھ نہ ملتا۔ اور اس لیے بھی کہ اجرت دینے میں اس طرح کے مشکل کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جس نے کسی کا مال ہلاکت سے بچا کر اس کے مالک کو پہنچا دیا تو وہ اس پر اجرت کا مستحق ہے اگرچہ بغیر شرط کے ہو۔ دو قولوں میں سے یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی منصوص ہے۔“[1]

---

[1] مجموع الفتاوٰی: 30/415۔

نیز امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جس نے کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر کام کیا تا کہ اس کام کے ذریعے سے دوسرے تک پہنچا جائے یا مالک کے مال کی حفاظت یا اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کوئی کام کرے تو درست بات یہی ہے کہ اسے کام کی مزدوری دی جائے گی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے کئی مواقع پر اس کی تصریح کی ہے۔“[1]

لُقَطه کے احکام

لُقَطه سے مراد ایسی گری پڑی چیز جو مالک سے گم ہو جائے۔

یاد رکھیے دین اسلام نے مال کی حفاظت اور اس کا خیال رکھنے کی تعلیم دی ہے اور مسلمانوں کے مال کا احترام اور اس کی محافظت کا درس دیا ہے۔ اسی میں سے ایک لُقَطه ہے۔

▲ گم شدہ چیز تین حالتوں سے خالی نہ ہوگی:

① اگر گری پڑی چیز معمولی ہے اور متوسط طبقہ کے لوگ اس کی پروا نہیں کرتے، مثلاً: چابک، روٹی، پھل کا دانہ اور لاٹھی وغیرہ تو اسے اٹھا کر اعلان کیے بغیر فوری طور پر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَخَّصَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الْعَصَا وَالسَّوْطِ وَالْحَبْلِ وَأَشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ يَنْتَفِعُ بِهِ»

”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گم شدہ لاٹھی، چابک اور رسی وغیرہ میں اجازت دی ہے کہ آدمی اٹھا کر اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔“[2]

② وہ حیوان جو چھوٹے درندوں سے اس وجہ سے محفوظ ہو کہ وہ مضبوط اور قد آور ہے، مثلاً: اونٹ، گھوڑا، گائے، خچر وغیرہ یا وہ اڑنے والا ہو، مثلاً: کبوتر یا وہ بہت تیز دوڑتا ہو، مثلاً: ہرن یا وہ اپنا دفاع اپنی کچلیوں سے خود کر سکتا ہو، مثلاً: چیتا وغیرہ...... یہ مذکورہ قسم کے جانور ایسے ہیں جنھیں پکڑنا ممنوع ہے، ان کو پکڑنے والا اعلان کرنے کے بعد بھی مالک قرار نہ پائے گا، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سے گم شدہ اونٹ کو پکڑنے کے بارے میں پوچھا گیا تو

① إعلام الموقعين: 379/2. ② [ضعيف] سنن أبي داود، اللقطة، باب التعريف باللقطة، حديث: 1717.

آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَالَكَ وَلَهَا؟ مَعَهَا سِقَاءُهَا وَحِذَاءُهَا ، تَرِدُ الْمَاءَ وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا»

''تم اسے کیوں پکڑتے ہو؟ حالانکہ اس کے ساتھ اس کا مشکیزہ (بڑا پیٹ) ہے اور اس کا جوتا ہے، وہ خود ہی پانی پی لے گا اور درختوں سے پتے کھالے گا حتی کہ اس کا مالک اسے پالے۔''[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''جس نے گم شدہ جانور (اونٹ وغیرہ) پکڑا وہ شخص گمراہ ہے۔''[2] یعنی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہے، لہٰذا اسے ہرگز نہیں پکڑنا چاہیے۔

درج بالا جانوروں کے علاوہ بڑے سائز کا سامان بھی اسی حکم میں شامل ہے، مثلاً: بڑی دیگ، لوہا، بھاری مقدار کی لکڑی وغیرہ یا جو چیز خود ہی محفوظ رہے وہ نہ ضائع ہو سکتی ہو اور نہ اپنی جگہ سے منتقل ہو سکتی ہو اسے اٹھانا یا پکڑنا ناجائز ہے۔

③ گم شدہ عام مال ہو، مثلاً: نقدی، عام سامان یا چھوٹے جانور جو درندوں سے خود دفاع اور بچاؤ نہیں کر سکتے، جیسے بکری، بچھڑا، اونٹ کا بچہ وغیرہ۔ اس قسم کی اشیاء یا جانوروں کو جو شخص پائے اگر اسے اپنی امانت و دیانت پر اعتماد ہو تو اٹھا لے۔ ایسی اشیاء کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ایسا حیوان جس کا گوشت کھایا جاتا ہو، مثلاً: اونٹ کا بچہ، بکری اور مرغی وغیرہ۔ ان گم شدہ جانوروں کو جو پکڑے اس کے لیے تین درج ذیل صورتیں ہیں، ان میں سے وہ صورت اختیار کی جائے جس میں مالک کا فائدہ زیادہ ہو۔

① اسے ذبح کر کے کھالے اور اس کی موجودہ قیمت مالک کو (جب بھی ملے) ادا کر دے۔

② پہچان کی خاطر اس جانور کی امتیازی علامات محفوظ کر لے، پھر اسے بیچ کر اس کی قیمت سنبھال کر رکھ لے تاکہ اس کے مالک کو بوقت ملاقات دی جا سکے۔

③ اس جانور کی حفاظت کرے۔ حسب ضرورت اس پر خرچ کرے تاکہ اس کی نگرانی و حفاظت ہوتی رہے۔ خود کو اس کا مالک نہ سمجھے۔ اگر مالک آ جائے تو اس کا جانور اس کے حوالے کر دے اور اس پر ہونے والے اخراجات وصول کر لے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جب گم شدہ بکری کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

---

① صحيح البخاري، العلم، باب الغضب في الموعظة والتعليم إذا رأى ما يكره، حديث:91، وصحيح مسلم، اللقطة، باب معرفة العفاص والوكاء وحكم ضالة الغنم والإبل، حديث : 1722 واللفظ له. ② السنن الكبرى للبيهقي : 191/6.

«خُذْهَا فَإِنَّمَا هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ»

''اسے پکڑ لو، وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ہے یا بھیڑیے کی ہے۔''[1]

ابن قیم رحمہ اللہ اس روایت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں گم شدہ بکری کو اٹھا لینے کا جواز ہے۔ بکری کا مالک اگر نہ آئے تو وہ اٹھانے والے کی ملک ہوگی۔ اس حال میں اسے اختیار ہے کہ اسے کھا لے اور اس کی قیمت مالک کو ادا کر دے یا اسے بیچ کر اس کی قیمت محفوظ کر لے یا پھر اس کی حفاظت کرے اور اپنے مال سے اس پر خرچ کرے۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر بکری کا مالک آ جائے اور اس گم شدہ بکری کو اٹھانے والے نے کھایا نہ ہو تو اس کا مالک اس کو لینے کا حقدار ہے۔''

دوسری قسم: وہ اشیاء جن کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً: تربوز یا کوئی اور پھل۔ ایسی اشیاء کو اٹھانے والا خود کھا لے اور بعد میں مالک کو اس کی قیمت ادا کر دے یا فروخت کر دے اور اس کی قیمت مالک کے لیے سنبھال کر رکھ لے۔

تیسری قسم: عام اموال و اشیاء جو درج بالا دو اقسام کی اشیاء کے سوا ہیں، مثلاً: نقدی یا برتن۔ اس قسم کی اشیاء کو امانت سمجھ کر بعینہ اسی حالت میں محفوظ رکھے اور لوگوں کے جمع ہونے کی جگہوں میں اعلان کرے اور متعارف کروائے۔

▲ گری پڑی چیز وہی شخص اٹھائے جسے اپنی امانت داری پر اعتماد ہو اور اسے متعارف کروانے کی ہمت رکھتا ہو ورنہ نہ اٹھائے کیونکہ سیدنا زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گم شدہ سونے یا چاندی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِعْرِفْ وِكَاءَهَا وَعِفَاصَهَا ، ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً ، فَإِنْ لَّمْ تُعْرَفْ فَاسْتَنْفِقْهَا ، وَلْتَكُنْ وَّدِيعَةً عِنْدَكَ ، فَإِنْ جَاءَ طَالِبُهَا يَوْمًا مِّنَ الدَّهْرِ فَأَدِّهَا إِلَيْهِ ، وَسَأَلَهُ عَنْ ضَالَّةِ الْإِبِلِ؟ فَقَالَ: مَالَكَ وَلَهَا؟ دَعْهَا ، فَإِنَّ مَعَهَا حِذَاءَهَا وَسِقَاءَهَا ، تَرِدُ الْمَاءَ وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّى يَجِدَهَا رَبُّهَا، وَسَأَلَهُ عَنِ الشَّاةِ؟ فَقَالَ: خُذْهَا فَإِنَّمَا هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ»

''اس (ملنے والی) چیز کو باندھنے والی رسی اور اس کی تھیلی کی پہچان رکھ، پھر ایک سال تک اعلان کرتا رہ۔

[1] صحيح البخاري، اللقطة، باب ضالّة الغنم، حديث: 2428، وصحيح مسلم، اللقطة، باب معرفة العفاص والوكاء وحكم ضالة الغنم والإبل، حديث: 1722 واللفظ له.

اگر اسے پہچاننے والا (مالک) نہ آئے تو اس سے (خرچ کر کے) فائدہ اٹھا لے۔لیکن پھر وہ شے تیرے پاس امانت رہے گی۔ اگر اس کا مالک کسی وقت بھی آ جائے تو اسے وہ شے (یا اس کی قیمت) دے دے۔'' پھر اس نے آپ ﷺ سے گم شدہ اونٹ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:'' تجھے اس سے کیا سروکار؟ اس کے پاس پانی کے لیے مشکیزہ ہے۔اس کے پاؤں مضبوط ہیں، تالاب سے پانی حاصل کرے گا اور درختوں کے پتے کھا لے گا یہاں تک کہ اس کا مالک آ کر اسے پکڑ لے۔'' پھر آپ سے گم شدہ بکری کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:'' تو اسے پکڑ لے، وہ یا تو تیرے لیے ہے یا تیرا بھائی اس کا مالک بن جائے گا یا پھر اسے بھیڑیا کھا جائے گا۔''[1]

حدیث میں مذکور لفظ: عِفَاصٌ اور وِکَاءٌ کے معنی ہیں:'' نفقہ وغیرہ کا تھیلا اور اس کا منہ باندھنے والی رسی (ڈوری)'' اور حدیث کے لفظ: ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً کا مفہوم ہے کہ گم شدہ چیز کو سال بھر متعارف کروائے ،اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے جمع ہونے والے مقامات، یعنی ڈیروں، بازاروں، مساجد کے دروازوں اور اجتماع گاہوں میں اس کا اعلان کرے جو ایک سال تک ہو پہلے ہفتے میں ہر روز اعلان کیا جائے کیونکہ پہلے ہفتے میں مالک کے آنے کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔ایک ہفتے کے بعد حسب عادت اس کا اعلان وقتاً فوقتاً کرتا رہے۔

▲ حدیث مذکور کے کلمات سے واضح ہوتا ہے کہ گم شدہ شے کا اعلان وتعارف کروانا واجب ہے حتی کہ شے کا مالک آ جائے۔اگر وہ ٹھیک ٹھیک علامات بتا دے تو شے اس کے حوالے کر دی جائے ورنہ اس کے حوالے کرنا جائز نہیں۔

▲ حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک سال تک اعلان کرنے کے بعد جسے شے ملی ہے وہ اس کا مالک ہو گا لیکن اس کو استعمال میں لانے سے قبل اس کی تھیلی ،تسمہ، مقدار، جنس اور مزید امتیازی علامات ونشانات کو دل و دماغ میں یا تحریری طور پر محفوظ کر لے۔اگر سال کے بعد اصل مالک آ گیا اور اس نے شے کی ٹھیک ٹھیک علامات بتا دیں تو اس کے حوالے کر دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہی حکم ہے۔

▲ سابقہ حدیث سے لقطے کے بارے میں چند امور کی وضاحت ہوتی ہے:

① اگر کسی کو کوئی گری پڑی شے ملے تو وہ اسے اٹھانے کی کوشش نہ کرے الّا یہ کہ اسے اپنے آپ پر امانت ودیانت کا بھروسہ ہو اور اعلان کرنے کی ہمت وطاقت رکھتا ہو یہاں تک کہ اس کا مالک مل جائے۔اگر اسے اپنی امانت خطرے میں محسوس ہو تو اس شے کو اٹھانا جائز نہیں، اگر اس نے وہ شے اٹھالی تو وہ غاصب شمار ہو گا کیونکہ اس نے کسی

① صحيح البخاري، العلم، باب الغضب في الموعظة والتعليم إذا رأى مايكره، حديث :91، وصحيح مسلم، اللقطة، باب معرفة العفاص والوكاء وحكم ضالة الغنم والإبل، حديث :1722.

کا مال ایسے طریقے سے پکڑا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں تھا اور اس میں دوسرے کے مال کو ضائع کرنا بھی لازم آئے گا۔

② گری پڑی شے کو لینے سے قبل اس کے برتن، تھیلی اور تسمے کی صفات اور اس شے کی مقدار، جنس اور اس کی قسم اچھی طرح نوٹ کر لے، ایسا کرنا لازمی ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور مطلق حکم (امر) وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

③ گری پڑی شے اٹھانے کے بعد پورا ایک سال اس کا اعلان کرنا لازمی ہے۔ پہلا ہفتہ روزانہ اعلان کرے، پھر دستور کے مطابق وقتاً فوقتاً اعلان کرے۔ اعلان کرنے کے لیے لوگوں کے عمومی اجتماع، بازار اور مساجد کے دروازوں پر کھڑا ہو کر اعلان کرے کہ کسی کی کوئی شے گم ہوئی ہو تو؟ مساجد کے اندر (سپیکر وغیرہ پر) اعلان نہ کرے کیونکہ مساجد اس قسم کے کاموں کے لیے نہیں بنائی جاتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا»

''جس آدمی کو تم سنو کہ وہ مسجد میں گم شدہ شے کا اعلان کر رہا ہے تو تم کہو: اللہ تعالیٰ (تیری شے) واپس نہ کرے کیونکہ مساجد اس کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔''[1]

④ گم شدہ شے تلاش کرنے والا جب آئے اور ٹھیک ٹھیک علامات بیان کر دے تو بغیر دلیل طلب کیے اور بغیر قسم لیے اس کو دے دو۔ آپ ﷺ نے بھی اسی بات کا حکم دیا ہے۔ اور اس چیز کی صحیح علامت بیان کر دینا گواہی (دلیل) اور قسم کے قائم مقام ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات دلیل اور قسم کی نسبت صحیح علامات کی نشان دہی زیادہ واضح اور زیادہ سچی ہوتی ہے۔ نیز اس (گری پڑی شے) کی متصل یا منفصل بڑھوتری بھی ساتھ ہی واپس کی جائے گی، ہاں! اگر اس شے کا طالب علامات بیان نہ کر سکے تو یہ شے اس کو نہ دی جائے کیونکہ یہ ایک امانت ہے اور امانت ایسے شخص کو دینا جائز نہیں جس کا مالک ثابت نہ ہو۔

⑤ ایک سال اعلانات کے باوجود اس شے کا مالک نہ آئے تو وہ شے اٹھانے والے کی ملک ہو جائے گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شے کو خرچ کرنے سے قبل اس کی علامات وغیرہ اچھی طرح محفوظ کر لے، اگر کہیں اس کا مالک آ جائے اور مذکورہ صفات وعلامات بتا دے تو وہ شے اس کو لوٹا دی جائے اگر بعینہ موجود ہو، اگر اس میں تصرف ہو چکا ہو تو اس کا بدل اسے دیا جائے کیونکہ اس کی ملکیت ایک نگہبان اور حفاظت کرنے والے کی طرح

[1] صحيح مسلم المساجد، باب النهي عن نشد الضالة في المسجد...... ، حديث :568.

عارضی ملکیت تھی جو کہ اس کے مالک کے آ جانے سے ختم ہوگئی۔

⑥ حرم (مکہ) میں گری ہوئی چیز کے بارے میں علمائے کرام میں اختلاف ہے کہ اسے اٹھانے والا ایک سال تک متعارف کروانے کے بعد مالک ہوگا یا نہیں؟ بعض علماء کا کہنا ہے کہ مدت مقررہ (ایک سال) کے بعد شے کو اٹھانے اور متعارف کروانے والا مالک ہوگا کیونکہ دلائل میں عموم ہے، جبکہ فریق ثانی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ مالک نہ ہوگا اور نہ اپنے تصرف میں لائے گا بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کا اعلان کرتا رہے کیونکہ مکہ مکرمہ سے متعلق فرمان نبوی ہے:

«وَلَا تَحِلُّ لُقَطَتُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ» ''اس کا لقطہ اٹھانا جائز نہیں مگر جو اسے متعارف کروانا چاہتا ہو۔''[1]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسی نقطہ نظر کو پسند کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''حرم کے لقطے کو اٹھانے والا کبھی بھی مالک نہیں ہوگا بلکہ اس پر ہمیشہ اعلان کرنا واجب ہے۔''[2] اور حدیث کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔

⑦ اگر کوئی شخص کسی ویران جگہ جانور کو اس لیے پیچھے چھوڑ گیا کہ وہ ریوڑ کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہا یا مالک اسے اپنے ساتھ لے جانے میں کمزور ثابت ہوا تو ایسے جانور کو پکڑنے والا مالک بن جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے:

«مَنْ وَّجَدَ دَابَّةً عَجَزَ عَنْهَا أَهْلُهَا أَنْ يَّعْلِفُوهَا فَسَيَّبُوهَا، فَأَخَذَهَا فَأَحْيَاهَا فَهِيَ لَهُ»

''جس نے ایسا جانور پایا کہ جس کا مالک اسے چارہ دینے سے عاجز ہو اور وہ اسے پیچھے چھوڑ گیا ہو تو جس نے پکڑ لیا، چارہ دیا اور خدمت کی تو وہ اسی کا ہے۔''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک کو اس کی طلب اور اس میں رغبت نہیں رہی، لہٰذا اس کا حکم وہی ہوگا جو ردی چیزوں کا ہوتا ہے۔ جس شخص کا جوتا یا سامان اٹھالیا گیا اور اسے اسی جگہ ویسا ہی جوتا یا کوئی اور سامان مل گیا تو وہ اسے اپنی شے کا بدل سمجھ کر خود کو مالک نہ سمجھے بلکہ وہ لقطہ ہے جو ایک سال تک متعارف کروائے گا۔ متعارف کروانے کے بعد اپنے حق کے مطابق اس کا مالک ہوگا اور باقی حصہ صدقہ کر دے۔

⑧ اگر کسی بچے یا کم عقل کو کوئی گری پڑی شے مل گئی تو اس کا ولی ایک سال تک اس شے کا اعلان کرے اور اسے متعارف کروائے، نیز وہ شے اپنے قبضے میں لے لے کیونکہ وہ دونوں امانت قبول کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اگر ولی نے ان سے وہ شے حاصل نہ کی حتی کہ ضائع ہوگئی تو ولی ضامن ہوگا کیونکہ وہ اسے ضائع کرنے والا ثابت ہوا۔ اگر مالک نہ آیا تو شے بچے یا کم عقل (جس نے اٹھائی ہے) کی ملکیت ہو جائے گی لیکن

---

① صحيح البخاري، اللقطة، باب كيف تعرف لقطة أهل مكة ؟ حديث:2433. ② الفتاوى الكبرى، باب الوديعة: 423/5. ③ سنن أبي داود، البيوع، باب فيمن أحيا حسيراً، حديث:3524.

مالک کے آنے پر ادائیگی ضرور ہوگی جیسا کہ عاقل و بالغ کا فرض ہے۔

⑨ اگر کسی شخص نے گری پڑی شے اٹھا کر دوبارہ وہیں رکھ دی حتی کہ وہاں پڑی پڑی ضائع ہوگئی تو یہ شخص ضامن ہو گا اس کے ہاتھ میں ایک امانت آئی تھی جس کی اسے دیگر امانتوں کی طرح حفاظت کرنی چاہیے تھی اس نے وہاں چھوڑ کر ضائع کر دی، لہٰذا وہ ضامن ہوگا۔

تنبیہ: دین اسلام نے لقطہ کے بارے میں ہمیں جو ہدایات دی ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کے اموال اور سامان کی حفاظت کرنے اور انھیں سنبھال کر رکھنے کی بڑی اہمیت ہے، نیز اسلام ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی و خیر خواہی کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی رغبت دلاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلام پر قائم و دائم رکھے اور اسی پر موت دے۔ آمین

لَقِیط کا حکم

لقیط اور لُقطہ کے مسائل کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے کیونکہ ''لقطہ'' گرے پڑے مال و متاع کو کہتے ہیں جبکہ ''لقیط'' گرے پڑے یا گم شدہ بچے کو کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہیں حتی کہ اس میں یتیم بچوں اور بے سہارا لوگوں کے حقوق بھی موجود ہیں بلکہ اسلام کے سنہری اصول اور انسانی حقوق آج کی مہذب دنیا کے معروف حقوق سے کئی درجے اعلیٰ اور فائق ہیں۔ اسی طرح اسلام نے لقیط کے بارے میں بھی لوگوں کی راہنمائی کے لیے اہم ہدایات دی ہیں۔

شرعی اعتبار سے جو بچہ کسی کو گرا پڑا یا گمشدہ حالت میں ملے اور اس کا نسب غیر معروف ہو اور کوئی اس کا مدعی بھی نہ بنے کہ یہ میرا ہے تو وہ ''لقیط'' ہے۔

لقیط کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسے حاصل کر کے اس کی تربیت و کفالت کرلے تو سب کی ذمے داری پوری ہو جائے گی، یعنی کوئی بھی گناہ گار نہ ہوگا۔ گویا یہ فرض کفایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾ ''نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو۔''[1]

آیت کے الفاظ اپنے عموم کے اعتبار سے لقیط بچے کو اٹھانے اور اس کی پرورش کرنے کے حکم کو بھی شامل ہیں

[1] المآئدة 2:5.

کیونکہ یہ بھی نیکی وتقوی میں تعاون کی ایک صورت ہے، نیز کسی کو اٹھا کر اس کی زندگی بچانا اسی طرح فرض ہے جیسے بوقت ضرورت کسی کو کھانا کھلانا یا کسی کو ڈوبنے سے بچانا فرض ہے۔

▲ لقیط بچہ تمام احکام شرعیہ میں آزاد متصور ہوگا کیونکہ آزادی اصل ہے اور غلامی ایک عارضہ ہے، جب کسی کی غلامی کا علم نہ ہو سکے تو اصل (آزادی) ہی کا اعتبار ہوگا۔

▲ اگر بچے کے ساتھ یا اس کے قریب ہی مال بھی ملا ہو تو اٹھانے والا اسی بچے کا مال سمجھ کر معروف اور مناسب طریقے سے اس پر خرچ کرے گا کیونکہ وہ بچے کا ولی اور سرپرست ہے۔ اگر مال نہیں ہے تو بیت المال سے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو (جس نے لقیط کو اٹھایا تھا) فرمایا:

«اِذْهَبْ فَهُوَ حُرٌّ وَّلَكَ وَلَاؤُهُ وَعَلَيْنَا نَفَقَتُهُ»

''اسے لے جاؤ یہ بچہ آزاد ہے غلام نہیں۔ اس کی سرپرستی تمھارے ذمے اور اخراجات ہمارے ذمے ہیں۔''[1]

واضح رہے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مراد ''بیت المال'' تھی۔

ایک روایت میں ہے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَعَلَيْنَا رَضَاعُهُ ''اسے دودھ پلانے کی ذمے داری ہم (بیت المال) پر ہے۔''

اس روایت کی روشنی میں بچے کے اخراجات اسے اٹھانے والے شخص پر نہیں بلکہ یہ بیت المال کی ذمے داری ہے۔ اگر بیت المال کا انتظام نہ ہو تو ان مسلمانوں پر اس کا خرچ ہے جو اس کے حالات سے واقف ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ ''نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو۔''[2]

علاوہ ازیں اخراجات کے ترک میں بچے کی ہلاکت ہے۔ مزید برآں اس کے اخراجات اٹھانا اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی ہے، جیسے مہمان کی مہمان نوازی۔

▲ اگر بچہ مسلمانوں کے کسی ملک سے ملا ہے یا کافروں کے کسی ایسے ملک میں سے ملا ہے جہاں کی اکثریت مسلمان ہے تو بچہ دینی اعتبار سے مسلمان متصور ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُّولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ» ''ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔''[3]

① الموطأ للإمام مالك، الأقضية، باب القضاء في المنبوذ، حديث: 1482. ② المآئدة 2:5.

③ صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين؟ حديث:1385. اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ بچہ کسی بھی جگہ سے ملے وہ ہر صورت مسلمان ہی متصور ہوگا۔ (صارم)۔

لَقِیط کا حکم

اگر بچہ خالص کافر ملک سے ملا ہے یا اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے تو ملک کا اعتبار کرتے ہوئے بچہ کافر متصور ہوگا جبکہ اس کی پرورش اسے اٹھانے والے ہی کے ذمے ہوگی بشرطیکہ وہ شخص امین ہو کیونکہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک لقیط بچے کی پرورش کی ذمے داری ابو جمیلہ نامی شخص پر ڈالی۔ جب معلوم ہوا کہ وہ نیک اور امین شخص ہے تو فرمایا: ''تم ہی اس کے سرپرست ہو۔'' اور اسے اٹھانے کی وجہ سے تم دوسروں کی نسبت پرورش کا حق زیادہ رکھتے ہو۔''[1]

* اگر بچے کے ساتھ مال بھی ملا ہو تو اس کو اٹھانے والا (سرپرست) وہی مال اس پر معروف طریقے سے خرچ کرے۔
* اگر بچے کو اٹھانے والا پرورش کرنے کے لائق نہیں، مثلاً: وہ فاسق یا کافر و مشرک ہے جبکہ لقیط بچہ مسلمان ہے تو بچہ ایسے شخص کے حوالے نہ کیا جائے۔ اسلام کسی کافر یا فاسق کو ولی و سرپرست مقرر کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ ان سے بچے کے دین کو خطرہ ہے۔
* اگر بچے کو اٹھانے والا خانہ بدوش ہے (جبکہ بچہ شہر سے ملا ہے) تو اس خانہ بدوش پر پرورش کی ذمے داری نہ ڈالی جائے کیونکہ وہ مختلف جگہوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس میں بچے کے لیے مشکلات ہیں۔ ایسے شخص سے بچہ لے کر کسی شہری کے حوالے کیا جائے کیونکہ خانہ بدوشی کی نسبت شہری زندگی بچے کے دین و دنیا کی بہتری کے اعتبار سے مناسب ترین ہے، نیز اس سے بچے کے خاندان اور ورثاء کی تلاش اور اس کے نسب کی معرفت میں بھی آسانی و سہولت ہے۔
* لقیط اگر مر جائے تو بیت المال اس کا وارث ہے۔ اگر اس پر ایسی جنایت کی جائے جس سے دیت لازم ہو تو اس کی دیت بیت المال میں جمع ہوگی بشرطیکہ اس کا کوئی وارث نہ ہو اور اگر اس کی بیوی زندہ ہو تو اسے چوتھائی ترکہ ملے گا۔

اگر لقیط کو عمداً قتل کر دیا گیا تو اس کی دیت بیت المال میں جمع ہونے کی وجہ سے تمام مسلمان اس کے وارث ہوں گے، البتہ حاکم اس کا ولی و وارث بن کر مسلمانوں کی نیابت کرے گا، لہٰذا اسے (حاکم کو) قصاص یا بیت المال کے لیے دیت میں سے کسی ایک کا اختیار ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

«اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهُ» ''جس کا کوئی ولی نہیں، امام (حاکم) اس کا ولی ہے۔''[2]

اگر اسے زخمی کر دیا گیا تو اس کی بلوغت اور سمجھ بوجھ کی عمر تک انتظار کیا جائے گا تاکہ وہ چاہے تو قصاص لے

① السنن الكبرى للبيهقي: 202/6، اللقطة، باب التقاط المنبوذ...... وإرواء الغليل: 23/6، حديث: 1573. ② سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، حديث: 2083.

لے یا معاف کر دے۔

لقیط کے بارے میں اگر کوئی مرد یا عورت دعویٰ کرے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اس صورت میں اگر اس کا بیٹا ہونا ممکن ہو تو اس کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے گا کیونکہ بچے کے نسب کے اتصال میں بچے کا فائدہ ہے اور کسی دوسرے کا نقصان بھی نہیں۔ اور اگر بہت سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں تو ان میں سے جو شخص دلیل پیش کرے گا وہ مقدم اور راجح ہو گا۔ اگر کسی کے پاس واضح دلیل نہ ہو اور متعدد دعویداروں کے دلائل میں تعارض ہو تو فیصلہ کسی قیافہ شناس سے کرایا جائے گا جو انصاف پسند' سمجھ دار اور تجربہ کار ہو۔ اور قیافہ شناس جس کے ساتھ نسب ملا دے اسی کے لیے فیصلہ کر دیا جائے گا کیونکہ ایک مرتبہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ایک قیافہ شناس کے فیصلے کی بنیاد پر فیصلہ کیا تھا۔[1] واللہ أعلم.

وقف کا حکم

کسی چیز (اصل) کو (بیع، وراثت اور ہبہ سے مستثنیٰ قرار دے کر) محفوظ کر لینا اور اس کی آمدنی اور فائدہ کسی خاص مد کے لیے فی سبیل اللہ متعین کرنا وقف کہلاتا ہے۔

واضح رہے اصل چیز سے مراد ایسی شے ہے جس سے استفادہ ممکن ہو اور استفادے کے بعد بھی وہ شے باقی رہے، مثلاً: مکان، دکان اور باغ وغیرہ۔ اور نفع سے مراد اس چیز کی آمدنی اور فائدہ ہے، مثلاً: پھل، کرایہ، گھر کی رہائش وغیرہ۔

اسلام میں وقف کرنا مستحب ہے اور اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ جس کی دلیل سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خیبر میں زمین ملی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشورے کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے خیبر میں جو زمین ملی ہے، اس سے بہتر اور نفیس مال میرے ہاں اور کوئی نہیں۔ اس کے بارے میں میرے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا»

[1] ایک قیافہ شناس کی زبان سے جب یہ بات نکلی کہ زید بن حارثہ اور اسامہ رضی اللہ عنہما دونوں باپ بیٹا ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ دیکھیے: صحیح بخاری، حدیث: 3555 (صارم)۔

''اگر تم چاہو تو اپنا اصل مال وقف کر دو اور اس (کے نفع) کو صدقہ کر دو۔''[1]

چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس طرح صدقہ کیا کہ اس کا اصل بیچا جائے نہ ہبہ کیا جائے اور نہ میراث بنایا جائے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُـنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»

''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین چیزیں جاری رہتی ہیں: صدقہ جاریہ، علم جس سے فائدہ حاصل کیا جا رہا ہے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''[2]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اگر کوئی صاحب استطاعت ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ وقف کرتا۔''[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مساجد اور پلوں کو وقف قرار دینے میں علماء کے درمیان قطعاً اختلاف نہیں، البتہ دوسری چیزوں میں اختلاف ہے۔''[4]

✍ وقف کی شرائط میں سے ہے کہ وقف کرنے والا وقف کرنے کا اہل اور صاحب اختیار ہو، یعنی عاقل و بالغ اور آزاد ہو، لہٰذا نادان، بچے اور غلام کا کوئی شے وقف کرنا صحیح نہیں۔

✍ وقف کا انعقاد دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے ساتھ ممکن ہے:

① الفاظ کے ساتھ وقف ہو، مثلاً: کوئی کہے: ''میں نے یہ مکان وقف کیا۔'' یا ''میں نے اس جگہ کو مسجد بنا دیا ہے۔''

② وقف کرنے والا کوئی ایسا کام یا انداز اختیار کرے جو عرف میں وقف پر دلالت کرتا ہو، مثلاً: کوئی اپنے گھر کو مسجد قرار دے دے اور لوگوں کو وہاں نماز ادا کرنے کی عام اجازت دے یا کوئی شخص اپنی زمین کو قبرستان بنا دے اور وہاں عام لوگوں کو مردے دفن کرنے کی اجازت دے دے۔

✍ جو الفاظ ''وقف'' پر دلالت کرتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

① صریح الفاظ کے ساتھ ہو، یعنی ''وقف'' کا لفظ استعمال کیا جائے یا ایسا لفظ جس کا مفہوم وقف کے علاوہ اور کوئی نہ

① صحيح البخاري، الشروط، باب الشروط في الوقف، حديث: 2737، وصحيح مسلم، الوصية، باب الوقف، حديث:1632. ② صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته؟ حديث: 1631. ③ منار السبيل، ص:397. ④ تفسير القرطبي: 22/19، الجن 18:72.

ہو، لہٰذا جب کوئی کسی شے پر ایسے الفاظ استعمال کرے گا تو بلا تاویل شے کو وقف ہی سمجھا جائے گا۔

② کنائے کے الفاظ کا استعمال ہو، مثلاً: کسی شے کے بارے میں صدقہ اور حرمت وغیرہ کے الفاظ کہے۔ ان الفاظ کو کنایہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان میں وقف اور غیر وقف دونوں کا احتمال ہے، لہٰذا اس میں انسان کی نیت فیصلہ کن ہوگی یا کنائے کے الفاظ کے ساتھ کوئی ایک صریح لفظ یا ایسا کنائے کا لفظ بولا جائے جس سے وقف کی طرف اشارہ ہو جائے۔ کنائے کے ساتھ صریح الفاظ کی مثال یہ ہے، کوئی کہے: ''میں نے فلاں شے وقف کرتے ہوئے صدقہ کی یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صدقہ کی وغیرہ۔'' اور کنائے کے الفاظ کے ساتھ کنائے کا ایسا لفظ بولنا جس سے وقف سمجھ آتا ہو تو اس کی مثال یوں ہوگی: ''میں نے یہ چیز صدقہ کی، اسے بیچا جائے گا نہ وراثت میں منتقل ہوگی۔''

✍ وقف کی درستی کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

① واقف (وقف کرنے والا) شے کے تصرف میں با اختیار ہو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

② موقوف (وقف شدہ) شے ایسی ہو کہ فائدہ حاصل کرنے کے بعد بھی باقی رہے، مثلاً: مکان یا اراضی وغیرہ۔ اور جو شے استعمال کرنے سے ختم ہو جائے، مثلاً: کھانے پینے کی شے تو ایسی چیز وقف نہیں ہوتی۔ (اور نہ اسے وقف کہا جاتا ہے۔ ایسی شے کے خیرات کرنے کو صدقہ کہتے ہیں۔)

③ وقف شدہ شے معین ہو۔ غیر معین شے کا وقف درست نہیں، مثلاً: کوئی کہے: ''میں نے اپنے غلاموں میں سے ایک غلام وقف کیا یا اپنے مکانات میں سے ایک مکان وقف کیا۔''

④ وقف کا مصرف جائز ہو کیونکہ وقف سے مقصود تقرب الی اللہ ہے، مثلاً: مساجد، پل، مساکین، پانی کی سبیلیں، علمی کتب یا کسی رشتے دار کے لیے شے وقف کرنا۔ ناجائز مصرف کے لیے وقف درست نہیں، مثلاً: کفار کی عبادت گاہ کے لیے جگہ دینا، دین اسلام کے مخالف لٹریچر کے لیے وقف کرنا، مزاروں پر روشنی یا خوشبو کے لیے یا ان کے مجاوروں کے لیے کوئی چیز وقف کرنا کیونکہ اس سے گناہ، شرک اور کفر کو تقویت ملتی ہے۔

⑤ موقوف علیہ (جس کو وقف کی شے دی جا رہی ہے) اگر وہ معین فرد ہو تو ایسا ہو جو مالک بننے کا اہل ہو کیونکہ وقف تملیک ہے اور جو شخص مالک نہیں بن سکتا اس پر وقف درست نہیں، مثلاً: میت یا حیوان وغیرہ۔

⑥ وقف کی درستی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ غیر محدود مدت کے لیے ہو، لہٰذا ایسا وقف جس کا وقت مقرر ہو یا وہ مشروط ہو، درست نہیں، البتہ اگر کوئی شخص اپنی موت کی شرط لگا دے تو وقف درست ہے، مثلاً: کوئی کہے: ''جب میں فوت ہو جاؤں تو میرا گھر فقراء کے لیے وقف ہوگا۔''

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی "ثمغ" (نامی) زمین سے متعلق وصیت کی تھی کہ وہ ان کی موت کے بعد صدقہ ہے۔ [1] اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ بنابریں اس کا جواز اجماع صحابہ سے ثابت ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ موت سے مشروط وقف تہائی مال سے زائد نہ ہو کیونکہ یہ عمل وصیت کے حکم میں ہے۔

وقف کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ واقف (وقف کرنے والے) کی شرط پر عمل کیا جائے بشرطیکہ وہ حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار نہ دے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا»

"مسلمان باہم طے شدہ شرائط کی پاسداری کریں مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے۔" [2]

علاوہ ازیں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی وقف میں شرط لگائی تھی۔

اگر جائز شرط کا لحاظ ضروری نہ ہو تو شرط لگانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں، لہٰذا اگر واقف خاص مقدار کی شرط لگائے یا کسی مستحق کو دوسرے سے زیادہ دینے کی شرط عائد کرے یا کسی مستحق کے بارے میں خاص وصف کا اعتبار کرتے ہوئے شرط لگائے، مثلاً: ایک شے طلباء پر وقف کرتے ہوئے شرط لگائے کہ جو صحیح بخاری پڑھنے والا طالب علم ہوگا یہ شے اس کے لیے وقف ہے یا یہ شے اس کے لیے وقف ہے جو ڈاڑھی نہ منڈوائے یا اس کے لیے وقف ہے جو اس شے کی نگرانی کرے وغیرہ تو اس قسم کی شرائط کی پاسداری ضروری ہے۔

الغرض اگر کوئی شرط کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو تو اس کا لحاظ واعتبار ضرور کیا جائے گا۔ اگر وقف کرنے میں کوئی شرط عائد نہ کی گئی تو اس کے استحقاق واستعمال میں امیر، غریب، مرد وعورت سب برابر ہیں۔

اگر وقف شدہ چیز کا کوئی نگران مقرر نہ کیا گیا ہو یا مقرر تو کیا گیا لیکن وہ فوت ہو گیا تو موقوف علیہ شخص خود اس کی نگرانی کرے بشرطیکہ وہ معین ہو۔ اگر موقوف علیہ کوئی نوع، یعنی ایک قسم کی مختلف چیزیں ہوں، مثلاً: مساجد یا جن کو شمار کرنا ممکن نہ ہو، جیسے مساکین، تب حاکم نگران ہوگا۔ وہ خود حفاظت کرے یا اس کی حفاظت پر کسی کو اپنا نائب مقرر کر دے۔

[1] رواہ أبو داود في سننه بمعناه، حديث: 2879، والقصة في صحيح البخاري أيضا، حديث: 2764. ان حدیثوں میں یہ وضاحت ہے کہ یہ مال عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وقف کیا تھا، البتہ بعد میں تولیت کے بارے میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں وصیت کی تھی (ع۔و) [2] جامع الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول اللهﷺ في الصلح بين الناس، حديث: 1352. دیکھیے صحيح البخاري، الوصايا، باب وما للوصي أن يعمل في مال اليتيم......، حديث: 2764، وسنن أبي داود، الوصايا، باب ما جاء في الرجل يوقف الوقف، حديث: 2879.

▲ وقف شدہ شے نگران کے پاس ایک امانت ہے، لہٰذا اس کی نگرانی اللہ سے ڈرتے ہوئے کرے۔

▲ اولاد کے لیے وقف صحیح ہے، مثلاً: اگر کوئی یوں کہے: "میں اپنی اولاد کے لیے وقف کرتا ہوں" تو اس میں بیٹے اور بیٹیاں سب برابری کی بنیاد پر شامل ہوں گے۔ اور کسی کی شراکت کو مطلق رکھنے سے استحقاق سب کے لیے برابر ہوتا ہے، مثلاً: اگر وہ ان کے لیے کسی شے کا اقرار کردے تو سب اس میں برابر شریک ہوں گے۔ ایسے ہی اگر کوئی شے وقف کردے تو وہ بھی سب کے لیے ہوگی، پھر صلبی اولاد کے بعد وقف بیٹوں کی اولاد کی طرف منتقل ہوگی جب کہ بیٹیوں کی اولاد شامل نہ ہوگی کیونکہ وہ دوسرے شخص کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ "اللہ تمھیں اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے۔"①

میں بیٹیوں کی اولاد شامل نہیں۔ بعض علمائے کرام کی یہ رائے ہے کہ بیٹیوں کی اولاد "الأولاد" میں داخل ہے کیونکہ بیٹیاں اولاد ہیں تو بیٹیوں کی اولاد بھی اولاد کی اولاد میں شامل ہے۔ واللّٰہ أعلم.

اگر کوئی یوں کہے: "میں اپنے بیٹوں کے لیے یا فلاں کے بیٹوں کے لیے وقف کرتا ہوں۔" تو صرف لڑکے مراد ہوں گے، لڑکیاں نہیں کیونکہ لفظ بَنِيْن (لڑکے) یہ مذکر ہی کے لیے بنایا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ۝﴾ "کیا اس (اللہ) کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے ہیں؟"②

البتہ اگر موقوف علیہ کوئی قبیلہ ہو، مثلاً: "یہ شے بنو ہاشم یا بنو تمیم کے لیے وقف ہے۔" تو اس میں قبیلے کے مرد اور عورتیں سب مراد ہوں گے کیونکہ "قبیلے کا نام" کا اطلاق مرد اور عورتوں سب پر ہوتا ہے۔

اگر وقف ایسی جماعت کے لیے ہے جن کا حصر وشمار ممکن ہو تو اس کے استحقاق استعمال میں سب برابر ہوں گے اور اگر حصر ممکن نہ ہو، مثلاً: بنو ہاشم، بنو تمیم تو تعمیم واجب نہیں اور بعض افراد پر اکتفا کرنا یا ان میں سے بعض کو دوسروں پر ترجیح دینا جائز ہوگا۔

▲ محض کہہ دینے سے وقف ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے فسخ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يُبَاعُ أَصْلُهَا وَلَا يُوهَبُ وَلَا يُورَثُ»

"مال وقف نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ و میراث بن سکتا ہے۔"③

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اہل علم کی اکثریت کا اسی حدیث پر عمل ہے۔"④

① النسآء 4:11. ② الطور 52:39. ③ صحیح البخاري، الوصايا، باب الوقف كيف يكتب؟، حديث: 2772.
④ جامع الترمذي، الأحكام، باب ما جاء في الوقف، تحت حديث: 1375.

▲ وقف کا فسخ جائز نہیں کیونکہ وہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ اسی طرح اسے فروخت یا کسی اور کو منتقل نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر جگہ کے ویران ہونے کی وجہ سے وقف سے فائدہ حاصل کرنا ممکن نہ رہے، مثلاً: وقف شدہ گھر گر گیا اور وقف کی آمدنی سے اس کی تعمیر ممکن نہیں یا زرعی زمین تھی جو ویران و بنجر ہوگئی اور وقف آمدنی سے اس کی تعمیر و آبادی ممکن نہ ہو تو اس حال میں وقف کو فروخت کیا جائے گا اور اس کی قیمت اس کے مثل میں لگائی جائے گی کیونکہ یہ صورت وقف کرنے والے کے مقصد کے قریب ترین ہے۔ اگر اسی طرح کی شے ممکن نہ ہو سکے تو اس کے قریب قریب ہی ہو جانی چاہیے اور متبادل شے خریدنے کے ساتھ ہی وقف ہو جائے گی۔

▲ اگر کوئی مسجد وقف تھی لیکن اس جگہ میں مسجد مفید اور کارآمد نہ رہی، یعنی وہاں کی آبادی ویران ہوگئی تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسری جگہ مسجد بنا دی جائے یا وہ رقم دوسری مسجد پر خرچ کی جائے۔ اگر کسی مسجد کے لیے کوئی شے وقف ہو تو جب اس وقف شدہ شے کی آمدن مسجد کی ضروریات سے زائد ہے تو زائد آمدن کسی دوسری مسجد پر صرف کر دی جائے کیونکہ وقف کا مقصد یہی تھا۔ مسجد پر وقف شے اگر غلہ و اناج ہے تو مسجد کی ضروریات سے زائد فقراء و مساکین پر صرف کیا جا سکتا ہے۔

▲ جب موقوف علیہ معین فرد ہو، مثلاً: کوئی کہے: ''یہ زمین زید کے لیے وقف ہے، اسے ہر سال سو من گندم دی جائے۔'' تو اگر اس کی پیداوار اس مقرر حد سے زائد ہو تو زائد کو سنبھال کر رکھنا ضروری ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر معلوم ہو کہ اس کی پیداوار ہمیشہ مقررہ مقدار سے زیادہ ہوتی ہے تو اس زائد پیداوار کو فی سبیل اللہ خرچ کر دیا جائے کیونکہ اس کو بچا کر رکھنے سے اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔''

▲ اگر کوئی شے کسی ایسی مسجد کے لیے وقف کی گئی جو ویران ہوگئی اور وقف شدہ شے کو وہاں خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہ رہا تو اس مال کو اس جیسی دوسری مسجد پر صرف کر دیا جائے۔

ہبہ اور عطیے کا حکم

کسی عاقل بالغ جائز التصرف شخص کا کسی کو اپنی زندگی میں معلوم مال و متاع تبرعاً (اپنی خوشی سے) دے دینا ''ہبہ'' کہلاتا ہے، جیسے ایک مسلمان کسی کو مکان یا کچھ روپے دے دے۔

نبی ﷺ ہدیہ (عطیہ) دیتے اور لیتے تھے۔ سنت رسول ﷺ میں ہدیہ و ہبہ کی نہایت رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ اسلامی معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [تَهَادَوا تَحَابُّوا]

''ایک دوسرے کو تحفے دو اس سے باہمی محبت بڑھے گی۔''[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَيُثِيبُ عَلَيْهَا»

''رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول کرتے اور جوابی تحفہ دیا کرتے تھے۔''[2]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«تَهَادَوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَسُلُّ السَّخِيمَةَ» ''تحفہ دیا کرو تحفہ دینے سے کینہ و بغض جاتا رہتا ہے۔''[3]

▲ جب ہبہ لینے والا قبول کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لے تو واہب (ہبہ کرنے والے) کے لیے جائز نہیں کہ اسے واپس لے، البتہ قبضہ سے پہلے رجوع کر سکتا ہے جس کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ''سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ''غابہ'' جگہ میں موجود اپنے مال میں سے بیس وسق کھجوریں انھیں ہبہ کر دیں۔ جب بیمار ہو گئے (وفات کا وقت قریب آیا) تو فرمایا: میری پیاری بیٹی!...... میں نے تجھے بیس وسق کھجوریں ہبہ کی تھیں۔ اگر تو انھیں قبضے میں لے لیتی تو وہ تیری ہوتیں، چنانچہ قبضہ نہ کرنے کی وجہ سے آج وہ کھجوریں میں اپنے تمام ورثاء کا مشترکہ مال قرار دیتا ہوں، لہٰذا تم اسے کتاب اللہ کی تعلیم کی روشنی میں تقسیم کر دینا۔''[4]

▲ اگر کوئی چیز کسی کے پاس امانت تھی یا اس نے عاریتاً لی ہوئی تھی، پھر مالک نے اسے ہبہ کر دی تو اس چیز کا اس کے پاس رہنا ہی قبضہ شمار ہو گا۔

▲ اگر کسی کے ذمے قرض تھا تو قرض خواہ نے اسے ہبہ کر دیا تو مقروض بری الذمہ ہو جائے گا۔ اور ہر وہ شے ہبہ ہو سکتی ہے جسے فروخت کرنا جائز ہو۔

▲ ہبہ کو مستقبل کی شرط سے مشروط کرنا جائز نہیں، مثلاً: کوئی کہے: ''میں نے تجھے یہ چیز ہبہ کر دی بشرطیکہ مجھے اس

---

① صحيح البخاري، الهبة، باب من رأى الهبة الغائبة جائزة، حديث: 2585. ② صحيح البخاري، الهبة، باب المكافأة في الهبة، حديث: 2585. ③ [ضعيف] جامع الترمذي، الولاء والهبة، باب في حث النبي ﷺ على الهدية، حديث:2130، وإرواء الغليل: 45/6 والمعجم الأوسط: 416/1، حديث: 1526 واللفظ له. ④ الموطأ للإمام مالك، الأقضية، باب ما لا يجوز من النحل: 313/2، حديث: 1503، والاستذكار لابن عبدالبر: 293/22، 294، حديث: 1444. والد اپنی اولاد کو کوئی شے ہبہ کر کے واپس لے سکتا ہے اگرچہ اولاد نے اس پر قبضہ کر لیا ہو، اس لیے کہ اولاد اور اس کا مال والد ہی کا تو ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعَ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ] ''کسی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کوئی شے ہبہ کر کے واپس لے، سوائے والد کے جو وہ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔'' (جامع الترمذي، الولاء والهبة، باب ماجاء في كراهية الرجوع في الهبة، حديث: 2132.) لہٰذا مذکورہ اثر سے استدلال جامع نہیں ہے۔

قدر مال حاصل ہو گیا۔"

ہبہ میں مدت متعین کرنا درست نہیں، مثلاً: کوئی کہے: "میں نے تجھے فلاں چیز ایک مہینہ یا ایک سال کے لیے ہبہ کر دی۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ہبہ سے مراد چیز کا مالک بنانا ہے، لہٰذا اس میں وقت کی تعیین قبول نہ ہو گی جیسا کہ "بیع" میں وقت کی تعیین نہیں ہوتی۔

اگر ہبہ میں موت کی شرط عائد کی جائے تو ایسا کرنا درست ہے، مثلاً: کوئی کہے: "جب میں فوت ہو جاؤں گا تو تجھے فلاں فلاں چیز ہبہ کرتا ہوں۔" یہ کام وصیت کے حکم میں ہوگا اور وصیت کے احکام اس پر لاگو ہوں گے۔

کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی اولاد میں سے کسی کو عطیہ دے اور کسی کو نہ دے یا ایک کو دوسرے سے زیادہ دے بلکہ اسے چاہیے کہ سب کو برابر برابر دے اور عدل و مساوات قائم رکھے۔ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ میرے والد نے مجھے غلام بطور عطیہ دیا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس ہبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَهُ مِثْلَ هٰذَا؟ فَقَالَ: لَا! فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: فَارْجِعْهُ»

"کیا تو نے ایسا عطیہ اپنے تمام بچوں کو دیا ہے؟" انھوں نے کہا: نہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنا عطیہ واپس لے لو۔"[1]

پھر فرمایا:

«اِتَّقُوا اللهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ» "اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کرو۔"[2]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ عطیے کے مسئلے میں اپنی اولاد میں عدل و انصاف اور مساوات کا لحاظ کیا جائے گا ورنہ ظلم ہوگا۔ اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو کچھ ہبہ کرتا ہے اور کسی کو نہیں یا بعض کو زیادہ دیتا ہے اور بعض کو کم اگر کسی کو اس صورت حال کا علم ہو تو اس کے لیے اس معاملے پر گواہ بننا حرام ہے۔

جب کوئی انسان کسی شے کو ہبہ کر دے اور موہوب لہ (جسے ہبہ کی گئی) اس پر قبضہ کر لے تو اسے واپس لینا حرام ہے، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْعَائِدُ فِي هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَقِيءُ ثُمَّ يَعُودُ فِي قَيْئِهِ»

[1] صحيح البخاري، الهبة، باب الهبة للولد، حديث: 2586، وصحيح مسلم، الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبه، حديث: 1623 واللفظ له. [2] صحيح البخاري، الهبة، باب الأشهاد في الهبة، حديث: 2587، وصحيح مسلم، الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، حديث: 1623.

''ہبہ واپس لینے والا کتے کی مانند ہے جو قے کرتا ہے اور پھر اپنی قے کھالیتا ہے۔''[1]

یہ حدیث ہبہ دے کر واپس لینے کی حرمت کی دلیل ہے سوائے اس ہبہ کے جسے شارع نے مستثنیٰ قرار دیا ہو، چنانچہ والد اپنی اولاد کو ہبہ کر کے واپس لے سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ أَنْ يُّعْطِيَ الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعَ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ»

''کسی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کو عطیہ، تحفہ دے کر واپس لے سوائے والد کے جو وہ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔''[2]

▲ والد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مال میں سے مال لے بشرطیکہ اولاد کو اس کی ضرورت نہ ہو اور اولاد کو نقصان نہ ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُمْ مِّنْ كَسْبِكُمْ وَإِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِّنْ كَسْبِكُمْ»

''بہترین مال جو تم کھاؤ وہ تمھاری کمائی کا مال ہے اور بے شک تمھاری اولاد بھی تمھاری کمائی ہے۔''[3]

اس حدیث کے کئی شواہد بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے لیے اپنے بیٹے کے مال سے لینا، اپنی ملکیت بنانا یا اس سے کھانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے بیٹے کو نقصان نہ ہوتا ہو اور نہ ہی اسے اس کی ضرورت ہو بلکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان:

«أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ» ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''[4]

تقاضا کرتا ہے اس کے مال کی طرح اس کی جان کی اباحت کا، لہٰذا اولاد پر واجب ہے کہ وہ اپنے باپ کی خدمت اپنی جان اور مال دونوں سے کرے، البتہ والد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی اولاد کے مال اپنی ملکیت بنا لے جس سے اولاد کو نقصان ہو یا اس سے ان کی ضرورت وابستہ ہو، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ کوئی نقصان اٹھائے اور نہ نقصان پہنچائے۔''[5]

▲ اولاد کے لیے قطعاً جائز نہیں کہ باپ کو قرض دے کر اس کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص

[1] صحيح البخاري، الهبة، باب هبة الرجل لامرأته والمرأة لزوجها، حديث:2589، وصحيح مسلم، الهبات، باب تحريم الرجوع في الصدقة ......، حديث:1622. [2] سنن أبي داود، البيوع، باب الرجوع في الهبة، حديث:3539، ومسند أحمد:237/1، وجامع الترمذي، الولاء والهبة، باب ماجاء في كراهية الرجوع في الهبة، حديث:2132. [3] جامع الترمذي، الأحكام، باب ما جاء أن الوالد يأخذ من مال ولده، حديث:1358. [4] سنن أبي داود، البيوع، باب الرجل يأكل من مال ولده، حديث:3530، وسنن ابن ماجه، التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، حديث: 2291 واللفظ له. [5] سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، حديث:2340.

اپنے باپ کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کی موجودگی میں باپ سے قرض کی واپسی کا تقاضا کرنے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ» ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''[1]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ باپ سے قرض کا مطالبہ کرنا اولاد کا حق نہیں ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ ''اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور احسان میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اگر والدین کے ذمے اولاد کا کوئی حق (قرض وغیرہ) ہو تو اولاد ان سے اس کا مطالبہ نہ کرے مگر والدین کے ذمے اولاد کے جو لازمی اخراجات ہیں (نان ونفقہ وغیرہ) ان کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ بچہ کمانے کے قابل نہ ہو کیونکہ زندگی کی حفاظت ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے سیدہ ہند رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ»

''اتنا مال (خاوند کی اجازت کے بغیر) لے سکتی ہو جو دستور کے مطابق تمھیں اور تمھاری اولاد کو کافی ہو۔''[3]

▲ ہدیہ بغض وکینہ کو ختم کرتا ہے اور الفت ومحبت پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«تَهَادَوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ»

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کیونکہ ہدیہ سینوں کی کدورت ختم کر دیتا ہے۔''[4]

▲ ہدیہ کو رد نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ نیز اس کا مناسب بدلہ دینا مسنون ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَيُثِيبُ عَلَيْهَا»

''آپ ﷺ ہدیہ قبول کرتے اور اس کے بدلے میں دیا کرتے تھے۔''[5]

اور یہ دین اسلام کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے اور بلندیٔ اخلاق کا مظہر ہے۔

① سنن أبي داود، البيوع، باب الرجل يأكل من مال ولده، حديث: 3530، وسنن ابن ماجه، التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، حديث: 2291 واللفظ له. ② الأنعام 6:151. ③ صحيح البخاري، النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل فللمرأة أن تأخذ بغير علمه ......، حديث: 5364. ④ جامع الترمذي، الولاء والهبة، باب في حث النبي ﷺ على الهدية، حديث: 2130. ⑤ صحيح البخاري، الهبة، باب المكافأة في الهبة، حديث: 2585.

باب 11

وراثت کے مسائل

مریض اور مالی تصرفات

انسان کی حالت صحت، حالت مرض سے اس اعتبار سے مختلف ہوتی ہے کہ اس کے شرعی حدود میں رہ کر سمجھداری کی حالت میں کیے ہوئے مالی تصرفات معتبر ہوتے ہیں اور اس پر کوئی پکڑ اور استدراک نہیں کر سکتا، لہٰذا حالت صحت میں صدقات و خیرات کرنا حالات مرض کے صدقات و خیرات سے کئی گنا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○﴾

”اور جو کچھ ہم نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) اس سے پہلے خرچ کرو کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! مجھے تو تھوڑی دیر کی مہلت کیوں نہیں دیتا کہ میں صدقہ کروں اور نیک لوگوں میں سے ہو جاؤں۔ اور جب کسی کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو اسے اللہ ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ بخوبی باخبر ہے۔“[1]

جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ افضل صدقہ کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ حَرِيصٌ تَأْمُلُ الْغِنٰى وَتَخْشَى الْفَقْرَ، وَلَا تُمْهِلْ حَتّٰى إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ قُلْتَ: لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ - وَفِي لَفْظٍ - شَحِيحٌ»

”تم ایسی حالت میں صدقہ کرو کہ تم تندرست اور مال کے خواہشمند ہو، غنی کی امید ہو، فقر کا ڈر ہو۔ اور اسے (صدقے کو) اس قدر مؤخر نہ کرو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو کہو: فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا جبکہ وہ تو فلاں فلاں کا ہو ہی چکا۔“[2]

مرض دو قسم کا ہوتا ہے:

[1] المنفقون 63:10،11. [2] صحيح البخاري، الوصايا، باب الصدقة عندالموت، حديث:2748، وصحيح مسلم، الزكاة، باب بيان أن أفضل الصدقة صدقة الصحيح الشحيح، حديث:1032.

① ایسا مرض جس میں عموماً موت کا خوف نہیں ہوتا: مثلاً: ڈاڑھ، آنکھ یا سر میں معمولی درد کا ہونا۔ ایسے مریض کے مالی تصرفات کا حکم اسی طرح ہے جس طرح حالت صحت میں ہے۔ اس حالت میں آدمی تمام مال بطور عطیہ دے سکتا ہے۔ اگر کسی کا ایسا معمولی مرض بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ اس کی موت واقع ہو گئی تو اس حالت کا صدقہ وعطیہ حالت صحت کے صدقے کے حکم میں ہے۔

② ایسا مرض جس میں عموماً موت کا خطرہ ہوتا ہے۔ ایسے مریض کو صدقات وعطیات میں کل مال کا تہائی حصہ دینے کا اختیار ہے، لہٰذا اگر اس کی تبرعات وعطایا تہائی مال یا اس سے کم کی ہے تو ان کا نفاذ ہو گا۔ اور اگر اس مقرر مقدار سے زیادہ کی ہیں تو موت کے بعد ان کا نفاذ اس کے ورثاء کی اجازت ورضامندی کے بغیر نہ ہو گا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللهَ تَصَدَّقَ عَلَيْكُمْ عِنْدَ وَفَاتِكُمْ بِثُلُثِ أَمْوَالِكُمْ زِيَادَةً لَكُمْ فِي أَعْمَالِكُمْ»

”اللہ تعالیٰ نے تمھیں بوقت وفات اپنے اموال میں سے تہائی مال کی وصیت کی اجازت دے کر مہربانی فرمائی تاکہ تم اپنے نیک اعمال میں اضافہ کر سکو۔“[1]

یہ حدیث اور اس موضوع کی دیگر احادیث شریفہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ انسان کو بوقت وفات اپنے کل مال میں سے ایک تہائی مال اپنی رضامندی سے خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ اور اس لیے کہ وہ اب اس خطرناک بیماری کی حالت میں ہے جس سے غالباً موت واقع ہو جاتی ہے تو کل مال کا عطیہ ورثاء کے لیے نقصان دہ ہے، اس بنا پر اس کا عطیہ وصیت کی طرح ثلث کی طرف لوٹایا گیا۔

مذکورہ بالا صورت کی طرح اس حالت کا بھی یہی حکم ہے جس میں موت کا خطرہ سامنے ہو، مثلاً: کسی شہر میں کوئی خطرناک وبا پھوٹ پڑے۔ یا کوئی شخص لڑائی میں شریک ہو یا کوئی سمندری طوفان کے وقت موجوں کی زد میں آ گیا ہو تو ان حالات میں بھی تہائی مال سے زیادہ عطیہ کرنا جائز نہیں۔ مگر یہ کہ ورثاء اس کی اجازت دیں۔ اس حال میں اگر وہ کسی ایک وارث کو عطیہ دے کر مر جاتا ہے تو دوسرے وارثوں کی اجازت کے بغیر وہ نافذ نہیں ہو گا، اگر مریض خطرے کی حالت سے نکل گیا تو اس کے تمام عطیات نافذ اور جاری ہوں گے کیونکہ مانع موجود نہیں رہا۔

جو شخص کسی دائمی مرض میں مبتلا ہے لیکن صاحب فراش نہیں تو ایسے شخص کے صدقات تندرست آدمی کے صدقات کی طرح ہوں گے اور وہ اپنا تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر سکتا ہے کیونکہ اس طرح کی بیماری میں موت جلدی

[1] سنن ابن ماجه، الوصايا، باب الوصية بالثلث، حديث: 2709، ومسند أحمد: 440/6، 441، وسنن الدارقطني: 149/4، حديث: 4245 بلفظ: [زِيَادَةً فِي حَسَنَاتِكُم لِيَجْعَلَهَا لَكُمْ زَكَاةً فِي أَعْمَالِكُمْ] .

آنے کا خوف نہیں ہوتا تو یہ بڑھاپے کی طرح ہے۔لیکن اگر کوئی دائمی مرض کی وجہ سے صاحب فراش بھی ہے تو وہ اس شخص کے حکم میں ہے جسے خطرناک مرض لاحق ہو، وہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا جو غیر وارث کے حق میں ہوگی۔ ہاں، وارث کے حق میں اس کی وصیت تب درست ہے جب دیگر ورثاء کی اجازت ہو۔

تہائی مال کی مقدار کا اعتبار عندالموت ہوگا کیونکہ وصیتوں کے لزوم اور ان کے استحقاق کا یہی وقت ہوتا ہے۔اور ثلث مال سے وصیت اور عطیہ بھی اسی وقت نافذ ہوگا۔ اگر ترکہ کم ہو تو عطیات وصایا پر مقدم ہوں گے کیونکہ وہ مریض کے حق میں لازم ہیں جیسا کہ حالت صحت میں عطیہ دینا وصیت پر مقدم ہے۔

وصیت اور عطیے میں (فقہاء کے نزدیک) چار لحاظ سے فرق ہے:

① وصیت میں اس بات کو مدنظر نہیں رکھا جاتا کہ جس کے حق میں پہلے وصیت کی اسے پہلے دیا جائے، پھر دوسرے کو کیونکہ وصیت موت کے بعد ایک تبرع ہے، جو یکبارگی کا تقاضا کرتا ہے، البتہ عطیے میں مقدم ومؤخر کا لحاظ ہوگا کہ جس کو پہلے عطیہ کیا گیا ہے اسے پہلے دیا جائے گا، اس لیے کہ عطیہ دینے والے کے حق میں لازم ہو چکا ہے۔

② عطیے پر قبضہ کرلیا جائے تو عطیہ دینے والا اسے واپس نہیں لے سکتا بخلاف وصیت کے۔ کہ یہ موت کے بعد لازم ہوتی ہے، لہٰذا موصی (وصیت کرنے والا) زندگی میں وصیت سے رجوع کرسکتا ہے۔

③ عطیے کے قبول کا اس وقت اعتبار ہوگا جب عطیہ دیا جائے کیونکہ یہ فوری ملکیت کا نام ہے۔اس کے برعکس وصیت میں موت کے بعد تملیک ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس میں قبول کا اعتبار تب ہوگا جب موت واقع ہو جائے۔

④ عطیہ قبول کرتے ہی ملکیت ثابت ہو جائے گی بخلاف وصیت کے کہ اس میں موت سے قبل ملکیت ثابت نہ ہو گی کیونکہ اس کی تملیک موت کے بعد ہوتی ہے، پہلے نہیں۔

وصیت کے احکام

وصیت کے لغوی معنیٰ ''ملانے'' کے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے سے زندگی کے (بعض معاملات) کو موت کے بعد (بعض معاملات) سے ملایا جاتا ہے۔ اور وصیت کرنے والے نے بھی اپنے بعض تصرفات، جو اس کی زندگی میں جائز تھے، ملا دیے ہیں تاکہ وہ زندگی کے بعد بھی جاری رہیں۔

فقہاء کی اصطلاح میں وصیت کے معنیٰ ہیں ''ترکے کا ایک مخصوص حصہ موت کے بعد (کسی شخص یا جگہ میں)

صرف کرنے کا حکم دینا۔'' یا دوسرے لفظوں میں یہ ''موت کے بعد مال کے ذریعے سے تبرع کرنا'' ہے۔

وصیت کی مشروعیت کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع سے ثابت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾

''تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑے جا رہا ہو تو اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لیے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے، پرہیزگاروں پر یہ حق اور ثابت ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ﴾

''(یہ تقسیم) اس کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی۔''[2]

فرمان نبوی ہے:

«إِنَّ اللهَ تَصَدَّقَ عَلَيْكُمْ عِنْدَ وَفَاتِكُمْ بِثُلُثِ أَمْوَالِكُمْ زِيَادَةً لَّكُمْ فِي حَسَنَاتِكُمْ»

''اللہ تعالیٰ نے تم پر مہربانی کی کہ بوقت وفات تہائی مال خرچ کرنے کا حکم دیا تاکہ تمھاری نیکیاں زیادہ ہو جائیں۔''[3]

وصیت کے جواز پر علمائے امت کا اجماع ہے۔

▲ وصیت کرنا کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر اس حق کے بارے میں وصیت کرنا واجب ہے جو اس کا لوگوں پر ہے یا لوگوں کا اس پر ہے، یعنی ان کے ساتھ لین دین ہے اور اس بارے میں کوئی ثبوت نہیں۔ ایسے حقوق کے بارے میں وصیت لازمی ہے تاکہ ان کا ضیاع نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَا حَقُّ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ لَّهُ شَيْءٌ يُّوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ»

''کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ (اگر) وہ کسی چیز کی وصیت کرنا چاہتا ہو تو اس میں دو راتیں گزار دے مگر اس حال میں کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔''[4]

[1] البقرة 2:180. [2] النسآء 4:11. [3] [ضعيف] سنن ابن ماجه، الوصايا، باب الوصية بالثلث، حديث: 2709، وسنن الدارقطني: 4/149، حديث:4245. [4] صحيح البخاري، الوصايا، باب الوصايا، حديث: 2738، وصحيح مسلم، الوصية، باب وصية الرجل مكتوبة عنده، حديث: 1627.

لہٰذا اگر اس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہیں یا اس نے ان کے حقوق ادا کرنے ہیں تو اس پر ان کا لکھنا اور واضح کرنا واجب ہے۔

اور مستحب وصیت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے مال کا ایک مخصوص حصہ کسی نیکی کے کام میں لگانے کی وصیت کرے تا کہ بعداز وفات اسے اجر وثواب ملتا رہے۔ ایسے موقع پر شریعت اسلامی نے زیادہ سے زیادہ تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سراسر مہربانی ہے تا کہ انسان زیادہ سے زیادہ نیکیاں جمع کر سکے۔

- سمجھ دار بچے کی وصیت درست ہے جیسا کہ اس کی نماز درست ہے۔ جب موصی، یعنی وصیت کرنے والا اپنی وصیت پر کسی کو گواہ بنا دے یا بقلم خود تحریر کر دے تو وصیت ثابت ہو جاتی ہے۔

- وصیت کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تہائی مال یا اس سے کم کی ہو جبکہ بعض علماء کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ تہائی مال سے کم کی وصیت ہو۔ یہ رائے حضرت ابوبکر صدیق، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کا ہے......''[1]

کی بنا پر خمس (پانچویں حصے) کی وصیت پسند کرتا ہوں۔''[2]

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''میں چوتھائی مال کی نسبت پانچویں حصے کی وصیت کرنا زیادہ بہتر خیال کرتا ہوں۔''[3]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کاش! لوگ تہائی مال کے بجائے چوتھائی مال کی وصیت کیا کریں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: [اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ] ''ایک تہائی کی وصیت درست تو ہے لیکن تہائی مال ہے زیادہ۔''[4]

- جس شخص کے وارث موجود ہوں، اسے تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں، البتہ ورثاء کی رضامندی اور اجازت سے تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز ہے کیونکہ تہائی مال سے زیادہ مال پر ورثاء کا حق ہے۔ اگر کوئی

① الأنفال 41:8. ② [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي: 270/6، وإرواء الغليل: 85/6، حديث: 1649. ③ [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي: 270/6، وإرواء الغليل: 85/6، حديث: 1650. ④ صحيح البخاري، الجنائز، باب رثاء النبي ﷺ سعد بن خولة، حديث: 1295، و السنن الكبرى للبيهقي: 269/6.

صاحب حق اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہے تو درست ہے۔ اور ان کی اس اجازت کا اعتبار موت کے بعد ہوگا۔

◄ احکام وصیت میں سے یہ حکم بھی ہے کہ ورثاء میں سے کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ» ''وارث کے حق میں وصیت نہیں۔''[1]

شیخ تقی الدین ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں: ''امت کا اس مسئلے پر اجماع ہے۔''[2] اور امام شافعی ؒ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث متواتر ہے۔'' مزید فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل فتویٰ کو اور ان اہل علم کو جن سے ہم نے علم حاصل کیا ہے، قریش وغیر قریش میں سے ایسے پایا ہے کہ ان میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا: ''وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔'' اور اسی کو وہ اہل علم سے نقل کرتے ہیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔''[3] البتہ ورثاء کی اجازت ہو تو ایسا کرنا درست ہے کیونکہ وہ خود اپنا حق کسی کو بخوشی دے رہے ہیں۔ اور اسی طرح غیر وارث کے حق میں وصیت اور وارث کے حق میں ایک تہائی کی وصیت کی اجازت ورثاء کی طرف سے اس وقت معتبر ہوگی جب مرنے والا مرض الموت میں مبتلا ہو یا وفات پا چکا ہو۔''

◄ احکام وصیت میں سے یہ بھی ہے کہ وصیت وہ شخص کرے جس کے پاس مال کثیر مقدار میں ہے اور اس کے ورثاء محتاج نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ ﴾

''تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑے جا رہا ہو تو وصیت کر جائے۔''[4]

اور عرفاً ''خیر'' سے مراد ''مال کثیر'' ہے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو وصیت کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے محتاج اقارب کو چھوڑ کو غیروں کو نوازنا لازم آتا ہے جو درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

«إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ»

''اپنے ورثاء کو مالدار بنا کر چھوڑ جانا بہتر ہے اس سے کہ انھیں ایسی حالت میں چھوڑو کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔''[5]

[1] سنن أبي داود، الوصايا، باب ماجاء في الوصية للوارث، حديث: 2870، وجامع الترمذي، الوصايا، باب ما جاء لاوصية لوارث، حديث: 2120، ومسند أحمد: 187,186/4. [2] منهاج السنة النبوية: 160/2. [3] المجموع للنووي: 374/16 [4] البقرة 2:180. [5] صحيح البخاري، الجنائز، باب رثاء النبي ﷺ سعد بن خولة، حديث: 1295.

امام شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''اجر و ثواب کے اعتبار سے سب سے افضل مال وہ ہے جو کوئی اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جائے جس سے وہ لوگوں سے مستغنی ہو جائیں۔''[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے فرمایا: ''تم جو معمولی مال چھوڑ کر جا رہے ہو تو اسے اپنے ورثاء کے لیے رہنے دینا۔''[2] علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کے متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کوئی وصیت نہیں کی تھی۔

▲ اگر کوئی موصی وصیت کے ذریعے سے ورثاء کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو یہ کام حرام اور گناہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ ''جبکہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو۔''[3]

حدیث میں ہے:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةَ بِطَاعَةِ اللهِ سِتِّينَ سَنَةً، ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ»

''بے شک ایک مرد اور عورت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ساٹھ سال عمل کرتے رہتے ہیں، پھر انھیں موت کا وقت آتا ہے تو وصیت کے ذریعے سے ورثاء کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان پر جہنم کی آگ لازم ہو جاتی ہے۔''[4]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«اَلْإِضْرَارُ فِي الْوَصِيَّةِ مِنَ الْكَبَائِرِ»

''وصیت کے ذریعے سے کسی وارث کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔''[5]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ موصی ایسی وصیت کر جائے جس میں ورثاء کا کسی بھی طریقے سے نقصان نہ ہو، مثلاً: کسی ایسی چیز کا اقرار کرے جو درحقیقت اس کے ذمے نہ تھی یا وصیت کا مقصد محض ورثاء کو نقصان پہنچانا ہو یا کسی وارث کے حق میں مطلق وصیت کر جائے یا غیر وارث کے حق میں تہائی مال سے زائد کی وصیت کرے جس پر ورثاء رضامند نہ ہوں۔[6] یہ تمام صورتیں باطل اور مردود ہیں جو کسی صورت میں نافذ نہ ہوں گی، وہ ثلث کی وصیت ہو یا اس سے کم کی ہو۔ واللّٰہ أعلم.

[1] المغني والشرح الكبير:6/447. [2] تفسير ابن كثير:1/298، البقرة 2:180. [3] النسآء 4:12. [4] [ضعيف] سنن أبي داود، الوصايا، باب ما جاء في كراهية الإضرار في الوصية، حديث :2867، وجامع الترمذي، الوصايا، باب ما جاء في الضرر في الوصية، حديث : 2117 واللفظ له، وسنن ابن ماجه، الوصايا، باب الحيف في الوصية، حديث: 2754، ومسند أحمد:2/278. [5] السنن الكبرى للنسائي:6/320. [6] تفسير فتح القدير :1/487.

احکام وصیت میں سے ایک حکم یہ ہے کہ جس شخص کا کوئی وارث نہ ہو وہ اپنے کل مال کی وصیت کر سکتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

«إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَّتَكَفَّفُونَ النَّاسَ»

''اگر تو اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ کر جائے تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تو انھیں ایسی حالت میں چھوڑے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔''[1]

اس روایت میں آپ ﷺ نے سارے مال کی وصیت کرنے سے جو روکا ہے وہ ورثاء کی وجہ سے ہے کہ وہ تنگ دست نہ ہو جائیں لیکن اگر کسی کے ورثاء نہ ہوں تب سارے مال کی وصیت کرنا جائز ہوگی کیونکہ اس سے کسی وارث یا قرض خواہ کے حق کا تعلق نہیں، پھر یہ ایسے ہی ہے جیسے صحت کی حالت میں سارا مال صدقہ کیا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اس کا جواز منقول ہے، نیز علمائے کرام کی ایک جماعت اس کی قائل ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات یہی ہے کہ (جس کا کوئی وارث نہ ہو) اس کو جمیع مال کی وصیت کرنے کا اختیار ہے۔ ایک تہائی سے زائد کی وصیت کرنے سے شریعت نے وارثوں کی موجودگی کی بنا پر روکا ہے، جس کا کوئی وارث ہی نہیں تو اس کے مالی تصرفات پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔''[2]

وصیت کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر مُوصی نے تہائی مال کی وصیت کی لیکن وہ مال موصٰی لهُم (جن افراد کے حق میں وصیت ہوئی) کو حسب وصیت پورا نہیں مل رہا بلکہ کم پڑ رہا ہے، نیز ورثاء وصیت کردہ تہائی مال سے زائد مال خرچ کرنے کی اجازت بھی نہیں دے رہے تو ہر ایک موصٰی لہ کو وصیت سے کم مال ملے گا اور باہمی نسبت بھی قائم رہے گی اس میں مقدم یا مؤخر کا لحاظ نہ ہوگا کیونکہ ہر ایک کو موصی کی موت کے بعد تبرعاً مال مل رہا ہے، لہٰذا سب میں مال یکبارگی تقسیم ہوگا لیکن اصل حصے سے کم جیسا کہ مسئلہ عائلہ میں ہر وارث کو اس کے مقرر حصے سے کم ملتا ہے۔

مثال کے ذریعے سے وضاحت: اگر کسی نے ایک شخص کو سو روپے دینے کی اور دوسرے کو بھی سو روپے جب کہ تیسرے کو پچاس روپے، چوتھے کو تیس روپے اور پانچویں کو بیس روپے دینے کی وصیت کی جب کہ ترکے کا تہائی مال صرف سو روپے ہے اور وصیتوں کی مجموعی رقم تین سو روپے بنتی ہے تو اس تناسب سے ہر موصٰی لہ کو اس کے لیے کی گئی وصیت کا تیسرا حصہ ملے گا، یعنی سو سو روپے والوں کو تینتیس تینتیس روپے تیس والے کو دس روپے علی هٰذا القياس.

وصیت کی درستی یا غیر درستی کا اعتبار بوقت موت ہوگا۔ اگر کسی نے وارث کے حق میں وصیت کر دی لیکن

---

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب رثاء النبي ﷺ سعد بن خولة، حديث: 1295. [2] إعلام الموقعين: 35/4.

بوقت موت وہی شخص وارث نہ رہا تو اس کے حق میں وصیت جائز ہوگی، مثلاً: بھائی جو پہلے وارث تھا اس کے حق میں وصیت کردی گئی (جو ناجائز تھی) پھر میت کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اب بھائی وارث نہ رہا، لہٰذا اس کے حق میں کی گئی وصیت جائز ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی کے حق میں غیر وارث سمجھ کر وصیت کردی گئی لیکن بوقت موت وہی شخص وارث بن گیا تو ورثاء کی اجازت کے بغیر اس کے حق میں وصیت جائز نہ ہوگی، مثلاً: بیٹے کی موجودگی میں بھائی کے حق میں وصیت کی گئی جو جائز تھی لیکن مُوصی کی موت سے قبل موصی کا بیٹا فوت ہوگیا تو اب بھائی وارث قرار پایا، لہٰذا ورثاء کی اجازت کے بغیر اس بھائی کے حق میں وصیت جائز نہ رہی۔

درج بالا حکم سے یہ بھی واضح ہوا کہ وصیت کو قبول کرنا اور وصیت کردہ چیز پر قبضہ کرنا موصی کی موت کے بعد ہوگا، پہلے نہیں کیونکہ موصی کی موت کے وقت ہی حق ثابت ہوگا، لہٰذا قبضہ بھی موت کے بعد ہوگا۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہمیں نہیں معلوم کہ اہل علم کے درمیان اس بات میں اختلاف ہو کہ وصیت کا اعتبار موت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر وصیت کا تعلق غیر معین افراد سے ہے، مثلاً: فقراء و مساکین یا لا تعداد افراد، مثلاً: بنو تمیم قبیلے کے لیے وصیت یا کسی مصلحت کے لیے، مثلاً: مساجد کے لیے تو اس کے لیے قبول کی شرط نہیں، محض موت واقع ہونے کے ساتھ ہی وصیت پر عمل کرنا لازم ہوگا۔ اگر اس کے برعکس ہو، یعنی معین فرد کے لیے وصیت ہے تو بعد از موت قبول کرنے سے عمل لازم ہوگا۔''[1]

◢ موصی اپنی وصیت سے کلی یا جزوی طور پر رجوع کرسکتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''آدمی اپنی وصیت میں حسب خواہش ترمیم کرسکتا ہے۔''[2] اہل علم کا اس پر اتفاق ہے، چنانچہ اگر وہ کہے: ''میں نے وصیت سے رجوع کیا۔'' یا ''میں نے وصیت کالعدم کردی۔'' تو وہ کالعدم ہو جائے گی کیونکہ قبول کرنے اور وصیت کے لازم ہونے میں موصی کی موت کا اعتبار ہے تو اسی طرح وصیت کرنے والا زندگی میں رجوع کرسکتا ہے، مثلاً: اگر اس نے کہا: ''اگر زید آ گیا تو جو کچھ میں نے عمرو کے حق میں وصیت کی ہے وہ اسے (زید کو) دے دینا۔'' اب اگر زید وصیت کرنے والے کی زندگی میں آ گیا تو وصیت کا مال اسے ملے گا کیونکہ وصیت کرنے والے نے عمرو والی وصیت سے رجوع کرلیا ہے لیکن اگر زید وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد آیا تو وصیت عمرو ہی کے لیے ہوگی کیونکہ جب اس کے آنے سے پہلے موصی فوت ہوگیا تو وصیت اول (عمرو) کے لیے متعین ہوگئی۔

---

[1] المغني والشرح الكبير: 473,460/6. [2] سنن الدارمي، الوصايا، باب الرجوع عن الوصية، حديث: 3212,3211 والتلخيص الحبير: 96/3، حديث: 1380.

▲ وصیت کے نفاذ سے قبل لوگوں کے قرض اور اللہ تعالیٰ کے قرضے، یعنی واجبات شرعیہ، مثلاً: زکاۃ، حج، نذر اور کفارے ادا کیے جائیں اگرچہ اس نے ان کی وصیت نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ﴾

''...... یہ حصے اس وصیت کی تکمیل کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد۔''[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ»

''رسول اللہ ﷺ نے وصیت سے قبل قرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔''[2]

اس روایت سے واضح ہوا کہ قرضوں کی ادائیگی وصیت کے اجرا پر مقدم ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

«اِقْضُوا اللهَ، فَاللهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»

''اللہ تعالیٰ کے قرض ادا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قرضوں کا ادا کرنا زیادہ حق رکھتا ہے۔''[3]

الغرض اول قرض کی ادائیگی ہوگی، پھر اجرائے وصیت' پھر تقسیم ترکہ۔ اس ترتیب پر علماء کا اجماع ہے۔

اگرچہ وصیت کا نفاذ ادائیگی قرض سے مؤخر ہے لیکن قرآن مجید میں وصیت کا ذکر مقدم ہے۔ اس میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ وصیت میراث کی طرح بلاعوض ہوتی ہے جس کی وجہ سے وصیت کا حصہ نکالنا انسان پر گراں ہوتا ہے (جبکہ قرض خواہ اپنا قرض قوت سے بھی حاصل کر سکتا ہے، نیز انسان کو اس کی فکر بھی لاحق ہوتی ہے۔) قرآن میں وصیت کا ذکر رغبت دلانے اور اس کی اہمیت کے پیش نظر مقدم رکھا گیا ہے۔ آیت میں ﴿أَوْ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ''برابری'' کے ہیں، یعنی وصیت اور قرض اہمیت میں دونوں ہی برابر ہیں اگرچہ قرض ادائیگی میں وصیت پر مقدم ہے۔

▲ وصیت کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وصیت نافذ کرنے پر نہایت رغبت دلائی ہے۔ اسی وجہ سے تذکرے میں اسے مقدم رکھا ہے۔ جائز وصیت کے نفاذ میں جو شخص کوتاہی کا مرتکب ہو یا کسی شرعی گنجائش (دلیل) کے بغیر ترمیم کرے اس کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَمَنۢ بَدَّلَهُۥ بَعْدَ مَا سَمِعَهُۥ فَإِنَّمَآ إِثْمُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُۥٓ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○﴾

---

① النسآء 4:11. ② صحيح البخاري، الوصايا، باب تأويل قوله تعالىٰ ﴿مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ ......﴾، قبل حديث:2750، وجامع الترمذي، الوصايا، باب ما جاء يبدأ بالدين قبل الوصية، حديث: 2122، ومسند أحمد:1/79و131.
③ صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب الحج والنذور عن الميت ...... ، حديث:1852.

''اب جو شخص اسے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ بدلنے والے ہی پر ہوگا، واقعی اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔''[1]

اس آیت کی تفسیر میں امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں: ''تبدیل تغییر کو کہتے ہیں آیت میں مذکور اس تبدل و تغیر کے نتیجے میں یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جو ایسی وصیت کو بدلتا ہے جو حق کے مطابق ہو اور اس میں کسی قسم کی زیادتی یا نقصان نہ ہو، لہٰذا بدلنے والا گناہ گار ہے، البتہ موصی پر اس کا کوئی بوجھ نہ ہوگا کیونکہ وہ وصیت میں حق بجانب تھا۔''[2]

- وصیت ہر اس شخص کے لیے جائز ہے جو مالک بننے کا اہل ہو، وہ مسلمان ہو یا کافر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ﴾

''(ہاں) مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو۔''[3]

حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں یہودی یا نصرانی کے لیے مسلمان کی وصیت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔''[4]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو لباس دیا تھا۔[5]

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنی مشرکہ ماں سے جو رغبت رکھتی تھی، صلہ رحمی کی تھی۔[6]

ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے یہودی بھائی کے حق میں تہائی ترکہ کی وصیت کی تھی۔[7]

اس کے جواز میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمھیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمھیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''[8]

- کسی معین کافر کے حق میں مسلمان کا وصیت کرنا درست ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، غیر معین کافر کے حق میں

---

① البقرة 2:181. ② تفسير فتح القدير:1/195. ③ الأحزاب 33:6. ④ تفسير الطبري :21/124. ⑤ صحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم لبس الحرير وغير ذلك للرجال، حديث:2068. ⑥ صحيح البخاري، الهبة وفضلها، باب الهدية للمشركين، حديث: 2620. ⑦ سنن الدارمي، الوصايا، باب الوصية لأهل الذمة، حديث:3299، والتلخيص الحبير: 3/95، حديث: 1379. ⑧ الممتحنة 60:8.

وصیت کرنا درست نہیں، مثلاً: کسی مسلمان کا یہود و نصاریٰ یا ان کے فقراء کے حق میں وصیت کرنا۔ اسی طرح کسی معین کافر کو بصورت وصیت کسی ایسی چیز کا مالک بنانا جن کا ان کو مالک بنانا جائز نہیں، ناجائز ہے، مثلاً: اسے نسخۂ قرآن یا مسلمان غلام یا اسلحہ دینے کی وصیت کرنا۔

ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے حق میں وصیت جائز ہے بشرطیکہ وقت وصیت اس کا پیٹ میں ہونا ثابت ہو۔ اس کا علم تب ہوگا اگر حاملہ وقت وصیت سے چھ ماہ کے پورے ہونے سے قبل اسے جنے بشرطیکہ اس کا شوہر یا مالک موجود ہو۔ اگر وہ شوہر یا آقا والی نہ ہو تو وہ چار سال سے کم مدت کے اندر اندر جنے کیونکہ جب ایسا حمل وارث قرار پاتا ہے تو اس کے حق میں وصیت بالاَولی جائز ہے۔[1] اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو اس کے حق میں کی گئی وصیت باطل ہو جائے گی۔

ایسے بچے کے حق میں وصیت کرنا درست نہیں جس کا وجود بوقت وصیت پیٹ میں نہ ہو، مثلاً: کوئی کہے: میں اس حمل کے حق میں وصیت کرتا ہوں جو فلاں عورت کے پیٹ میں آئندہ ہوگا۔

اگر کسی نے مال کی بڑی مقدار کے بارے میں وصیت کرتے ہوئے کہا کہ ''اس مال سے میری طرف سے حج کیا جائے۔'' تو اس مال سے بار بار حج کروایا جائے یا متعدد افراد روانہ کیے جائیں حتی کہ وہ رقم ختم ہو جائے۔ اگر رقم کم ہو تو جس قدر وہ حج میں کام دے، استعمال میں لائی جائے۔ اگر موصی نے کہا کہ میری اس قدر کثیر رقم ایک ہی حج میں استعمال کی جائے تو اسے ایک ہی حج میں خرچ کیا جائے گا کیونکہ موصی کا مقصد حج کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ، راحت و آرام پہنچانا ہے۔

جس شخص کو وصیت نافذ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی ہے، وہ اس مالِ وصیت سے حج نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس شخص کا وراثت میں حصہ ہے وہ بھی اس وصیت سے مستفید نہیں ہو سکتا کیونکہ وصیت کرنے والے کا مقصد بظاہر اس کے علاوہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

جس میں مالک بننے کی اہلیت نہیں اس کے حق میں وصیت جائز نہیں، مثلاً: جن، چوپایہ یا میت وغیرہ۔

معصیت کے کاموں میں وصیت کرنا جائز نہیں، مثلاً: گرجا گھروں یا کافروں اور مشرکوں کے معبد خانے کی تعمیر سے متعلق وصیت کرنا۔ اسی طرح مزاروں کی تعمیر، ان پر چراغاں کرنے یا ان کے مجاوروں کے لیے وصیت کرنا۔ اس کے بارے میں مُوصی کافر ہو یا مسلمان برابر ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: ''اگر کسی ذمی نے اپنا مال اپنی کسی عبادت گاہ کے لیے وقف کرنے کی

[1] یہ مسئلہ محل نظر ہے

وصیت کی تو مسلمانوں کے لائق نہیں کہ اس کے جواز کا فتویٰ دیں کیونکہ انھیں وہ فتویٰ دینا چاہیے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور حکم الٰہی یہ ہے کہ کفر وفسق اور نافرمانی کے امور میں باہمی تعاون نہ کرو، لہٰذا کفر وعصیاں کی جگہوں کے لیے مال وقف کرنے میں تعاون کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟''

- منسوخ شدہ کتب، مثلاً: تورات، انجیل یا گمراہ کن کتب کی طباعت واشاعت کی وصیت کرنا بھی درست نہیں، مثلاً: زندیقوں اور ملحدوں کی کتب۔

احکام وصیت میں سے ایک حکم یہ ہے کہ موصٰی بہٖ (جس چیز کی وصیت کی گئی ہے) مال کی شکل میں ہو یا اس سے جائز منافع حاصل ہوا اگرچہ اس کی سپردگی سے وہ عاجز ہو، مثلاً: فضا میں موجود پرندے کے بارے میں وصیت کرنا یا (جانور کے) پیٹ میں موجود بچے کے بارے میں وصیت یا جانور کے تھنوں میں موجود دودھ کے بارے میں وصیت کرنا یا معدوم چیز کے بارے میں وصیت کرنا، مثلاً: کسی نے وصیت کی کہ اس کے جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہوگا یا فلاں درخت کا پھل ہمیشہ کے لیے یا ایک سال کے لیے تمھارا ہوگا۔ اگر معدوم شے سے کچھ حاصل ہوا تو وہ موصی لہ کا ہے ورنہ وصیت باطل قرار پائے گی کیونکہ وصیت نافذ ہونے کا محل موجود نہیں رہا۔

- مجہول شے کی وصیت کرنا درست ہے، مثلاً: کسی نے کسی کو غلام یا بکری دینے کی وصیت کی تو موصٰی لہ کو کوئی غلام یا بکری مہیا کی جائے گی۔

- وصیت کے احکام میں یہ بھی ہے کہ اگر موصی (وصیت کرنے والے) نے تہائی مال کی وصیت کی، پھر وصیت کے بعد مزید مال حاصل ہوا تو تہائی میں نیا مال بھی شامل ہوگا کیونکہ تہائی مال سے مراد اس مال کی تہائی ہے جو عندالموت موجود ہے نہ کہ بوقت وصیت۔

- وصیت کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر موصی نے کسی شخص کو اپنے مال میں سے کوئی مخصوص شے دینے کی وصیت کی لیکن وہ چیز موصی کی موت سے قبل یا بعد میں ضائع ہوگئی تو وصیت باطل ہو جائے گی کیونکہ وصیت کردہ چیز کے ضائع ہونے کی وجہ سے موصٰی لہ کا حق ختم ہو گیا۔

- احکام وصیت میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے وصیت میں مال کی حد مقرر نہ کی اور یوں کہا: ''میرے مال کا ایک سہم (حصہ) فلاں شخص کو دیا جائے تو کل ترکہ میں سے چھٹا حصہ مراد ہوگا کیونکہ کلام عرب میں ''سہم'' سے مراد چھٹا حصہ ہی ہوتا ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی یہی رائے ہے۔ علاوہ ازیں مرد کے لیے چھٹا حصہ (وراثت کے) فرض حصوں میں سے کم از کم ہے، لہٰذا وصیت میں یہی مراد لیا جائے گا۔ اگر وصیت کرنے والے نے کہا: ''فلاں شخص کو کچھ مال دیا جائے لیکن اس کی مقدار متعین نہ کی تو موصٰی لہ کو اس قدر مال دیا جائے گا

جسے عرف میں مال کہا جائے کیونکہ لغت عرب میں اور شریعت میں شے کی کوئی مقرر حد نہیں، لہٰذا موصٰی لہ کو کم از کم اس قدر مال دیا جائے گا کہ وہ مالدار ہو جائے ورنہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔ واللّٰہ أعلم.

وصی کے احکام

''وصی'' یا ''موصٰی الیہ'' سے مراد وہ شخص ہے جس پر میت نے اپنی وصیت کے نفاذ میں ان امور کی ذمے داری ڈالی ہو جن کو وہ خود اپنی زندگی میں انجام دیتا تھا اور ان میں نیابت بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ''موصٰی الیہ'' وصیت کے نفاذ میں مُوصِی (وصیت کرنے والے) کا نائب ہوتا ہے۔

وصیت کرنے والے کی نیابت قبول کرنا ''موصٰی الیہ'' کے لیے مستحب ہے اور اجر وثواب کا باعث ہے لیکن اس ذمے داری کو وہ شخص قبول کرے جس میں وصیت کو نافذ کرنے کی قدرت وطاقت ہو نیز اسے اپنی امانت داری پر اعتماد ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾ ''نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی امداد کرو۔''[1]

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ»

''اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مشغول رہتا ہے۔''[2]

علاوہ ازیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنی وصیت کے نفاذ میں نائب بنایا تھا۔ اسی طرح سیدنا عبیدہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر اپنی وصیت کے اجرا کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو وصیت کے نفاذ میں ذمے دار بنایا تھا۔[3]

اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے بعد اپنی بڑی اولاد کو اس کا ذمے دار قرار دیا۔

جو شخص موصی کی وصیت پر عمل درآمد نہیں کروا سکتا یا اسے اپنی امانت داری پر اعتماد نہیں، اسے یہ ذمے داری ہرگز قبول نہیں کرنی چاہیے۔

▲ وصی کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ کسی کافر پر ایسی اہم ذمہ داری ڈالنا درست نہیں ہے۔

[1] المآئدة 2:5. [2] صحیح مسلم الذکر و الدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن و علی الذکر، حدیث: 2699. [3] سنن الدارمي، الوصایا، باب الوصیة للنساء، حدیث:3298.

◾ وصی کا مکلّف ہونا بھی ضروری ہے، یعنی وہ عاقل و بالغ ہو، لہٰذا بچے، کم عقل اور پاگل شخص پر یہ ذمے داری ہرگز نہ ڈالی جائے کیونکہ یہ لوگ مالی معاملات میں ولی بننے اور تصرف کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، البتہ بچے کو ''وصی بناتے وقت یہ شرط عائد کر دینا کہ وہ وصیت پر عمل تب کروائے جب بالغ ہو جائے تو یہ درست ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

«أَمِيرُكُمْ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ ، فَإِنْ قُتِلَ فَجَعْفَرُ بْنُ أَبِي طَالِبٍ»

''تمھارا امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما ہے اگر وہ شہید ہو جائے تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو امیر بنا لینا......''[1]

◾ عورت کو وصی بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ امور وصیت اور اس کے احکام کو سمجھتی ہو نیز وصیت کو نافذ کر سکتی ہو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنا وصی بنایا تھا۔[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت مرد کی طرح شہادت دے سکتی ہے تو وہ وصی بھی بن سکتی ہے۔

◾ اگر کوئی شخص وصیت پر عمل درآمد کی طاقت نہیں رکھتا لیکن وہ فکر سلیم اور عقل و دانش کا مالک ہے تو اسے وصی بنایا جا سکتا ہے، البتہ بطور معاون اس کے ساتھ ایسا شخص مقرر کیا جائے جو وصیت کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو اور امانت دار ہو۔

◾ وصی ایک سے زیادہ افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ انھیں یکبارگی وصی مقرر کیا گیا ہو یا ایک ایک کر کے جبکہ پہلے کو معزول بھی نہ کیا ہو۔

◾ اگر ایک سے زیادہ افراد کو وصی مقرر کیا گیا ہو تو نفاذ وصیت کے عمل میں سبھی شریک ہوں گے۔ ان میں کوئی بھی دوسرے کے بغیر مال میں تصرف نہ کرے۔ اگر ایک کہیں غائب ہو گیا یا فوت ہو گیا تو حاکم کو چاہیے کہ اس کی جگہ کسی اور کو مقرر کر دے جو امور وصیت کو اچھی طرح نبھا سکے۔

◾ وصی (جس کو وصیت کی گئی) موصی (وصیت کرنے والا) کی وصیت کو اس کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد قبول کر سکتا ہے، نیز وہ موصی کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد (جب چاہے) اس ذمے داری سے الگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح موصی وصی کو جب بھی چاہے وصیت کی ذمے داری سے معزول کر سکتا ہے کیونکہ اس کی حیثیت ایک وکیل کی سی ہوتی ہے۔

◾ وصی کسی دوسرے شخص کو وصی نہیں بنا سکتا الا یہ کہ موصی نے اسے اجازت دی ہو، مثلاً: موصی وصی کو کہے: ''میں

[1] التمهيد لابن عبدالبر: 388/8، ومنار السبيل، ص: 430. [2] سنن الدارمي، الوصايا، باب الوصية للنساء، حديث: 3298.

تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ تم جسے چاہو وصی بنالو۔''

▲ جب کسی پر مالی وصیت کے نفاذ کی ذمے داری ڈالی جائے تو وہ مال واضح اور متعین ہونا چاہیے تا کہ وصی اس کی اچھی طرح حفاظت ونگرانی اور اس میں تصرف کر سکے۔

▲ جس کام کی وصیت کی گئی ہے وہ ایسا ہونا چاہیے جو موصی کے لیے کرنا جائز ہو، مثلاً: موصی کے قرض کی ادائیگی کرنا، تہائی مال کا تقسیم کرنا یا موصی کے بچوں کی نگہداشت کرنا وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وصی بغیر اجازت شے میں تصرف کا مجاز نہیں، لہٰذا موصی جس مال کا مالک نہیں اس میں وصی کے لیے تصرف جائز نہیں جیسے وکالت میں ہوتا ہے، نیز موصی اصل ہے اور وصی اس کی فرع اور نائب۔ جس کام کا اصل شخص کو اختیار نہیں اس کے نائب کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوسکتا، مثلاً: کسی عورت کا اپنے چھوٹے بچوں کی نگہداشت کے لیے ان کے باپ کی موجودگی میں کسی کو وصی بنانا جائز نہیں کیونکہ بچوں کی سرپرستی ان کے باپ کے علاوہ اور کسی شخص پر نہیں ہوتی۔

▲ جس چیز کی وصیت میں کسی کو وصی مقرر کیا جائے اس کی ذمے داری صرف اسی چیز تک محدود ہے۔ موصی پر دوسری چیزوں کی ذمے داری نہ ہوگی، مثلاً: کسی نے اپنے قرضوں کی ادائیگی میں ایک شخص کو وصی مقرر کیا تو وہ موصی کی اولاد کے امور میں وصی نہ ہوگا کیونکہ وہ ایک ایسا وکیل ہے جس کے اختیارات محدود ہوتے ہیں، یعنی جن میں اجازت حاصل ہے صرف انھیں ہی نبھائے گا۔

▲ کافر کسی مسلمان شخص کو اپنا وصی بنا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا ترکہ مباح ہو۔ اگر غیر مباح، یعنی شراب یا خنزیر وغیرہ حرام اشیاء پر اسے وصی بنایا گیا تو درست نہیں بلکہ اسے انکار کر دینا چاہیے کیونکہ ایسی ذمے داری قبول کرنا مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

▲ اگر موصی نے اپنے وصی سے کہا کہ میرے ترکہ کا ایک تہائی حصہ جہاں چاہو خرچ کر دینا تو وصی کے لیے جائز نہیں کہ اس میں سے کچھ اپنے لیے رکھ لے کیونکہ اس کی اسے اجازت نہیں دی گئی نیز یہ بھی جائز نہیں کہ وہ مال اپنی اولاد یا اپنے ورثاء کو دے کیونکہ ممکن ہے عام لوگ اس پر شک کریں کہ اس نے وصیت کے خلاف ذاتی مفاد حاصل کیا ہے۔

▲ احکام وصیت میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جنگل میں فوت ہو جائے جہاں کوئی حاکم نہ ہو اور نہ کوئی وصی مقرر کیا گیا ہو تو جو مسلمان بھی مرنے والے کے پاس ہو وہ اس کے ترکہ کی تقسیم کا ذمے دار بن جائے اور وہ کام کرے جو اس کے لیے مفید ہو، مثلاً: بیع وغیرہ، اس لیے کہ اس کی ضرورت ہے وگرنہ مال ترکہ ضائع ہو جائے گا اور مال ترکہ کی حفاظت فرض کفایہ ہے۔

اور اسی ترکہ سے میت کی تجہیز و تکفین کرے۔

احکام وراثت

وراثت کا موضوع نہایت اہم اور قابل اعتناء ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت سی احادیث میں اس علم کو سیکھنے اور سکھانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا فَإِنَّهُ نِصْفُ الْعِلْمِ وَهُوَ يُنْسٰى وَهُوَ أَوَّلُ شَيْءٍ يُّنْزَعُ مِنْ أُمَّتِي»

''علم فرائض سیکھو اور اسے (لوگوں کو) سکھاؤ کیونکہ یہ نصف علم ہے اور اسے بھلا دیا جائے گا۔ اور علم میں سے یہی وہ پہلی شے ہوگی جسے میری امت سے اٹھا لیا جائے گا۔''[1]

ایک روایت میں ہے:

«فَإِنِّي امْرُؤٌ مَّقْبُوضٌ وَّالْعِلْمُ سَيُقْبَضُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ، حَتَّى يَخْتَلِفَ اثْنَانِ فِي فَرِيضَةٍ لَّا يَجِدَانِ اَحَدًا يَّفْصِلُ بَيْنَهُمَا»

''میں ایسا انسان ہوں جس کی روح قبض کر لی جائے گی اور بے شک علم اٹھا لیا جائے گا۔ فتنے ظاہر ہوں گے حتی کہ دو آدمی مسئلۂ وراثت میں اختلاف کریں گے لیکن کوئی فیصلہ کرنے والا نہ پائیں گے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے جیسے فرمایا تھا اب ویسی ہی صورت حال نظر آ رہی ہے۔ علم میراث نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اکثر لوگ اسے بھول چکے ہیں۔ آج مساجد و مدارس میں شاذ و نادر ہی اسے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ اگر کہیں پڑھایا بھی جاتا ہے تو ایسے ناقص اور سرسری انداز میں کہ حقیقی مقصد حاصل نہیں ہو رہا اور نہ اس سے اس کی بقا کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس علم کو زندہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوں اور اس کے محافظ بنیں۔ مساجد و مدارس اور جامعات میں اس کی تعلیم کا اہتمام کریں کیونکہ لوگوں کو اس علم کی اشد ضرورت ہے۔ خصوصاً اہل علم پر اس کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

---

[1] [ضعيف] سنن ابن ماجه، الفرائض، باب الحث على تعليم الفرائض، حديث: 2719، وسنن الدارقطني: 66/4، حديث: 4014. [2] [ضعيف] جامع الترمذي، الفرائض، باب ما جاء في تعليم الفرائض، حديث: 2091، وسنن الدارمي، المقدمة، باب الاقتداء بالعلماء، حديث: 227 واللفظ له.

«اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ، وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُّحْكَمَةٌ أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ»

''(بنیادی) علم تین ہیں ان کے سوا سب علوم ایک زائد فضیلت کا باعث ہیں: محکم آیات کا علم، سنت صحیحہ ثابتہ کا علم یا علم الفرائض جس کی بنیاد عدل وانصاف پر ہے۔''[1]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ فَإِنَّهَا مِنْ دِينِكُمْ» ''علم فرائض سیکھو کیونکہ یہ تمھارے دین کا حصہ ہے۔''[2]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

«مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ، فَلْيَتَعَلَّمِ الْفَرَائِضَ»

''جو شخص قرآن مجید کا علم حاصل کرے وہ فرائض کا علم بھی سیکھے۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی: ''علم فرائض نصف علم ہے۔'' (کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت حیات اور دوسری حالت موت۔ علم فرائض کا تعلق موت کے بعد کے احکام سے ہے جبکہ بقیہ علوم حیات سے متعلق ہیں۔ بعض علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تمام لوگوں کو اس علم سے واسطہ پڑتا ہے، یعنی لوگ تقسیم ترکہ میں علم فرائض کے زیادہ محتاج ہیں۔ اسی طرح بعض علماء نے اس کے اور بھی مطالب بیان کیے ہیں۔ الغرض مقصد یہ ہے کہ اس علم کی تعلیم وتدریس میں اہتمام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

▲ اس علم کو علم الفرائض کہا جاتا ہے۔ فرائض: فریضة کی جمع ہے جو فرض سے ماخوذ ہے۔ فرض کے لغوی معنی مقرر کرنے کے ہیں، اس لیے کہ اس علم میں ورثاء کے حصے مقرر شدہ ہوتے ہیں، لہٰذا فریضة وہ مقرر حصہ ہے جو شریعت نے مستحق شخص کے لیے مقرر کیا ہے۔

علم فرائض کی تعریف یوں کی جاتی ہے: ''فقہ وحساب سے متعلق ان اصولوں کو جاننا جن کے ذریعے سے ترکہ میں سے وارثوں کے حصے معلوم ہوں۔''

▲ میت کے ترکہ سے متعلق چار[4] حقوق ہیں:

---

① [ضعیف] سنن أبي داود، الفرائض، باب ما جاء في تعليم الفرائض، حديث: 2885، وسنن ابن ماجه، السنة (المقدمة)، باب اجتناب الرأي والقياس، حديث: 54. ② السنن الكبرٰى للبيهقي: 209/6. ③ السنن الكبرٰى للبيهقي: 209/6.

④ اصل کتاب میں پانچ کا لفظ ہے اور یہ تصحیح علم وراثت کی معتبر کتاب السراجي اور فقه المواريث سے کی ہے۔

① تجہیز وتکفین: سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے کفن سے لے کر دفن تک تمام اخراجات ادا ہوں گے۔

② ادائیگی قرض: پھر مطلق قرض ادا ہوں گے۔ وہ قرض اللہ تعالیٰ کا ہو، مثلاً: زکاۃ، کفارات نذر اور حج واجب یا کسی انسان کا حق ہو۔

③ اجرائے وصیت: پھر میت کے مال میں سے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی (1/3) سے وصیتیں پوری کی جائیں گی۔

④ تقسیم ترکہ: مذکورہ حقوق ادا کرنے کے بعد جو مال بچے گا اسے کتاب وسنت کے مطابق ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ ترکہ کی تقسیم اصحاب الفروض سے شروع ہوگی، پھر اگر مال باقی بچ گیا تو وہ عصبات (ورثاء) کو ملے گا جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

شریعت کے وضع کردہ احکام میراث میں کسی قسم کا تغیر جائز نہیں ان میں تغیر کرنا اللہ عزوجل کے ساتھ کفر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ ﴾

''یہ حدیں اللہ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور ایسوں ہی کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ کے فرمان: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ میں سابقہ احکام میراث کی طرف اشارہ ہے اور انھی کو حدود اللہ کہا ہے کیونکہ حد سے تجاوز کرنا درست نہیں ہوتا۔ اور ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ میں میراث کی تقسیم کی طرف اور شرعی احکام کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے الفاظ ﴿ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ کا عموم بھی اسی پر دال ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَطَعَ مِيرَاثَ وَارِثِهِ قَطَعَ اللهُ مِيرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''جس نے کسی وارث کو اس کی میراث سے محروم کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے جنت کی میراث سے

① النسآء 4:13،14.

محروم کردے گا۔‘‘[1]

شرعی احکام میراث میں تصرف وتغیر کی صورت یہ ہے کہ غیر وارث کو وارث قرار دینا یا کسی وارث کو اس کے تمام حصے سے یا کچھ حصے سے محروم کر دینا یا مرد اور عورت کا حصۂ میراث برابر کر دینا جیسا کہ بعض کفریہ قوانین میں موجود ہے جو سراسر اللہ تعالیٰ کے حکم: ’’مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔‘‘ کے مخالف ہے۔ ایسی ترامیم کرنے والا شخص کافر ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے الا یہ کہ وہ موت سے قبل توبہ کر لے۔

دور جاہلیت میں لوگ عورتوں اور بچوں کو حق میراث سے محروم رکھتے تھے اور ان بالغ مردوں کو حق دار سمجھتے تھے جو گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل ہوں اور اسلحہ اٹھا (کر جنگ کر) سکتے ہوں۔ اسلام نے اس قانون کو باطل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴾

’’ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی۔ جو مال ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ کر مریں خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ (اس میں) حصہ مقرر کیا ہوا ہے۔‘‘[2]

اس آیت میں عورتوں اور بچوں کو میراث نہ دینے کا قانون جاہلیت ختم کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾

’’اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں تاکیدی حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔‘‘[3]

اور فرمان الٰہی:

﴿ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾

’’اور اگر کئی بھائی بہن، یعنی مرد بھی اور عورتیں بھی ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے مثل حصہ ہے۔‘‘[4]

میں جدید جاہلی دعووں کو باطل قرار دیا گیا ہے جن میں عورت کو مرد کے برابر میراث دے کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت اور حدود اللہ سے تجاوز کیا گیا ہے۔

واضح رہے قدیم جاہلیت کے قانون میں عورتیں حق میراث سے محروم ہوتی تھیں جبکہ جدید جاہلیت کے قانون

---

① تفسیر فتح القدیر، النساء 4:13،14 واللفظ له، وسنن ابن ماجه، بلفظ: [مَنْ فَرَّ مِنْ مِّيرَاثِ ......] الوصايا، باب الحيف في الوصية، حديث: 2703. (یہ روایت ضعیف ہے۔) ② النسآء 4:7. ③ النسآء 4:11. ④ النسآء 4:176.

میں عورتوں کو ان کے جائز حق سے زیادہ دے دیا گیا ہے، حالانکہ دین اسلام نے عورت سے عدل وانصاف کیا ہے اور اسے یہ مقام عزت بخشا کہ اسے جائز حق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار و منافقین اور ملحدین کو تباہ و برباد کرے جن کے عزائم وارادے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کیے ہیں:

﴿ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ ﴾

''وہ (کافر) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔''[1]

وراثت کے اسباب اور ورثاء کا بیان

شرعاً وراثت یہ ہے کہ میت کا مال شریعت کے اصولوں کے مطابق زندہ شخص یا اشخاص کی طرف منتقل ہو جائے۔

اسباب میراث درج ذیل ہیں:

① رحم، یعنی قرابت نسبی، وہ لوگ جو قرابت داری کی وجہ سے وارث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ﴾

''اور رشتے ناتے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ اولی ہیں اللہ کے حکم میں۔''[2]

اصحاب قرابت میت سے قریب کا رشتہ رکھتے ہوں یا دور کا وہ وارث ہوں گے بشرطیکہ اس کے آگے کوئی رکاوٹ بننے والا نہ ہو، یعنی قریب کے رشتے دار کی موجودگی میں دور کا رشتے دار وارث نہ ہوگا۔

رشتے دار ورثاء تین قسم کے ہیں ① اصول ② فروع ③ اور حواشی۔

اصول سے مراد ہے: باپ دادا پردادا اوپر تک۔

فروع سے مراد ہے: اپنی صلبی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد نیچے تک۔

حواشی کا مطلب ہے: بہن، بھائی اور بھائی کے بیٹے نیچے تک اور چچے (خواہ سگے ہوں یا باپ دادا کے) اوپر تک اور ان کے بیٹے نیچے تک۔

② نکاح: کسی مرد اور عورت کا شرعی طریقے سے عقد زوجیت میں منسلک ہونا اگرچہ خلوت کا موقع میسر نہ ہوا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے:

① التوبة 9:32. ② الأنفال 8:75.

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ﴾

''تمھاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا (نصف) تمھارا ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمھارے لیے چوتھائی حصہ ہے اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد۔ اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی حصہ ہے......۔''[1]

محض عقد نکاح کے سبب خاوند اور بیوی ایک دوسرے کے ترکہ کے وارث ہوں گے۔ اسی طرح زوجین طلاق رجعی کی عدت میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے کیونکہ طلاق رجعی کی عدت میں زوجیت قائم رہتی ہے۔ واضح رہے کہ نکاح کی تعریف میں شرعی کی قید لگانے سے غیر شرعی نکاح خارج ہو گیا جو فاسد ہے اور اس سے وارثت بھی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ایسا نکاح کالعدم ہے۔

③ ولاء: شرعاً ایسی میراث ہے جو مالک کو اپنے آزاد کردہ غلام کی موت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اسے عَصُوبَةٌ سَبَبِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

ولاء کے سبب آزاد کرنے والا اپنے آزاد کردہ کا وارث ہوتا ہے اس کے برعکس نہیں۔ اور اگر مُعْتِق، یعنی آزاد کرنے والا زندہ نہ ہو تو اس کے عصبات بالنفس (بیٹے، باپ، بھائی اور چچا) آزاد کردہ کی ولاء (ترکہ) لیں گے، عصبہ بالغیر یا عصبہ مع الغیر وارث نہ ہوں گے۔

ولاء کے سبب وارث ہونے کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ» ''ولاء کا تعلق نسبی تعلق کی طرح ہے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ» ''ولاء صرف اسے ملتی ہے جو آزاد کرے۔''[3]

جنس کے اعتبار سے ورثاء کی اقسام: جنس کے اعتبار سے ورثاء دو طرح کے ہوتے ہیں: مرد اور عورت۔ مرد ورثاء

① النسآء 4:12. ② صحيح ابن حبان (الإحسان): 220/7، حديث: 4929، والمستدرك للحاكم: 379/4، حديث: 7991,7990. ③ صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبيﷺ، حديث: 1493، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث: 1504. واضح رہے آزاد کردہ شخص کی ولاء اس کو آزاد کرنے والے یا اس کے عصبات کو تب ملتی ہے جب آزاد کردہ کا اپنا کوئی نسبی عصبہ نہ ہو۔ اس مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھیے تفہیم المواریث۔ (صارم)

درج ذیل ہیں:

① بیٹا پوتا نیچے تک۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۚ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''[1]

یاد رہے جب بیٹا موجود نہ ہو تو پوتا اس کا قائم مقام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ ﴾ ''اے آدم کے بیٹو!

نیز فرمایا: ﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ ''اے یعقوب کے بیٹو!

② باپ دادا اوپر تک، یعنی جن کا تعلق میت سے محض مردوں کے ذریعے سے ہو (وارث اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ نہ ہو۔) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ﴾

''اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے مال کا چھٹا حصہ ہے۔''[2]

دادا باپ کے قائم مقام ہوتا ہے (جبکہ باپ زندہ نہ ہو۔) رسول اللہ ﷺ نے میت کے دادے کو چھٹا حصہ دیا تھا۔

③ بھائی: بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں: ① عینی، یعنی جو ماں باپ دونوں کی طرف سے سگے ہوں۔ ② علاتی، یعنی جو صرف باپ کی طرف سے سگے ہوں۔ ③ اخیافی، یعنی جو صرف ماں کی طرف سے سگے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے حق وراثت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ﴾

''وہ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ (خود) تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس (بہن کے کل مال) کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو۔''[3]

اس آیت میں عینی اور علاتی بھائیوں کا ذکر ہے۔ اخیافی بھائی بہن کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ﴾

① النسآء 4:11. ② النسآء 4:11. ③ النسآء 4:176.

''اور جس کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو (اس کا باپ بیٹا نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''[1]

④ اسی طرح عینی اور علاتی بھتیجا بھی وارث ہے، البتہ اخیافی بھتیجا وارث نہیں ہوتا کیونکہ وہ ذوی الارحام میں شامل ہے۔

⑤ عینی اور علاتی چچا اور ان کے بیٹے وغیرہ نیچے تک۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»

''اصحاب الفروض کو ان کے حصے دو، پھر جو بچ جائے وہ قریبی مرد (عصبہ) کو دو۔''[2]

⑥ خاوند: ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ ﴾

''تمھاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا حصہ تمھارا ہے۔''[3]

⑦ صاحب ولاء آزاد کرنے والا یا اس کے عصبات آزاد کردہ کے وارث ہیں۔ارشاد نبوی ہے:

«اَلْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ» ''ولاء بھی نسب کی طرح کا ایک تعلق ہے۔''[4] نیز فرمایا:

«فَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ» ''ولاء کا حقدار وہ ہے جو آزاد کرنے والا ہے۔''[5]

ورثاء عورتیں درج ذیل ہیں:

① بیٹی اور بیٹے کی بیٹی اگرچہ بیٹا نیچے تک ہو۔فرمان الٰہی ہے:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ﴾

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انھیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔''[6]

① النسآء 12:4. ② صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، حديث: 6732، وصحيح مسلم، الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فلأولى رجل ذكر، حديث: 1615 ③ النسآء 12:4. ④ صحيح ابن حبان (الإحسان): 220/7، حديث: 4929، والمستدرك للحاكم: 379/4، حديث: 7990،7991. ⑤ صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبيﷺ، حديث: 1493، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث: 1504. ⑥ النسآء 11:4.

② ماں، دادی اور نانی: ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ﴾

''اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے۔ ہاں، اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا (حصہ) ہے۔''[1]

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلْجَدَّةِ السُّدُسُ إِذَا لَمْ تَكُنْ دُونَهَا أُمٌّ»

''دادی نانی کو صرف چھٹا حصہ ملتا ہے بشرطیکہ میت کی ماں زندہ نہ ہو۔''[2]

③ عینی بہن، علاتی بہن اور اخیافی بہن: ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ﴾

''اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو (اس کا باپ بیٹا نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''[3]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ﴾

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو، پس اگر بہنیں دو ہوں تو کل چھوڑے ہوئے کا دو تہائی ملے گا۔''[4]

④ بیوی: ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ﴾

''اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمھاری اولاد نہ ہو۔''[5]

⑤ آزاد کرنے والی عورت: فرمان نبوی ہے:

«فَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ» ''ولاء کا حقدار وہی ہے جو آزاد کرے۔''[6]

① النسآء 4:11. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الفرائض، باب في الجدة، حديث: 2895. ③ النسآء 4:12. ④ النسآء 4:176. ⑤ النسآء 4:12. ⑥ صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقه على موالي أزواج النبي ﷺ، حديث: 1493، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث: 1504.

یہ ہیں وہ مرد اور عورتیں جنھیں اسلام نے وارث قرار دیا ہے۔ اگر ہم مزید تفصیل میں جائیں تو مرد ورثاء کی تعداد پندرہ (15) جب کہ عورتوں کی تعداد دس (10) تک پہنچ جاتی ہے۔ تفصیل اس موضوع کی اہم اور بڑی کتب میں موجود ہے۔

وارث بننے کے اعتبار سے ورثاء کی اقسام: وارث بننے کے اعتبار سے ورثاء کی تین قسمیں ہیں۔ ① اصحاب الفروض ② عصبات ③ ذووالارحام۔ ہر ایک کی تعریف درج ذیل ہے۔

① **اصحاب الفروض:** وہ ورثاء جن کا حصہ شریعت میں مقرر ہے۔ ان کے حصے میں اضافہ صرف رَدّ کی صورت میں ہوسکتا ہے اور کمی صرف عَوْل کی صورت میں ہوسکتی ہے۔

② **عصبات:** وہ ورثاء جو اصحاب الفرائض سے بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں۔ اگر وہ اکیلا ہو تو سارے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

③ **ذووالارحام:** وہ ورثاء جو اس وقت وارث ہوتے ہیں جب اصحاب الفرائض (زوجین کے علاوہ) اور عصبات نہ ہوں۔

اصحاب الفرائض ورثاء کی تعداد بارہ ہے جن میں چار مرد، یعنی باپ، دادا، خاوند اور اخیافی بھائی ہیں اور آٹھ عورتیں ہیں، یعنی ماں، دادی (دادی کے ساتھ نانی بھی شریک ہے)، بیوی، بیٹی، پوتی، اخیافی بہن، عینی بہن اور علاتی بہن۔ اب ہم ہر صاحب فرض کے حصے کی تفصیل سے آپ کو آگاہ کریں گے۔

خاوند اور بیوی کی میراث کا بیان

خاوند نصف ترکہ کا حقدار ہے بشرطیکہ اس کی فوت شدہ بیوی کی اپنی اولاد نہ ہو یا بیٹے کی اولاد نہ ہو اور وہ چوتھائی ترکہ کا حقدار ہے جب اس کی فوت شدہ بیوی کی اولاد ہو یا اس کے بیٹے کی اولاد ہو۔[1] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾

''تمھاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا (نصف) تمھارا ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمھارے لیے چوتھائی حصہ ہے اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد۔''[2]

① بیوی کی اولاد، خواہ موجود شوہر سے ہو یا سابق شوہر سے ہو۔ (صارم) ② النسآء 12:4.

بیوی (ایک ہو یا زیادہ) کے لیے ترکہ کا چوتھائی حصہ ہے بشرطیکہ فوت شدہ شوہر کی اولاد یا اس کے بیٹے کی اولاد نہ ہو اور وہ آٹھویں حصے کی حقدار ہے جب کہ اس کے فوت شدہ خاوند کی اپنی صلبی اولاد ہو یا بیٹے کی اولاد ہو۔[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ﴾

''اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمھاری اولاد نہ ہو اور اگر تمھاری اولاد ہو تو انھیں تمھارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔''[2]

باپ اور دادا کی میراث کا بیان

میت کا باپ وارث ہو تو دادا ترکہ سے محروم ہو جاتا ہے۔

باپ ہو یا دادا ذی فرض کی حیثیت سے اسے صرف چھٹا حصہ ملے گا بشرطیکہ میت کی مذکر اولاد ہو (خواہ مونث اولاد ہو یا نہ ہو) جیسے بیٹا اور پوتا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ﴾

''اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے اگر اس (میت) کی اولاد ہو۔''[3]

- باپ ہو یا دادا اسے صرف عصبہ کی حیثیت سے باقی ترکہ ملے گا بشرطیکہ میت کی اولاد (بیٹا، بیٹی، پوتا اور پوتی) نہ ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ﴾

''اور اگر میت کے لیے اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے۔''[4]

اس آیت میں میت کے ترکہ کا وارث والدین کو قرار دیا، پھر ماں کا حصہ (ایک تہائی) مقرر کر دیا جبکہ باپ کا حصہ مقرر نہیں کیا، لہٰذا ثابت ہوا کہ باپ عصبہ کی حیثیت سے باقی سارا ترکہ لے گا۔

---

[1] خاوند کی اولاد موجودہ بیوی سے ہو یا کسی اور بیوی سے جو زندہ ہو یا فوت ہو گئی ہو۔ (صارم)

[2] النسآء 12:4. [3] النسآء 11:4. [4] النسآء 11:4.

▲ باپ یا دادا کو ذی فرض اور عصبہ دونوں حیثیتوں سے حصہ ملے گا۔ ذی فرض کی حیثیت سے چھٹا اور مزید عصبہ کی حیثیت سے اصحاب الفرائض سے بچا ہوا مال مل جاتا ہے بشرطیکہ میت کی صرف مونث اولاد، یعنی بیٹی یا پوتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ»

''اصحاب الفرائض کو ان کے حصے ادا کرو، پھر جو مال باقی بچ جائے وہ قریبی مرد (عصبہ) کو دو۔''[1]

واضح رہے بیٹے اور پوتے کے بعد باپ ہی میت کے قریب ترین ہے۔

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ باپ کی تین حالتیں ہیں: ① میت کے بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں صرف صاحب فرض ہوگا۔ ② میت کے بیٹے یا پوتے کے نہ ہونے کی حالت میں صرف عصبہ ہوگا۔ ③ صاحب فرض اور عصبہ ہوگا جبکہ میت کی اولاد میں بیٹی یا پوتی ہو۔

مذکورہ تین صورتوں میں دادا باپ کی طرح ہے جبکہ باپ زندہ نہ ہو۔ نصوص شرعیہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔

دادا کے باب میں ایک چوتھی اضافی حالت بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب دادا وارث بن رہا ہو اور اس کے ساتھ میت کے عینی (سگے) یا علاتی (پدری) بھائی یا بہنیں ہوں تو دادا انھیں محروم کر دے گا جیسا کہ باپ انھیں محروم کر دیتا ہے یا دادا ایک بھائی کے برابر حصہ لے گا۔ اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

علماء کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ دادا بھائی کے برابر حصہ لے گا کیونکہ دونوں باپ کے واسطے سے میت کی قرابت میں برابر ہیں۔ دادا باپ کا باپ ہے جب کہ بھائی باپ کے بیٹے ہیں، لہٰذا میراث میں بھی سب برابر ہوں گے۔ صحابۂ کرام میں سے سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی یہی رائے ہے۔ ائمۂ کرام میں سے امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان حضرات نے مختلف دلائل توجیہات اور قیاسات سے استدلال کیا ہے جو کتب مطولہ میں موجود ہیں۔

علمائے کرام کے دوسرے فریق کی رائے یہ ہے کہ باپ کی طرح دادا بھی بھائی بہنوں کو ترکہ سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ رائے سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن زبیر، سیدنا عثمان، سیدہ عائشہ، سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہم کی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی کی تائید میں ملتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اس مسلک کی تائید میں

[1] صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد مع أبيه وأمه، حديث: 6732، وصحيح مسلم، الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها......، حديث: 1615.

نہایت قوی اور کثیر دلائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ رائے پہلی رائے سے قوی تر ہے۔[1]

ماں کی میراث کا بیان

ماں کے حصہ پانے کی تین صورتیں ہیں:

① دو حالتوں میں چھٹا حصہ لیتی ہے:

① جب میت کی مذکر یا مونث اولاد ہو جو وراثت کی حقدار ہو یا بیٹے کی اولاد ہو۔

② جب میت کے کسی بھی قسم کے دو یا زیادہ بھائی بہنیں ہوں خواہ وہ وارث ہوں یا نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ﴾

''اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے اگر اس (میت) کی اولاد ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے۔ ہاں! اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''[2]

② ماں کو کل مال کا ایک تہائی حصہ ملے گا جبکہ مندرجہ بالا دونوں حالتیں نہ ہو، یعنی نہ تو میت کی اپنی صلبی اولاد ہے اور نہ بیٹے کی اولاد ہے۔ اور نہ ہی میت کے بھائی بہن ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ﴾

''پس اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے۔ ہاں! اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''[3]

③ ماں کو باقی ماندہ ترکہ میں سے ایک تہائی ملے گا جبکہ دو صورتوں عُمَرِیَّتَیْنِ میں سے کوئی ایک صورت ہو جو یہ ہیں:

ا) خاوند، ماں اور باپ (یہ مسئلہ چھ کے عدد سے بنے گا۔)

ب) بیوی، ماں اور باپ (یہ مسئلہ چار کے عدد سے بنے گا۔)

① جو صاحب علم اس مسئلے میں تفصیل کا طالب ہو وہ ''تفہیم المواریث'' کا مطالعہ کرے۔ (صارم)

② النسآء 4:11۔ ③ النسآء 4:11۔

اس مسئلے کو عُمَرِیَّتَیْنِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس میں فیصلہ دیا کہ ماں کے لیے زوجین میں سے کسی ایک کی موجودگی میں ثُلُثُ مَابَقِيَ ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ماں کے لیے ثُلُثُ مَا بَقِيَ کا حصہ نہایت درست ہے کیونکہ صرف والدین کے وارث ہونے کی صورت میں قرآن نے ماں کو تہائی حصہ دیا ہے۔ اگر زوجین میں سے کوئی شامل ہو تو اسے اس کا حصہ دے کر باقی والدین کا ہے تو اسے اصل کی طرح ہی تقسیم کریں گے جیسا کہ میت پر قرض ہو یا اس نے وصیت کی ہو تو پہلے اسے ادا کریں گے، پھر باقی مال تین حصے کر کے تقسیم کریں گے کہ ماں کو ایک حصہ اور باپ کو دو حصے ملیں گے۔''[1]

جدہ صحیحہ (دادی نانی) کی میراث کا بیان

جدہ صحیحہ سے مراد وہ عورت ہے جس کی میت کے ساتھ قرابت بواسطہ جد فاسد[2] نہ ہو، مثلاً: نانی پرنانی یا دادی پردادی وغیرہ۔ اور اگر کسی کی میت کے ساتھ قرابت بواسطہ جد فاسد ہو تو وہ جدہ فاسدہ ہے جو وارث نہ ہوگی کیونکہ وہ ذوی الارحام میں شامل ہے، مثلاً: ماں کے باپ (نانا) کی ماں وغیرہ۔

- جدہ جو وارث بن سکتی ہے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ میت سے اس کی قرابت صرف مؤنثوں کے ذریعے سے ہو جیسے نانی پرنانی وغیرہ یا اس کی قرابت صرف مذکر کے ساتھ ہو جیسے دادی پردادی وغیرہ۔

جدہ جو وارث نہیں بن سکتی اس کا ضابطہ یہ ہے کہ قرابت مذکر کے ذریعے سے ہو جیسے ماں کے باپ کی ماں (ماں کی دادی) یا (دادی کی دادی) دوسرے الفاظ میں: وہ عورت جس کی میت کی طرف نسبت کرتے ہوئے دو مؤنثوں کے درمیان ایک مذکر ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر جدہ صحیحہ وارث ہوگی جبکہ جدہ فاسدہ وارث نہ ہوگی۔

- جدہ صحیحہ کے وارث ہونے کی دلیل سنت رسول اور اجماع ہے۔

حضرت قبیصہ بن ذویب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس کسی میت کی نانی حاضر ہوئی اور اس نے اپنے حق میراث کی مقدار پوچھی تو آپ نے فرمایا: کتاب اللہ میں تیرا حصہ کچھ نہیں ہے اور نہ میرے علم

[1] مجموع الفتاوٰی: 16/198,197 بتصرف.

[2] جد فاسد وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان واسطہ عورت ہو، مثلاً: نانا یا دادی کا باپ وغیرہ۔ (صارم)

کے مطابق سنت رسول میں تیرا حصہ ہے۔ ہاں تو واپس چلی جا میں لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کروں گا۔ جب لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس مجلس میں موجود تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی نانی کو چھٹا حصہ دیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر وہی بات کہی جو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہی تھی، چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کر دیا۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کے پاس کسی اور میت کی دادی آئی جو اپنی میراث کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیرے لیے کتاب اللہ میں علیحدہ کوئی حصہ نہیں۔ اور جو پہلے فیصلہ کیا گیا ہے وہ تیری غیر کے لیے ہے اور میں وراثت میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ بس وہی چھٹا حصہ ہی ہے جو تم دونوں (نانی دادی) کو ملے گا اگر تم اکٹھی ہو اور اگر تم میں سے کوئی ایک اکیلی وارث ہو تو وہ حصہ اسی کو مل جائے گا۔[1]

اسی طرح سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کے لیے چھٹا حصہ تب مقرر کیا جب میت کی ماں نہ ہو۔[2]

ان دو روایتوں سے ثابت ہوا کہ جدہ صحیحہ کے لیے میراث میں سے چھٹا حصہ ہے جیسا کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما نے کہا تھا کہ اس (جدہ) کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ قرآن میں مذکورہ ماں کئی قیود کے ساتھ مقید ہے جو کہ قریبی ماں کے ساتھ حکم کو خاص کرتی ہے، جدہ (دادی نانی) کو اگرچہ ماں کہا گیا ہے مگر وراثت میں مذکورہ جدہ ماں کے حکم میں داخل نہیں جبکہ قرآن میں مذکور ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَٰتُكُمْ ﴾ میں (دادی نانی) شریک ہیں[3] لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (جدہ) کو سدس (چھٹا حصہ) دیا ہے۔

اسی طرح جدہ کی میراث علمائے امت کے اجماع سے ثابت ہے۔ نانی دادی کے حق میراث میں تو کسی صاحب علم کا اختلاف نہیں، البتہ ان دونوں کے علاوہ میں اختلاف ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء کی ایک جماعت کا فرمان ہے: ایک درجہ کی جدہ صحیحہ ایک ہو یا زیادہ تمام کی تمام وارث ہوں گی، البتہ ان کے نزدیک جدہ فاسدہ وارث نہیں، مثلاً: نانا کی ماں۔ بعض علماء نے تین جدات کو وارث قرار دیا ہے اور وہ ہیں نانی دادی اور دادا کی ماں۔

---

① [ضعيف] سنن أبي داود، الفرائض، باب في الجدة، حديث: 2894، وجامع الترمذي، الفرائض، باب ما جاء في ميراث الجدة، حديث: 2101، وسنن ابن ماجه، الفرائض، باب ميراث الجدة، حديث: 2724، ومسند أحمد: 226,225/4. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الفرائض، باب في الجدة، حديث: 2895. ③ مجموع الفتاوى: 352/31.

▲ جدہ صحیحہ کے وارث ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ ماں زندہ نہ ہو کیونکہ میت اور جدہ (نانی) کے درمیان ماں واسطہ ہے اور واسطہ دور کے رشتہ والے کو محروم کر دیتا ہے الا یہ کہ شریعت نے جسے مستثنیٰ قرار دیا ہو۔[1] اہل علم کا اجماع ہے کہ ماں ہر قسم کی جدات کو محروم کر دیتی ہے۔

جدات میں ترکہ کی تقسیم کا طریقہ: جب جدہ ایک ہو اور میت کی ماں زندہ نہ ہو تو وہ چھٹا حصہ لے گی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ یاد رہے جدہ کا حصہ چھٹے سے زیادہ نہ ہوگا۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ جب میت کی اولاد نہ ہو اور دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن نہ ہوں تو جدہ کو (ماں کی طرح) ایک تہائی ترکہ ملے گا لیکن یہ قول شاذ اور ناقابل اعتماد ہے۔

▲ اگر ایک سے زیادہ جدات ہوں جو ایک درجے کی ہوں تو وہ سب چھٹے حصے میں برابر کی شریک ہوں گی کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی فیصلہ دیا تھا، اس لیے کہ وہ ایک سے زیادہ تھیں اور کوئی مذکر ان کے ساتھ شریک نہیں تھا، لہٰذا (زیادہ) بیویوں کی طرح وہ بھی (ایک ہو یا زیادہ) برابر ہیں اور پھر ترجیح دینے والا قرینہ بھی نہیں ہے۔

▲ اگر زیادہ جدات ہوں تو جو میت کے قریب تر ہوں گی وہ چھٹے حصے کی وارث ہوں گی۔ وہ ماں کی جانب سے ہوں یا باپ کی جانب سے اور دور کے رشتے والی جدات محروم ہوں گی۔

▲ میت کی دادی میت کے باپ کی موجودگی میں وارث ہوگی۔ اس طرح دادے کی ماں دادے کی موجودگی میں وارث ہوگی ساقط نہ ہوگی اور یہ عام قاعدے کے خلاف ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی واسطے سے میت سے قرابت رکھے تو وہ واسطہ دور والے کو محروم کر دے گا، چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے باپ کی موجودگی میں دادی کے حصے کے بارے میں روایت ہے کہ "یہ پہلا واقعہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی دادی کو باپ کی موجودگی میں چھٹا حصہ دیا تھا۔[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جدہ اپنے واسطے کی میراث نہیں سمیٹ رہی کہ اس کی موجودگی میں اسے محروم قرار دیا جائے۔"[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جس نے یہ کہا کہ جو شخص کسی کے واسطے سے وارث ہوگا وہ اس واسطے کی موجودگی میں ترکہ سے محروم ہوگا اس کا قول باطل ہے کیونکہ کبھی کوئی واسطے کی موجودگی میں اپنا حصہ لیتا ہے جیسے اخیافی بھائی اور بہن ماں کی موجودگی میں وارث ہوتے ہیں حالانکہ یہ ماں ان کے اور میت کے درمیان

---

[1] مثلاً: اخیافی بھائی اور اخیافی بہنیں ماں کی موجودگی میں بھی حالانکہ وہ واسطہ ہے وارث ہو جاتے ہیں۔ (صارم)

[2] [ضعيف] جامع الترمذي، الفرائض، باب ما جاء في ميراث الجدة مع ابنها، حديث: 2102.

[3] حضرت علی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ دادی کو اس کے بیٹے (میت کے باپ) کی موجودگی میں وارث نہیں بناتے تھے۔ (صارم)

واسطہ ہے۔اسی طرح کبھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا، پھر بھی محروم کر دیتا ہے جیسے پوتا اپنے چچے کو یا بھتیجا میت کے چچے کو محروم کر دیتا ہے۔تو اصل قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی کی میراث کا وارث ہو وہ اقرب شخص کے ہوتے ہوئے ساقط ہو جاتا ہے...... جدہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے، لہٰذا اس کی موجودگی میں ساقط، یعنی محروم ہو گی اگرچہ وہ ماں کے واسطے سے حصہ نہیں لے رہی۔[1]

بیٹی اور پوتی کی میراث کا بیان

جب بیٹی اکیلی ہو تو وہ دو شرطوں کے ساتھ نصف ترکہ کی حقدار ہے۔

① اس کے ساتھ اس کی دوسری کوئی بہن نہ ہو۔

② اس کو عصبہ بنانے والا کوئی بھائی بھی نہ ہو۔دلیل اس کی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِيٓ أَوۡلَٰدِكُمۡۖ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ ٱلۡأُنثَيَيۡنِۚ فَإِن كُنَّ نِسَآءٗ فَوۡقَ ٱثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَۖ وَإِن كَانَتۡ وَٰحِدَةٗ فَلَهَا ٱلنِّصۡفُۚ ﴾

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انھیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَإِن كَانَتۡ وَٰحِدَةٗ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکیلی ہونا شرط ہے۔

اور اللہ کے فرمان: ﴿ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ ٱلۡأُنثَيَيۡنِ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی عاصب (کسی کو عصبہ بنانے والے) کا اس کے ساتھ نہ ہونا شرط ہے۔

پوتی کے نصف ترکہ لینے کی تین شرائط ہیں:

① اس کا عاصب کوئی نہ ہو جو اس کا بھائی یا اس کے درجے کا چچے کا بیٹا ہو سکتا ہے۔

② اس کے ساتھ اس کی بہن یا اس کے درجے کی چچا زاد بہن نہ ہو۔

③ میت کا کوئی ایسا وارث فرع (اولاد یا اولاد کی اولاد وغیرہ) موجود نہ ہو جو پوتی (پر پوتی وغیرہ) کی نسبت میت سے قریب تر ہو، مثلاً: بیٹا، بیٹی وغیرہ۔

[1] مجموع الفتاوٰی: 204/16. [2] النسآء 11:4.

▲ جب دو یا زیادہ بیٹیاں ہوں تو وہ دو شرطوں کے ساتھ دو تہائی کی حقدار ہیں:

① دو یا دو سے زیادہ ہوں۔

② کوئی عاصب نہ ہو اور وہ میت کا صلبی بیٹا ہے۔

درج بالا دونوں صورتوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ﴾

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انھیں مال کا دو تہائی ملے گا۔''[1]

اللہ کے فرمان ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ سے بیٹیوں کی دو تہائی وراثت کے لیے کسی عصبے کا نہ ہونا شرط معلوم ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو یا زیادہ لڑکیاں ہونا شرط ہے۔

کلمات آیت: ﴿ فَوْقَ اثْنَتَيْنِ ﴾ کے ظاہری معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ دو تہائی حصہ دو سے زیادہ بیٹیوں کا ہے دو کا نہیں جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک ہے لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو تہائی ہے، چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہ سعد کی بیٹیاں ہیں جو غزوۂ احد میں آپ کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اب ان (بیٹیوں) کے چچا نے سارا مال خود ہی سمیٹ لیا ہے۔ مال کے بغیر ان کی شادی کیسے ہو گی؟ آپ نے فرمایا: ''اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کوئی حکم نازل کرے گا، پھر آیت میراث: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ...... ﴾ الآیۃ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچا کو بلوایا اور فرمایا:

''سعد رضی اللہ عنہ کی ان دونوں بیٹیوں کو ترکہ کی دو تہائی دو اور ان کی والدہ (سعد کی بیوہ) کو آٹھواں حصہ ادا کرو پھر جو باقی بچے گا وہ تمھارا ہے۔''[2]

① النساء 4:11. ② جامع الترمذي، الفرائض، باب ما جاء في ميراث البنات، حديث: 2092، وسنن أبي داود، الفرائض، باب ما جاء في ميراث الصلب، حديث :2892,2891، وسنن ابن ماجه، الفرائض، باب فرائض الصلب، حديث:2720 ، ومسند أحمد:352/3.

نبی ﷺ کی یہ حدیث زیر بحث آیت کی تفسیر ہے، نیز یہ واقعہ اس آیت کی شان نزول ہے۔ باقی رہا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے ہم نواؤں کا مسلک مذکور کہ دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی نہیں تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کلمہ ﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ بعض کلمات کی بعض کے ساتھ مطابقت کے پیش نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾

میں تینوں کلمات ، یعنی: ﴿أَوْلَادِ﴾ ، ﴿كُنَّ﴾ اور ﴿نِسَاءً﴾ جمع استعمال ہوئے ہیں، اس لیے یہاں ﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ ہی مناسب کلمات تھے جو استعمال کیے جاتے۔

ایک جواب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے مساوی رکھا ہے۔ جب ایک لڑکا دو تہائی لے لیتا ہے تو ایک لڑکی کے لیے ایک تہائی باقی بچتا ہے۔ تو اس سے واضح ہوگیا کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہے کیونکہ اگر ایک لڑکی بھائی کے ساتھ مل کر ایک تہائی لیتی ہے تو ایک بہن کے ساتھ ایک تہائی حصہ زیادہ لائق ہے۔ اس میں ادنیٰ کے ساتھ اعلیٰ پر تنبیہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی کی میراث نصاً ذکر کی تو دو لڑکیوں کی میراث تنبیہاً ذکر کر دی۔ کلمہ ﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ بیٹیاں دو سے زیادہ بھی ہو جائیں تو ان کا حصہ نہیں بڑھتا۔

◄ دو پوتیاں دو بیٹیوں کی طرح دو تہائی کی مستحق ہیں۔ وہ دو سگی بہنیں ہوں (یا سوتیلی بہنیں) یا ایک درجے کی دو چچازاد بہنیں۔ ان کو حقیقی بیٹیوں پر قیاس کرتے ہوئے دو تہائی وراثت کا حصہ ملے گا کیونکہ پوتی بھی حقیقی (صلبی) بیٹی کی طرح ہے لیکن اس میں تین شرطیں ہیں:

① پوتیاں دو یا زیادہ ہوں۔

② کوئی عاصب نہ ہو، یعنی پوتا جو اس کا بھائی ہو یا ان کے چچا کا بیٹا جو ان کے درجے کا ہو۔

③ ان سے اعلیٰ درجے کی اولاد نہ ہو جو میت کے قریب ہو، مثلاً: بیٹا، بیٹی، پوتا۔ واللہ أعلم.

عینی (سگی) اور علاتی (پدری) بہنوں کی میراث کا بیان

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کے آخر میں عینی اور علاتی بہنوں کا حصہ وضاحت سے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ

① النسآء 4:11.

مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۗ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾

''آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ (خود) تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے۔ اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو پس اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ملے گا اور اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لیے حصہ مثل دو عورتوں کے ہے۔''[1]

اور اخیافی بہنوں کی میراث کا ذکر شروع سورت میں ان الفاظ میں فرمایا:

﴿ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ ﴾

''اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو (اس کا باپ بیٹا نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔''[2]

- سگی بہن نصف ترکہ کی حقدار ہے جب اس میں درج ذیل چار شرائط جمع ہوں:

① اس کے ساتھ عاصب، یعنی اس کا سگا بھائی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾

''اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لیے مثل دو عورتوں کے حصہ ہے۔''[3]

② وہ اکیلی ہو اس کے ساتھ کوئی دوسری سگی بہن شریک نہ ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ﴾

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو پس اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ملے گا۔''[4]

① النسآء 4:176. ② النسآء 4:12. ③ النسآء 4:176. ④ النسآء 4:176.

③ میت کا باپ وارث نہ ہو اور صحیح قول کے مطابق دادا بھی وارث نہ ہو۔

④ میت کی اولاد: بیٹا، بیٹی یا پوتا، پوتی وغیرہ (وارث) نہ ہو۔ تیسری اور چوتھی شرط کی دلیل یہ ہے کہ یہاں بھائی اور بہن کلالہ کے وارث بن رہے ہیں اور کلالہ وہ ہوتا ہے جس کا والد اور اولاد موجود نہ ہو۔

◢ علاتی بہن نصف ترکہ کی حقدار ہے جب درج ذیل پانچ شرائط موجود ہوں۔ چار شرائط تو وہی ہیں جو سگی بہن کی میراث کے تحت ابھی بیان ہوئی ہیں اور پانچویں شرط یہ ہے کہ میت کا کوئی سگا بھائی یا سگی بہن نہ ہو کیونکہ سگے بھائی بہن کا رشتہ علاتی بہنوں کی نسبت قوی تر ہے۔

◢ سگی بہنیں دو یا زیادہ ہوں تو ان کا حصہ دو تہائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ﴾

''پھر اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ملے گا۔''[1]

دو تہائی ترکہ لینے کی چار شرائط ہیں:

① وہ تعداد میں دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ آیت: ﴿ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ ﴾ سے استدلال ہے۔

② ان کو عصبہ بنانے والا ان کا سگا بھائی موجود نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾

''اور اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لیے مثل دو عورتوں کے حصہ ہے۔''[2]

③ میت کی وارث اولاد (بیٹا، بیٹی یا پوتا، پوتی) موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ﴾

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو، پھر اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ملے گا۔''[3]

④ میت کا باپ اور دادا موجود نہ ہو یا وارث نہ ہو۔

◢ علاتی بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کا مجموعی حصہ دو تہائی ہے کیونکہ آیت کلالہ کے مفہوم عام میں وہ بھی بالاجماع شامل ہیں، چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

① النسآء 4:176. ② النسآء 4:176. ③ النسآء 4:176.

﴿ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ﴾

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو، پھر اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ملے گا۔''[1]

یاد رہے ان کا دو تہائی حصہ تب ہے جب پانچ شرائط موجود ہوں۔ چار شرائط تو وہی ہیں جو سگی بہنوں کے بیان میں گزر چکی ہیں اور پانچویں شرط یہ ہے کہ میت کے سگے بھائی یا سگی بہنیں موجود نہ ہوں۔ اگر سگا بھائی یا سگی بہنیں ایک ہوں یا زیادہ ہوں تو علاتی بہنیں دو تہائی کی وارث نہیں ہوں گی۔ اگر ایک سگا بھائی یا دو سگی بہنیں ہوں تو یہ محروم ہو جاتی ہیں الا یہ کہ علاتی بہنوں کے ساتھ علاتی بھائی ہو تو وہ عصبہ بن کر حصہ لیں گی (جو ایک تہائی ہوگا)۔ اگر سگی بہن ایک ہو تو وہ نصف ترکہ لے گی اگر اس کے ساتھ ایک یا زیادہ علاتی بہنیں ہوں تو ان کا حصہ چھٹا ہوگا تاکہ دو تہائی مکمل ہو۔

▲ اگر ایک بیٹی ہو اور اس کے ساتھ ایک یا زیادہ تعداد میں پوتیاں ہوں تو بیٹی کو نصف اور پوتیوں کو (دو تہائی مکمل کرنے کے لیے) چھٹا حصہ ملے گا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی فیصلہ دیا تھا اور فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ بیٹی کے لیے نصف ہے اور پوتی کے لیے چھٹا حصہ ہے دو ثلث مکمل کرتے ہوئے اور جو بچ جائے وہ بہن کا ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بیٹیاں ایک سے زائد ہوں تو ان کا حصہ دو تہائی ہی بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ﴾

''اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انھیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا۔''[3]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بیٹی کا نصف اور پوتی کا چھٹا حصہ مجموعی طور پر دو تہائی بنتا ہے، البتہ اس میں دو شرطیں ہیں:

① میت کی پوتی کے ساتھ اس کے درجے کا پوتا نہ ہو۔

② اقرب اور اعلیٰ اولاد، یعنی بیٹا نہ ہو۔

▲ علاتی بہن بھی ایک سگی بہن کی موجودگی میں (دو تہائی کی تکمیل کے لیے) چھٹا حصہ لیتی ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے نیز علاتی بہن کو پوتی پر قیاس کیا گیا ہے، البتہ علاتی بہنیں چھٹا حصہ تب لیں گی جب دو شرطیں موجود ہوں:

① النسآء 4:176. ② صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث ابنة ابنٍ مع ابنةٍ، حديث:6736. ③ النسآء 4:11.

① علاتی بہن ایک سگی بہن کے ساتھ ترکہ میں شریک ہو جو نصف لے رہی ہو۔ اگر سگی بہنیں ایک سے زیادہ ہوں تو علاتی بہن محروم ہو جاتی ہے کیونکہ دو تہائی حصہ انھی پر مکمل ہو چکا ہے۔

② میت کی علاتی بہن کے ساتھ علاتی بھائی نہ ہو جو اسے عصبہ بنا دے۔ اگر علاتی بہن کے ساتھ اس کا بھائی موجود ہو تو سگی بہن کو اس کا حصہ نصف ترکہ دے کر باقی نصف ترکہ ان میں ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ کے مطابق تقسیم ہوگا۔ واللہ أعلم.

بیٹیوں کی موجودگی میں بہنوں کا حصہ اور اخیافی بھائی بہن کی میراث کا بیان

جب میت کی ایک یا زیادہ بیٹیوں کے ساتھ ایک یا زیادہ سگی یا پدری بہنیں موجود ہوں تو بیٹیاں اپنا مقررہ حصہ دو تہائی (2/3) لیں گی اور جو باقی بچے گا وہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے نزدیک سگی بہنوں کو اگر وہ نہ ہوں تو علاتی (پدری) بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ کی حیثیت سے ملے گا۔ (فقہائے کرام اسے عصبہ مع الغیر کہتے ہیں۔) اس کی دلیل صحیح بخاری کی روایت ہے:

«سُئِلَ أَبُومُوسٰى عَنِ ابْنَةٍ وَّابْنَةِ ابْنٍ وَّأُخْتٍ، فَقَالَ: لِلِابْنَةِ النِّصْفُ، وَلِلْأُخْتِ النِّصْفُ، وَائْتِ ابْنَ مَسْعُودٍ فَسَيُتَابِعُنِي، فَسُئِلَ ابْنُ مَسْعُودٍ وَّأُخْبِرَ بِقَوْلِ أَبِي مُوسٰى، فَقَالَ: لَقَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ، أَقْضِي فِيهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ لِلْابْنَةِ النِّصْفُ، وَلِابْنَةِ الِابْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِيَ فَلِلْأُخْتِ»

''سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ بیٹی، پوتی اور بہن تینوں میں ترکہ تقسیم کیسے ہوگا؟ انھوں نے فرمایا: بیٹی اور بہن دونوں کو نصف نصف ترکہ ملے گا اور پوتی محروم ہوگی، پھر سائل سے کہا تم یہی مسئلہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھو، نیز انھیں میرے فتوے سے بھی آگاہ کرنا، امید ہے وہ میری تائید فرمائیں گے، چنانچہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ فتویٰ سن کر فرمایا: اگر میں بھی یہی فتویٰ دوں تو گمراہ ہوں گا ہدایت یافتہ نہ رہوں گا۔ میں تو وہی فیصلہ دوں گا جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا کہ بیٹی کا حصہ نصف اور پوتی کا حصہ چھٹا

ہے (تاکہ دوثلث مکمل ہو) جبکہ باقی ترکہ (ایک تہائی) بہن کا ہے۔''[1]

اس روایت سے واضح ہوا کہ جب بیٹی اور پوتی اپنا مقرر حصہ وصول کر لیں گی تو باقی ترکہ عصبہ کی حیثیت سے بہن کو ملے گا۔

ایک اخیافی (مادری) بھائی ہو یا ایک اخیافی بہن تو اس کا حصہ چھٹا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ان کا مجموعی حصہ ایک تہائی ہے جو مذکر و مؤنث میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ ﴾

''جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو (اصول و فروع نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔''[2]

علمائے کرام کا اجماع ہے کہ اس آیت میں اخیافی بھائی بہن کا بیان ہے، نیز سیدنا ابن مسعود اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی قراءت بھی یوں ہے: وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِنْ أُمٍّ. علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہی رائے دلالت قرآن کی رو سے قرین قیاس ہے کہ صورت مذکورہ میں مذکر و مونث برابر ہوں۔

اخیافی بھائی بہن چھٹا حصہ تب لیتے ہیں جب ان میں تین شرطیں پائی جائیں: ① وارث اولاد (فرع) موجود نہ ہو۔ ② میت کا باپ دادا وغیرہ (اصول) نہ ہو۔ ③ اخیافی بھائی یا بہن ایک ہو۔

اخیافیوں کا تہائی ترکہ کا مستحق ہونا درج ذیل تین شرائط کے ساتھ ہے: ① اخیافی بھائی یا اخیافی بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ مرد ہوں یا عورتیں یا دونوں ہوں۔ ② وارث اولاد یا بیٹے کی اولاد موجود نہ ہو۔ ③ میت کا باپ دادا نہ ہو۔

اخیافی بھائی بہنوں کے درج ذیل خصوصی احکام ہیں:

① مذکر اور مؤنث تقسیم میں برابر برابر حصہ لیتے ہیں، یعنی ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ایک ہونے کی صورت میں فرمان الٰہی یہ ہے:

﴿ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ﴾

''اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو (اس کا باپ بیٹا نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''[3]

① صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث ابنة ابنٍ مع ابنةٍ، حديث: 6736. ② النسآء 4:12. ③ النسآء 4:12.

اور ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں ارشاد الٰہی یہ ہے:

﴿ فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي ٱلثُّلُثِ ﴾

''اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔'' [1]

یاد رہے کہ جمہور کے ہاں'' کلالہ شخص وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو اور باپ بھی موجود نہ ہو تو گویا کہ اخیافیوں کے لیے میراث لینے کی یہ شرط ہوئی کہ میت کی اولاد اور باپ نہ ہو۔ یہ بھی یاد رہے کہ اولاد سے مراد مذکر و مؤنث دونوں ہیں۔ اسی طرح والد سے مراد باپ دادا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي ٱلثُّلُثِ ﴾

''اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔'' [2]

اس فرمان میں دلیل ہے کہ بھائیوں کو بہنوں پر حصے میں ترجیح نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ترکہ کے بارے میں سب کی شراکت بیان کی ہے اور شراکت کا اطلاق مساوات کا متقاضی ہے۔

شاید اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ محض ایک عورت (والدہ) کی قرابت کی بنیاد پر وارث ہو رہے ہیں اور یہ قرابت ان کے مذکر و مؤنث میں برابر ہے، لہٰذا حصے میں ترجیح کا کوئی معنی نہیں بخلاف باپ کی قرابت کے۔

② یہ سب ماں کی موجودگی میں اپنا مقررہ حصہ لیتے ہیں جس کے واسطے سے ان کی میت سے قرابت ہے اور یہ بات قاعدہ عامہ کے خلاف ہے۔ قاعدہ عامہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی واسطے سے میت سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اس واسطے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا جیسے نواسا۔

③ یہ جس کے واسطے سے حصہ لیتے ہیں اس کا حصہ کم کر دیتے ہیں، یعنی ان کی وجہ سے ماں کا حصہ تہائی سے کم ہو کر چھٹا رہ جاتا ہے اور یہ اس قاعدہ عامہ کے خلاف ہے جس میں ہے کہ واسطے کے ہوتے ہوئے وارث کو کچھ نہیں ملتا۔ واضح رہے دو یا زیادہ بھائی بہن ماں کا حصہ کم کرتے ہیں۔ ایک بھائی ہو یا ایک بہن وہ ماں کے حصے پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

④ یہ جس واسطے سے میت کے قرابت دار بنتے ہیں اس کی موجودگی میں وارث بنتے ہیں، یعنی وہ اپنی ماں کے ساتھ وارث ہوں گے جس کے واسطے سے وہ میت کے قریبی ہوئے ہیں۔ ان کے سوا دوسرے وارث اپنے رشتے دار کے ہوتے ہوئے وارث نہیں ہوتے جیسے پوتا میت کے بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں بنتا۔ اور اسی مسئلے میں دادی اور دادے کی ماں بھی شریک ہے کیونکہ وہ بھی اپنے بیٹے کی وجہ سے میت کی رشتہ دار بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واسطہ

① النسآء 4:12. ② النسآء 4:12.

اس قرابت دار کو محروم نہیں کرتا جس کی وجہ سے وہ قرابت دار بنا ہے مگر اس وقت جب وہ نیابتاً اس کا حصہ لیتا ہو۔ اور اگر وہ رشتے دار اپنے قریبی کا نیابتاً حصہ نہ لے تو وہ محروم نہ ہوگا جیسا کہ اخیافی بھائیوں کا معاملہ ہے کیونکہ وہ ماں کی عدم موجودگی میں ماں کا حصہ نہیں لیتے۔ اس کے برعکس دادی اور دادے کی ماں نائب بن کر ماں کے حصے کی وارث بنتی ہیں۔

عصبات کا بیان

''عصبہ'' عصب سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ''باندھنے گھیرنے اور تقویت پہنچانے کے ہیں۔'' پگڑیوں کو ''عصائب'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سر کا احاطہ کرتی ہیں۔ عصبہ کا واحد ''عاصب'' ہے۔ عصبہ کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث سب پر یکساں ہوتا ہے۔ کسی شخص کے باپ کی جانب سے قرابت دار عصبات کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہوتا ہے۔

علمائے فرائض کی اصطلاح میں ''عاصب'' وہ وارث ہے جس کا حصہ ترکہ میں مقرر نہ ہو۔ اور اگر وہ اکیلا ہو تو سارا مال لے لیتا ہے، اگر صاحب فرض کے ساتھ ہو تو صاحب فرض کا بچا ہوا مال لیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»

''اصحاب الفرائض کو ان کے مقررہ حصے دو، پھر جو باقی بچے وہ قریب ترین مرد (عصبہ) کو دو۔''[1]

- عصبہ نسبی کی تین قسمیں ہیں جو درج ذیل ہیں:
- عصبہ بنفسہ: اس قسم میں خاوند اور اخیافی بھائی کے سوا وہ مرد شامل ہیں جن کا میراث میں سے حصہ لینے پر علماء کا اجماع ہے اور وہ چودہ افراد ہیں جو یہ ہیں: بیٹا، پوتا اگرچہ نیچے ہو، باپ، دادا، سگا بھائی، سگے بھتیجے، علاتی بھائی، علاتی بھتیجے، سگا چچا، سگے چچے کے بیٹے، علاتی چچا، علاتی چچے کے بیٹے، آزاد کرنے والا اور آزاد کرنے والی۔
- عصبہ بغیرہ: ہر وہ ذی فرض عورت ہے جو اپنے عصبہ بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بن جاتی ہے اور یہ چار عورتیں ہیں:

① بیٹی، میت کے بیٹے کے ساتھ مل کر عصبہ بن جاتی ہے۔

② پوتی، اپنے درجے کے پوتے کے ساتھ عصبہ بن جاتی ہے۔ وہ اس کا سگا بھائی ہو یا اس کے چچا کا بیٹا یا اس کے

[1] صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، حديث: 6732، وصحيح مسلم، الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فلأولى رجل ذكر، حديث: 1615.

نیچے کے درجے کا بیٹا۔ دونوں قسموں کی دلیل میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''[1]

یہ آیت صلبی اولاد اور پوتوں کو شامل ہے۔

③ سگی بہن، جب اپنے سگے بھائی کے ساتھ ہو۔

④ علاتی بہن، جب اپنے علاتی بھائی کے ساتھ ہو۔

دونوں کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾

''اور اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لیے مثل دو عورتوں کے حصہ ہے۔''[2]

یہ آیت سگے بھائیوں اور علاتی (پدری) بھائیوں کو شامل ہے۔

الغرض یہ چار مرد: بیٹا، پوتا، سگا بھائی اور علاتی بھائی ان کے ساتھ ان کی بہنیں ان کے ساتھ عصبہ بننے کی وجہ سے میراث لیتی ہیں۔ ان کے علاوہ جو مرد ہیں ان کی بہنیں ان کے ساتھ عصبہ نہیں بنتیں، مثلاً: بھتیجا، چچا اور چچے کا بیٹا۔

عصبہ مع غیرہ: یہ دو عورتیں ہیں: ① سگی بہن ② اور علاتی بہن۔

① سگی بہن جب میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ ترکہ لیتے وقت شریک ہو، اسی طرح علاتی بہن جب میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ ترکہ لیتے وقت شریک ہو بشرطیکہ سگی بہن یا سگا بھائی نہ ہو۔ اس کی دلیل سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جو صحیح بخاری میں مذکور ہے اور یہی جمہور صحابہ وتابعین اور ان کے بعد آنے والے علماء کا فتویٰ ہے کہ سگی بہنیں یا علاتی بہنیں بیٹی یا پوتی کے ساتھ مل کر عصبہ بن جاتی ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

«سُئِلَ أَبُومُوسٰى عَنِ ابْنَةٍ وَّابْنَةِ ابْنٍ وَّأُخْتٍ، فَقَالَ: لِلْاِبْنَةِ النِّصْفُ، وَلِلْأُخْتِ النِّصْفُ، وَائْتِ ابْنَ مَسْعُودٍ فَسَيُتَابِعُنِي، فَسُئِلَ ابْنُ مَسْعُودٍ وَّأُخْبِرَ بِقَوْلِ أَبِي مُوسٰى، فَقَالَ: لَقَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ، أَقْضِي فِيهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ لِلْاِبْنَةِ النِّصْفُ، وَلِابْنَةِ الْاِبْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِيَ فَلِلْأُخْتِ»

''سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ بیٹی، پوتی اور بہن ان تینوں میں میراث کس طرح

[1] النسآء 11:4. [2] النسآء 176:4.

تقسیم ہوگی؟ تو انھوں نے فرمایا: بیٹی اور بہن کو نصف نصف ترکہ ملے گا (اور پوتی محروم ہوگی) اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی پوچھ لیں وہ میری موافقت کریں گے۔ جب سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے فتوے سے آگاہ کیا گیا تو فرمانے لگے: اگر میں بھی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی موافقت کروں تو میں گمراہ ہوں گا اور ہدایت یافتہ نہ رہوں گا۔ میں اس کے بارے میں وہی فیصلہ کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے صادر فرمایا تھا کہ بیٹی کو نصف دے دو اور پوتی کو چھٹا حصہ دے دو، دو ثلث مکمل ہوجائیں گے اور جو بچ جائے وہ بہن کو دے دو۔''[1]

- عصبہ بنفسہ میں سے اگر کوئی اکیلا ہوگا تو وہ سارا مال لے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ﴾ ''اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو۔''[2]

اس آیت میں بھائی کو بہن کے سارے مال کا وارث قرار دیا ہے اور یہ حکم تب ہے جب وہ اکیلا ہو۔

- اگر اس کے ساتھ کوئی صاحب فرض ہو تو اصحاب الفرائض کو دے کر بچا ہوا مال عصبہ کو ملے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»

''اہل فرائض کو ان کے مقررہ حصے دو، پھر جو باقی بچے وہ میت کے قریب ترین مرد کو دو۔''[3]

یاد رہے اگر اصحاب الفرائض کو دے کر مال باقی کچھ نہ بچے تو عصبات محروم ہوجاتے ہیں۔

- عصبات کی پانچ جہات ہیں:

① بُنُوَّةٌ، یعنی بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔

② أُبُوَّةٌ، یعنی باپ، دادا، پردادا وغیرہ۔

③ أُخُوَّةٌ، یعنی سگا بھائی، علاتی بھائی، سگے بھائی کا بیٹا، علاتی بھائی کا بیٹا۔

④ عُمُومَةٌ، یعنی سگا چچا، علاتی چچا، سگے چچے کا بیٹا، علاتی چچے کا بیٹا۔

⑤ ولاء، یعنی آزاد کرنے کے سبب آزاد کرنے والا شخص عتیق کا عصبہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ» ''ولاء صرف آزاد کرنے والے کو ملے گی۔''[4]

① صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث ابنة ابنٍ مع ابنةٍ، حديث :6736. ② النسآء4:176. ③صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، حديث :6732، وصحيح مسلم، الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فلأولى رجل ذكر، حديث : 1615. ④ صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبيﷺ، حديث :1493، وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، حديث :1504.

▲ اگر دو یا زیادہ عصبات جمع ہوں تو ان کی چار صورتیں ہیں:

① دونوں اشخاص جہت، درجہ اور قوت میں برابر ہوں تو میراث میں دونوں شریک ہوں گے، مثلاً: بیٹے یا سگے بھائی یا چچے۔

② اگر جہت میں مختلف ہوں تو قوی جہت والے کو دوسرے پر ترجیح ہوگی، لہٰذا بیٹا، باپ سے عصبے کی حیثیت میں مقدم ہوگا۔

③ جہت میں متحد ہوں لیکن درجے میں مختلف ہوں، مثلاً: بیٹا اور پوتا دونوں جمع ہوں تو ترکہ بیٹے کو ملے گا پوتے کو نہیں کیونکہ بیٹا درجے میں قریب تر ہے۔

④ اگر جہت اور درجے میں دونوں متحد ہوں لیکن قوت درجے میں مختلف ہوں کہ ایک دوسرے سے قوی ہو تو قوی کو ترجیح ہوگی، مثلاً: سگا بھائی اور علاتی بھائی دونوں ہوں تو سگا بھائی مقدم ہوگا کیونکہ اس کی نسبت ماں باپ دونوں کی طرف ہے جب کہ علاتی کی نسبت صرف باپ کی طرف ہے۔

حجب کا بیان

علم میراث میں ''حجب'' کا باب بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس باب کی تفصیلی معرفت حاصل ہونے ہی سے حق والے کو اس کا حق دیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے عدم واقفیت خطرے کا موجب ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وارث کو غیر وارث یا غیر وارث کو وارث قرار دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین علمِ میراث کا کہنا ہے کہ جو شخص حجب کے بارے میں علم نہیں رکھتا اس کے لیے میراث کے مسائل میں فتویٰ دینا حرام ہے۔

''حجب'' کے لغوی معنی ''منع کرنے اور روکنے'' کے ہیں۔[1] حجاب (پردہ) اور حاجب بمعنی مانع ہے، بادشاہ کے دربان کو اسی وجہ سے حاجب کہتے ہیں۔

علمائے میراث کی اصطلاح میں حجب سے مراد یہ ہے: ''کوئی وارث کسی دوسرے وارث کی وجہ سے اپنے کل حصے سے یا زیادہ حصے سے محروم ہو جائے۔''

▲ علم میراث میں حجب کی دو قسمیں ہیں:

---

① قرآن مجید میں ہے: ﴿كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝﴾ (المطففین 15:83) ''ہرگز نہیں! یہ لوگ اس دن اپنے رب سے اوٹ (پردے) میں رکھے جائیں گے۔''

① حجب اوصاف: جس شخص کو میراث کے تین موانع: غلامی، قتل اور اختلاف دین میں سے کوئی ایک مانع لاحق ہو۔ ایسا شخص وارث نہیں قرار پاتا۔ اس کا موجود ہونا نہ ہونے کے مترادف ہے۔

② حجب اشخاص: کوئی وارث دوسرے وارث کی وجہ سے ترکہ سے بالکل محروم ہو جائے تو اسے ''حجب'' حرمان کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی وارث کو دوسرے وارث کی وجہ سے کم حصہ ملے تو یہ حجب نقصان ہے۔ چونکہ ان قسموں میں مانع شخص ہوتا ہے، اس لیے اسے حجب اشخاص کا نام دیا گیا ہے۔

حجب اشخاص کی سات صورتیں ہیں۔ تین صورتوں میں کسی شخص کی وجہ سے وارث کا حصہ زیادہ کے بجائے کم ہو جاتا ہے اور چار صورتوں میں افراد کی تعداد بڑھ جانے سے ان کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

① کوئی وارث دوسرے کی وجہ سے صاحب فرض کی حیثیت سے زیادہ کے بجائے کم حصہ لے، مثلاً: اولاد کی وجہ سے خاوند نصف کے بجائے چوتھائی ترکہ کا حقدار ہے۔

② کوئی وارث دوسرے وارث کی وجہ سے بحیثیت عصبہ زیادہ کے بجائے کم حصہ لے، مثلاً: بہن عصبہ مع الغیر کی بجائے عصبہ بالغیر بن جائے۔

③ کوئی صاحب فرض کسی دوسرے کی وجہ سے عصبہ بن کر کم حصہ لے، مثلاً: بیٹی نصف کے بجائے (اپنے بھائی کے ساتھ) عصبہ بالغیر بن کر کم حصہ لے۔

④ کوئی عصبہ کے بجائے صاحب فرض بن کر کم حصہ لے، مثلاً: اولاد کی موجودگی میں میت کا باپ عصبہ کی بجائے صاحب فرض ہو جائے۔

⑤ ایک مقرر فرض حصے میں شرکاء کی تعداد بڑھ جائے، مثلاً: میت کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو چوتھائی یا آٹھواں حصہ سب میں برابر تقسیم ہو جائے۔

⑥ عصبہ کی حیثیت سے لینے والے شرکاء کی تعداد بڑھ جائے، مثلاً: میت کے بیٹے زیادہ ہوں تو اولاد کا حصہ سب میں بٹ جائے گا اور ہر ایک کا حصہ کم ہو جائے گا۔

⑦ عول کے سبب ورثاء کا حصہ کم ہو جائے۔ اس صورت میں ہر ایک کو اس کے مقررہ حصے سے کم ملتا ہے۔

- حجب کا دارومدار چند قواعد پر ہے:
- جو بھی میت سے رشتہ کسی دوسرے وارث کے واسطے سے رکھتا ہو تو وہ شخص اس واسطے کی موجودگی میں محجوب (محروم) ہوگا، مثلاً: پوتا بیٹے کی موجودگی میں دادی، نانی ماں کی موجودگی میں دادا، باپ کی موجودگی میں اور بھائی، باپ کی موجودگی میں محروم ہوں گے۔

▲ الاقرب فالاقرب، یعنی جب دو یا زیادہ عصبات جمع ہو جائیں تو جو جہت کے اعتبار سے مقدم ہو گا وہ وارث ہو گا، مثلاً: بیٹا بحیثیت عصبہ باپ سے مقدم ہو گا۔ اگر جہت میں دونوں متحد ہوں تو قریب تر مقدم ہو گا، مثلاً: بیٹا اور دوسرے بیٹے کا بیٹا (پوتا) جمع ہوں تو بیٹا پوتے سے مقدم ہو گا کیونکہ وہ میت کے قریب تر ہے۔ سگا بھائی اور دوسرے بھائی کا بیٹا (بھتیجا) اکٹھے ہوں تو سگا بھائی مقدم ہو گا۔

اگر جہت اور قرابت میں برابر ہوں تو قوی تر رشتہ رکھنے والے کو ترجیح ہو گی، مثلاً: سگا بھائی علاتی بھائی سے مقدم ہو گا کیونکہ سگے بھائی کی میت سے قرابت علاتی بھائی سے دوگنا ہے۔

▲ اس قاعدے کا تعلق حجب حرمان سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اصول اصول ہی کی وجہ سے محجوب ہوتے ہیں، مثلاً: دادا میت کے باپ کی وجہ سے محجوب ہو جاتا ہے، دادی اور نانی میت کی ماں کی موجودگی میں محجوب ہوتی ہیں۔ اسی طرح قریب کا دادا بعید کے دادے کو اور قریب کی دادی بعید کی دادی کو محروم کر دیتی ہے۔

اسی طرح فروع فروع ہی کی وجہ سے محجوب ہوتے ہیں، مثلاً: پوتا میت کے بیٹے کی موجودگی میں اور پرپوتا پوتے کی موجودگی میں محروم ہوتا ہے۔ حواشی: بھائی، بھتیجے، چچے اور ان کے بیٹے میت کے اصول، فروع اور حواشی کی وجہ سے محجوب ہو جاتے ہیں، مثلاً: چچا میت کے باپ، بیٹے یا بھائی کی موجودگی میں محجوب (محروم) ہو جاتا ہے۔ اور علاتی بھائی بیٹے، پوتے اور باپ کی موجودگی میں محجوب ہو جاتا ہے۔ اور صحیح قول کے مطابق دادے کی وجہ سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سگے بھائی اور بہن، جب وہ عصبہ مع الغیر ہو، کی موجودگی میں بھی محروم ہو گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ علاتی بھائی اصول، فروع اور حواشی کے سبب محروم ہو جاتا ہے۔

▲ آخر میں ہم پھر ایک بار تلقین و تاکید کریں گے کہ علم میراث میں حجب کا باب نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ میراث کے مسائل میں فتویٰ دینے والے شخص پر لازم ہے کہ وہ اس باب کے قواعد و ضوابط کو اچھی طرح ذہن نشین کرے اس کی باریکیوں کو سمجھے تاکہ فتویٰ میں غلطی کا امکان نہ رہے اور میراث کے شرعی مسائل کا حلیہ اور حقیقت بدل نہ جائے جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ مستحق محروم ہو جائے اور محروم وارث بن جائے۔

دادا کے ساتھ بھائیوں کو وارث بنانے کے احکام

اگر میت کے دادے کے ساتھ ایک یا زیادہ بھائی بہن موجود ہوں تو مشہور ائمۂ کرام، یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ نے انھیں وارث قرار دینے کے بارے میں سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مسلک اختیار کیا ہے۔ ان

کے علاوہ ابویوسف اور محمد بن حسن شیبانی ﷬ وغیرہ اہل علم کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس مسلک کا حاصل یہ ہے کہ دادے کے ساتھ شریک ہونے والے بھائی صرف عینی ہوں گے یا صرف علاتی یا دونوں قسم کے۔ اگر صرف ایک قسم کے بھائی ہوں تو دادے کی دو حالتیں ہوں گی:

① دادے اور بھائی کے ساتھ کوئی صاحب فرض شریک نہ ہو، چنانچہ اس کی پھر تین حالتیں ہیں ان میں سے جو حالت بہتر ہوگی اس کی روشنی میں اسے حصہ ملے گا۔

▲ تہائی مال کے بجائے مقاسمت (دادے کو بھائیوں کی طرح ایک بھائی فرض کر کے مال تقسیم کرنا مقاسمت کہلاتا ہے) کی صورت میں اسے حصہ دیا جائے گا۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ بھائی دادے سے نصف یا نصف سے کم مال لیں۔ اس کی پانچ صورتیں ہیں:

پہلی صورت: دادا اور بہن ...... اس صورت میں مقاسمت کے ساتھ دادے کا حصہ دو تہائی ہے کیونکہ بہن کے لیے تہائی ہے۔

دوسری صورت: دادا اور بھائی ...... اس صورت میں دادے کے لیے نصف ترکہ ہے۔

تیسری صورت: دادا اور دو بہنیں ...... اس صورت میں بھی دادے کا حصہ نصف ہے۔

چوتھی صورت: دادا اور تین بہنیں ...... اس صورت میں دادے کے لیے 2/5 حصہ ہے جو تہائی سے زائد ہی ہے۔

پانچویں صورت: دادا، ایک بھائی اور ایک بہن ...... اس صورت میں بھی دادے کا وہی حصہ ہے جو ابھی چوتھی صورت میں بیان ہوا ہے۔

▲ دادے کو مقاسمت سے دیا جائے یا کل ترکہ کا تہائی، دونوں صورتوں میں اس کا یکساں حصہ ہے۔ اس حالت میں بھائیوں کو دادے سے دوگنا ملتا ہے اس کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت: دادا اور دو بھائی۔

دوسری صورت: دادا، بھائی اور دو بہنیں۔

تیسری صورت: دادا اور چار بہنیں۔

ان صورتوں میں دادے کے لیے مقاسمت اور ثلث برابر ہیں، یعنی دونوں حالتوں میں ایک تہائی ہی ملے گا۔

اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ گزشتہ حالت میں مقاسمت کا اعتبار کرتے ہوئے دادے کو عصبہ قرار دیں گے یا تہائی کا اعتبار کرتے ہوئے صاحب فرض کہیں گے یا مقاسمت اور تہائی دونوں کا اعتبار کرتے ہوئے عصبہ یا فرض کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض علماء نے تہائی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے صاحب فرض تسلیم کیا ہے نہ کہ مقاسمت کا

اعتبار کرتے ہوئے عصبہ کیونکہ صاحب فرض کی حیثیت سے ترکہ لینا اگر ممکن ہو تو عصبہ کی نسبت قوی تر ہے کیونکہ صاحب فرض عصبہ پر مقدم ہوتا ہے۔ و اللّٰہ أعلم.

دادے کے لیے تہائی ترکہ مقاسمت کی نسبت بہتر ہو تو وہ صاحب فرض کی حیثیت سے لے گا۔ اس میں بھائیوں کا حصہ دادے سے دوگنا ہوتا ہے۔ اس حالت کی صورتیں پچھلی دو حالتوں کی طرح محدود نہیں ہیں۔

اس حالت میں جس قدر صورتیں ہیں ان میں بہن بھائیوں کی تعداد کم از کم یوں ہو سکتی ہے: دادا، دو بھائی اور ایک بہن یا دادا اور پانچ بہنیں یا دادا، ایک بھائی اور تین بہنیں، جبکہ باقی صورتوں میں بہن بھائیوں کی تعداد اس سے بڑھ کر ہے اور وہ غیر محدود صورتیں ہیں۔

② دادا اور بھائیوں کے ساتھ کوئی صاحب فرض ہو۔

اس حالت کی روشنی میں بھائیوں کے ساتھ دادے کی سات حالتیں ہیں جو اجمالاً یہ ہیں: ① تعیین مقاسمت ② تعیین باقی مال کا ثلث، یعنی صاحب فرض کو مقررہ حصہ دے کر جو باقی بچے اس کی تہائی ③ کل مال کا چھٹا حصہ ④ مقاسمت یا ثُلُثُ مَابَقِيَ دونوں کا یکساں ہونا۔ ⑤ مقاسمت یا کل مال کا چھٹا حصہ دونوں کا یکساں ہونا۔ ⑥ ثُلُثُ مَابَقِيَ ہو یا کل مال کا چھٹا حصہ دونوں کا یکساں ہونا۔ ⑦ مقاسمت، کل مال کا چھٹا حصہ اور ثلث باقی تینوں کا یکساں ہونا۔ اب ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی حالت | دادے کے حق میں ثلث الباقی ہو یا کل مال کا چھٹا دونوں کی نسبت مقاسمت بہتر ہو۔ مثال: خاوند، دادا اور بھائی۔ اس صورت میں فرض حصے کی مقدار نصف کے برابر ہوتی ہے، نیز بھائیوں کی تعداد دادے کے دوگنا سے کم ہوتی ہے۔ اس حالت میں مقاسمت کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ اولاً خاوند کو نصف مال ملے گا، پھر باقی نصف مال دادے اور بھائی میں تقسیم ہوگا۔ جب مقاسمت کی بنا پر دادے کو ایک بھائی فرض کیا تو اس طرح سے کل مال کا چوتھا حصہ ملا جو (خاوند کو اس کا مقررہ حصہ دینے کے بعد) ثلث الباقی اور کل مال کے چھٹے حصے سے زیادہ ہے۔

صورت مسئلہ میں جب صاحب فرض کو دو میں سے ایک سہم دیا تو ایک سہم باقی بچ گیا جو دادے اور بھائی دونوں پر بلا کسر (پورا پورا) تقسیم نہیں ہوتا، لہٰذا تصحیح کی غرض سے دو کو اصل مسئلہ، یعنی دو سے ضرب دی گئی حاصل ضرب چار ہوئے۔ خاوند کو اولاً دو میں سے ایک ملا تھا تو اسے جب دو سے ضرب دی تو اس کے چار میں سے دو سہام ہو گئے جبکہ دادے اور بھائی دونوں کو پہلے صرف ایک سہم ملا تھا جب اسے بھی دو سے ضرب دی تو اب دونوں کے مجموعی طور پر دو ہو گئے۔ اب ہر ایک کو ایک ایک سہم مل گیا۔ الغرض اس صورت میں دادے کو مقاسمت سے چوتھائی حصہ ملا

جو کل مال کے چھٹے اور باقی کے ثلث سے زیادہ ہے۔ اصل مسئلہ 2 سے جبکہ تصحیح 4 سے ہوگی۔

حل:

4=2x2

خاوند	1	2
دادا		1
بھائی		1

دوسری حالت باقی مال کا ثلث دونوں صورتوں، یعنی مقاسمت اور کل مال کے چھٹے حصے سے بہتر ہو۔

مثال: ماں، دادا اور پانچ بھائی۔ اس صورت میں فرض حصے کی مقدار نصف سے کم ہوتی ہے، نیز بھائیوں کی تعداد دادے کے دوگنا سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں ثلث الباقی کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ اولاً ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، پھر باقی پانچ حصے دادے اور پانچ بھائیوں میں تقسیم ہوں گے۔ دادے کو ثلث الباقی، یعنی $1\frac{2}{3}$ ملا جو مقاسمت اور چھٹے حصے سے زیادہ ہے، البتہ صاحب فرض کا حصہ ادا کر کے باقی مال کا تہائی بلا کسر حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا تہائی کے مخرج، یعنی تین کو اصل مسئلہ، یعنی چھ سے ضرب دی تو حاصل ضرب اٹھارہ ہوئے۔ ماں کو اصل مسئلہ سے ایک ملا تھا جب اسے تین سے ضرب دی تو اس کے تین حصے ہوگئے۔ اس طرح دادے کو پانچ مل گئے جو کہ باقی مال کی تہائی ہے اور باقی دس حصے پانچ بھائیوں میں یوں تقسیم کیے کہ ہر ایک کو دو دو مل گئے۔ الغرض اس صورت میں باقی کا ثلث مقاسمت اور کل مال کے چھٹے حصے سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

حل:

18=3x6

ماں	1	3
دادا	$1\frac{2}{3}$	5
5 بھائی	$3\frac{1}{3}$	2/10

تیسری حالت کل مال کا چھٹا حصہ دونوں صورتوں، یعنی مقاسمت اور ثلث الباقی سے بہتر ہو۔

مثال: خاوند، ماں، دادا اور دو بھائی۔ اس صورت میں فرض حصہ دو تہائی ہوتا ہے نیز بھائیوں کی تعداد دادے سے زیادہ ہوتی ہے اگرچہ ایک بہن ہی کا اضافہ کیوں نہ ہو۔ اس حالت میں مال کے چھٹے حصے کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ خاوند کو نصف اور ماں کو چھٹا حصہ دینے کے بعد دادے اور بھائیوں کے لیے مجموعی طور پر دو حصے بچتے ہیں۔ یہاں

بلاشبہ چھٹا حصہ باقی ثلث اور مقاسمت سے زیادہ ہے لیکن ایک حصہ دو بھائیوں پر پورا پورا تقسیم نہیں ہوتا، لہٰذا دو (تعدادِ افراد) کو اصل مسئلہ چھ سے ضرب دی تو حاصل ضرب بارہ (12) ہوئے۔ اسی عدد سے مسئلے کی تصحیح ہوگی۔ خاوند کے پاس پہلے تین تھے جب دو سے ضرب دی تو کل چھ سہام ہو گئے۔ ماں کو اصل مسئلے سے ایک ملا تھا اب اس کے دو سہام ہو گئے۔ اس طرح دادے کے بھی دو ہوئے جبکہ دونوں بھائیوں کو اصل مسئلے سے مجموعی طور پر ایک سہم (حصہ) ملا تھا اب دو ہو گئے۔ گویا ہر ایک کو ایک ایک سہم مل گیا۔ الغرض اس مثال میں کل مال کا چھٹا حصہ باقی دونوں صورتوں، یعنی مقاسمت اور ثلث باقی سے بہتر ہے۔

حل:

12=2x6

خاوند	3	6
ماں	1	2
دادا	1	2
2 بھائی	1	$\frac{1}{2}$

چوتھی حالت مقاسمت ہو یا ثلث باقی دونوں صورتیں کل مال کے چھٹے حصے سے بہتر ہیں۔

مثال: ماں، دادا اور دو بھائی۔ اس صورت میں فرض حصہ نصف سے کم ہوتا ہے، نیز بھائیوں کی تعداد دادے سے دوگنا ہوتی ہے۔ اس حالت میں مقاسمت اور ثلث الباقی کے یکساں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ دینے کے بعد باقی پانچ حصے دادے اور دو بھائیوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس میں ثلث الباقی $1\frac{2}{3}$ حصہ ہے۔ جو مقاسمت کے مساوی ہے لیکن ثلث الباقی بلا کسر حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا تہائی کے مخرج، یعنی تین کو اصل مسئلہ چھ سے ضرب دی۔ اس طرح حاصل ضرب اٹھارہ ہوئے۔ ماں کو اصل مسئلے سے ایک ملا تھا اسے تین سے ضرب دی تو تین ہو گئے۔ باقی پندرہ بچ گئے۔ دادا کو مقاسمت یا ثلث الباقی کی بنیاد پر پانچ مل گئے جبکہ دونوں بھائیوں کو مجموعی طور پر دس ملے۔ ہر ایک کو پانچ پانچ مل گئے۔

حل:

18=3x6

ماں	1	3
دادا	$1\frac{2}{3}$	5
2 بھائی	$3\frac{1}{3}$	5/10

اس مثال میں چھٹا حصہ دینے کے بجائے مقاسمت اور ثلث باقی دینا دادے کے حق میں زیادہ بہتر ہے، نیز دونوں صورتوں میں حصہ یکساں ہے۔

پانچویں حالت: مقاسمت ہو یا کل مال کا چھٹا حصہ دادے کے لیے یہ دونوں ثلث باقی سے بہتر ہوں۔

مثال: خاوند، دادی، دادا اور بھائی۔ اس صورت میں فرض حصہ دو تہائی کے برابر ہوتا ہے، نیز دادے کے ساتھ بھائی ایک ہی ہوتا ہے۔ اس حالت میں مقاسمت اور کل مال کے چھٹے کے یکساں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خاوند کو نصف اور دادی یا نانی کو چھٹا حصہ دینے کے بعد دادا اور بھائی کے لیے دو سہام بچتے ہیں۔ اب دادے کو مقاسمت سے دیں یا کل مال کا چھٹا حصہ دونوں صورتوں میں ایک ہی سہم ملتا ہے اسی طرح بھائی کے لیے بھی ایک ہی سہم ہے۔

حل:

	6
خاوند	3
دادی	1
دادا	1
بھائی	1

اس صورت میں دادے کو مقاسمت یا کل مال کا چھٹا دیں دونوں صورتوں میں یکساں ہے جو باقی کے تہائی سے زیادہ ہے۔

چھٹی حالت: کل مال کا چھٹا حصہ دیا جائے یا باقی کا تہائی دونوں اعتبار سے دادے کو یکساں اور مقاسمت سے زیادہ حصہ ملتا ہو۔

مثال: خاوند، دادا اور تین بھائی۔ اس صورت میں فرض حصہ نصف ہوتا ہے، نیز بھائیوں کی تعداد دادے کے دو گنا سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں کل مال کا چھٹا اور ثلث الباقی کے یکساں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خاوند کو نصف دینے کے بعد باقی نصف دادے اور تین بھائیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس صورت میں کل مال کا چھٹا اور ثلث الباقی دونوں برابر ہوں گے، البتہ باقی مال میں سے ثلث الباقی بلا کسر حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا ثلث کے مخرج، یعنی تین کو اصل مسئلہ، یعنی دو سے ضرب دی۔ حاصل ضرب چھ ہوئے۔ اسی عدد سے مسئلے کی تصحیح ہوگی۔ خاوند کو اصل مسئلے سے ایک سہم ملا تھا جب اسے تین سے ضرب دی تو خاوند کو تین سہام ملے۔ تین سہام باقی بچ گئے۔ دادے کو ایک مل گیا جو ثلث الباقی ہے اور یہی کل مال کا چھٹا حصہ بھی ہے۔ بھائیوں کو دو سہام ملے

جبکہ ان کی تعداد تین ہے۔ یہ پورے پورے تقسیم نہیں ہوتے، لہٰذا تصحیح کرتے ہوئے تین کو چھ سے ضرب دی گئی تو حاصل ضرب اٹھارہ ہوئی جو تصحیح ثانی کہلائی۔ خاوند کو پہلے تین ملے تھے اب تین سے ضرب دی تو اس کے نو سہام ہوگئے۔ دادے کو ایک ملا تھا تو اس کے تین جبکہ تینوں بھائیوں کے مجموعی سہام چھ ہوئے اس طرح ہر ایک کو دو دو آ گئے۔

حل: 18=3x6=3x2

خاوند	1	3	9
دادا	1	1	3
3 بھائی		2	2/6

اس حالت میں دادے کو کل مال کا چھٹا دیا جائے یا باقی کا تہائی دونوں صورتوں میں یکساں حصہ ملتا ہے جو مقاسمت سے زیادہ ہے۔

ساتویں حالت تینوں امور مقاسمت باقی مال کا تہائی اور کل مال کا چھٹا حصہ برابر ہوں۔

مثال: خاوند، دادا اور دو بھائی۔ اس صورت میں فرض حصہ نصف کے برابر ہوتا ہے نیز بھائیوں کی تعداد دادے سے دوگنا ہوتی ہے۔

حل: 6=3x2

خاوند	1	3
دادا	$\frac{1}{3}$	1
2 بھائی	$\frac{2}{3}$	½

اس حالت میں تینوں امور کے برابر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خاوند کو نصف دینے کے بعد باقی نصف دادا اور دو بھائیوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس میں ثلث الباقی، مقاسمت اور کل مال کا چھٹا حصہ سبھی امور برابر ہوتے ہیں لیکن ثلث الباقی بلا کسر حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا اصل مسئلے کو ثلث کے مخرج، یعنی تین کو اصل مسئلہ دو سے ضرب دی جائے گی تو حاصل ضرب چھ ہوں گے۔ خاوند کو پہلے ایک ملا تھا جب تین سے ضرب دی تو تین سہام ہوئے۔ باقی تین بچ گئے۔ دادا کو ہر حال میں ایک سہم ملا جبکہ باقی دو دونوں بھائیوں میں تقسیم ہوں گے۔ ہر ایک کو ایک ایک سہم ملے گا۔

مُعادہ کا بیان

پچھلے باب میں اس موضوع پر بحث کی گئی تھی کہ دادے کا اس وقت کیا حصہ ہے جب میت کے عینی یا صرف علاتی بھائی موجود ہوں۔ اب ہم اس باب میں بتائیں گے کہ اگر میت کے دادے کے ساتھ اس کے دونوں قسم کے بھائی عینی اور علاتی جمع ہوں تو عینی بھائی دادے کا حصہ کم کرنے کی خاطر اور اپنی تعداد بڑھانے کے لیے علاتی بھائیوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیں۔ جب دادا ترکہ میں سے اپنا حصہ وصول کرلے تو عینی بھائی اپنے علاتی بھائیوں کی طرف رجوع کریں اور جو کچھ مال ترکہ ان کے ہاتھوں میں آیا عینی بھائی اسے بھی سمیٹ لیں، البتہ اگر ایک عینی بہن ہوئی تو وہ اپنا کامل حصہ، یعنی نصف ترکہ لے گی اور جو باقی بچے گا وہ علاتیوں کو ملے گا۔

دادے کے مقابلے میں عینی اور علاتی بھائی متحد ہوں گے کیونکہ دونوں باپ کی جہت میں مشترک ہیں۔ عینی بھائیوں میں ماں کی جہت زائد ہے جو دادے کی وجہ سے مجوب ہوتی ہے (جیسا کہ دادے کی موجودگی میں اخیافی بالاتفاق محروم ہیں)، لہٰذا دادے کے مقابلے میں علاتی بھائی بھی تقسیم ترکہ میں شامل ہوں گے تاکہ دادے کے حصے میں کمی کرنے کے لیے مقاسمت کے بجائے اسے تہائی یا باقی مال کی تہائی یا کل مال کا چھٹا حصہ دیا جائے۔

▲ عینی بھائی اپنے علاتی بھائیوں کو اپنے ساتھ شامل کریں گے، پھر دادے کو کہیں گے کہ آپ کے مقابلے میں ہم دونوں (عینی اور علاتی) ایک مرتبہ رکھتے ہیں، لہٰذا تقسیم کے وقت علاتی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے اور ہم ساتھ ملا کر تمھاری مزاحمت کریں گے، پھر وہ علاتی بہن بھائیوں کو کہتے ہیں تم ہمارے ساتھ وارث نہیں ہو ہم نے تمھیں مقاسمت میں اپنے ساتھ صرف اس لیے شامل کیا تھا کہ دادے کا حصہ کم ہو جائے۔ اب تمھارا حصہ بھی ہمارا ہے گویا ہمارے ساتھ دادا موجود ہی نہیں۔[1]

معادہ کی ضرورت کب ہوتی ہے؟ معادہ کی ضرورت تب ہوتی ہے جب عینی بھائیوں کا حصہ دادے سے دوگنا نہ ہو۔ اور صاحب فرض کو دے کر چوتھائی ترکہ سے زیادہ بچ جائے۔ اگر ان کا حصہ دادے سے دوگنا یا زیادہ ہو تو معادہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

معادہ کی صورتیں معادہ کی کل اڑسٹھ صورتیں ہیں جن کی تفصیل کتب مطولہ میں موجود ہے۔

---

[1] العذب الفائض: 114/1.

کیا معادہ کی کسی صورت میں عینی کے ساتھ علاتی کا حصہ ہے؟ جب ایک عینی بھائی یا دو عینی بہنیں ہوں یا زیادہ ہوں تو علاتیوں کے لیے باقی بچا ہوا حصہ لینے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اگر ایک عینی بہن ہو تو اسے اس کا مقرر نصف ترکہ ملے گا اگر باقی بچ گیا تو علاتیوں کو مل جائے گا (ورنہ نہیں۔)

جن صورتوں میں علاتیوں کے لیے کچھ بچتا ہے وہ چار صورتیں ہیں جو سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے زیدیات أربع کہلاتی ہیں۔[1] چار صورتیں یہ ہیں:

عَشْرِيَّة: اس صورت مسئلہ میں ارکان یہ ہیں: دادا، ایک عینی بہن اور ایک علاتی بھائی۔

حل:

10=2x5

4	2	دادا
5	$2\frac{1}{2}$	عینی بہن
1	$\frac{1}{2}$	علاتی بھائی

وضاحت اس صورت کا اصل مسئلہ 5 سے بنتا ہے۔ عینی بہن کا حصہ نصف ہے جس کی وجہ سے عینی بہن کے حصے میں کسر واقع ہوئی ہے، اس لیے اس کسر کے مخرج دو (2) کو اصل مسئلہ، یعنی پانچ (5) سے ضرب دی تو تصحیح دس (10) سے ہوئی۔ اسی لیے اس مسئلے کو عشریۃ کہا جاتا ہے۔ دادے کو دو خمس (چار) ملے۔ عینی بہن کو نصف حصہ (پانچ) ملے۔ باقی ایک بچا وہ علاتی بھائی کو مل جائے گا۔

عِشْرِينِيَّة: اس صورت مسئلہ میں ارکان یہ ہیں: دادا، عینی بہن اور دو علاتی بہنیں۔

حل:

20=2x10=2x5

8	4	2	دادا
10	5	$2\frac{1}{2}$	عینی بہن
2	1	$\frac{1}{2}$	علاتی بھائی

وضاحت اس صورت مسئلہ کی تصحیح پہلے دس پھر بیس کے ساتھ ہوئی، اس لیے اس کو عشرینیۃ کہتے ہیں۔

مختصرة زيد: ارکان مسئلہ یہ ہیں: ماں، دادا، عینی بہن، ایک علاتی بھائی اور ایک علاتی بہن۔

[1] یہ تقسیم موصوف کے مسلک کے مطابق ہے۔

حل:

54=2÷108=3x36=6x6

ماں	1	6	18	9
دادا	5	10	30	15
عینی بہن		18	54	27
علاتی بھائی		2	4	2
علاتی بہن			2	1

وضاحت: اس مسئلہ کی تصحیح پہلے 36 سے ہوئی، پھر 108 کے ساتھ ہوئی، پھر اختصار کی خاطر 54 کے ساتھ ہوئی اسی لیے اسے مختصرہ زید کہا جاتا ہے۔

تِسْعِینِیَّة زید: ارکان مسئلہ یہ ہیں: ماں، دادا، عینی بہن، دو علاتی بھائی اور ایک علاتی بہن۔

حل:

90=5x18=3x6

ماں	1	3	15
دادا	5	5	25
عینی بہن		9	45
2 علاتی بھائی			4
ایک علاتی بہن		1	1

وضاحت: اس مسئلے کی تصحیح اول 18 اور تصحیح ثانی 90 کے ساتھ ہوئی، اس لیے اس مسئلے کو تِسْعِینِیّة کہا جاتا ہے۔

نوٹ: دامن کتاب تنگ ہونے کی وجہ سے ہم نے حساب، مناسخات اور تقسیم ترکہ کے ابواب چھوڑ دیے ہیں۔ اس کے لیے آپ علم الفرائض کی کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔[1]

[1] ان ابواب کو سمجھنے کے لیے دیکھیے عربی کتاب ''فقه المواريث'' جس کا اردو ترجمہ ''تفهيم المواريث'' کے نام سے مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ (صارم)

احتیاط کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم

میراث کے بارے میں پچھلے صفحات پر جو مسائل بیان کیے گئے ہیں ان کا تعلق ایسی صورتوں کے ساتھ ہے جن میں مُوَرِّث (میت) کی موت یقینی اور واضح ہو۔ اس طرح مُورِّث کی موت کے وقت وارث کا وجود بھی یقینی ہو۔ یہ تمام صورتیں واضح ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی تردد اور اشکال نہیں۔

اب ان صورتوں کے احوال ذکر کرنا مقصود ہے جن میں مورث کی موت یا مورث کی زندگی غیر یقینی اور غیر واضح ہو، چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مورث کی موت یا وارث کی زندگی کی صورت حال مشتبہ ہوتی ہے، مثلاً: پیٹ میں حمل کی صورت حال یا پانی میں ڈوبنے والے یا مکان و دیوار کے نیچے دب جانے والے افراد یا مفقود الخبر شخص کی صورت حال یا کسی وارث کے مرد یا عورت ہونے میں تردد ہو جائے جیسا کہ خنثیٰ مشکل کہ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ یہ مرد ہے یا عورت، اسی طرح پیٹ میں موجود حمل کا واضح نہ ہونا۔

مذکورہ اشخاص کی صورت حال میں تردد کی بنا پر میں نے ذیل میں مستقل طور پر چند ابواب ذکر کیے ہیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

خُنثیٰ مشکل کا بیان

خُنثیٰ کا کلمہ اِنْخِنَاثٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نرم ہونے، ٹوٹنے اور مڑ جانے کے ہیں۔ خَنَثَ فَمَ السِّقَاءِ تب کہا جاتا ہے جب کوئی مشکیزے کا منہ موڑ کر اس سے پانی پیے۔

علم میراث کی اصطلاح میں خنثیٰ مشکل وہ ہے جس کا جسمانی معاملہ مشتبہ ہو، یعنی اس کا مردانہ عضوِ مخصوص بھی ہو اور زنانہ بھی یا سرے سے کوئی آلہ تناسل ہی نہ ہو نہ مؤنث والا اور نہ مذکر والا۔

خنثیٰ شخص بُنوّۃ اُخوّۃ عمومۃ اور ولاء کی جہات میں سے کسی جہت سے ہو سکتا ہے کیونکہ ہر جہت میں اس کے مذکر یا مؤنث ہونے کا امکان ہے، البتہ وہ اُبُوَّۃُ (باپ، ماں، دادا اور دادی) کی جہت سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو اس کا جسمانی معاملہ مشتبہ نہ ہوا، یعنی خنثیٰ مشکل نہ رہا۔ نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ خنثیٰ مشکل خاوند یا بیوی ہو کیونکہ جب وہ خنثیٰ مشکل ہے تو اس کی شادی کرنا درست نہیں۔

▲ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو مرد یا عورت پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ﴾

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے ایک جان سے تمھیں پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں (آدم وحواء) سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔''[1]

اور سورۂ شوریٰ میں یوں فرمایا:

﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ ﴾

''آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔''[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ہر ایک کا حکم بیان فرما دیا لیکن ایسے کسی شخص کا حکم بیان نہیں کیا جو مرد بھی ہو اور عورت بھی۔ تو یہ بات اس فیصلے کے حق میں دلیل ہے کہ یہ دونوں وصف (زنانہ ومردانہ) ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہو سکتے اور یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں صنفوں میں امتیاز کی ایسی علامات اور خصوصیات رکھی ہیں جن کی وجہ سے دونوں صنفوں میں واضح فرق نظر آتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود کبھی اشتباہ اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم میں دونوں قسم کے آلے (مردانہ وزنانہ) موجود ہوتے ہیں۔

▲ اہل علم کا اجماع ہے کہ خنثیٰ اپنی غالب علامات کی وجہ سے مذکر یا مؤنث کی جنس سے ملحق ہوگا۔ مثلاً: اہل علم کی یہ رائے ہے کہ خنثیٰ مشکل کو وارث بنانے میں فیصلہ کن صورت اس کے پیشاب کرنے کی کیفیت ہے۔ اگر وہ مرد کے مقام سے پیشاب کرتا ہے تو اسے مرد شمار کیا جائے گا اور اگر عورت کے مقام سے پیشاب کرتا ہے تو اسے عورت سمجھا جائے گا کیونکہ عموماً یہی کیفیت ایک جنس کو دوسری سے ممتاز کرتی ہے۔[3] اور جس آلے سے اس کا پیشاب خارج نہیں ہوتا وہ ایک عیب ہے اور زائد عضو ہے۔ اگر پیشاب دونوں راستوں سے آیا تو جس راستے سے زیادہ نکلا وہ

---

[1] النسآء 4:1. [2] الشوریٰ 42:49.

[3] سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص جو مردانہ اور زنانہ دونوں عضو رکھتا ہے اسے کون سی میراث دی جائے، یعنی مرد کا حصہ یا عورت کا؟ تو انھوں نے جواب دیا جس عضو سے وہ پیشاب کرتا ہے۔ ایسی ہی روایات سیدنا عمر، قتادہ اور جابر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔ بیہقی (صارم)

معتبر ہو گا۔ اگر ابتدا میں ایک آلے سے پیشاب کرتا رہا، پھر دونوں سے شروع ہو گیا تو پہلی کیفیت کا اعتبار ہو گا۔ اگر پیشاب دونوں راستوں سے برابر نکلتا ہے وقت اور مقدار میں بھی یکساں ہے تو اس کے بالغ ہونے تک دیگر علامات کے ظہور کا انتظار کیا جائے گا۔ تب تک وہ خنثیٰ مشکل ہی متصور ہو گا۔

بلوغت کے وقت ظاہر ہونے والی بعض علامات جو مرد کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً: مونچھوں کا اگنا، داڑھی کا ظاہر ہونا اور ذکر سے منی کا خارج ہونا وغیرہ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک علامت بھی ظاہر ہو جائے تو وہ مرد ہے جبکہ بعض علامات جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً: حیض کا آنا، حمل کا ظاہر ہونا اور پستانوں کا نمایاں ہونا۔ اگر ان علامات میں سے کوئی ایک علامت بھی ظاہر ہو جائے تو وہ عورت ہے۔

▲ اگر مردانہ یا زنانہ علامات میں سے کوئی علامت بھی ظاہر نہ ہو تو وہ خنثیٰ مشکل ہے جس میں کسی تبدیلیٔ بدن کی کوئی امید نہیں تو اس کے ساتھ دیگر ورثاء ہوں یا نہ ہوں دونوں حالتوں میں تقسیم وراثت کے بارے میں علماء کی درج ذیل آراء ہیں:

① بعض علماء کی رائے ہے کہ خنثیٰ کو دونوں حصوں (مذکر و مؤنث) میں سے کم حصہ ملے گا اور دیگر ورثاء کو زیادہ اور اگر وہ ایک اعتبار سے وارث ہو اور دوسرے اعتبار سے وارث نہ ہو تو وہ غیر وارث قرار پائے گا۔

② بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر اس کی جسمانی حالت میں کسی تبدیلی کی امید ہو تو ایسے خنثی مرجوّ (وضاحت کی امید ہو) کو اور اس کے ساتھ شریک ورثاء کو کم حصہ دیا جائے گا اور باقی حصہ اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک اس کی جسمانی صورت حال واضح نہ ہو جائے یا ورثاء کسی مناسب صورت پر صلح کر لیں۔

③ بعض علماء کی رائے ہے کہ خنثیٰ مشکل کو مرد کا نصف اور عورت کا نصف حصہ دیا جائے گا[1] جبکہ اس کے دونوں حصوں میں فرق ہو۔ اگر صرف ایک اعتبار (مذکر یا مؤنث) سے وارث ہو تو اس اعتبار کا نصف حصہ ملے گا۔ یہ حکم دونوں صورتوں میں ہے خنثیٰ کی صورت حال بدلنے کی امید ہو یا نہ ہو۔

③ بعض علماء کا یہ مسلک ہے کہ اگر اس میں تبدیلی ظاہر ہونے کی امید ہو تو خنثیٰ اور اس کے ساتھ شریک ورثاء سب کو کم حصہ دیا جائے گا کیونکہ وہ حصہ یقینی ہے اور باقی مال صورت حال واضح ہونے تک محفوظ رہے گا۔ اور اگر اس میں تبدیلی کی امید نہ ہو تو اسے مرد اور عورت دونوں کا نصف نصف حصہ دیا جائے گا بشرطیکہ وہ دونوں حالتوں میں وارث ہو۔ اگر صرف ایک حالت (مرد یا عورت) میں وارث ہو تو وہ اس میں نصف کا مستحق ہے۔ واللہ أعلم.

[1] مثلاً: مرد کا حصہ ایک روپیہ ہو اور عورت کا حصہ پچاس پیسے تو خنثیٰ کو پچھتر پیسے حصہ ملے گا۔ (صارم)

حمل کی میراث کا بیان

کبھی ورثاء کی فہرست میں حمل بھی شامل ہوتا ہے، البتہ اس کی حالت غیر یقینی ہوتی ہے کہ وہ زندہ پیدا ہوگا یا مردہ، ایک ہے یا ایک سے زیادہ، عورت ہے یا مرد۔ ان مختلف احتمالات میں حکم بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے حمل کے مسائل کو اہتمام سے بیان کیا ہے اور کتب میراث میں حمل کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

▲ پیٹ میں جو بچہ ہو اسے "حمل" کہا جاتا ہے۔ جب مُوَرِّث فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء میں حمل شامل ہو تو کبھی وہ ہر اعتبار سے وارث ہوتا ہے اور کبھی ہر اعتبار سے محجوب کبھی بعض اعتبار سے وارث اور بعض اعتبار سے محجوب بشرطیکہ پیدائش کے وقت زندہ ہو۔

▲ جو حمل بالاجماع وارث ہوتا ہے اس میں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

① مورث کی موت کے وقت رحم میں اس کا موجود ہونا، اگرچہ نطفہ ہی ہو۔

② ولادت کے وقت اس میں زندگی کی واضح علامات کا ہونا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا اسْتَهَلَّ الْمَوْلُودُ وُرِّثَ» "اگر بچہ چیخ مار کر رو دیا تو اسے وارث بنایا جائے گا۔"[1]

"استہلال" کے ایک معنی تو وہ ہیں جو ہم نے ترجمے میں ظاہر کیے ہیں، البتہ بعض علماء کے نزدیک اس کے معنی ہیں کہ اس میں زندگی کی کوئی بھی علامت ہو، رونا ضروری نہیں، مثلاً: چھینک لینا یا حرکت کرنا وغیرہ۔ یہ ایسی صورتیں ہیں جن سے کسی میں زندگی کے آثار معلوم ہوتے ہیں، یہ دوسری شرط ہے۔ باقی رہی پہلی شرط کہ مُوَرِّث کی موت کے وقت حمل موجود ہو تو اس کا تحقق تب ہوگا جب حاملہ حمل کو مقررہ مدت کے دوران جنے جو مختلف احوال کے مطابق کم از کم مدت بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی۔ مورث کی وفات کے بعد وضع حمل کی تین حالتیں ممکن ہیں:

① مورث کی موت کے وقت سے لے کر کم از کم مدت کے دوران میں وضع حمل ہو۔ اس حالت میں حمل مطلقاً وارث ہوگا کیونکہ اس مدت میں وضع حمل اس امر کی دلیل ہے کہ مورث کی موت کے وقت رحم میں حمل موجود تھا۔

① سنن أبي داود، الفرائض، باب في المولود يستهل ثم يموت، حديث:2920.

واضح رہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے، اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ ''اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔''[1]

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ ''مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔''[2]

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اگر تیس مہینوں سے مدت رضاعت کے دو سال، یعنی چوبیس ماہ نکال دیے جائیں تو باقی چھ ماہ ہی رہ جاتے ہیں جو حمل کی کم از کم مدت ہوگی۔

② مورث کی موت کے وقت سے لے کر زیادہ سے زیادہ مدت حمل گزرنے کے بعد وضع حمل ہو۔ اس حالت میں حمل وارث نہ ہوگا کیونکہ اس قدر مدت کے بعد وضع حمل اس امر کی دلیل ہے کہ مورث کی موت کے وقت اس کا وجود نہ تھا بلکہ مورث کی موت کے بعد حمل ٹھہرا ہے۔

زیادہ سے زیادہ مدت حمل کی تعیین کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(i) زیادہ سے زیادہ مدت حمل دو سال ہے جیسا کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: ''ماں کے رحم میں دو سال سے زیادہ عرصہ حمل نہیں رہتا۔''[3] اس قسم کے قول کا تعلق اجتہاد سے نہیں ہوتا، اس لیے یہ ''مرفوع حدیث'' یعنی فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں ہے۔

(ii) زیادہ سے زیادہ مدت حمل چار سال ہے۔

(iii) اکثر مدت حمل پانچ برس ہے۔

ہمارے ہاں راجح قول یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدت حمل چار برس ہے کیونکہ قرآن وسنت میں تحدید کی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا وقوع پذیر واقعات کی طرف رجوع کریں گے، چنانچہ ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں کہ حمل ماں کے پیٹ میں چار سال تک ٹھہرا رہا۔

③ کم مدت حمل (چھ ماہ) کے بعد اور اکثر مدت حمل سے پہلے وضع حمل ہو۔ اس حالت میں اگر اس کا خاوند یا آقا موجود ہو جو اس سے وطی کرتا رہا ہو تو وہ حمل میت کا وارث نہ ہوگا کیونکہ مورث کی موت کے وقت حمل کا وجود غیر یقینی ہے۔ ممکن ہے کہ مورث کی موت کے بعد کی وطی سے حمل ٹھہرا ہو۔ اور اگر اس دوران میں اس سے وطی نہ ہوئی ہو، مثلاً: اس کا خاوند یا آقا نہ ہو یا اس سے غائب رہا ہو یا اس نے کسی عجز و امتناع کی وجہ سے وطی کرنا چھوڑ دیا ہو تو حمل وارث ہوگا کیونکہ میت سے اس کا وجود ثابت ہے۔

① الأحقاف 46:15. ② البقرة 2:233. ③ السنن الكبرى للبيهقي: 7/443.

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب بچہ ولادت کے بعد چیخ مارے تو اس سے زندگی ثابت ہو جاتی ہے۔ چیخ کے سوا دوسرے امور میں اختلاف ہے جن میں بچے کا حرکت کرنا، دودھ پینا، یا سانس لینا ہے۔ علماء میں سے بعض تو صرف چیخ والے معنی کا اعتبار کرتے ہیں دوسرے کسی معاملے کو شامل نہیں کرتے۔ اور بعض علماء چیخ کے ساتھ ساتھ ہر اس امر کو معتبر سمجھتے ہیں جس سے زندگی کے آثار معلوم ہوں اور یہی مسلک راجح ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ اِسْتَهَلَّ کے معنی صرف چیخ مارنا ہی نہیں بلکہ بعض علماء کے نزدیک اس میں حرکت وغیرہ بھی شامل ہے۔ اگر بالفرض استھل کے معنی صرف چیخ یا آواز ہی ہو تو یہ دوسری علامات کے ذریعے سے استدلال سے مانع نہیں۔ واللہ أعلم.

حمل کو حصہ دینے کا طریقہ: جب کسی کے ورثاء میں ایسا حمل شامل ہو جس کے وارث یا عدم وارث ہونے کا علم نہ ہو اور ورثاء اس کی پیدائش سے قبل ہی ترکہ کی تقسیم کا مطالبہ کریں۔ اس صورت میں اختلاف سے نکلنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ حمل کے وضع ہونے کا انتظار کیا جائے تاکہ کیفیت حمل واضح ہو جائے، نیز تقسیم ترکہ ایک ہی بار ہو۔

▲ اگر ورثاء تقسیم ترکہ میں تاخیر اور وضع حمل کے انتظار کرنے پر رضامند نہ ہوں تو کیا ترکہ کی تقسیم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں علمائے کرام کے دو قول ہیں:

① انھیں ترکہ تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حمل کی صورت حال مشکوک ہے، نیز حمل ایک سے زائد بچے بھی ہو سکتے ہیں جس کی بنا پر حمل اور اس کے ساتھ شریک ورثاء کے حصوں کی مقدار میں فرق اور اختلاف ممکن ہے، لہٰذا وہ وضع حمل کے بعد کی صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کریں۔

② ورثاء تقسیم ترکہ کا مطالبہ کرنے کے مجاز ہیں۔ انھیں وضع حمل کے انتظار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں ان کا نقصان ہے۔ ممکن ہے وہ ایسے محتاج اور فقیر ہوں جن کے لیے وضع حمل کی طویل مدت کا انتظار کرنا مشکل ہو۔ باقی رہا حمل تو بطور احتیاط اس کے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ رکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تقسیم ترکہ کی تاخیر کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسرا قول راجح معلوم ہوتا ہے لیکن اس قول کے قائلین میں اختلاف ہے کہ حمل کے لیے کتنی مقدار میں ترکہ سے حصہ رکھا جائے کیونکہ اس کی حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ اس میں بہت سے احتمالات ہیں، مثلاً: وہ زندہ پیدا ہوگا یا مردہ، ایک بچہ ہے یا ایک سے زیادہ، لڑکا ہے یا لڑکی۔ بلاشبہ یہ احتمالات ورثاء کے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حمل کے حصے کی مقدار میں جو اختلاف ہے اس میں تین اقوال مشہور ہیں:

① تعداد حمل کو مقرر کرنا مشکل ہے کیونکہ عورت کتنی جنینوں کو پیٹ میں اٹھاتی ہے ان کی تعداد معلوم کرنا ممکن نہیں، البتہ جو ورثاء حمل کے ساتھ حصول ترکہ میں شریک ہوں اگر کوئی ایک صورت میں وارث ہو اور دوسری میں محجوب یا وہ

عصبہ ہو، ایسے شخص کو ترکہ میں سے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اور جو شخص ہر صورت میں وارث ہو لیکن کسی میں کم اور کسی میں اسے زیادہ حصہ ملتا ہو تو اسے کم حصہ ملے گا اور جس کے حصے میں کسی صورت میں اختلاف نہیں ہوتا (حمل، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) تو اسے کامل حصہ ملے گا۔ اس کے بعد باقی حصہ محفوظ کر لیا جائے گا حتی کہ حمل کی صورت حال واضح ہو جائے۔

② ترکہ میں سے حمل کے لیے زیادہ حصہ اور دیگر ورثاء کے لیے کم حصہ ہو گا۔ حمل کے لیے دو لڑکوں یا دو لڑکیوں کا حصہ (جو زیادہ ہو) رکھا جائے گا اور اس کے ساتھ شریک وارث کو یقینی حصہ ملے گا۔ جب حمل کی ولادت ہو گی اور صورت حال واضح ہو جائے گی تو حمل اگر موقوف مال کے اکثر حصے کا حقدار ہو گا تو اسے مل جائے گا اور اگر موقوف حصہ کم ہوا تو ورثاء سے وصول کر کے حمل کے حصے کی کمی پوری کی جائے گی۔

③ حمل کے لیے ایک لڑکے یا ایک لڑکی کا حصہ (جو زیادہ ہو) رکھا جائے گا کیونکہ عام طور پر عورت ایک ہی بچہ جنتی ہے، لہٰذا حکم غالب اور عام عادت پر محمول ہو گا۔

قاضی پر لازم ہے کہ ورثاء میں سے کسی کو حمل کا کفیل مقرر کرے کیونکہ حمل خود اپنے مفاد کا خیال رکھنے سے قاصر ہے۔ کفیل وضع حمل کے بعد حصص میں ردو بدل آنے کی صورت میں ہر حق والے کو اس کا حق پہنچانے کی ذمے داری پوری کرے گا۔

ہمارے نزدیک دوسرا قول احتیاط اور انصاف پر مبنی ہے کیونکہ دو بچوں کی ولادت کے واقعات کثرت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ دو سے زائد بچوں کی ولادت کے واقعات شاذ و نادر ہیں۔

راجح قول کے مطابق حمل کی چھ حالتیں ہو سکتی ہیں:

① زندہ پیدا ہو گا یا مرا ہوا ② زندہ پیدا ہوا تو پھر لڑکا ہو گا ③ لڑکی ہو گی ④ ایک لڑکا ایک لڑکی ⑤ دونوں لڑکے ⑥ دونوں لڑکیاں۔

ہر صورت کا مسئلہ بنایا جائے گا اور حساب کے مطابق دیگر ورثاء میں سے ہر وارث کو اس کا حصہ دیا جائے گا۔ جس وارث کا حصہ ہر صورت میں ایک جیسا ہو گا اسے کامل حصہ دے دیا جائے گا۔ جس کا حصہ ایک اعتبار سے کم اور دوسرے اعتبار سے زیادہ ہو گا تو اسے کم حصہ دیا جائے گا۔ اور جو ایک اعتبار سے وارث اور دوسرے اعتبار سے غیر وارث ہو گا اسے محروم رکھا جائے گا۔ باقی ترکہ موقوف اور محفوظ رہے گا حتی کہ حمل کی پیدائش سے صورت حال واضح ہو جائے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ واللہ أعلم.

مفقود کی میراث کا بیان

مفقود کے لغوی معنی ''معدوم یا گمشدہ شے'' کے ہیں۔ فَقَدْتُ الشَّيْءَ کے معنی ہیں: ''میں نے شے تلاش کی لیکن نہ مل سکی۔'' یہاں مفقود سے مراد وہ شخص ہے جو لا پتہ ہو، یعنی ایسا غائب ہو کہ اس کا اتا پتا نہ ہو کہ زندہ ہے یا فوت ہو چکا ہے۔ اس کی گمشدگی کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً: کوئی سفر پر نکلا یا لڑائی کے لیے گیا یا کشتی ٹوٹ گئی یا کفار نے اسے قیدی بنا لیا اور معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کدھر چلا گیا۔

گمشدگی کے دوران میں مفقود شخص کے بارے میں تردد ہوتا ہے کہ آیا وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے ہر صورت سے متعلق مخصوص احکام ہیں، مثلاً: اس کی بیوی کے احکام، خود مفقود کا وارث ہونا، دوسروں کا اس کے ساتھ شریک ہونا، مفقود سے ورثہ پانا وغیرہ۔ ان احتمالی صورتوں میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح بھی نہیں دے سکتے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک مدت کا تعین کیا جائے جس میں اس کی اصل صورت حال معلوم کی جا سکے۔ جب وہ مدت بیت جائے تو اسے مفقود کی موت پر دلیل قرار دیا جائے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے کرام نے ایک مدت کے مقرر ہونے پر اتفاق کیا ہے لیکن اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں:

① تعیینِ مدت میں حاکم کا اجتہاد معتبر ہے کیونکہ مفقود کی زندگی اصل ہے اور اس اصل کو کسی ایسی صورت کے ساتھ ہی چھوڑا جائے گا جو یقینی ہو یا یقین کے حکم میں ہو۔ الغرض فیصلہ کن امر حاکم کا اجتھاد ہے خواہ اس کی سلامتی کی جانب غالب ہو یا ہلاکت کی۔ وہ نوے برس کی عمر سے پہلے گم ہوا ہو یا بعد میں۔ اس کا انتظار ہو گا حتی کہ اس کی موت پر کوئی دلیل مل جائے یا اس قدر مدت گزر جائے کہ اس میں گمان غالب ہو کہ اب اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ یہ جمہور کا قول ہے۔

② اس قول میں قدرے تفصیل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مفقود کی دو حالتیں ہیں:

* ایسی صورت ہو کہ جس میں مفقود کی ہلاکت کا پہلو غالب ہو، مثلاً: ہلاکت کی جگہ میں گم ہو گیا ہو یا برسر پیکار صفوں میں گم ہو گیا یا کشتی ڈوب گئی جس کے بعض افراد ہلاک ہو گئے اور بعض سلامت رہے یا کوئی اپنے گھر، شہر میں رہتے ہوئے نماز کے لیے نکلا لیکن واپس نہ آ سکا۔ ایسے شخص کا انتظار گمشدگی کے وقت سے لے کر چار سال تک کیا جائے گا[1]

[1] دلیل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ جس عورت کا خاوند گم ہو جائے اور اس کا اتا پتا نہ ہو تو وہ چار سال تک انتظار کرے، پھر چار ماہ اور دس دن عدت وفات گزارے۔ الموطأ للإمام مالك، الطلاق، باب عدة التي تفقد زوجها: 119/2، حديث: 1249.

کیونکہ یہ ایسی مدت ہے جس میں مسافروں، تاجروں کا آنا جانا بار بار ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی خبر نہ مل سکی تو غالب گمان یہی ہوگا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔

◄ مفقود کے بارے میں گمان غالب ہو کہ وہ زندہ اور سلامت ہے، مثلاً: کوئی تجارت، سیاحت یا طلب علم کی خاطر سفر کے لیے نکلا، پھر اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو سکی۔ ایسے شخص کا مدت ولادت سے لے کر نوے سال کی عمر تک کا انتظار کیا جائے گا کیونکہ عموماً اس قدر عمر کے بعد آدمی زندہ نہیں رہتا۔[1]

ہمارے نزدیک پہلا قول راجح اور معتبر ہے کہ مفقود کی مدتِ انتظار کی تحدید حاکم کے اجتہاد پر ہے کیونکہ شہر، اشخاص اور احوال کے مختلف ہونے کی بنا پر صورت حال بھی مختلف ہو جاتی ہے، نیز آج کے دور میں اطلاعات اور مواصلات کے ذرائع و وسائل عام اور تیز ہیں حتی کہ سارا جہاں ایک شہر کی مانند چھوٹا سا ہو گیا ہے اور اب پرانے دور والے حالات نہیں رہے۔

◄ اگر مفقود کی مدتِ انتظار کے دوران میں اس کا کوئی مورث فوت ہو جائے تو؟:

① اگر مفقود کے سوا اور کوئی وارث نہیں تو مدت انتظار مکمل ہونے تک یا صورت حال واضح ہونے تک تمام ترکہ محفوظ کر لیا جائے۔

② اگر مفقود کے ساتھ میت کے دیگر ورثاء بھی ہوں تو ترکہ کے طریقۂ تقسیم کے بارے میں علمائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں راجح قول (جس پر علماء کی کثرت متفق ہے) یہ ہے کہ دیگر شریک ورثاء کو کم حصہ دیا جائے گا جو یقینی ہے اور باقی ترکہ محفوظ ہوگا۔ اس میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مسئلے کی تصحیح مفقود کو زندہ سمجھ کر ہوگی، پھر دوسری مرتبہ مسئلے کی تصحیح اس کو میت سمجھ کر ہوگی تو جو دونوں مسئلوں میں وارث ہے لیکن ایک میں اس کا حصہ کم ہے اور دوسرے میں زیادہ تو اسے کم حصہ دیا جائے گا اور جس کو دو مسئلوں میں مساوی حصہ ملتا ہے اسے اس کا کامل حصہ ملے گا اور جسے صرف ایک مسئلے میں حصہ ملتا ہے اور دوسرے میں نہیں ملتا تو اسے کچھ نہ ملے گا۔ باقی ترکہ صورت حال واضح ہونے تک محفوظ رہے گا۔

◄ سابقہ صورت تو ایسی تھی جس میں مفقود خود وارث بن رہا تھا۔ اگر مفقود خود مورث ہو تو جب اس کی مدت انتظار گزر جائے اور کوئی خبر نہ مل سکے تو قاضی اس کے بارے میں موت کا فیصلہ صادر کرے گا، پھر اس کا ذاتی مال ہو یا

[1] یوم ولادت سے لے کر نوے سال تعیین جس طرح غیر معقول ہے اسی طرح یہ غیر منقول بھی ہے کیونکہ گمشدگی کے وقت اگر ایک شخص کی عمر نوے سال سے ایک یا دو دن کم تھی تو اس کا ایک یا دو دن انتظار کرنا کسی اعتبار سے بھی درست نہیں بلکہ امر فاسد ہے کیونکہ بحث و تلاش کے لیے اتنی مدت کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (صارم)

دوران گمشدگی میں کسی سے بطور وراثت اسے ملا ہو اور محفوظ ہو اس تمام مال کو ان ورثاء پر تقسیم کیا جائے گا جو قاضی کے حکم موت صادر کرنے کے وقت زندہ ہوں۔ اور جو مدت انتظار کے دوران میں فوت ہو گئے وہ اشخاص وارث نہ ہوں گے کیونکہ قاضی کا فیصلہ مدت انتظار میں مرنے والوں کے بعد جاری ہوا ہے۔

میراث لینے کے لیے مورث کی وفات کے بعد وارث کا زندہ ہونا شرط ہے۔

اجتماعی موت پر میراث کے احکام

اجتماعی موت کے واقعات عموماً وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جب دو یا دو سے زیادہ ایک دوسرے سے میراث لینے والے لوگ یکبارا کٹھے فوت ہو جائیں اور پہلے اور بعد میں مرنے والوں کا پتہ نہ چل سکے کہ کون وارث بنا اور کون موروث، مثلاً: دیوار کے نیچے آ گئے یا پانی میں ڈوب گئے یا آگ میں جل گئے یا طاعون وغیرہ کی زد میں آ گئے یا معرکہ جنگ میں کام آ گئے یا کار، بس، ہوائی جہاز، ریل گاڑی وغیرہ کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ جب اجتماعی موت کا واقعہ ہو جائے تو اس معاملے کی پانچ حالتیں ممکن ہیں:

① متعدد افراد موت کی آغوش میں چلے گئے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پہلے کون مرا اور بعد میں کون تو اس صورت میں فوت شدگان آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے بلکہ ہر ایک کا ترکہ ان کے زندہ ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا کیونکہ کسی کو وارث بنانے کی یہ شرط ہے کہ وہ اپنے مورث کی موت کے وقت زندہ ہو لیکن یہ شرط اس جگہ مفقود ہے۔

② اگر معلوم ہو گیا کہ ایک شخص دوسرے سے پہلے فوت ہوا تھا۔ اس میں کوئی بھول یا شک شبہ نہ ہو تو متأخر شخص متقدم کا بالاجماع وارث ہوگا کیونکہ مورث کی موت کے بعد وارث کا زندہ ہونا ضروری ہے جو یہاں ثابت شدہ ہے۔

③ بعض افراد کی موت بعض سے متأخر واقع ہوئی لیکن یہ علم نہ ہو سکا کہ پہلے کون مرا اور بعد میں کون۔

④ یہ معلوم تھا کہ فلاں پہلے مرا اور فلاں بعد میں لیکن یہ ترتیب یاد نہ رہی۔

⑤ موت کے واقعے کا بروقت علم نہ ہو سکا، چنانچہ معلوم نہ ہوا کہ سب بیک وقت فوت ہوئے یا یکے بعد دیگرے۔

آخری تین حالتوں میں احتمال کی گنجائش ہے جس میں نظر و فکر سے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں علمائے کرام کے دو قول ہیں:

◣ ان مذکورہ تینوں صورتوں میں مرنے والے باہم وارث نہیں ہوں گے۔ یہ قول صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت

کا ہے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق، زید بن ثابت اور ابن عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ائمۂ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ اور یہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک کے بھی مطابق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ورثہ پانے کی شرائط میں ہے کہ مورث کی وفات کے بعد وارث زندہ ہو اور یہ شرط یہاں یقینی نہیں بلکہ مشکوک ہے اور شک سے حق وراثت ثابت نہیں ہوتا، نیز جنگ یمامہ، جنگ صفین اور جنگ حرّہ کے مقتولوں کو ایک دوسرے کا وارث نہیں بنایا گیا تھا۔

▲ ہر ایک دوسرے کا وارث ہوگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر بن خطاب اور علی رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب بھی ہے۔ اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ ہر ایک کا زندہ ہونا یقین سے ثابت ہے جو اصل ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسے دوسرے کی موت کے بعد زندہ سمجھا جائے، نیز سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں شام میں طاعون کی وبا پھیل گئی تو لوگ یکے بعد دیگرے مرنے لگے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ ایک دوسرے کا وارث بنایا جائے۔

ان کی توریث کے لیے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ ورثاء اس قسم کی مشتبہ اموات میں اختلاف نہ کریں کہ ہر کوئی دعویٰ کرے کہ ہمارا مورث بعد میں مرا ہے جبکہ ان میں سے دلیل کوئی بھی پیش نہ کرے اختلاف کی صورت میں ورثاء قسمیں اٹھائیں گے لیکن ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے۔

اس قول کے مطابق تقسیم وراثت اس طرح ہوگی کہ ہر میت کا وہ مال تقسیم ہوگا جو اس کا ذاتی قدیم مال ہے نہ کہ وہ مال جو اسے اس شخص کے ترکہ سے ملا ہے جو اس کے ساتھ فوت ہوا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس اجتماعی موت میں ہر ایک کو اولاً یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ پہلے فوت ہوا تھا، لہٰذا اس کا ذاتی ترکہ مال قدیم اس کے زندہ ورثاء میں اور جو اس کے ساتھ فوت ہوئے تھے ان میں تقسیم کیا جائے گا۔ باقی رہا وہ مال جو اسے اپنے ساتھ فوت ہونے والوں کی طرف سے ملا ہے وہ صرف زندہ ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا تاکہ ہر ایک اپنے ہی مال کا خود وارث نہ ہو، پھر اس عمل کو دہرایا جائے گا کہ کسی شخص کو یہ فرض کیا جائے گویا وہ بعد میں فوت ہوا اور اسے دوسری میت کا بحیثیت وارث اسی طرح حصہ ملے گا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

▲ اس مسئلے میں راجح قول پہلا قول ہے کہ بیک وقت فوت ہونے والے زیادہ افراد باہم ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے کیونکہ احتمال اور شک سے حق وراثت ثابت نہیں ہوتا جبکہ اس واقعے میں کسی کی موت کو مقدم اور کسی کی موت کو مؤخر قرار دینا صرف لاعلمی کی بنیاد پر ہے جو کالعدم ہے، نیز کسی زندہ شخص کو میراث اس لیے ملتی ہے تاکہ وہ مورث کے بعد اس سے فائدہ اٹھالے اور یہ چیز یہاں مفقود ہے۔ علاوہ ازیں انھیں باہم وارث قرار دینے میں

تناقض پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ کسی کو وارث قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ وفات میں متاخر ہے اور پھر اس کے ترکے کا کسی دوسری میت کو وارث قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ وفات میں مقدم ہے۔ ایک ہی شخص کو موت میں بیک وقت مقدم اور مؤخر قرار دینا تناقض ہے۔

الغرض راجح قول کے مطابق مال ترکہ صرف ان ورثاء کو ملے گا جو زندہ ہوں گے اور جو اس کے ساتھ ہی فوت ہوئے ہیں انھیں کچھ حصہ نہ ملے گا۔ اس عمل کی بنیاد یقین پر ہے نہ کہ شک وشبہ پر۔ واللہ أعلم.

رد کا بیان

''رد'' کے لغوی معنی پھیرنے اور لوٹانے کے ہیں۔ دین حق سے پھر جانے کو بھی ''ارتداد'' اسی وجہ سے کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میراث میں ''رد'' سے مراد ہے ''اصحاب الفرائض کے حصص کی ادائیگی کے بعد جو سہام باقی بچ جائیں اور کوئی عصبہ وارث نہ ہو انھیں دوبارہ اصحاب الفرائض نسبیہ پر لوٹا دینا۔''

اللہ تعالیٰ نے بعض ورثاء کے حصے، جیسے نصف، چوتھائی، آٹھواں، دو تہائی، تہائی اور چھٹا مقرر فرما دیے ہیں۔ علاوہ ازیں عصبات مردوں یا عورتوں کے لیے طریقۂ تقسیم بھی بیان کر دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰی رَجُلٍ ذَكَرٍ»

''اصحاب الفرائض کو ان کے مقرر حصے ادا کرو، پھر جو بچ جائے وہ قریبی مرد (عصبہ) کا حصہ ہے۔''[1]

یہ حدیث قرآن مجید کے حکم کی وضاحت کرتی ہے اور ورثاء کی دونوں قسموں میں تقسیم ترکہ میں ترتیب مقرر کرتی ہے، لہٰذا جب اصحاب الفرائض اور عصبہ ورثاء کی دونوں قسمیں موجود ہوں تو حدیث مذکورہ کی روشنی میں حکم واضح ہے کہ اولاً اصحاب الفرائض کو ان کے مقررہ حصص دیے جائیں اور جو ترکہ باقی بچ جائے وہ عصبہ کو دیا جائے۔ اگر باقی کچھ نہ بچے تو عصبہ محروم ہوگا۔ اور اگر صرف عصبات وارث ہوں تو وہ سارا مال اپنی تعداد کے مطابق بانٹ لیں گے۔

اشکال اس صورت میں ہے کہ جب اصحاب الفرائض کو ان کے مقررہ حصص دے کر ترکہ بچ جائے اور عصبہ میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو جسے باقی ترکہ مل جائے تو اس کا حل یہ ہے کہ بچا ہوا ترکہ بھی اصحاب الفرائض پر ان کے

[1] صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، حديث: 6732، وصحيح مسلم، الفرائض، باب ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فلأولى رجل ذكر، حديث: 1615.

سہام کے مطابق دوبارہ لوٹا دیا جائے گا، البتہ خاوند یا بیوی میں سے کوئی موجود ہو تو اس پر رد نہ ہوگا۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾

"اور اللہ کے حکم میں رشتے ناتے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ نزدیک ہیں۔"[1]

چونکہ اصحاب الفرائض بھی میت کے رشتے دار ہیں، لہٰذا وہ اس کے باقی ترکہ کے (عصبات کے سوا) دوسروں کی نسبت زیادہ حقدار ہیں۔

نبیٔ کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ تَرَكَ مَالًا ، فَهُوَ لِوَرَثَتِهِ» "جو شخص مال چھوڑ گیا وہ اس کے ورثاء کا حق ہے۔"[2]

یہ حکم نبوی اس تمام مال کے بارے میں ہے جو میت چھوڑ جائے حتی کہ اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد جو مال بچ جائے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے، لہٰذا جب عصبات نہ ہوں تو اصحاب الفرائض اپنے مورث کے مال کے زیادہ حقدار ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ایام بیماری میں ان کی بیمار پرسی کے لیے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے ترکہ کی وارث صرف میری ایک بیٹی ہے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی اکیلی بیٹی کو کل ترکہ کا وارث قرار دیا تو آپ ﷺ نے اس کی بات کو غلط قرار نہیں دیا۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو آپ ﷺ اس کو ٹوک دیتے، چنانچہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر صاحب فرض اپنا مقرر حصہ وصول کر لے اور مال ترکہ باقی بچ جائے اور عصبہ وارث نہ ہو تو صاحب فرض باقی مال بھی سمیٹ لے گا۔ اور یہی "رد" ہے۔

▪ تمام اصحاب الفرائض پر رد ہوتا ہے سوائے زوجین کے کیونکہ زوجین کبھی نسبی رشتے دار نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾[3] کے عمومی حکم میں شامل نہیں۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ زوجین پر رد نہیں ہوتا، البتہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایت آتی ہے کہ انھوں نے خاوند پر رد کیا تھا تو ممکن ہے انھوں نے رد کے سوا کسی اور صورت میں دیا ہو، مثلاً: وہ عصبہ یا ذو رحم بھی ہو۔

① الأنفال 8:75. ② صحيح البخاري، الكفالة، باب الدَّين، حديث:2298، وصحيح مسلم، الفرائض، باب من ترك مالاً فلورثته، حديث: 1619 واللفظ له. ③ الأنفال 8:75.

ذوی الارحام کی میراث کا بیان

علم میراث کی اصطلاح میں ''ذی رحم'' ہر وہ رشتے دار ہے جو نہ صاحب فرض ہو اور نہ عصبہ ہو۔ ذوی الارحام کی اجمالاً چار اقسام ہیں:

① جو میت کی طرف منسوب ہوں، جیسے بیٹیوں کی اولاد، پوتیوں کی اولاد نیچے تک۔

② جس کی طرف میت منسوب ہو، جیسے جد فاسد، یعنی ماں کا باپ، دادی کا باپ اور جدہ فاسدہ، یعنی نانا کی ماں۔

③ جو میت کے والدین کی طرف منسوب ہو، جیسے بہنوں کی اولاد (بھانجے، بھانجیاں) بھائیوں کی بیٹیاں (بھتیجیاں) اخیافی بھائیوں کی اولاد اور نیچے تک جو بھی ان کے ساتھ میت کی طرف نسبت کرے۔

④ جو میت کے دادا، نانا یا دادی و نانی کی طرف منسوب ہو، مثلاً: اخیافی چچے، پھوپھیاں، چچوں کی بیٹیاں، ماموں اور خالائیں اگرچہ دور کے ہوں اور ان کی اولاد۔

تنبیہ: یہ تمام کے تمام مذکورہ ورثاء اور ان کے علاوہ جو ان کے واسطے سے میت سے قرابت رکھے وہ ذوی الارحام میں شمار ہوگا۔

ذوی الارحام تب وارث ہوں گے جب (زوجین کے سوا) کوئی صاحب فرض اور عصبہ نہ ہو۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾

''اور اللہ کے حکم میں رشتے ناتے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ نزدیک ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا عمومی فرمان ہے:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ﴾

''ماں باپ اور خویش و اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی (جو مال ماں باپ اور خویش و اقارب چھوڑ کر مریں۔)''[2]

ان آیات میں عام مردوں اور عورتوں کے لیے میراث کا ذکر ہے وہ صاحب فرض ہو یا عصبہ یا ذوی الارحام۔

① الأنفال 75:8. ② النسآء 7:4.

آیت میں جو تخصیص کا دعویٰ کرتا ہے اس کے ذمے دلیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهُ»

''جس کا کوئی (صاحب فرض اور عصبہ) وارث نہ ہو اس کا وارث ماموں ہے۔''[1]

وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس میت کا وارث صاحب فرض یا عصبہ نہ ہو اس کے ماموں کو، جو ذوی الارحام میں سے ہے، وارث قرار دیا ہے، لہٰذا حدیث شریف کا اطلاق ماموں کی طرح دوسرے ذوی الارحام پر بھی ہوگا۔

درج بالا دلائل ان حضرات کے ہیں جو ذوی الارحام کو وارث بنانے کے قائل ہیں۔ یہی رائے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی، ان میں سیدنا عمر اور علی رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔ حنابلہ اور حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ مذہب شافعیہ کی جدید رائے یہی ہے بشرطیکہ بیت المال کا انتظام نہ ہو۔

▲ ذوی الارحام کو وارث بنانے کے قائلین نے آپس میں طریقۂ تقسیم میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ اس کے بارے میں اہل علم کے مشہور درج ذیل دو قول ہیں:

① پہلا قول بمنزلہ گرداننے کا ہے، اس قول والوں کے نزدیک ذوی الارحام خود بلا واسطہ وارث نہیں ہوتے۔ یہ حضرات ذوی الارحام کو ان اصحاب الفرائض اور عصبات کے قائم مقام بناتے ہیں جن کے واسطے سے ان کی میت سے رشتے داری اور قرابت ہے۔ اور پھر انھی والا حصہ دیتے ہیں، مثلاً: ان کے نزدیک بیٹیوں کی اولاد اور پوتیوں کی اولاد اپنی ماؤں کے قائم مقام ہوگی، اور اخیافی چچا اور پھوپھیاں باپ کے قائم مقام ہوں گی۔ اسی طرح ماموں، خالائیں اور نانا ماں کے قائم مقام ہوں گے اور بھتیجیاں اور بھائیوں کی پوتیاں اپنے باپوں کے قائم مقام ہوں گی۔ على هذا القياس.

② ذوی الارحام میں ترکہ کی تقسیم عصبات کی طرح ہوگی جس کی بنیاد الاقرب فالاقرب ہے۔ واللّٰہ أعلم.

مطلقہ عورت کی میراث کا بیان

یہ امر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقد زوجیت کو وارث بننے کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

[1] سنن أبي داود، الفرائض، باب في ميراث ذوي الأرحام، حديث: 2899، وجامع الترمذي، الفرائض، باب ما جاء في ميراث الخال، حديث: 2104.

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾

''تمھاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا (نصف) تمھارا ہے۔ اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمھارے لیے چوتھائی حصہ ہے اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد۔ اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمھاری اولاد نہ ہو اور اگر تمھاری اولاد ہو تو انھیں تمھارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔''[1]

▲ جب تک عقد زوجیت قائم ہے تب تک حق میراث باقی ہے الا یہ کہ کوئی مانع ارث حائل ہو جائے۔

▲ جب زوجیت کی گرہ مکمل طور پر کھل جائے جس کی صورت طلاق بائن ہے تو حق میراث ختم ہو جاتا ہے کیونکہ سبب موجود نہ رہا تو مسبب بھی جاتا رہا، البتہ طلاق رجعی کی صورت میں عورت عدت کے دوران میں حق میراث سے محروم نہ ہوگی۔ مطلقہ کی میراث کی توضیح میں فقہائے کرام نے کتب میراث میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

▲ مطلقات کی اجمالاً تین قسمیں ہیں:

① مطلقہ رجعیہ: جس عورت کو رجعی طلاق ہو۔ ایسی طلاق طلاق دینے والے کی حالت صحت میں دی گئی ہو یا حالت مرض الموت میں دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ ② مطلقہ بائنہ: جسے حالت صحت میں ایسی طلاق دی گئی ہو جس میں رجوع کا حق نہیں رہتا۔ ③ مطلقہ بائنہ: یعنی جسے حالت مرض الموت میں طلاق دی گئی ہو جس میں رجوع کا حق نہیں رہتا۔

پہلی قسم کی عورت بالاجماع ''حق میراث'' رکھتی ہے بشرطیکہ طلاق دینے والا فوت ہو جائے اور مطلقہ اپنی عدت طلاق کے اندر ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک مطلقہ عدت میں ہو وہ طلاق دینے والے کی بیوی ہی شمار ہوتی ہے، لہٰذا اسے بیوی کے حقوق بھی حاصل ہوں گے۔

جس عورت کو شوہر نے حالت صحت میں طلاق بائن دی وہ بالاجماع وارث نہیں کیونکہ طلاق بائن سے زوجیت کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں شوہر پر الزام بھی نہیں لگ سکتا کہ اس نے بیوی کو محروم رکھنے کے لیے طلاق دی ہے۔ اسی طرح اگر مرد بیوی کو اپنی ایسی بیماری میں طلاق بائن دے جس میں موت کا اندیشہ نہ ہو اس کا بھی درج بالا حکم ہے۔

① النسآء 4:12.

جس عورت کو اس کے شوہر نے مرض الموت میں طلاق بائن دی اور اس پر بیوی کو بلاوجہ میراث سے محروم کرنے کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا تو ایسی عورت بھی وارث نہ ہوگی۔ اور اگر شوہر پر یہ الزام آتا ہو کہ اس نے مرض الموت میں اس لیے طلاق بائن دی کہ اسے میراث سے محروم کر دے تو مطلقہ عورت عدت میں ہو یا عدت گزار چکی ہو وارث ہوگی بشرطیکہ اس نے دوسری جگہ شادی نہ کی ہو یا مرتد نہ ہو چکی ہو۔

مرض الموت میں طلاق بائن کی صورت میں جبکہ خاوند پر شک کیا جا سکتا ہو، مطلقہ کو وارث بنانے کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بیوی کو وارث قرار دیا تھا جب انھوں نے حالت مرض الموت میں طلاق بائن دی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس مشہور فتوے کی مخالفت نہیں کی تھی، نیز اس سے فساد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص مرتے وقت بیوی کو اس کے حق میراث سے محروم کر جائے۔ اسی لیے یہ کہنا درست نہیں کہ مطلقہ بائنہ عدت کے دوران اپنے شوہر کی میراث کا حق رکھتی ہے بعد از عدت نہیں۔ واللہ أعلم.

انعقاد نکاح کے بعد زوجین ایک دوسرے کے وارث قرار پاتے ہیں، رخصتی ہو یا نہ ہو اور خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو کیونکہ آیت کریمہ کے حکم میں عموم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾

''تمھاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا تمھارا ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمھارے لیے چوتھائی حصہ ہے اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد۔ اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمھاری اولاد نہ ہو اور اگر تمھاری اولاد ہو تو انھیں تمھارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ زوجیت کا رشتہ نہایت اہم، با اعتماد اور مقدس ہے جس پر بہت سے احکام مرتب ہوتے ہیں۔ نیز اس پر عظیم مصالح کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے دوسرے کے مال سے بعد از موت ایک

[1] النسآء 4:12.

حصہ مقرر کر دیا ہے جیسا کہ اس کے اقرباء کا حق ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ ہر ایک دوسرے کو احترام و توقیر کی نگاہ سے دیکھے۔

دین اسلام کے ان جملہ احکام میں خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ اسی پر ہمیں زندہ رکھے اور اسی پر موت دے۔

اختلاف دین کی بنا پر وراثت

اختلاف دین کا مطلب ہے کہ مورث اور وارث دونوں الگ الگ دین وملت کے متبع ہوں۔ اس بارے میں دو مسئلے نہایت اہم ہیں:

① کافر کو مسلمان کا اور مسلمان کو کافر کا وارث بنانا۔ اس مسئلے میں علماء کے مختلف چار اقوال ہیں:

◣ مسلمان اور کافر دونوں ایک دوسرے کے مطلقاً وارث نہیں ہیں۔ یہ قول اکثر اہل علم کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ»

''مسلمان کافر شخص کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں۔''[1]

◣ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں مگر ''ولاء'' کی صورت میں وارث ہوں گے، یعنی آزاد کرنے والے کو آزاد کردہ کی ولاء (مال ترکہ) ملے گی اگرچہ ایک فریق کافر ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے:

«لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ النَّصْرَانِيَّ إِلَّا أَنْ يَكُونَ عَبْدَهُ أَوْ أَمَتَهُ»

''مسلمان نصرانی کا وارث نہ ہوگا الا یہ کہ وہ (آزاد کردہ) اس کا غلام یا لونڈی رہی ہو۔''[2]

اس حدیث شریف سے واضح ہوا کہ ''وَلاء'' کی صورت میں مُعتِق اپنے آزاد کردہ کا وارث ہوگا چاہے دونوں کا دین الگ الگ ہو۔

◣ اگر کوئی کافر رشتے دار کسی مسلمان کی موت کے بعد اور اس کے ترکہ کی تقسیم سے پہلے پہلے مسلمان ہو گیا تو وہ وارث ہوگا، چنانچہ حدیث میں ہے:

① صحيح البخاري، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم ...... ، حديث : 6764، وصحيح مسلم، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم، حديث : 1614. ② [ضعيف] سنن الدارقطني : 41/4، حديث: 4036 اور فرمایا کہ موقوف محفوظ ہے۔ إرواء الغليل: 155/6، حديث: 1715.

«كُلُّ قَسْمٍ قُسِمَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ عَلٰى مَا قُسِمَ، وَكُلُّ قَسْمٍ أَدْرَكَهُ الْإِسْلَامُ فَإِنَّهُ عَلٰى قَسْمِ الْإِسْلَامِ»

''جو تقسیم جاہلیت میں ہوگئی اسے قائم رکھا جائے گا اور جو تقسیم زمانۂ اسلام میں ہوگی وہ اسلام کے قوانین کے مطابق ہوگی۔''[1]

▲ مسلمان کافر کا وارث ہوگا لیکن کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ حدیث میں ہے:

«اَلْإِسْلَامُ يَزِيدُ وَلَا يَنْقُصُ» ''اسلام بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔''[2]

لہٰذا اگر مسلمان کو کافر کا ترکہ ملے تو فائدہ ہے اور حدیث کا تقاضا پورا ہوتا ہے جبکہ حصہ نہ ملنے میں نقصان ہے۔

ان مذکورہ اقوال میں سے پہلا قول راجح ہے کیونکہ دوسرے اقوال کی نسبت اس کی دلیل صحیح اور صریح ہے۔[3]

② کافر شخص کو کافر کا وارث بنانا: اس مسئلے کی دو حالتیں ہیں:

مورث اور وارث ایک ہی مذہب پر ہوں، مثلاً: دونوں یہودی ہوں یا دونوں عیسائی ہوں۔ اس حالت میں وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

مورث اور وارث دونوں کا مختلف مذہب ہو، مثلاً: ایک یہودی ہو اور دوسرا عیسائی یا اس کے برعکس یا ایک مجوسی ہو دوسرا بت پرست یا اس کے برعکس صورت ہو۔ اس حالت میں حق میراث کے متعلق علماء میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ کفر کو ایک ہی مذہب قرار دیا جائے یا مختلف مذاہب کو الگ الگ حیثیت دی جائے۔ اس بارے میں اقوال ائمہ درج ذیل ہیں:

① کفر ایک ہی ملت ہے، وہ یہودیت ہو یا نصرانیت یا مجوسیت یا بت پرستی، لہٰذا وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے بشرطیکہ وہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوں[4] کیونکہ اس کے بارے میں وارد نصوص شرعیہ میں عموم ہے جن کی تخصیص بلا مخصص جائز نہیں الا یہ کہ جسے شارع نے خود ہی مستثنیٰ کر دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

① سنن أبي داود، الفرائض، باب فيمن أسلم على ميراث، حديث: 2914. اس مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھیے ''تفہیم المواریث'' (صارم) ② [ضعيف] سنن أبي داود، الفرائض، باب هل يرث المسلم الكافر؟ حديث: 2912.

③ قول اول کی طرح قول ثانی بھی قابل عمل ہے کیونکہ اس کا تعلق خاص ترکہ، یعنی ''ولاء'' سے ہے، چنانچہ قول ثانی میں پیش کردہ روایت سے جس طرح قول اول کی تائید ہوتی ہے اسی طرح اس سے قول ثانی کی صحت بھی ثابت ہوتی ہے۔ الغرض روایت لا يرث المسلم...... دونوں اقوال کی مؤید ہے۔ (صارم)

④ یہ شرط محل نظر ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ ''کافر آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''[1]

احناف اور شوافع کا یہی قول ہے۔ حنابلہ سے بھی ایک روایت اسی قول کے مطابق منقول ہے۔

② کفر کی تین مختلف ملتیں ہیں: یہودیت، نصرانیت اور باقی دوسرے کفر یہ مذاہب تیسری ملت ہیں کیونکہ پہلی دو قسمیں اہل کتاب کی ہیں جب کہ تیسری قسم کے پاس کوئی کتاب الٰہی نہیں، لہٰذا یہودی نصرانی کا یا ان میں سے کوئی ایک کسی مجوسی یا بت پرست کا وارث نہ ہوگا۔

③ کفر کی متعدد ملتیں ہیں۔ ایک ملت والا دوسری ملت والے کا وارث نہ ہوگا۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتّٰى» ''دو مختلف ملتوں والے باہم وارث نہ ہوں گے۔''[2]

آخری قول راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قول کی تائید میں پیش کردہ روایت محل نزاع میں نص صریح ہے، نیز مختلف مذاہب والے آپس میں ایک دوسرے کے ایسے مخالف اور دشمن ہیں جیسا کہ مسلمان اور کافر، لہٰذا جس طرح مسلمانوں اور کفار کے درمیان اختلاف دین حق میراث سے مانع ہے اسی طرح کفر کی دیگر ملتوں کے افراد میں بھی اختلاف دین مانع ہے۔

جن حضرات کی یہ رائے ہے کہ کفر ایک ہی ملت ہے تو ان حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ اختلافِ دار کفار کے مابین حق میراث کی ادائیگی میں رکاوٹ ہے کیونکہ اختلافِ دار کی وجہ سے وہ باہم ایک دوسرے کی مدد اور تعاون نہیں کرتے۔ ہم کہیں گے کہ یہی سبب اختلاف دین میں بھی موجود ہے، لہٰذا ہمیں درست بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ نصرانی کسی یہودی یا مجوسی کسی بت پرست کا وارث نہ ہوگا۔ اسی طرح بت پرست یہودی کا ترکہ نہ لے گا بلکہ نصارٰی کی نصارٰی میں اور یہود کی یہود میں میراث تقسیم ہوگی۔ اسی طرح باقی ملل کفریہ کے لوگ باہم وارث ہوں گے۔

قاتل کی میراث کا حکم

کبھی ایک شخص میں مال میراث لینے کا سبب موجود ہوتا ہے لیکن وہ کسی مانع کی وجہ سے حق میراث سے محروم ہو جاتا

① الأنفال 73:8. ② سنن أبي داود، الفرائض، باب هل يرث المسلم الكافر؟، حديث: 2911، وجامع الترمذي، الفرائض، باب لايتوارث أهل الملّتين، حديث: 2108، وسنن ابن ماجه، الفرائض، باب ميراث أهل الإسلام من أهل الشرك، حديث: 2731، ومسند أحمد: 178/2و195.

ہے۔ موانع میراث متعدد ہیں، ان میں سے ایک مانع قتل ہے، یعنی اگر کوئی وارث اپنے مُورِّث کو قتل کر دے گا تو قاتل کو اس کی میراث میں سے کچھ نہ ملے گا کیونکہ فرمان نبوی ہے:

«لَيْسَ لِقَاتِلٍ مِّيرَاثٌ» ''قاتل کے لیے میراث میں سے کچھ نہیں۔''[1]

ایک اور روایت میں یوں ہے:

«لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا» ''قاتل (مقتول کی) کسی شے کا وارث نہ ہوگا۔''[2]

اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت نے اس حکم کے ذریعے سے ایک خطرناک دروازہ بند کیا ہے اور وہ یہ کہ کبھی دنیوی مال کی محبت وارث کو آمادہ کرتی ہے کہ اپنے مورث کا مال جلدی حاصل کرنے کی خاطر اسے قتل کر دے ایسی صورت میں شریعت نے اسے محروم قرار دیا۔ علاوہ ازیں قاعدہ مشہور ہے کہ جو شخص کسی چیز کو اس کے (مشروع) وقت سے پہلے (ناجائز طور پر) حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اسی سے محروم کر دیا جائے۔

قاتل کو میراث سے محروم رکھنے پر اہل علم کا اجماع ہے، البتہ ان میں اختلاف یہ ہے کہ قتل کی وہ کون سی نوعیت اور صورت ہے جو مانع ہے اور کون سی مانع نہیں ہے۔

مذہب شافعی یہ ہے کہ قتل کی جو بھی نوعیت ہو بہر حال قاتل وارث نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان عام ہے:

«لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا» ''قاتل کسی شے کا وارث نہ ہوگا۔''[3]

علاوہ ازیں قتل میراث سے اس لیے محروم کر دیتا ہے کہ مورث کے مال کو جلدی حاصل کرنے کے لیے قتل کو ذریعہ نہ بنایا جائے، چنانچہ قاتل کو ہر حال میں میراث سے محروم رکھنا واجب ہے تاکہ قتل کا دروازہ بند کیا جائے، لہٰذا اس امر کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر قسم کا قتل مانع میراث قرار پائے اگرچہ وہ قتل جائز ہی کیوں نہ ہو، مثلاً: کسی کو قصاص میں قتل کرنا یا قاضی کے فیصلے یا گواہ کی گواہی کے نتیجے میں کسی کا قتل ہونا۔ اسی طرح وہ قتل جس میں قصد وارادہ شامل نہ ہو، مثلاً: نیند کی حالت میں کسی کو قتل کرنا، بچے یا مجنون کا کسی کو قتل کر دینا یا کسی کا کسی ایسے امر کے نتیجے میں قتل ہو جانا جس میں شرعاً اجازت ہو، مثلاً: کسی کو ادب وتمیز سکھانے کے خاطر سزا دی یا کسی مریض کا علاج کیا جس کے نتیجے میں وہ مر گیا وغیرہ۔

مذہب حنابلہ یہ ہے کہ حق میراث سے مانع وہ قتل ہے جو ناحق ہو، یعنی جس قتل سے قصاص یا دیت وکفارہ لازم

[1] سنن ابن ماجه، الديات، باب القاتل لايرث، حديث: 2646. [2] سنن أبي داود، الديات، باب ديات الأعضاء، حديث: 4564. [3] سنن أبي داود، الديات، باب ديات الأعضاء، حديث: 4564.

آئے، مثلاً: قتل عمد، شبہ عمد یا قتل خطا یا جو قتل ان صورتوں کے مشابہ ہو، مثلاً: قتل سبب، بچے، مجنون یا سوئے ہوئے شخص کے ہاتھوں قتل ہو جانا۔ اور جو قتل ایسا نہیں وہ مانع بھی نہیں ہوگا، مثلاً: قصاص کے طور پر یا حد لگا کر کسی کو قتل کیا جائے یا کوئی اپنا دفاع کرتے ہوئے کسی کو قتل کر دے یا قاتل عادل ہو اور مقتول باغی یا کسی تادیب یا علاج کے دوران میں کوئی مر گیا۔

علمائے احناف کا بھی یہی مسلک ہے، البتہ انھوں نے قتل سبب کو مانع میراث قرار نہیں دیا، مثلاً: کسی نے کنواں کھودا یا راستے میں پتھر رکھ دیا تو کنویں میں گر کر یا پتھر کی ٹھوکر لگنے سے اس کا مورث قتل ہوا۔ اسی طرح علمائے احناف کے نزدیک وہ قتل مانع ارث نہیں جو بچے اور مجنون سے صادر ہو۔

مالکیہ کے ہاں قتل کی دو حالتیں ہیں:

① مورث کو عمداً و ظلماً قتل کیا گیا۔ اس صورت میں قاتل مورث کے مال اور دیت کا وارث نہ ہوگا۔

② قتل خطا کی صورت میں قاتل اپنے مورث کے مال کا وارث ہوگا، البتہ اس کی دیت کا وارث نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مقتول کے مال پر قبضہ کرنے کی خاطر جلدی نہیں کی۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ دیت میں وارث نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دیت کی ادائیگی اسی پر لازم تھی۔

◄ ہمارے نزدیک حنابلہ اور احناف کا مسلک درست ہے کیونکہ جس فعل میں قاتل کا قصور ہے اور اس پر ضمان لازم آتا ہے اس میں اسے حق میراث سے محروم رکھنا درست ہے، البتہ قتل کی جن صورتوں میں ضمان نہیں ان میں قاتل کو معذور سمجھا جائے گا اور اس کی مسئولیت نہ ہوگی، لہٰذا وہ قتل مانع میراث بھی نہ ہوگا۔

اگر شوافع کے قول پر عمل کرتے ہوئے ہر قاتل کو میراث سے محروم قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حدیں نافذ نہیں کی جائیں گی اور حقدار کو حق نہیں ملے گا، یعنی جب قصاص لینے والے کو معلوم ہوگا کہ قصاص لینے کی وجہ سے وہ میراث سے محروم ہو جائے گا تو وہ قصاص نہیں لے گا۔ اس تفصیل کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان: «لَيْسَ لِقَاتِلٍ مِّيرَاثٌ» کے عموم کو اس صورت کے ساتھ خاص کیا جائے گا جب قتل ناحق ہوگا جس کی وجہ سے اسے قصاص یا دیت دینی پڑے اور ضمان لازم آئے۔

باب 12

نکاح کے مسائل

نکاح کے احکام

نکاح کا موضوع نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ فقہائے کرام نے اپنی تصنیفات میں نکاح کے مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے مقاصد اور اثرات کو خوب واضح فرمایا ہے کیونکہ کتاب و سنت اور اجماع میں اس کی مشروعیت نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾

''عورتوں میں سے جو بھی تمھیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کرلو دو دو، تین تین اور چار چار سے۔''①

جب اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کا ذکر کیا جن سے نکاح کرنا حرام ہے تو آخر میں فرمایا:

﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾

''اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمھارے لیے حلال کی گئیں کہ اپنے مال کے مہر سے تم ان سے نکاح کرنا چاہو، برے کام سے بچنے کے لیے نہ کہ شہوت رانی کرنے کے لیے۔''②

رسول اللہ ﷺ نے نکاح پر توجہ اور رغبت دلاتے ہوئے فرمایا:

«يَامَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ»

''اے نوجوانوں کی جماعت! جو شخص تم میں سے قوت پاتا ہو وہ نکاح کرے کیونکہ اس سے نگاہ نیچی اور شرمگاہ محفوظ ہو جاتی ہے۔''③

نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''تم بہت بچے جننے والیوں اور بہت محبت کرنے والیوں سے نکاح کرو۔ بے شک میں تمھاری کثرت ہی کی وجہ سے روز قیامت دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''④

① النسآء 4:3. ② النسآء 4:24. ③ صحيح البخاري، النكاح، باب من لم يستطع الباءة فليصم، حديث: 5066، وصحيح مسلم، النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه إليه ......، حديث: 1400 واللفظ له. ④ سنن أبي داود، ◄◄

▲ نکاح میں جو عظیم اور اہم مقاصد پنہاں ہیں اب ان کا تذکرہ اختصار سے کیا جاتا ہے:

① نکاح کے ذریعے سے نسل انسانی کی بقا ہے اور مسلمانوں کی تعداد کو بڑھانا مقصود ہے، نیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور اس کے دین کا دفاع کرنے والوں کو جنم دے کر ان کی تعداد بڑھا کر کفار پر رعب قائم رکھنا ہے۔

② نکاح کا ایک مقصد عزت و عصمت کو بچانا اور انسان کو بدکاری سے محفوظ رکھنا ہے جس کے باعث انسانی معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

③ نکاح کا ایک مقصد یہ ہے کہ مرد خاوند کی حیثیت سے اپنی بیوی کو نان ونفقہ دے اور اس کے دیگر حقوق کا خیال رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔"[1]

④ نکاح کا مقصد خاوند اور بیوی کے درمیان محبت وسکون پیدا کرنا ہے اور دل کی راحت اور نفسانی تسکین ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا ﴾

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے آرام پاؤ۔"[2]

نیز فرمان باری ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ﴾

"وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس جوڑے سے انس حاصل کرے۔"[3]

⑤ نکاح انسانی معاشرے کو ان برے کاموں سے محفوظ رکھتا ہے جو انسان کے اخلاق کو تباہ کرتے اور اسے اعلیٰ مقام و مرتبے سے گرا دیتے ہیں۔

◄◄ النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، حديث: 2050، وسنن النسائي، النكاح، باب كراهية تزويج العقيم، حديث :3229، والتلخيص الحبير: 145/3، وكنز العمال : 302/16، حديث:44597 واللفظ لهما.

① النسآء4: 34. ② الروم30: 21. ③ الأعراف7: 189.

⑥ نکاح کے ذریعے سے نسب کی حفاظت، رشتے داری کی بنیاد اور اقرباء کو باہم جوڑنا ہے۔ اور یہ ایک شریف خاندان کے قیام کا موجب ہے جس کی بنیاد محبت، شفقت، صلہ رحمی اور ایک دوسرے کی مدد و خیر خواہی کرنے پر ہوتی ہے۔

⑦ نکاح سے آدمی حیوانی زندگی سے بلند ہو کر اعلیٰ انسانی زندگی کی سطح پر آ جاتا ہے۔

نکاح کے یہ مذکورہ فوائد اور اثرات و نتائج اس نکاح پر مرتب ہوتے ہیں جو کتاب و سنت کے احکام کی روشنی میں منعقد ہو اور اس کے شرعی تقاضے پورے ہوں۔

▲ نکاح ایک عقد شرعی ہے جس کا تقاضا ہے کہ خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے متمتع ہوں جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ وَّاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللهِ»

''میں تمھیں عورتوں کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں کہ ان سے اچھا سلوک کرنا وہ تمھارے ماتحت اور احکام کی پابند ہیں۔[1] اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق تم نے ان کی عصمت کو حلال سمجھا ہے۔''[2]

▲ عقد نکاح زوجین کے درمیان ایک پختہ معاہدے کا نام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ ﴾ ''اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط عہد و پیمان لے رکھا ہے۔''[3]

اس عقد کے جملہ تقاضے پورے کرنا زوجین میں سے ہر ایک پر لازم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ ''اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو۔''[4]

▲ جس شخص میں ہمت و استطاعت ہو اور اسے بیویوں کے درمیان ناانصافی کے ارتکاب کا خطرہ نہ ہو تو وہ ایک سے زیادہ، یعنی چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ﴾

''اور عورتوں میں سے جو بھی تمھیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کرو دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمھیں برابری (عدل) نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کے ساتھ نکاح کرو۔''[5]

اس آیت میں عدل سے مراد حسب طاقت انصاف قائم کرنا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ خاوند اپنی بیویوں کے

① سنن ابن ماجه، النكاح، باب حق المرأة على الزوج، حديث: 1851. ② صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: 1218. ③ النسآء 4:21. ④ المآئدة 5:1. ⑤ النسآء 4:3.

درمیان نفقہ، لباس، رہائش اور شب بسری وغیرہ امور میں مساوات قائم رکھے۔

ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت شریعت اسلامی کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شریعت ہر زمانے میں اور ہر مقام پر قابل عمل ہے۔ اس میں مردوں، عورتوں بلکہ پورے معاشرے کے لیے قیمتی فوائد ہیں۔

اس لیے کہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں مردوں کو ایسے خطرناک حالات سے واسطہ پڑتا ہے جن کی وجہ سے ان کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے، مثلاً: جنگ اور سفر کے خطرات وغیرہ جبکہ عورتوں کو اس قسم کے حالات کا سامنا نہیں ہوتا، اسی لیے ان کی تعداد بڑھتی ہے۔ اگر مرد پر صرف ایک عورت بطور بیوی رکھنے کی پابندی عائد کر دی جائے تو بہت سی عورتیں دائرہ نکاح میں داخل نہ ہو سکیں گی۔

اسی طرح عورت کو حیض اور نفاس کا عارضہ بھی ہوتا ہے اگر مرد کو دوسری عورت سے نکاح کرنے سے روک دیا جائے تو مرد پر اکثر ایسے اوقات گزریں گے جن میں وہ وظیفۂ زوجیت سے متمتع نہ ہو سکے گا۔

یہ بات بھی بہت واضح ہے کہ عورت سے کامل اور نتیجہ خیز استمتاع ناامیدی کی عمر میں ختم ہو جاتا ہے جو پچاس برس کی عمر ہے بخلاف مرد کے کہ اس میں استمتاع اور تولید کی صلاحیت بڑھاپے کی عمر تک ہوتی ہے۔ اگر اسے صرف ایک عورت سے شادی کرنے کا پابند کر دیا جائے تو وہ خیر کثیر سے محروم ہو جائے گا اور منفعت انجاب ونسل کے حصول میں تعطل واقع ہوگا۔

تعدد ازواج میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسانی معاشرے میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اگر مرد کو ایک عورت سے شادی کا پابند کر دیا جائے تو معاشرے میں بہت سی عورتیں بے سہارا رہیں گی جس کا نتیجہ اخلاقی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوگا، عورتوں کا فطری اور طبعی نقصان ہوگا اور وہ زندگی کی زینت اور لطیف لمحات سے بہرہ ور نہ ہو سکیں گی۔

خلاصہ یہ کہ انسانی معاشرے پر تعدد ازواج کے کثیر اور مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں اور شریعت کے ان احکام میں نہایت قیمتی حکمتیں پنہاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ستیاناس کرے جو اس راہ میں بند باندھنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کی فطری مصلحتوں اور منفعتوں میں تعطل پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

شرعی حکم کے اعتبار سے نکاح کی چار قسمیں ہیں، یعنی نکاح کبھی واجب، کبھی مستحب، کبھی حرام اور کبھی مکروہ ہوتا ہے۔ نکاح واجب تب ہے جب کسی کو ترک نکاح کی صورت میں بدکاری میں ملوث ہو جانے کا خطرہ ہو کیونکہ نکاح

کا مقصد خود کو حرام کے ارتکاب سے بچانا ہے۔

اسی حالت کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر کسی انسان کو نکاح کی ایسی احتیاج ہو کہ اس کے ترک سے بدکاری میں ملوث ہو جانے کا خطرہ ہو تو وہ نکاح فرض حج سے مقدم ہے۔''[1]

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''ایسے شخص کے لیے نکاح کرنا نفلی حج، نفلی نماز اور نفلی روزے سے بہتر ہے۔'' اہل علم کی رائے یہ ہے کہ ایسی حالت میں نکاح کرنا فرض ہے، وہ اخراجات کی ادائیگی پر قادر ہو یا نہ ہو۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر فقہاء کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح کرنے کے لیے مال دار ہونا ضروری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نکاح کے سبب غنی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔'' چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾

''اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے امیر بنا دے گا۔''[2]

خود رسول اللہ ﷺ کا یہ حال تھا کہ اس حال میں صبح ہوتی کہ کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا اور کبھی اس حال میں شام ہوتی کہ پاس کچھ نہ ہوتا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کی شادی کی جس کے پاس لوہے کی انگوٹھی بھی نہ تھی۔

قوت و شہوت موجود ہو اور ارتکاب زنا کا خطرہ نہ ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے کیونکہ نکاح مردوں اور عورتوں کے لیے بہت سی مصلحتوں اور فوائد پر مشتمل ہے۔

جب جماع کی خواہش نہ ہو، مثلاً: کسی شخص کا عمر رسیدہ ہونا یا اس کی قوت باہ کا کمزور ہونا، تو اس کے لیے نکاح کرنا مباح ہے، البتہ کبھی ایسی حالت میں نکاح کرنا مکروہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے عورت کے لیے نکاح کا مقصد، یعنی تحفظ عصمت فوت ہو جاتا ہے اور اس کے فطری جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

مسلمان شخص کے لیے اس وقت نکاح کرنا حرام ہے جب وہ کفار کے ایسے ملک میں رہتا ہو جو ''دار الحرب'' ہو کیونکہ اس صورت میں اولاد کو اخلاقی خطرات درپیش ہوتے ہیں اور کافروں کے تسلط کا خطرہ ہوتا ہے، نیز اس ماحول میں بیوی کے غیر مامون ہونے کا اندیشہ ہے۔

◢ ایسی عورت سے نکاح کرنا مسنون ہے جو دین والی، باعفت اور نیک خاندان کی ہو کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

① الفتاوی الکبریٰ، الاختیارات العلمیة: 5/451. ② النور 24:32.

«تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ : لِمَالِهَا ، وَلِحَسَبِهَا ، وَلِجَمَالِهَا ، وَلِدِينِهَا ، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ»

''عورت سے چار چیزوں کے پیش نظر نکاح کیا جاتا ہے:① اس کے مال② خاندان③ جمال④ اور دین کی وجہ سے لیکن تم اس کے دین کو دیکھ کر نکاح کرو، تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے لیے عورت کے انتخاب میں دین کے علاوہ کسی اور چیز کو معیار بنانے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

«لَا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ فَلَعَلَّهُ يُرْدِيهُنَّ وَلَا لِمَالِهِنَّ فَلَعَلَّهُ يُطْغِيهُنَّ وَانْكِحُوهُنَّ لِلدِّينِ»

''عورتوں سے حسن کی بنا پر شادی نہ کرو، ہوسکتا ہے ان کا حسن انھیں تباہ کر دے اور نہ ان کے مال کو دیکھ کر شادی کرو کیونکہ ممکن ہے مال انھیں سرکش بنا دے، تم ان کے دین کی وجہ سے شادی کرو۔''[2]

نبی ﷺ نے جوان اور کنواری عورت سے شادی کرنے کی طرف رغبت دلائی ہے، چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«هَلَّا تَزَوَّجْتَ بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ»

''تم نے کنواری سے شادی کیوں نہ کی کہ تم اس سے اور وہ تم سے کھیل و شغل کرتی؟''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کوئی خاوند دیکھا نہیں ہوتا، اس لیے اس کی محبت کامل درجے کی ہوتی ہے وگرنہ ممکن ہے اس کا دل پہلے خاوند کے ساتھ معلق رہے اور دوسرے شوہر کی طرف اس کا پوری طرح میلان نہ ہو۔

مسنون یہ ہے کہ ایسی عورت سے شادی کی جائے جس سے زیادہ بچے پیدا ہونے کی امید ہو کیونکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

① صحيح البخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين، حديث: 5090، وصحيح مسلم، الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدين، حديث: 1466. ② [ضعيف] سنن ابن ماجه، النكاح، باب تزويج ذات الدين، حديث: 1859، والسنن الكبرى للبيهقي: 80/7، والتلخيص الحبير: 146/3 واللفظ له. ③ صحيح البخاري، الجهاد، باب استئذان الرجل الإمام، حديث: 2967، وصحيح مسلم، الرضاع، باب استحباب نكاح البكر، حديث: (55) 715، بعد حديث: 1466.

''تم ان عورتوں سے شادی کرو جو بہت محبت کرنے والیاں اور بچے زیادہ جننے والیاں ہوں کیونکہ روزِ قیامت میں تمھاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''[1]

اس مفہوم کی اور بھی روایات ہیں۔

▲ نکاح کا حکم انسان کی جسمانی اور مالی حالت اور ذمے داری نبھانے کی استعداد کے مختلف ہونے کی بنا پر مختلف ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے نوجوانوں کو جلدی شادی کرنے کی ترغیب دی کیونکہ دوسروں کی نسبت انھیں نکاح کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَامَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ»

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو قوت رکھے وہ شادی کرے کیونکہ اس سے نگاہ نیچی اور شرمگاہ محفوظ ہو جاتی ہے اور جو شخص طاقت نہ رکھے وہ روزے رکھے اس کی وجہ سے اس کے جذبات کی شدت ختم ہو جائے گی۔''[2]

شادی کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں آپ نے جذبات کا جوش کم کرنے کے لیے روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ روزہ سے جہاں صنفی (جنسی) خواہشات پر کنٹرول ہوتا ہے وہاں خشیت الٰہی اور تقوے کی صفات سے بھی انسان مالا مال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○﴾

''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر صوم (روزہ) فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقوی اختیار کرو۔''[3]

نیز فرمان باری ہے:

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○﴾

''لیکن تمھارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم باعلم ہو۔''[4]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دو چیزوں کے بارے میں حکم دیا ہے اور انسان کو شہوت کے

---

① سنن أبي داود، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، حديث :2050، وسنن النسائي، النكاح، باب كراهية تزويج العقيم، حديث : 3229، والتلخيص الحبير: 145/3، وكنز العمال: 302/16، حديث :44597 واللفظ لهما. ② صحيح البخاري، النكاح، باب من لم يستطع الباءة فليصم، حديث:5066، وصحيح مسلم، النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه إليه...... ، حديث :1400 واللفظ له. ③ البقرة 183:2. ④ البقرة 184:2.

خطرات سے بچنے کی تعلیم دی ہے، لہٰذا انسان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو خطرات کے بھنور میں ڈالے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾

''تم میں سے جو مرد وعورت بے نکاح کے ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلام لونڈیوں کا بھی۔ اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے امیر بنا دے گا، اللہ کشادگی والا اور علم والا ہے۔ اور ان لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے مال دار بنا دے۔''[1]

نکاح کا پیغام دینے کے احکام

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمُ الْمَرْأَةَ فَقَدَرَ أَنْ يَّرٰى مِنْهَا بَعْضَ مَا يَدْعُوهُ إِلَيْهَا فَلْيَفْعَلْ»

''جب کوئی کسی عورت کو نکاح کرنے کا پیغام دے، تو اگر وہ اس (خوبی) کو دیکھ سکتا ہو جس کی بنا پر وہ اس عورت کی طرف راغب ہوتا ہو تو وہ کام کر لے۔''[2]

ایک اور حدیث میں ہے:

«اُنْظُرْ إِلَيْهَا فَإِنَّهُ أَحْرٰى أَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا»

''تم اسے (اپنی متوقع بیوی کو) دیکھ لو، یہ زیادہ لائق ہے کہ اس وجہ سے تمھارے درمیان زیادہ محبت پیدا ہو جائے۔''[3]

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ مرد اپنی مخطوبہ کو دیکھ سکتا ہے، البتہ اس کا طریقہ یہ ہو کہ عورت کو علم ہو نہ اس سے خلوت میں ملاقات ہو۔

فقہائے اسلام فرماتے ہیں: ''جو آدمی کسی عورت سے منگنی کا ارادہ رکھے اور غالب گمان یہ ہو کہ عورت اس کے پیغام

① النور24:33,32. ② مسند أحمد : 360/3، وسنن أبي داود، النكاح، باب في الرجل ينظر إلى المرأة......، حديث:2082و اللفظ له. ③ جامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء في النظر إلى المخطوبة، حديث: 1087.

کو قبول کرے گی تو اس کے لیے اس عورت کے عادۃً کھلے رہنے والے اعضاء کا دیکھنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے خلوت نہ ہو اور فتنے کا ڈر نہ ہو۔"

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: "(ہدایات نبوی کے مطابق) میں اسے دیکھنے کے لیے چھپ کے بیٹھا کرتا تھا یہاں تک کہ میں نے اپنی مخطوبہ کے وہ اوصاف دیکھ لیے جن کی بنا پر مجھے اس سے نکاح کی رغبت پیدا ہوگئی تو میں نے اس سے شادی کر لی۔"[1]

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ مخطوبہ عورت سے خلوت میں ملاقات کرنا جائز نہیں، نیز وہ اس طرح دیکھے کہ عورت کو خبر تک نہ ہو۔ علاوہ ازیں عورت کا وہ جسمانی حصہ دیکھے جو عموماً ظاہر باہر ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اجازت تب ہے جب غالب گمان ہو کہ وہ عورت اس کی دعوت کو قبول کرے گی۔ اگر عورت کو دیکھنا ممکن اور آسان نہ ہو تو یہ کام کسی با اعتماد عورت سے لیا جا سکتا ہے جو اس کے سامنے صحیح صورت حال واضح کر دے، چنانچہ مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو ایک عورت دیکھنے کے لیے بھیجا۔

اگر کوئی شخص نکاح کرنے سے قبل کسی مرد یا عورت کے بارے میں کسی شخص سے تحقیق کرے یا کوئی رائے یا مشورہ لے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس کی خوبی یا خامی بتا دے اور یہ غیبت شمار نہ ہوگی۔

جو عورت عدت گزار رہی ہو اسے واضح الفاظ میں دعوت نکاح دینا حرام ہے، مثلاً: کوئی کہے: "میں تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ﴾

"تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارتاً ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو۔"[2]

اس آیت میں عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ تعریض (اشارے کنائے) کی اجازت دی ہے، مثلاً: کوئی کہے: "میں تجھ جیسی عورت سے نکاح کی رغبت رکھتا ہوں۔" یا اسے کہے: "جب تم اپنی مستقبل کی زندگی کا فیصلہ کرو تو ہمیں یاد رکھنا۔" صراحتاً دعوت نکاح دینے میں یہ خطرہ ہے کہ عورت عدت پوری ہونے سے قبل ہی نکاح کے لالچ میں تکمیل کا اعلان کر کے نکاح کر لے گی۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "عدت گزارنے والی عورت کو دوران عدت میں اسے طلاق دینے والا صراحتاً یا اشارتاً پیغام نکاح دے سکتا ہے بشرطیکہ طلاق اس قسم کی ہو جس کے بعد عدت کے اندر بھی دوبارہ نکاح جائز ہو۔"[3]

[1] سنن أبي داود، النكاح، باب في الرجل ينظر إلى المرأة وهو يريد تزويجها، حديث:2082، ومسند أحمد:3/334.
[2] البقرة2:235. [3] الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية:5/450.

کسی مسلمان بھائی کے پیغامِ نکاح پر پیغامِ نکاح دینا حرام ہے الّا یہ کہ پہلا شخص خود اجازت دے دے یا اس کا ارادۂ نکاح نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَخْطُبِ الرَّجُلُ عَلٰى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتَّى يَنْكِحَ أَوْ يَتْرُكَ»

''کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نہ دے (بلکہ انتظار کرے) حتی کہ وہ نکاح کر لے یا (ارادۂ نکاح) چھوڑ دے۔''[1]

درج بالا ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ دوسرے شخص کے پیغام بھیجنے سے پہلے شخص کے معاملے میں بگاڑ لازم آ سکتا ہے جو دونوں میں باہمی عداوت کا موجب ہے، نیز اس کی حق تلفی ہوتی ہے، البتہ اگر پہلا شخص خود ہی ارادۂ نکاح ختم کر دے یا وہ دوسرے شخص کو اجازت دے دے تو اس عورت کو پیغام نکاح دینا دوسرے شخص کے لیے جائز ہو گا۔ اس میں جہاں مسلمان کا احترام ملحوظ ہے وہاں ظلم و زیادتی سے احتراز بھی ہے۔ فرمان نبوی کا مقصد بھی یہی ہے۔

بعض لوگ اس حکم نبوی پر عمل کرنے میں لاپروائی برتتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں نے فلاں عورت کو پیغام نکاح دیا ہے اپنی جانب سے نکاح کا پیغام بھیج کر مسلمان بھائی پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دوسرے کا کام خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر حرام ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہ گار ہے بلکہ وہ دنیا میں بھی سخت سزا کا مستحق ہے۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایسے حالات میں خبردار رہے، اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق کا احترام کرے کیونکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر بہت بڑا حق ہے، لہٰذا وہ اپنے مسلمان بھائی کے پیغام پر پیغام نہ بھیجے اور نہ اس کی بیع پر بیع کرے اور اسے کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائے۔

نکاح کے ارکان اور شرائط کا بیان

مستحب یہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے خطبہ مسنونہ پڑھا جائے جو ''خطبہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ'' کے نام سے مشہور ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ ونَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب لا يخطب على خطبة أخيه حتى ينكح أو يدع، حديث: 5144، وصحيح مسلم، النكاح، باب تحريم الخطبة على خطبة أخيه حتى يأذن أو يترك، حديث: 1414.

سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

اس کے بعد قرآن مجید کی ان آیات کی تلاوت کی جائے جو یہ ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ﴾
﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا○﴾
﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○﴾[1]

عقد نکاح کے تین ارکان ہیں:

① خاوند بیوی بننے والے دونوں ایسے افراد ہوں کہ ان کے باہمی نکاح میں کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو، مثلاً: عورت نسب، رضاعت یا عدت کے اعتبار سے ایسی نہ ہو جس سے نکاح کرنا اس مرد کے لیے حرام ہو یا مرد کافر اور عورت مسلمان ہو یا اور کوئی شرعی مانع ہو جن کا ذکر آگے چل کر ہم تفصیل سے کریں گے۔ إن شاء الله.

② عقد نکاح کا دوسرا رکن ''ایجاب'' ہے، یعنی عورت کا ولی یا جو اس کے قائم مقام ہے وہ عورت کے بننے والے شوہر سے کہے: ''میں نے فلاں نامی عورت کا نکاح تجھ سے کیا۔'' یا ''اسے تیری بیوی بنا دیا۔''

③ تیسرا رکن قبول کرنا ہے، یعنی شوہر یا جو اس کا وکیل ہے، وہ کہے: ''میں نے یہ نکاح قبول کیا۔'' یا ''اسے بیوی بنالیا۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم ؒ کی رائے یہ ہے کہ ''نکاح کا انعقاد ہر اس لفظ کے ساتھ ہو سکتا ہے جو نکاح پر دلالت کرے۔''[2] البتہ وہ لوگ جو نکاح کے انعقاد کو اِنکاح یا تزویج کے ساتھ خاص کرتے ہیں، وہ یہ کہتے کہ یہ دونوں وہ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا ﴾

''پھر جب زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی تو ہم نے اس کی تزویج تیرے ساتھ کر دی۔''[3]

① صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 868، وسنن أبي داود، النكاح، باب في خطبة النكاح، حديث: 2118، وسنن النسائي، الجمعة، باب كيفية الخطبة، حديث: 1405، وسنن ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح، حديث: 1892 واللفظ له. ② مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 20/533، 534، وإعلام الموقعين: 1/273. ③ الأحزاب 33:37.

ایک اور مقام پر فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ ﴾

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہے۔''[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نکاح کا انعقاد انھی الفاظ میں منحصر ہے، الغرض ان دو الفاظ کے علاوہ اور الفاظ سے بھی انعقادِ نکاح ہو جاتا ہے۔

- گونگے شخص کا قبولِ نکاح تحریر یا کسی قابل فہم اشارے سے ہوگا۔
- ایجاب وقبول حاصل ہو جانے سے نکاح منعقد ہو جائے گا اگر چہ اس نے کلمۂ قبول وایجاب از راہ مذاق کہا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَّهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ»

''تین چیزیں پکی کرنے سے بھی پکی ہیں اور از راہ مذاق بھی پکی ہیں، یعنی نکاح، طلاق اور رجوع کرنا۔''[2]

نکاح کی درستی کے لیے چار شرائط ہیں: ① عقد نکاح کے وقت خاوند اور بیوی کا تعین ہو اور یہ کہنا کافی نہیں کہ ''میں نے اپنی بیٹی تیرے نکاح میں دے دی۔'' جبکہ اس کی متعدد بیٹیاں غیر شادی شدہ ہوں، یا وہ کہے: ''میں نے اس کی شادی تیرے بیٹے سے کر دی۔'' جبکہ اس کے متعدد بیٹے ہوں۔

الغرض جس کا نکاح کیا جا رہا ہو اس کی تعیین ضروری ہے جو اشارہ کر کے ہو یا اس کا نام لیا جائے یا اس کے امتیازی اوصاف ذکر کیے جائیں۔

② زوجین میں سے ہر ایک باہمی نکاح پر رضا مند ہو، اس میں کسی ایک کو مجبور کرنا درست نہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ»

''شوہر دیدہ کا نکاح اس کی رائے معلوم کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری سے اجازت لیے بغیر نکاح نہ کیا جائے۔''[3]

البتہ اگر کوئی عمر کے اعتبار سے چھوٹا (نابالغ بچہ) ہو یا کم عقل تو اس کا سرپرست اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔

① النسآء4:22. ② سنن أبي داود، الطلاق، باب في الطلاق على الهزل، حديث:2194، وجامع الترمذي، الطلاق، باب ما جاء في الجد و الهزل في الطلاق، حديث: 1184، وسنن ابن ماجه، الطلاق، باب من طلق أو نكح أو راجع لاعبًا، حديث:2039. ③ صحيح البخاري، النكاح، باب لا ينكح الأب وغيره البكر و الثيب إلا برضا هما، حديث: 5136، وصحيح مسلم، النكاح، باب استيذان الثيب في النكاح ......، حديث: 1419.

③ عورت کا نکاح اس کا سرپرست کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ» ''سرپرست (ولی) کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوتا۔''[1]

اگر کسی عورت نے سرپرست کے بغیر نکاح کر لیا تو اس کا نکاح باطل ہے کیونکہ یہ زنا کا ذریعہ ہے، نیز (مسلمان) عورت ولی کی نسبت بہتر خاوند کی تلاش سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے اولیاء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ﴾ ''تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح کے ہوں ان کا نکاح کر دو۔''[2]

اور فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ ﴾

''...... چنانچہ انھیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔''[3]

عورت کے سرپرستوں کی ترتیب یوں ہے: باپ، باپ کا متعین کیا ہوا شخص، دادا، پردادا اوپر تک، بیٹا، پوتا، سگا بھائی، علاتی بھائی یا ان کی اولاد، سگا چچا اور ان کے بیٹے، علاتی چچا اور ان کے بیٹے، عصبہ نسبی میں سے میراث کی ترتیب سے کوئی قریبی قرابت دار، پھر مُعتِق اور حاکم و قاضی۔

④ عقد نکاح پر گواہ موجود ہوں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَّشَاهِدَيْ عَدْلٍ» ''ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔''[4]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اصحاب رسول ﷺ کا عمل یہی تھا۔ اسی طرح ان کے بعد کے تابعین عظام کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا کہ گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس کے بارے میں سلف صالحین کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا، البتہ بعض متأخرین اہل علم نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے۔''[5]

نکاح میں میاں بیوی کا کفو ہونا

''کفو'' کے معنی ہیں ''برابر اور ایک جیسا ہونا'' اور یہاں خاوند بیوی کے درمیان برابری مراد ہے۔ خاوند اور بیوی

① سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، حديث: 2085، وجامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء لا نكاح إلا بولي، حديث: 1101، وسنن ابن ماجه، النكاح، باب لا نكاح إلا بولي، حديث: 1880، ومسند أحمد: 250/1. ② النور 32:24. ③ البقرة 232:2. ④ سنن الدارقطني: 158/3، حديث: 3492، وموارد الظمآن: 171,170/4، حديث: 1247. ⑤ جامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء لا نكاح إلا ببينة، تحت حديث: 1104.

کا پانچ اوصاف میں ہم پلہ ہونا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

① دین: فاجر و فاسق مرد پاک دامن، صالح عورت کا کفو نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسے شخص کی گواہی اور روایت مردود ہوتی ہے جو شرف انسانیت میں ایک نقص ہے۔

② نسب: عجمی اور عربی میں مساوات نہیں، لہٰذا عجمی شخص عربی عورت کا کفو نہیں۔[1]

③ آزادی: کامل یا جزوی غلام آزاد عورت کے مساوی نہیں ہوتا کیونکہ ایسا مرد غلامی کی وجہ سے ناقص ہے۔

④ صنعت: معمولی اور کم درجے کا پیشہ اختیار کرنے والا، مثلاً: سینگی لگانے والا اور جولاہا اس عورت کے برابر نہیں ہوسکتا جو کسی عزت والے پیشے، یعنی تاجر کی بیٹی ہے۔[2]

⑤ مال میں فراخی: نکاح میں مہر اور نان ونفقہ کی ادائیگی شوہر کے ذمے ہوتی ہے، لہٰذا تنگدست اور فقیر شوہر مالدار عورت کے برابر نہیں کیونکہ خاوند کی تنگ دستی اور اس کی طرف سے اخراجات کی عدم ادائیگی عورت کے لیے تکلیف اور نقصان کا باعث ہے۔

اگر خاوند اور بیوی میں درج بالا پانچ چیزوں میں اختلاف ہو تو ان میں برابری اور مساوات نہ رہی۔

واضح رہے اگر ان پانچ امور میں سے کوئی ایک امر زوجین میں پایا جائے تو صحت نکاح پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ زوجین میں برابری صحت نکاح کے لیے شرط نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو مشورہ دیا تھا:

«اِنْكِحِي أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ فَكَرِهَتْهُ»

''تم اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے شادی کرلو۔ انھوں نے (اولاً یہ مشورہ) پسند نہ کیا۔''

تو آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا:

«اِنْكِحِي أُسَامَةَ فَنَكَحَتْهُ» ''اسامہ سے شادی کرلو تو انھوں نے ان سے شادی کر لی۔''[3]

واضح رہے کہ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ ایک آزاد کردہ غلام، یعنی سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے جبکہ سیدہ فاطمہ

---

① رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ] ''کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔'' مسند أحمد: 411/5، اور اللہ نے فرمایا: ''﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾'' لہٰذا مؤلف ﷾ کا دعویٰ درست نہیں۔ (صارم)

② کفاءت کا اعتبار دو چیزوں میں ہے: دین اور اخلاق، باقی چیزیں بلا دلیل ہیں۔ اسلام میں اونچ نیچ کے لیے اس قسم کی بنیاد کا کوئی تصور نہیں اور نہ کوئی دلیل ہے۔ (صارم)

③ صحيح البخاري، الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قيس ...... ، حديث: 5321، وصحيح مسلم، الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها، حديث: 1480 واللفظ له.

بنت قیس رضی اللہ عنہا قریش کے خاندان میں سے تھیں۔ لیکن مذکورہ پانچ چیزوں میں برابری زوجین کے تعلقات میں پختگی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ (زندگی آسان گزرتی ہے، محبت میں کمی نہیں آتی) اگر کسی عورت کی شادی کر دی جائے اور اس کا شوہر اس کے مساوی اور برابر کا نہ ہو تو اس عورت یا اس کے ولی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ حدیث میں ہے ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے بھتیجے سے کر دیا تاکہ لوگوں کی نظروں میں بھتیجے کا مقام بلند ہو جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو نکاح قائم رکھنے یا فسخ کرنے کا اختیار دے دیا۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ زوجین میں کفو (برابری) صحت نکاح کے لیے شرط ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام احمد رحمہ اللہ کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کو معلوم ہو کہ زوجین میں برابری نہیں تو دونوں کا نکاح فسخ قرار دے کر انھیں علیحدہ کر دیا جائے، علاوہ ازیں ولی کے لائق نہیں کہ وہ عورت کا نکاح غیر کفو سے کرے، نہ مرد ایسا کرے نہ عورت۔ کفو (برابری) مالی معاملات، یعنی حق مہر وغیرہ کی طرح نہیں کہ اگر عورت اور اس کے ولی چاہیں تو اس کا مطالبہ کریں چاہیں تو چھوڑ بھی سکتے ہیں لیکن مناسب ہے کہ کفو کا اعتبار کیا جائے۔''[1]

محرم عورتوں کا بیان

نکاح میں محرمات (جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے) کی دو قسمیں ہیں:

▲ وہ عورتیں جن سے نکاح کرنا ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ وہ چودہ ہیں: سات نسب کی بنیاد پر حرام ہیں اور سات سبب (رضاعت اور رشتے داری) کی وجہ سے حرام ہیں ان سب کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے:

﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

[1] الفتاوی الکبریٰ، الاختیارات العلمیة: 455,454/5.

''اوران عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہے مگر جو گزر چکا ہے، یہ بے حیائی کا کام اور بغض کا سبب ہے اور بڑی بری راہ ہے۔ حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں، تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمھاری وہ مائیں جنہوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری ساس اور تمھاری وہ پرورش کردہ لڑکیاں جو تمھاری گود میں ہیں تمھاری ان عورتوں سے جن سے تم دخول کر چکے ہو، ہاں! اگر تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے صلبی سگے بیٹوں کی بیویاں اور تمھارا دو بہنوں کا جمع کرنا، ہاں! جو گزر چکا سو گزر چکا، یقیناً اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''[1]

درج بالا دونوں آیات کی روشنی میں جو عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں ان کی وضاحت یوں ہے:

ماں، دادی اور نانی جیسا کہ اللہ کے فرمان: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَٰتُكُمْ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

بیٹی، پوتی، نواسی پوتی کی بیٹی وغیرہ، اللہ کے فرمان: ﴿ وَبَنَاتُكُمْ ﴾ میں ہے۔

سگی بہن، علاتی بہن اور اخیافی بہن۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ وَأَخَوَٰتُكُمْ ﴾ سے واضح ہوتا ہے۔

پھوپھی اور خالہ۔ یہ دونوں عورتیں اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَعَمَّٰتُكُمْ وَخَٰلَٰتُكُمْ ﴾ میں مذکور ہیں۔

بھتیجی، بھتیجی کی بیٹی اور بھتیجے کی بیٹی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَبَنَاتُ الْأَخِ ﴾ میں ہے۔

بھانجی، بھانجے کی بیٹی، بھانجی کی بیٹی۔ یہ اللہ کے فرمان: ﴿ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ ﴾ سے مستفاد ہے۔

▲ وہ عورتیں جو سبب کی وجہ سے حرام ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

▲ ملاعنہ (لعان کرنے والی عورت)، ملاعن (لعان کرنے والے) شخص پر حرام ہے، یعنی اگر مرد نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگا دیا اور عورت نے اس کا انکار کیا تو دونوں کے درمیان لعان (ایک دوسرے پر لعنت کرنا) ہوگا۔ لعان کے بعد دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں۔ نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لعان کرنے والوں میں ہمیشہ سے یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ ان میں جدائی ڈال دی جائے گی، پھر وہ کبھی اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔''[2]

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلے میں کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں آیا۔''[3]

▲ رضاعت کے سبب وہ تمام عورتیں حرام ہیں جو نسب کے سبب حرام ہوتی ہیں، مثلاً: رضاعی مائیں، رضاعی بہنیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

① النسآء 4:23,22. ② سنن أبي داود، الطلاق، باب في اللعان، حديث: 2250. ③ المغني والشرح الكبير: 34/9.

﴿ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾

''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں (تم پر حرام کی گئی ہیں۔)''[1]

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»

''رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔''[2]

- باپ اور دادا کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہے۔''[3]

- بیٹے، پوتے اور پرپوتے کی بیوی سے نکاح کرنا حرام ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾

''اور تمھارے صلبی (سگے) بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنا بھی تم پر حرام ہے۔''[4]

- منکوحہ عورت (بیوی) سے نکاح ہوتے ہی اس کی ماں، دادی، نانی سے نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ ﴾ ''اور تمھاری بیویوں کی مائیں (بھی تم پر حرام ہیں۔)''[5]

- بیوی کی بیٹی، پوتی اور نواسی سے نکاح کرنا حرام ہے بشرطیکہ اس سے دخول ہو چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ﴾

''اور تمھاری وہ پرورش کردہ لڑکیاں جو تمھاری گود میں ہیں تمھاری ان عورتوں سے جن سے تم دخول کر چکے ہو (حرام ہیں) ہاں! اگر تم نے ان سے دخول نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔''[6]

---

① النسآء4:23. ② صحيح البخاري، الشهادات، باب الشهادة على الأنساب ......، حديث:2645، وصحيح مسلم، الرضاع، باب تحريم ابنة الأخ من الرضاعة، حديث:1447. ③ النسآء4:22. ④ النسآء4:23. ⑤ النسآء4:23.

⑥ النسآء4:23. وہ عورتیں جو کسی سبب (رضاعت یا رشتے داری) کی وجہ سے حرام ہیں۔ مؤلف حفظہ اللہ نے ان میں پہلی قسم ملاعنہ کی بتائی ہے، حالانکہ آیت تحریم میں اس کا ذکر نہیں ہے اگرچہ یہ قسم محرمات سببیہ میں شامل ہے۔ اکثر مفسرین نے آیت تحریم میں مذکورہ اقسام کے تحت ساتویں قسم ''ایک ہی وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا'' شمار کی ہے۔ یاد رہے کہ احادیث میں ان سات اقسام کے علاوہ مزید آٹھویں قسم بھی مذکورہ ہے کہ ''ایک ہی وقت میں پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو نکاح میں رکھنا حرام ہے۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے تفسير فتح القدير:497/1، و تفسير القرطبي:70/5، والروضة الندية:2/183-186.

وہ عورتیں جو وقتی طور پر حرام ہیں۔ان کی دو انواع ہیں: اولاً: وہ عورتیں جو ایک شخص کے نکاح میں جمع ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ان کی دو صورتیں ہیں:

① کسی شخص کا دو بہنوں کو بیک وقت اپنی بیویاں بنا کر رکھنا حرام ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَأَن تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ ﴾ ''اور تمھارا دو بہنوں کا جمع کرنا (بھی تم پر حرام ہے۔)''[1]

اور اسی طرح بیک وقت بیوی اور اس کی بھانجی سے یا بیوی اور اس کی بھتیجی سے شادی کرنا حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَجْمَعُوا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا»

''تم عورت (تمھاری بیوی) اور اس کی پھوپھی یا عورت اور اس کی خالہ کو بیک وقت نکاح میں نہ رکھو۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے خود اس فرمان کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«إِنَّكُمْ إِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ ، قَطَعْتُمْ أَرْحَامَهُنَّ» ''اگر تم ایسا کرو گے تو قطع رحمی کے مرتکب ہو جاؤ گے۔''[3]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سوکنوں کے درمیان غیرت اور حسد ہوتا ہے تو جب ان میں پہلے ہی سے قرابت ہو گی تو سوکن ہونے کے بعد نتیجہ قطع رحمی کی صورت میں برآمد ہو گا، البتہ اگر ایک کو طلاق دے دی جائے اور اس کی عدت گزر جائے یا ایک فوت ہو جائے تو اس کی بہن یا پھوپھی یا خالہ سے نکاح کرنا درست ہے کیونکہ اب ممانعت کا سبب باقی نہیں رہا۔

▪ ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنا حرام ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ﴾

''اور عورتوں میں سے جو بھی تمھیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے۔''[4]

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص مسلمان ہوا جس کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ ان میں سے چار بیویاں رکھ لو اور باقی کو چھوڑ دو۔

ثانیاً: ایسی عورتیں جن سے کسی عارضی سبب کی بنا پر نکاح کرنا حرام ہے جو ایک مدت کے بعد ختم ہو جائے گا، اس کی

---

① النسآء 23:4. ② صحيح البخاري، النكاح، باب لا تنكح المرأة على عمتها، حديث: 5110,5109، وصحيح مسلم، النكاح، باب تحريم الجمع بين المرأة وعمتها أو خالتها في النكاح، حديث: 1408، **البتہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ ہیں:** [لَا يُجْمَعُ بين الْمَرْأَةِ ......] و [نَهٰى أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ ......] ③ صحيح ابن حبان (الإحسان): 166/6، حديث: 4104، والتلخيص الحبير: 168/3 واللفظ له، والكامل لابن عدي: 262/5 في ترجمة عبدالله بن الحسين أبي حريز.
④ النسآء 3:4.

متعدد صورتیں ہیں:

▲ جو عورت عدت گزار رہی ہے اس سے دوران عدت میں نکاح کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ﴾

''اور عقد نکاح کا پختہ ارادہ مت کرو یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔''[1]

اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر دوران عدت میں اس سے کوئی نکاح کر لے تو اندیشہ ہے کہ وہ حاملہ ہو جائے اور یہ خبر نہ ہو کہ حمل پہلے شوہر کا ہے یا دوسرے کا۔ اس سے نسب میں اشتباہ کا اندیشہ ہے۔

▲ اگر کسی عورت کے بارے میں علم ہوا کہ وہ زانیہ ہے تو اس سے نکاح کرنا حرام ہے الا یہ کہ وہ توبہ کرے اور عدت گزارے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾

''اور زنا کار عورت سے بھی سوائے زانی یا مشرک مرد کے اور کوئی نکاح نہیں کرتا اور ایمان والوں پر یہ حرام کر دیا گیا۔''[2]

▲ جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں اس پر حرام ہے کہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کرے الا یہ کہ کوئی دوسرا آدمی اسے شرعی نکاح میں لے اور اس سے وطی کرے اور پھر اسے طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْــًٔـا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾

''یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں، پھر یا تو اچھائی سے روکنا یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور تمھیں حلال نہیں کہ تم نے انھیں جو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو، ہاں! یہ اور بات ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو، اس لیے اگر تمھیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لیے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں، خبردار! ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں، پھر اگر اس کو طلاق دے دے تو اب اس کے لیے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کر لے۔''[3]

---

[1] البقرۃ 235:2. [2] النور 3:24. [3] البقرۃ 230,229:2.

▲ احرام باندھنے والے مرد اور عورت دونوں کے لیے حالت احرام میں نکاح کرنا حرام ہے حتی کہ وہ اپنا احرام کھول دیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكِحُ وَلَا يَخْطُبُ»

''محرم نہ نکاح کرے اور نہ کروائے اور نہ پیغام نکاح دے۔''[1]

▲ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾

''اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی (مسلمان) عورتوں کو دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔''[2]

▲ مسلمان کسی کافر عورت سے نکاح نہ کرے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾

''اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ ''اور کافر عورتوں کی ناموس اپنے قبضے میں نہ رکھو۔''[4]

البتہ آزاد کتابیہ عورت سے نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾

''اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں ان کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں۔''[5]

یہ آیت پہلی دو آیتوں کے لیے مخصص ہے جس میں مسلمانوں پر کافر عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے (کیونکہ اس میں اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔) اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے۔

▲ آزاد مسلمان شخص پر حرام ہے کہ وہ مسلمان لونڈی سے نکاح کرے کیونکہ اس میں اولاد کو غلامی کی طرف لے جانا لازم آتا ہے الا یہ کہ جب اسے زنا میں پڑنے کا خطرہ ہو اور آزاد عورت کا حق مہر ادا نہ کر سکتا ہو یا لونڈی کو آزاد کرنے کی قیمت کا مالک نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ

---

① صحيح مسلم، النكاح، باب تحريم نكاح المحرم وكراهة خطبته، حديث: 1409. ② البقرة 2:221. ③ البقرة 2:221. ④ الممتحنة 60:10. ⑤ المآئدة 5:5.

فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ ؕ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْکِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ ﴾

''اور تم میں سے جس کسی کو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت و طاقت نہ ہو تو وہ مسلمان لونڈیوں سے جن کے تم مالک ہو (اپنا نکاح کرلو) اللہ تمھارے اعمال بخوبی جاننے والا ہے، تم سب آپس میں ایک ہی تو ہو، اس لیے ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو اور قاعدے کے مطابق ان کے مہر ان کو دو، وہ پاک دامن ہوں نہ کہ علانیہ بدکاری کرنے والیاں، نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں، پس جب یہ لونڈیاں نکاح میں آ جائیں، پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں تو آدھی سزا ہے اس سزا سے جو آزاد عورتوں کی ہے۔ کنیزوں (لونڈیوں) سے نکاح کا یہ حکم تم میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جنھیں گناہ اور تکلیف کا اندیشہ ہو۔''[1]

◣ غلام پر حرام ہے کہ وہ اپنی مالکہ کے ساتھ نکاح کرے۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے کیونکہ یہ درست نہیں کہ بیوی اس کی مالک ہو حالانکہ وہ اس کا خاوند ہے کیونکہ ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں۔

◣ مالک پر حرام ہے کہ وہ اپنی مملوکہ کو بیوی بنائے کیونکہ عقد ملک، عقد نکاح سے قوی تر ہے۔ عقد قوی عقد ضعیف کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔

◣ جس عورت سے نکاح کے ذریعے سے جماع حرام ہے، اس سے لونڈی ہونے کی صورت میں بھی جماع حرام ہے، مثلاً: جو عورت عدت گزار رہی ہو یا حالت احرام میں ہو یا بدکار عورت ہو یا جسے تین طلاقیں دی جا چکی ہوں کیونکہ نکاح تو اس لیے حرام ہے کہ وہ وطی کا ذریعہ بنتا ہے تو وطی کرنا بالاولیٰ حرام ہوگا، خواہ وہ لونڈی ہی ہو۔

نکاح میں شرط عائد کرنا

شرائط نکاح سے مراد وہ شرائط ہیں جو نکاح کے وقت زوجین میں سے کوئی ایک اپنی مصلحت کی خاطر دوسرے پر عائد کرتا ہے یا ان شرائط پر قبل از نکاح دونوں فریق اتفاق کر لیتے ہیں۔ یہ شرائط دو قسم کی ہیں بعض صحیح اور بعض فاسد۔

صحیح شرائط درج ذیل ہیں:

[1] النسآء 4:25.

① نئی بیوی اپنے مفاد کی خاطر اپنی سوکن کو طلاق دینے کی شرط عائد کرے۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ شرط صحیح ہے جبکہ بعض علماء اس کے فاسد ہونے کے قائل ہیں۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

«وَلَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَكْفَأَ مَا فِي إِنَائِهَا»

''نبی ﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی عورت اپنی (یا دینی) بہن کو طلاق دینے کی شرط عائد کرے تاکہ اس کا برتن خالی کر دے۔''[1]

اور انھی کے بارے میں قاعدہ ہے کہ وہ فساد کا تقاضا کرتی ہے۔

② کوئی عورت اپنے خاوند پر یہ شرط عائد کر دے کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ دوسرا نکاح نہیں کرے گا، نہ لونڈی رکھے گا وگرنہ اسے فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔ ایسی شرط درست ہے۔ حدیث میں ہے:

«أَحَقُّ الشُّرُوطِ أَنْ تُوفُوا بِهِ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ»

''وہ شرائط پوری کرنے کے زیادہ لائق ہیں جن کی بنیاد پر تم نے اپنے لیے شرم گاہوں کو حلال کرایا ہے۔''[2]

③ اگر عورت نے یہ شرط لگائی کہ اس کا خاوند اسے اس کے گھر یا شہر سے باہر نہیں نکالے گا تو درست ہے، البتہ اس کی اجازت سے نکالنا صحیح ہے۔

④ اگر عورت نے خاوند پر یہ شرط عائد کی کہ وہ اس کے اور اس کی اولاد یا اس کے والدین کے درمیان جدائی پیدا نہیں کرے گا تو یہ شرط درست ہے۔ اگر خاوند اس کی مخالفت کرے گا تو عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

⑤ اگر کسی عورت نے بطور مہر زیادہ رقم لینے کی شرط عائد کی یا کسی خاص کرنسی کی صورت میں حق مہر کا مطالبہ کیا تو یہ شرط صحیح ہے جس کا پورا کرنا شوہر پر لازم ہے۔ اسے پورا نہ کرنے کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ہے، وہ جب چاہے نکاح فسخ کر سکتی ہے، البتہ اگر خاوند نے بیوی کو راضی کر لیا تو اس کا فسخ نکاح کا اختیار ساقط ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ ''عورت نے بوقت نکاح جو شرائط مقرر کی تھیں خاوند انھیں پورا کرے۔'' تو آدمی نے کہا: تب عورتیں ہمیں چھوڑ دیں گی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''شرائط عائد ہونے سے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔''[3] نیز فرمان رسول ﷺ ہے:

① صحيح البخاري، البيوع، باب لا يبيع على بيع أخيه ......، حديث: 2140. ② صحيح البخاري، الشروط، باب الشروط في المهر عند عقدة النكاح، حديث: 2721. ③ ذكره البخاري تعليقاً: 396/5.

«وَالْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ» ''مومن باہمی طے شدہ شرائط کی پاسداری کریں۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نکاح میں عائد کردہ صحیح اور جائز شرائط کو پورا کرنا واجب ہے۔ یہ شریعت، عقل اور قیاسِ صحیح کا تقاضا ہے، نیز عورت اپنی عصمت خاوند کے حوالے کرنے کے لیے جن شرائط کے بغیر راضی نہیں ہوتی انھیں پورا کیا جائے۔ اگر انھیں پورا نہ کیا جائے گا تو عقد نکاح عورت کی مرضی کے مطابق نہ ہوا بلکہ اس پر وہ کچھ لازم کیا گیا جو اس نے نہ خود لازم کیا اور نہ اللہ اور اس کے رسول نے اس پر لازم کیا تھا۔''[2]

فاسد شرائط | نکاح میں فاسد شرائط کی دو انواع ہیں: پہلی نوع: وہ فاسد شرائط جن سے عقد نکاح باطل ہو جاتا ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں:

① نکاح شغار: یعنی کوئی شخص اپنی بہن یا بیٹی کا اس شرط پر کسی سے نکاح کر دے کہ دوسرا شخص بھی اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح اس سے کر دے، نیز دونوں میں مہر نہ ہو۔ واضح رہے شغار شغور سے ہے جس کے معنی ''معاوضے سے خالی ہونے'' کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ شغار شَغَرَ الْکَلْبُ سے اور یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کتا پیشاب کرنے کی خاطر ٹانگ اٹھاتا ہے۔ اس قسم کے نکاح کی قباحت کتے کے اس قبیح فعل کی طرح ہے۔ نکاح کی اس قسم میں عورت کے بدلے عورت ہوتی ہے جس کے حرام ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے اور ایسا نکاح باطل ہے۔ اس قسم کے نکاح میں جدائی ڈالنا واجب ہے، مہر کی نفی کی صراحت ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو دونوں صورتیں برابر ہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰی عَنِ الشِّغَارِ، وَالشِّغَارُ: أَنْ یُّزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلٰی أَنْ یُّزَوِّجَهُ الْآخَرُ ابْنَتَهُ، لَیْسَ بَیْنَهُمَا صَدَاقٌ»

''رسول اللہ ﷺ نے نکاح شغار سے منع کیا ہے۔'' (راوی کہتے ہیں کہ) نکاح شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کو کسی کے نکاح میں اس شرط پر دے کہ وہ بھی اپنی بیٹی اسے نکاح میں دے گا اور دونوں عورتوں کا حق مہر بھی نہ ہو۔''[3]

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے (بزبان رسول ﷺ) نکاح شغار کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ عورت کے ولی پر لازم ہے کہ وہ اس کی شادی اس وقت کر دے جب کسی ''کفو'' مرد کی جانب سے پیغام نکاح آ جائے، نیز اس میں عورت کی مصلحت کو پیش نظر رکھے نہ کہ اپنی خواہش کو۔ اور یاد رکھے کہ مہر عورت کا حق ہے ولی کا

① جامع الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول اللهﷺ في الصلح......، حديث:1352. ② إعلام الموقعين:3/295.
③ صحيح البخاري، النكاح، باب الشغار، حديث:5112، وصحيح مسلم، النكاح، باب تحريم نكاح......، حديث:1415.

نہیں، لہٰذا باپ یا ولی کو چاہیے کہ عورت کے نکاح میں اپنی غرض کے بجائے عورت کے مفاد کو سامنے رکھے ورنہ اس کا حق ولایت ساقط ہو جائے گا۔ جب ولی کی غرض فرج کا فرج کے ساتھ تبادلہ کرنا ہو تو وہ جس عورت کا ولی بن کر نکاح کر رہا ہے اس کے مفاد کے بجائے اپنی مصلحت کو مقدم رکھے گا۔ اور وہ اس آدمی کی طرح ہو گا جس نے صرف اپنے لیے مال دیکھ کر نکاح کیا نہ کہ عورت کی مصلحت و منفعت کا خیال کیا۔ اور یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نے نکاح شغار میں حق مہر محض حیلے کے طور پر مقرر کیا تو پھر بھی نکاح جائز نہ ہو گا امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کیونکہ مقصود وٹہ سٹہ ہی ہوتا ہے۔''

اگر ہر ایک عورت کا حق مہر الگ الگ مقرر ہو اور کوئی حیلہ بھی نہ ہو، نیز دونوں عورتیں اپنے اپنے نکاح پر رضامند ہوں تو نکاح درست ہے کیونکہ اب نقصان و ضرر کا پہلو نہیں رہا۔

② نکاح حلالہ، کوئی شخص کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کرے کہ جب وہ اسے (صحبت کے بعد) پہلے شوہر کے لیے حلال کر دے گا تو اسے طلاق دے دے گا تاکہ پہلے شوہر کے ساتھ اس کا نکاح دوبارہ کر دیا جائے یا بوقت نکاح یا نکاح سے پہلے شرط عائد نہ کرے لیکن ایسی نیت ضرور رکھے، بہر حال یہ نکاح باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِالتَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ؟ قَالُوا: بَلٰى يَارَسُولَ اللهِ! قَالَ: هُوَ الْمُحَلِّلُ، لَعَنَ اللهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ»

''کیا میں تمھیں مانگ کر لیے ہوئے سانڈ کی خبر نہ دوں؟ صحابہ نے عرض کی: ضرور بتائیے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حلالہ کرنے والا مرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لیے حلالہ کیا جا رہا ہے دونوں پر لعنت کی ہے۔''[1]

③ عقد نکاح کو مستقبل کی شرط کے ساتھ مشروط کرنا، مثلاً: کوئی کہے: ''میں تجھ سے اس عورت کا نکاح اس وقت کروں گا جب مہینہ شروع ہو گا'' یا ''اس (عورت) کی ماں رضامند ہو گی۔'' اس طرح کا نکاح منعقد نہ ہو گا کیونکہ نکاح عقد معاوضہ ہے جسے کسی شرط سے مشروط قرار دینا صحیح نہیں۔

اسی طرح ایک مدت مقرر تک کسی کو بیوی بنانا جائز نہیں، مثلاً: کوئی کہے: میں نے ایک رات کے لیے فلاں عورت کو تیری بیوی بنا دیا، چنانچہ اگلے دن اسے طلاق دے دینا یا کوئی شخص کسی عورت کا ایک مہینے یا ایک سال تک کے لیے نکاح کرے تو یہ مقرر وقت تک کا نکاح باطل ہے کیونکہ یہی ''نکاح متعہ'' ہے۔

① سنن ابن ماجه، النكاح، باب المحلل والمحلل له، حديث: 1936، والمستدرك للحاكم: 199,198/2، حديث: 2804.

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مشہور اور متواتر روایات متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے متعہ کو حلال کرنے کے بعد مستقل طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تمام روایات اس امر پر متفق ہیں کہ متعے کی اباحت کا دور لمبا دور نہ تھا، پھر اسے حرام قرار دے دیا گیا۔ اس کی حرمت پر سلف وخلف علماء کا اتفاق ہے، ماسوا روافض کے جو کسی گنتی وشمار میں نہیں آتے۔''[2]

دوسری نوع ان فاسد شرائط کی ہے جن سے نکاح باطل نہیں ہوتا اور وہ حسب ذیل ہیں:

① اگر کسی نے عقد نکاح میں عورت کے حقوق میں سے کسی حق کو ختم کرنے کی شرط عائد کی، مثلاً: مرد نے شرط عائد کی کہ عورت کے لیے مہر نہ ہوگا یا وہ اسے نان ونفقہ نہیں دے گا یا اسے اس کی سوکن سے کم حقوق ملیں گے تو ان تمام احوال میں شرط فاسد ہوگی، البتہ نکاح صحیح ہوگا کیونکہ اس شرط کا تعلق ایک زائد چیز سے ہے جس کا ذکر لازم ہے نہ اس سے عدم واقفیت باعث ضرر ہے (اس شرط کا عقد نکاح سے کوئی تعلق نہیں۔)

② اگر کسی نے بیوی کے مسلمان ہونے کی شرط عائد کی لیکن معلوم ہوا کہ وہ ''کتابیہ'' ہے تو نکاح صحیح ہے، البتہ اسے فسخ نکاح کا اختیار ہے۔

③ اسی طرح شوہر نے بیوی کے کنواری ہونے یا خوبصورت ہونے یا اونچے خاندان کی شرط عائد کی لیکن صورت حال اس کے برعکس ظاہر ہوئی تو شوہر کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے کیونکہ عائد کردہ شرط مفقود ہے۔

④ کسی نے ایک عورت کو آزاد سمجھ کر شادی کی لیکن بعد میں اس کا لونڈی ہونا ثابت ہوا تو اگر اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں تو دونوں میں تفریق ڈال دی جائے گی اور اگر اس کے لیے نکاح کرنا جائز ہوا تو اسے فسخ نکاح کا اختیار ہے۔

⑤ اسی طرح اگر کسی عورت نے کسی مرد کو آزاد سمجھ کر شادی کی اور بعد میں وہ غلام ثابت ہوا تو عورت کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے۔

اگر غلام کی بیوی کو آزادی مل گئی تو اسے غلام خاوند کے نکاح میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار ہے کیونکہ بریرہ رضی اللہ عنہا جو غلام کی بیوی تھی۔ جب اسے خاوند سے پہلے آزادی مل گئی تو اس نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مفارقت اختیار کی جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے۔

① منهاج السنة النبوية: 156/2. ② فتح الباري: 173/9.

نکاح میں عیوب کا بیان

نکاح کے سلسلے میں کچھ ایسے عیوب ہیں جن کی وجہ سے فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

① جس عورت کا خاوند نامرد ہونے یا مقطوع الذکر ہونے کی وجہ سے وطی کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اس عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ہے۔ اگر عورت نے خاوند کے نامرد ہونے کا دعویٰ کیا جس کا خاوند نے اقرار کر لیا تو اسے (علاج معالجے کے لیے) ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اگر وہ مقرر مدت کے دوران وطی کرنے کے قابل ہو گیا تو ٹھیک ورنہ عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

② اگر مرد نے اپنی بیوی میں ایسا عیب پایا جو وطی میں رکاوٹ کا باعث ہے، مثلاً: اس کی شرم گاہ کے سوراخ کا نہ کھلنا جس کا ازالہ بھی ناممکن ہو تو مرد کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

③ اگر زوجین میں سے کسی ایک نے دوسرے میں ایسا عیب پایا جس کا دونوں میں ہونا ممکن ہے، مثلاً: بواسیر، جنون، پھلبہری، کوڑھ، گنجا پن اور منہ میں بدبو کا آنا وغیرہ تو اس میں ہر ایک کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا کیونکہ یہ عیوب نفرت کا باعث ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر وہ عیب جو زوجین میں سے کسی ایک کے لیے نفرت کا باعث ہو، نیز اس سے مقصودِ نکاح حاصل نہ ہو رہا ہو تو اس سے نکاح قائم رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار لازماً حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ اختیار بیع کو قائم رکھنے یا نہ رکھنے کے اختیار سے زیادہ پختہ ہے۔''[1]

④ اگر زوجین میں سے کسی ایک میں نکاح کے بعد عیب پیدا ہو گیا تو دوسرے کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

زوجین میں سے ہر ایک کو فسخ نکاح کا اختیار تب ہوتا ہے جب دوسرا فریق اس عیب کو پسند نہ کرے اگرچہ خود اس میں ویسا ہی یا کوئی دوسرا عیب موجود ہو کیونکہ انسان اپنے عیب سے نفرت نہیں کرتا۔ اگر کسی کے عیب پر مطلع ہونے کے باوجود دوسرا فریق رضامندی کا اظہار کر دے یا کسی اور ذریعے سے اس کی رضامندی معلوم ہو جائے تو اسے فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا۔

جب کسی فریق کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا تو اس کی تکمیل قاضی کے ہاں جا کر ہوگی کیونکہ اس میں غور و فکر

[1] سبل السلام: 1353/3، تحت حدیث: 948.

اور اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا صاحب اختیار کے مطالبہ کرنے پر قاضی نکاح کو فسخ قرار دے گا یا اسے اجازت دے گا کہ وہ نکاح کو فسخ کر دے۔

- اگر مجامعت سے پہلے ہی نکاح فسخ ہوگیا تو عورت کو مہر میں سے کچھ نہ ملے گا کیونکہ اگر فسخ اس (عورت) کی طرف سے ہوا ہے تو یہ جدائی بھی اسی کی طرف سے آئی ہے اور اگر مرد نے نکاح فسخ کیا ہے تو عورت اپنا عیب چھپانے کے باعث خود اس فسخ کا سبب بنی ہے۔
- اگر فسخ مجامعت کے بعد ہوا تو عورت کو مقرر مہر ملے گا کیونکہ وہ عقد نکاح سے واجب ہو چکا تھا تو مجامعت سے برقرار رہے گا ساقط نہ ہوگا۔
- نابالغ لڑکی، دیوانی عورت یا لونڈی کا نکاح اس شخص سے کرنا جائز نہیں جس میں اس قسم کا عیب موجود ہو جس کی بنا پر نکاح فسخ کیا جا سکتا ہو کیونکہ ان مذکورہ عورتوں کے سرپرستوں کو چاہیے تھا کہ ہر صورت ان کی مصلحت اور منفعت کو ملحوظ رکھیں۔ اگر انھیں عیب کا علم نہ ہو تو جب علم ہو ان کا نکاح فسخ کر دیں تاکہ عورتوں کو ان سے ضرر نہ پہنچے۔
- اگر کوئی عمر رسیدہ عقل مند عورت کسی نامرد شخص کو بطور شوہر پسند کر لے تو اس کا ولی رکاوٹ پیدا نہ کرے کیونکہ وطی عورت کا حق ہے کسی دوسرے شخص کا نہیں۔
- اگر عورت کسی مجنون، کوڑھ یا پھلبہری والے سے شادی کرنے پر رضامند ہو تو ولی اسے روک دے کیونکہ آگے چل کر اولاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اس سے عورت کے خاندان کو اذیت پہنچے گی۔

کفار کے نکاح کا بیان

کفار سے مراد اہل کتاب، مجوس، بت پرست وغیرہ لوگ ہیں۔ اس باب میں اس نکاح پر بات کرنا مقصود ہے جس کو ان کے مسلمان ہو جانے کی صورت میں صحیح تسلیم کیا جائے گا یا اگر وہ کفر کی حالت میں مسلمان قاضی سے رجوع کریں تو ان کا نکاح قائم رکھا جائے گا۔

کفار کے نکاح کا حکم صحت و درستی، وقوع طلاق، ظہار، ایلاء، وجوب نفقہ اور باری کی تقسیم کے اعتبار سے مسلمانوں کے نکاح ہی کی طرح ہے۔

- جن عورتوں سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے۔ انھی سے نکاح کرنا کفار کے لیے بھی حرام ہے۔ کافر خاوند اور بیوی کے نکاح کے درست ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت کی نسبت اس کے کافر شوہر کی

طرف کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ ﴾ ''اور اس کی بیوی بھی (آگ میں جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔''[1]

نیز ارشاد ہے: ﴿ امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ﴾ ''فرعون کی بیوی۔''[2]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عورت کی نسبت اس کے کافر خاوند کی طرف کی ہے اور یہ نسبت زوجیت کے درست ہونے کی متقاضی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات یہی ہے کہ کفار کے وہ نکاح جو اسلام میں حرام ہیں وہ مطلقاً حرام ہیں۔ ایسا کرنے والے لوگ اگر اسلام قبول نہیں کریں گے تو آخرت میں انھیں اس جرم کی بھی سزا ملے گی اور اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا کیونکہ ان کا عقیدہ نہ تھا کہ ان عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے۔ باقی رہا نکاح کا صحیح یا فاسد ہونا تو درست بات یہی ہے کہ وہ ایک اعتبار سے صحیح ہے اور ایک اعتبار سے فاسد۔ اگر نکاح کے صحیح ہونے سے مراد تصرف کا جائز ہونا ہے تو بشرط اسلام جائز ہوگا۔ اور اگر یہ مقصد ہے کہ اسے نافذ مانا جائے اور زوجیت کے احکام مرتب ہوں، مثلاً: اس کی وجہ سے تین طلاق دینے والے کے لیے دوبارہ نکاح کرنا جائز ہونا یا اس نکاح کے بعد طلاق ہونا یا اس کی وجہ سے اسے شادی شدہ شمار کرنا تو اس معنی میں یہ نکاح صحیح ہے۔''[3]

کفار کے نکاح کے احکام میں سے یہ ہے کہ وہ فاسد صورتوں میں بھی دو شرطوں کے ساتھ قائم رہیں گے۔

① کفار اپنی شریعت کے مطابق اسے جائز سمجھیں۔ اگر وہ اپنے عقیدے کے مطابق جائز نہ سمجھیں تو انھیں اس نکاح پر قائم نہیں رہنے دیا جائے گا کیونکہ یہ ان کے دین میں شامل نہیں۔

② کفار ان فاسد نکاح کے مقدمات کو ہماری عدالتوں میں پیش نہ کریں۔ اگر وہ پیش کریں گے تو ہم انھیں ان فاسد نکاح پر قائم نہیں رہنے دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾

''آپ ان کے معاملات میں اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی فیصلہ کیا کیجیے۔''[4]

اگر کفار اس نکاح کو درست سمجھنے کا عقیدہ رکھیں اور ہماری عدالتوں میں ایسا مقدمہ نہ لائیں تو ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ''ہجر'' کے مجوسیوں سے جزیہ لیا لیکن ان کے نکاح کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی، حالانکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ مجوس محرمات سے نکاح کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ واضح

[1] اللھب 4:111. [2] التحریم 11:66. [3] الفتاوی الکبری، الاختیارات العلمیة:466/5. [4] المآئدة 49:5.

رہے کہ بہت سے لوگوں نے عہد نبوی میں اسلام قبول کر لیا تھا تو آپ ﷺ نے ہر ایک کو سابقہ نکاح پر قائم رکھا اور ان نکاحوں کی کیفیت نہ پوچھی۔

◄ اگر کفار عقد نکاح سے قبل ہمارے پاس آ جائیں گے تو ہم دین اسلام کے مطابق ان کے نکاح کریں گے، یعنی ایجاب وقبول کرنا، ولی کا ہونا اور دو مسلمان گواہوں کی موجودگی وغیرہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ﴾

''اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔''[1]

◄ اگر وہ انعقاد نکاح کے بعد ہمارے ہاں آئیں گے تو ہم ان سے کیفیت نکاح کے بارے میں تعرض نہ کریں گے۔

◄ اسی طرح اگر خاوند اور بیوی دونوں حالت کفر کے نکاح کے بعد مسلمان ہو جائیں تو ہم ان کے نکاح کی کیفیت وشرائط کے بارے میں تعرض نہ کریں گے، البتہ ہم ان کے ہمارے ہاں مقدمہ لانے یا اسلام قبول کرنے کے وقت کا لحاظ ضرور کریں گے۔

اگر مذکورہ وقت میں بغیر کسی شرعی مانع کے اس کی بننے والی بیوی سے نکاح جائز تھا تو ان کا نکاح قائم رہے گا کیونکہ ابتدائے نکاح میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں، لہٰذا نکاح کو ہمیشہ قائم رکھنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اور اگر ہمارے ہاں مقدمہ لانے یا قبول اسلام کے وقت اس کی بننے والی بیوی سے نکاح حرام تھا تو ان میں تفریق کر دی جائے گی کیونکہ جب عقد نکاح کی ابتدا ہی فاسد ہے تو نکاح کو قائم رکھنا بھی فاسد اور حرام ہے۔ اگر حالت کفر میں عورت کے لیے مہر کی مقرر شے جائز اور درست ہے تو بیوی اسے وصول کرے گی کیونکہ اس کی وصولی میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے اور اگر حرام شے ہے، مثلاً: شراب یا خنزیر تو اگر عورت نے اسے وصول کر لیا تو اس کا نکاح قائم رہے گا۔ اور بیوی نے جو کچھ وصول کر لیا اس کے سوا اسے اور کچھ نہ ملے گا کیونکہ اس نے اسے مشرکانہ حالت میں لیا تھا، لہٰذا خاوند بری الذمہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں اگر مہر کو از سر نو چھیڑا جائے تو اس میں خاوند کے لیے مشکل ہو گی جو اسلام سے نفرت کا باعث ہو سکتی ہے، لہٰذا دیگر کفریہ اعمال کی طرح اسے بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔

اگر عورت نے مہر فاسد قبضے میں نہیں لیا تو اس کا مہر ''مہر مثل'' ہو گا۔ اگر اس نے مہر فاسد کا کچھ حصہ وصول کر لیا اور کچھ حصہ ابھی وصول کرنا ہے تو جس قدر حصہ وصول کرنا ہو اس کے برابر وہ مہر مثل کی قسط وصول کر لے گی۔ اور اگر اس کے مہر کا سرے سے نام نہیں لیا گیا تو اسے مہر مثل ملے گا کیونکہ یہ نکاح مہر کا نام لیے (مہر مقرر کیے) بغیر ہوا ہے۔

[1] المآئدة 5:42.

▲ اگر خاوند اور بیوی دونوں نے ایک ہی وقت میں اسلام قبول کر لیا تو دونوں اپنے سابقہ نکاح پر قائم رہیں گے کیونکہ ان پر اختلاف دین کے لمحات نہیں گزرے۔

▲ اگر اہل کتاب کا کوئی آدمی مسلمان ہو گیا لیکن اس کی بیوی (جو اہل کتاب میں سے ہے) مسلمان نہ ہوئی تو دونوں اپنے اسی نکاح پر قائم رہیں گے کیونکہ مسلمان مرد جب کتابیہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے تو اس کے اسی نکاح کو قائم رکھنا بالاولیٰ جائز ہے۔

▲ اگر کسی کافر شخص کی کافر بیوی دخول سے پہلے پہلے مسلمان ہو گئی تو ان کا نکاح باطل ہو جائے گا کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾

''تو اب تم انھیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، یہ ان کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔''[1]

واضح رہے کہ بیوی کو مہر میں سے کچھ نہ ملے گا کیونکہ تفریق کی وجہ خود بیوی کا عمل ہے۔

▲ اسی طرح اگر دخول سے قبل غیر کتابی عورت کا شوہر مسلمان ہو گیا تو نکاح باطل ہو جائے گا کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ ''اور تم کافر عورتوں کی ناموس اپنے قبضے میں نہ رکھو۔''[2]

اس صورت میں مرد کو نصف مہر دینا ہوگا کیونکہ تفریق کا سبب وہ خود بنا ہے۔

▲ اگر (اہل کتاب کے علاوہ) زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو گیا یا کافر مرد کی کافر بیوی نے بعد از دخول اسلام قبول کر لیا تو عدت مکمل ہونے تک اس کا معاملہ موقوف رہے گا۔ اگر عدت تک دوسرا فرد مسلمان نہ ہوا تو سمجھا جائے گا کہ پہلے شخص کے قبول اسلام ہی سے نکاح فسخ ہو گیا تھا۔

▲ اگر کسی شخص نے اسلام قبول کیا اور اس کی چار سے زائد بیویاں ہیں اور ان سب نے بھی اسلام قبول کر لیا یا وہ اہل کتاب سے تعلق رکھتی ہوں تو مرد کو چاہیے کہ ان میں سے صرف چار کا انتخاب کرے اور باقی کو طلاق دے کر فارغ کر دے کیونکہ قیس بن حارث نے جب اسلام قبول کیا تھا تو اس وقت ان کی آٹھ بیویاں تھیں۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

«اِخْتَرْ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا»

''ان میں سے چار بیویوں کا انتخاب کر لو۔''[3] یہی بات آپ ﷺ نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی فرمائی تھی۔ واللہ أعلم.

---

[1] الممتحنة 10:60. [2] الممتحنة 10:60. [3] سنن أبي داود، الطلاق، باب في من أسلم وعنده نساء......، حديث: 2241.

مہر کا بیان

مہر خاوند کی طرف سے بیوی کو معاوضہ دینے کا نام ہے جو نکاح کے وقت یا اس کے بعد مقرر کیا جاتا ہے۔ مہر کا حکم ''وجوب'' کا ہے۔ اس کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝﴾

''اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو، پھر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے رچتا پچتا کھاؤ پیو۔''[1]

خود رسول اللہ ﷺ نے جتنے نکاح کیے، ان میں سے کوئی نکاح بھی مہر سے خالی نہ تھا، نیز آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا:

«اِلْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِّنْ حَدِیدٍ» ''مہر کے لیے کچھ تلاش کرو اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔''[2]

علاوہ ازیں اہل علم نے مہر کی مشروعیت پر اتفاق کیا ہے۔

▲ شریعت میں مہر کی مقدار کی کوئی حد مقرر نہیں۔ نہ کم از کم کی اور نہ زیادہ سے زیادہ کی۔ جو شے قیمت یا اجرت کے طور پر دینے کے قابل ہو، اسے مہر میں دینا درست ہے اگرچہ وہ کم ہو یا زیادہ، البتہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا اور پیروی کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اور وہ یہ کہ مہر کی رقم چار سو درہم کے قریب ہو۔[3] رسول اللہ ﷺ کی بیٹیوں کا مہر بھی اسی قدر تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر کوئی شخص مہر کی رقم زیادہ مقدار میں دینے کی طاقت رکھتا ہو تو مہر زیادہ دینا مکروہ نہیں الا یہ کہ کوئی شخص فخر و مباہات کے سبب ایسا کرے۔ اور اگر وہ عاجز و تنگ دست ہے تو مہر کی رقم زیادہ مقرر کرنا نہ صرف مکروہ ہے بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح اگر مرد مجبور ہو جائے کہ مہر ادا کرنے کے لیے حرام صورتیں اختیار کرے یا لوگوں کے آگے دست سوال پھیلائے تو اس صورت میں بھی زیادہ حق مہر مقرر کرنا حرام ہے۔ اور اگر

---

[1] النسآء 4:4. [2] صحیح البخاري، النكاح، باب عرض المرأة نفسها على الرجل الصالح، حديث: 5121.

[3] چار سو درہم کا وزن ایک سو پانچ تولے چاندی ہے۔ مارکیٹ کے ریٹ کے حساب سے اس کی قیمت کا حساب لگا لیا جائے۔ (صارم)

اس نے زیادہ مہر مقرر کر کے ادائیگی مؤخر کر دی تو یہ بھی مکروہ ہے کیونکہ اس میں بھی خود کو مشکل میں ڈالنا ہے۔''[1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مہر کی رقم کا زیادہ ہونا مکروہ نہیں الا یہ کہ اس میں فخر ومباہات پایا جائے یا اسراف کا پہلو ہو یا اس کا بوجھ مرد کے لیے قابل برداشت نہ ہو اور وہ اس بوجھ کو اتارنے کے لیے لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرتا رہے اور وہ قرض کے بوجھ تلے دبا رہے۔ یہ بہت قیمتی اصول ہیں جن پر عمل کرنے سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور انھیں نظر انداز کرنے سے نقصانات ہوتے ہیں۔

گزشتہ کلام سے واضح ہوا کہ جو لوگ شادی کرنے والے شخص کی غربت وتنگ دستی کا لحاظ کیے بغیر خود ہی مہر کی کثیر رقم مقرر کر دیتے ہیں وہ لوگ اس شخص کے لیے مشکلیں اور مصیبتیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ یہ رواج نکاح کے راستے میں رکاوٹ بن چکا ہے۔ مہر کے علاوہ بیوی اور اس کے رشتے داروں کی طرف سے مزید مختلف بوجھ ڈالے جاتے ہیں، مثلاً: قیمتی کپڑوں اور بھاری زیورات کا مہیا کرنا، اچھے اور قیمتی کھانوں اور گوشت کا ضائع ہونا وغیرہ۔ یہ سب کچھ بھاری بوجھ اور گلے کے طوق ہیں، اغیار کی بری اور اندھی تقلید ہے جن کا مقابلہ کرنا اور ان سے زوجین کے راستوں کو صاف کرنا از حد ضروری ہے تاکہ یہ دینی تقریب آسان سے آسان طریقے سے انجام پا سکے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ مَئُونَةً»

''وہ عورتیں عظیم برکت کا باعث ہیں جن کے نکاح اور نان ونفقہ کا خرچ کم ہو۔''[2]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«أَلَا ! لَا تَغْلُوا صُدُقَ النِّسَاءِ، فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مَكْرُمَةً فِي الدُّنْيَا أَوْ تَقْوَى عِنْدَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ كَانَ أَوْلَاكُمْ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ، مَا أَصْدَقَ رَسُولُ اللهِ ﷺ امْرَأَةً مِّنْ نِّسَائِهِ وَلَا أُصْدِقَتِ امْرَأَةٌ مِّنْ بَنَاتِهِ أَكْثَرَ مِنْ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ أُوقِيَّةً، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيُغَالِي بِصَدُقَةِ امْرَأَتِهِ حَتَّى يَكُونَ لَهَا عَدَاوَةٌ فِي نَفْسِهِ وَحَتَّى يَقُولَ: كُلِّفْتُ لَكُمْ عَلَقَ الْقِرْبَةِ»

''خبردار! عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو، اگر یہ کام دنیا میں عزت اور اللہ عزوجل کے ہاں تقوے کا باعث ہوتا تو رسول اللہ ﷺ تمھاری نسبت اس کے زیادہ لائق تھے۔ آپ ﷺ نے تو اپنی بیویوں یا اپنی بیٹیوں

[1] الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب الصداق: 468/5. [2] مسند أحمد: 145/6، والسنن الكبرى للبيهقي: 235/7، والمستدرك للحاكم: 195/2، حديث: 2732.

میں سے کسی کا مہر بارہ اوقیے (تقریباً پانچ صد درہم) سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔ ایک آدمی اپنی بیوی کا مہر گراں قبول کر لیتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل میں عداوت اور دشمنی سما جاتی ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میں نے تجھ کو نکاح میں لانے کے لیے ہر ایک مشکل کو برداشت کیا ہے یہاں تک کہ مشکیزے کی رسی بھی اٹھانی پڑی تو اٹھائی ہے (محنت مزدوری کر کے تیرا مہر پورا کیا ہے۔)''[1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ بسا اوقات مہر کے زیادہ ہونے سے خاوند کے دل میں بیوی کے خلاف بغض وعداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''جو عورتیں مہر کے بارے میں آسانی پیدا کرتی ہیں برکت کا باعث ہیں'' جیسا کہ سیدہ عائشہ ؓ کی روایت میں ذکر ہو چکا ہے۔ الغرض مہر میں آسانی پیدا کرنے سے خاوند کے دل میں بیوی کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

- مہر کی مشروعیت میں یہ حکمت ہے کہ یہ عورت سے استمتاع کا معاوضہ، بیوی کی عزت وتکریم اور اس کے مقام ومرتبے کا لحاظ ہے۔
- نکاح کے وقت مہر کی رقم کا نام لینا، اس کی تحدید وتعیین کرنا مستحب ہے تاکہ بعد میں کسی قسم کا کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔
- انعقاد نکاح کے بعد بھی مہر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً﴾

''اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کیے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔''[2]

آیت کریمہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ مہر عقد نکاح کے وقت سے مؤخر ہو سکتا ہے۔

- نوعیت مہر کے بارے میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو شے بیع میں قیمت بن سکے یا اجارے میں اجرت کے طور پر ادا ہو سکے، اسے مہر کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے۔ وہ کوئی معین شے ہو یا کوئی ایسی چیز جس کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا ہو یا کوئی معین کام حق مہر مقرر کر لیا جائے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مطلوب ومقصود مہر میں آسانی پیدا کرنا ہے جو احوال وواقعات کی مناسبت سے ہو، نیز نکاح کو آسان بنانا مطلوب ہے جس سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی عظیم مصلحتیں وابستہ ہیں۔

مہر سے متعلق چند اہم مسائل حسب ذیل ہیں:

[1] سنن أبي داود، النكاح، باب الصداق، حديث: 2106، وجامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء في مهور النساء، حديث: 1114، وسنن النسائي، النكاح، باب القسط في الأصدقة، حديث :3351 واللفظ له. [2] البقرة2:236.

① مہر کی مالک عورت ہے نہ کہ اس کا ولی، الا یہ کہ عورت خود اپنی رضامندی سے کسی کو مہر کا کچھ (یا سارا) حصہ دے دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ﴾ ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو۔''[1]

البتہ عورت کا باپ خصوصی طور پر مہر کی رقم لے سکتا ہے اگرچہ عورت کی اجازت نہ بھی ہو بشرطیکہ اس میں عورت کے لیے کوئی مشکل و تکلیف نہ ہو اور عورت کو اس کی ضرورت نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ» ''تم اور تمھارا مال (سب کچھ) تمھارے باپ کا ہے۔''[2]

② مہر کی رقم عقد نکاح کے وقت ہی سے عورت کی ملکیت میں آنا شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ بیع میں ہوتا ہے، البتہ وطی یا خلوت یا کسی ایک کی موت کی صورت میں مکمل طور پر اس کا تقرر و ثبوت ہو جاتا ہے۔

③ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو دخول و خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی اور مہر کی رقم مقرر ہو چکی تھی تو خاوند آدھا مہر ادا کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾

''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو۔''[3]

آیت کے سیاق کا تقاضا ہے کہ صرف طلاق دینے سے نصف مہر خاوند کا ہو اور نصف عورت کا اور جس نے بھی اپنا حصہ چھوڑ دیا، جبکہ جائز التصرف ہو تو اس کا یہ معاف کرنا اور چھوڑنا صحیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾

''یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ (معاملہ) ہے۔''[4]

بلکہ اللہ تعالیٰ نے معاف کرنے کی رغبت دلاتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾

''تمھارا معاف کر دینا تقوے کے بہت نزدیک ہے، اور تم آپس میں بھلائی اور احسان کرنا مت بھولو۔''[5]

واضح رہے عورت کی جانب سے معافی یہ ہے کہ وہ آدھا مہر بھی نہ لے اور مرد کی طرف سے معافی کی صورت یہ

---

① النسآء 4:4. ② سنن ابن ماجه، التجارات، باب ماللرجل من مال ولده؟ حديث: 2291. ③ البقرة 2:237.
④ البقرة 2:237. ⑤ البقرة 2:237.

ہے کہ وہ آدھا مہر دینے کے بجائے پورا مہر ادا کر دے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کو اس بات کی ترغیب ہے کہ وہ ایک دوسرے سے تنگ ظرفی کا معاملہ نہ کریں اور باہم قائم ہونے والے تعلق کا لحاظ رکھیں۔

④ جو کچھ بھی نکاح کی وجہ سے وصول کیا جائے وہ حق مہر میں شامل ہے، مثلاً: اس کے باپ یا بھائی کے لیے لباس کا جوڑا وغیرہ۔

⑤ اگر کسی عورت کو بطور مہر ایسا مال دیا گیا جو کسی سے چھینا گیا تھا یا حرام شے تھی تو نکاح صحیح ہوگا، البتہ مرد پر لازم ہے کہ حرام مہر کے عوض عورت کو مہر مثل ادا کرے۔

⑥ اگر انعقاد نکاح کے وقت عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو نکاح صحیح ہوگا۔ اس کو تفویض (بلا مہر شادی) کہتے ہیں اور اس میں مہر مثل مقرر کیا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾

"اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کیے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔"[1]

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ "ان سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس کا مہر مقرر نہ کیا اور وطی کرنے سے قبل ہی فوت ہو گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: اس عورت کو مہر مثل ملے گا، یعنی وہ مہر جو اس عورت کے قبیلے کی عورتوں میں معروف ہے۔ اس میں کمی بیشی نہ ہوگی، اس عورت پر عدت بھی ہوگی اور اسے خاوند کی میراث بھی ملے گی، چنانچہ معقل بن سنان رضی اللہ عنہ (صحابیٔ رسول) نے کھڑے ہو کر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے قبیلے کی عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایسا ہی فیصلہ صادر فرمایا تھا۔"[2]

تفویض کی ایک صورت یہ ہے کہ مہر کی مقدار کو مفوض کیا جائے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ہونے والے خاوند اور بیوی آپس میں طے کر لیں کہ تو جتنا چاہے مہر مقرر کر لینا یا تیسرا (اجنبی) آدمی جتنا کہے وہ مقرر ہو جائے۔ اس طریقے سے کیا ہوا نکاح صحیح ہوگا اور اس میں مہر مثل مقرر کیا جائے گا اور مہر مثل سے متعلق فیصلہ قاضی کرے گا اور یہ اس عورت کی رشتے دار خواتین کے مہر کو دیکھ کر مقرر کیا جائے گا، جیسے اس کی ماں، خالہ یا پھوپھی وغیرہ ہے۔ فیصلے میں قاضی ان عورتوں کا اعتبار کرے گا جو اس عورت کے مال، حسن و جمال، عقل و فہم، ہنر و ادب، عمر اور باکرہ یا بیوہ وغیرہ ہونے میں ہم پلہ ہوں گی۔ اگر اس عورت کی قریبی رشتے دار خواتین نہ ہوں تو اس کے شہر کی دوسری عورتیں جو

① البقرة 2:236. ② سنن أبي داود، النكاح، باب فيمن تزوج ولم يسم لها صداقا حتى مات، حديث: 2114، و جامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء في الرجل يتزوج المرأة فيموت عنها قبل أن يفرض لها، حديث: 1145 و اللفظ له.

اس کے مشابہ ہوں گی، ان کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اگر شوہر نے بیوی کو قبل از دخول طلاق کے ذریعے سے الگ کر دیا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق بیوی کو مال ومتاع سے فائدہ پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

''اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کیے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں! انھیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنی حیثیت سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق معروف طریقے سے اچھا فائدہ دے، بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔''[1]

آیت میں صیغہ امر وجوب کے معنی دیتا ہے اور واجب کی ادائیگی احسان ہے۔

اگر قبل از وطی کسی ایک کے مرنے کے سبب مفارقت ہوگئی تو عورت کے لیے مہر مثل ہوگا اور ہر ایک دوسرے کا وارث بھی ہوگا کیونکہ انعقاد نکاح کے وقت مہر کے عدم ذکر سے صحت نکاح میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت اس کی مؤید ہے۔

اگر دخول یا خلوت حاصل ہوگئی تو عورت کے لیے مہر مثل کامل ہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے خلفائے راشدین کا فیصلہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

«مَنْ أَغْلَقَ بَابًا وَّأَرْخٰى سِتْرًا فَقَدْ وَجَبَ الصَّدَاقُ»

''جس نے دروازہ بند کرلیا اور پردہ لٹکا لیا اس پر مہر واجب ہوگیا۔''[2]

اگر قبل از وطی عورت کی جانب سے تفریق پیدا ہوئی تو اسے مہر میں سے کچھ نہ ملے گا، مثلاً: وہ مرتد ہوگئی یا اس نے خاوند میں کوئی عیب نکال کر نکاح فسخ کر دیا وغیرہ۔

⑦ عورت کو حق حاصل ہے کہ مہر معجّل (جسے خلوت سے پہلے ادا کرنا طے پایا ہو) کی ادائیگی سے پہلے خاوند کو قریب نہ آنے دے کیونکہ ایک بار یہ موقع دینے کے بعد وصولی مشکل ہوگی۔ اگر سارا مہر مؤجل (جسے تاخیر سے ادا کرنا طے پایا ہو) ہے تو عورت کو خلوت سے انکار کا حق حاصل نہیں کیونکہ وہ مہر کی تاخیر پر رضا مندی کا اظہار کر چکی ہے۔ اسی طرح اس نے اگر ایک بار خلوت کا موقع دے دیا تو اس کے بعد اس نے چاہا کہ مہر وصول ہونے تک خاوند سے

[1] البقرة 2:236. [2] سنن الدارقطني: 3/212، حديث: 3779,3778، والمصنف لابن أبي شيبة: 3/512، والمغني: 8/63.

الگ رہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔

ولیمے کا بیان

ولیمے کے لغوی معنی ہیں: ''کسی شے کا مکمل ہونا اور اس کا جمع ہونا۔'' شادی کے موقع پر ''کھانا کھلانے'' کو ولیمہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ شادی کے سبب مرد اور عورت اکٹھے ہوتے ہیں۔

لغت عرب اور فقہاء کی اصطلاح میں مرد کی طرف سے شادی کے موقع پر کھانا کھلانے ہی کو ولیمہ کہا جاتا ہے کسی اور کھانے کو نہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے دوسرے کھانوں کے اور نام ہیں۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ ولیمہ کرنا ''سنت'' ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ولیمہ کرنا ''واجب'' ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور دعوت ولیمہ کو قبول کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب نکاح کی خبر سنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ» ''ولیمہ کرو چاہے ایک بکری کا ہو۔''[1]

اور خود نبی ﷺ نے جب امہات المومنین حضرت زینب، صفیہ اور میمونہ رضی اللہ عنہن سے شادیاں کیں تو ولیمہ کیا۔

- دعوت ولیمہ کے انعقاد کے وقت میں وسعت ہے جس کی ابتدا عقد نکاح سے ہو جاتی ہے اور شادی کے اختتام تک ہے۔
- مقدار ولیمہ کے بارے میں بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ ایک بکری سے کم نہ ہو، زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے جو حکم دیا تھا اس کا یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے لیکن ایسا تب ہے جب آسانی ہو ورنہ دعوت ولیمہ کا اہتمام حسب طاقت ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو حَیس بنا کر ولیمہ کیا جو کہ آٹا، گھی اور پنیر وغیرہ ملا کر تیار کیا جاتا ہے، اسے ایک چٹائی (دستر خوان) بچھا کر اس پر رکھ دیا گیا، (پھر سب نے کھایا۔)[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت کے بغیر بھی ولیمہ جائز ہے۔

---

① صحيح البخاري، البيوع، باب ما جاء في قول الله عزوجل:﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا ......﴾ [الجمعة 62: 10،11]، حديث: 2049، وصحيح مسلم، النكاح، باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن......، حديث: 1427. ② صحيح البخاري، الصلاة، باب ما يذكر في الفخذ؟ حديث: 371.

ولیمے میں فضول خرچی ناجائز ہے جیسا کہ آج کل کیا جاتا ہے کہ بہت سی بکریاں اور اونٹ ذبح کر دیے جاتے ہیں اور بہت سے کھانے پکائے جاتے ہیں جو اکثر بچ جاتے ہیں۔ بعد میں وہ نہ صرف کھائے نہیں جاتے بلکہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیے جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس سے ہمیں ہماری شریعت منع کرتی ہے اور عقل سلیم اسے جائز نہیں قرار دیتی۔ ممکن ہے اس قبیح حرکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے زوال نعمت کی کوئی سزا مل جائے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے، نیز ان ولیمے کی دعوتوں میں فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے، دولت کی نمائش ہوتی ہے، منکرات اور خلاف شرع امور سرعام کیے جاتے ہیں۔ کبھی دعوت ولیمہ کا اہتمام بڑے بڑے ہوٹلوں میں کیا جاتا ہے جہاں مرد وزن کا اختلاط ہوتا ہے، بے پردگی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ گانے باجے بجائے جاتے ہیں۔ فوٹو گرافر اور مووی میکر ماہرین کی ٹیموں کو خصوصی دعوت دے کر بلایا جاتا ہے جو بنی سنوری عورتوں کی تصاویر کھینچتے اور ان کے مختلف پوز محفوظ کرتے ہیں، خصوصاً دلھا اور دلھن کی مختلف انداز میں تصاویر کھینچی جاتی ہیں حتی کہ ان اجتماعات میں پانی کی طرح بے جا سرمایہ بہایا جاتا ہے جس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ فتنہ وفساد اور بہت سی معاشرتی اور دینی خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کی پکڑ نہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ﴾

''اور ہم نے بہت سی وہ بستیاں تباہ کر دیں جو اپنی عیش وعشرت میں اترانے لگی تھیں۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾

''اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو۔ بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

اور فرمایا:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾

''(اور ہم نے کہہ دیا کہ) اللہ کا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔''[3]

اس عنوان پر اور بھی بہت سی قرآنی آیات ہیں جو کہ معلوم ہیں۔

جس شخص کو دعوت ولیمہ دی جائے وہ ضرور قبول کرے بشرطیکہ اس دعوت میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

① وہ پہلے دن کا ولیمہ ہو۔ صرف پہلے ولیمے میں شرکت کرنا واجب ہے، باقی دنوں کے ولیمے میں شرکت کرنا

① القصص 58:28. ② الأعراف 31:7. ③ البقرة 60:2.

واجب نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْوَلِيمَةُ أَوَّلُ يَوْمٍ حَقٌّ، وَالثَّانِي مَعْرُوفٌ، وَالْيَوْمُ الثَّالِثُ سُمْعَةٌ وَّرِيَاءٌ»

''پہلے دن کا ولیمہ ضروری ہے، دوسرے دن کا نیکی ہے اور تیسرے دن کا شہرت اور ریا کاری ہے۔''[1]

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دوسرے ایام میں مناسب حد سے زیادہ جانور ذبح کرنا، کھانا اور کھلانا منع ہے اگر چہ اس کی عادت ہو یا اپنے اہل کو خوش کرنا مقصود ہو۔ اگر کوئی دوبارہ یہ حرکت کرے تو اسے سزا دی جائے۔''

② دعوت دینے والا مسلمان ہو۔

③ دعوت دینے والا اللہ تعالیٰ کا باغی اور ظاہری نافرمان اور ان کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کرتا ہو جن کی وجہ سے اس سے کنارہ کش ہونا ضروری ہو۔

④ دعوت دینے والے نے اگر کسی کو خصوصی طور پر دعوت دی ہو تو اس میں شرکت کرنا واجب ہے اور اگر دعوت ولیمہ کا اعلان عام ہو تو شرکت واجب نہیں۔

⑤ تقریب ولیمہ میں کوئی خلاف شرع کام نہ ہو، مثلاً: شراب پینا، فحش گانے گانا، ڈھول باجے بجانا وغیرہ جیسا کہ آج کے دور میں ولیموں کی بعض تقاریب میں خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

جب درج بالا شرائط موجود ہوں تو دعوت ولیمہ کو قبول کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَّأْتِيهَا وَيُدْعٰى إِلَيْهَا مَنْ يَّأْبَاهَا وَمَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَرَسُولَهُ»

''بدترین کھانا اس ولیمے کا کھانا ہے جس میں آنے والے کو روکا جائے اور جو انکاری ہیں ان کو بلایا جائے۔ جس نے دعوت ولیمہ قبول نہ کی اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔''[2]

▲ نکاح کا اعلان واظہار کرنا مسنون ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ» ''اس نکاح کا اعلان کرو۔''[3]

▲ تقریب نکاح کے موقع پر دف بجانا جائز ہے کیونکہ فرمان رسول ﷺ ہے:

① [ضعيف] سنن ابن ماجه، النكاح، باب إجابة الداعي، حديث: 1915، وسنن أبي داود، الأطعمة، باب في كم تستحب الوليمة؟ حديث:3745 واللفظ له. ② صحيح مسلم، النكاح، باب الأمر بإجابة الداعي إلى دعوة، حديث: (110)-1432. ③ [ضعيف] سنن ابن ماجه، النكاح، باب إعلان النكاح، حديث:1895.

«فَصْلُ مَا بَيْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الدُّفُّ وَالصَّوْتُ فِي النِّكَاحِ»

''حلال اور حرام نکاح میں امتیاز دف بجانے اور آواز سے ہوتا ہے۔''[1]

عورتوں سے برتاؤ کا بیان

عورتوں سے برتاؤ سے مراد محبت والفت اور میل جول کے وہ تعلقات ہیں جو زوجین میں از حد ضروری ہیں۔ ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ ایسے انداز سے زندگی گزارنا لازم ہے جس میں کوئی کسی کے حق میں کوتاہی نہ کرے بلکہ خوش دلی سے تمام حقوق ادا کرے اور اسے تکلیف دے نہ احسان جتلائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ ''ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بودوباش رکھو۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾

''اور ان عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ» ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے حق میں بہتر ہو۔''[4]

نیز فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا»

''اگر میں نے کسی کو حکم دینا ہوتا کہ وہ کسی انسان کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے[5] کیونکہ اس کا عورت پر بہت بڑا حق ہے۔''[6]

---

[1] جامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء في إعلان النكاح، حديث: 1088، وسنن النسائي، النكاح، باب إعلان النكاح بالصوت وضرب الدف، حديث:3371 واللفظ له، ومسند أحمد: 418/3. یعنی خفیہ حرام نکاح میں گانے اور دف کی آوازیں شامل نہیں ہوتیں۔

[2] النسآء 19:4. [3] البقرة 228:2. [4] سنن ابن ماجه، النكاح، باب حسن معاشرة النساء، حديث: 1977. [5] سنن أبي داود، النكاح، باب في حق الزوج على المرأة، حديث: 2140، وجامع الترمذي، الرضاع، باب ما جاء في حق الزوج على المرأة، حديث: 1159. [6] السنن الكبرى للنسائي، عشرة النساء، باب حق الرجل على المرأة، حديث: 9147.

ایک اور روایت میں فرمان نبوی یوں ہے:

«إِذَا بَاتَتِ الْمَرْأَةُ هَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ»

''اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے بستر سے دور رہ کر (حالت ناراضی میں) رات بسر کرتی ہے تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔''[1]

▲ زوجین میں سے ہر ایک پر لازم ہے کہ وہ دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس سے نرمی برتے، اس کی طرف سے کوئی تکلیف یا پریشانی آئے تو اسے برداشت کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾

''اور ماں باپ کے ساتھ سلوک واحسان کرو اور رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار ہمسائے، اجنبی ہمسائے اور پہلو کے ساتھی سے (بھی نیکی کرو۔)''[2]

کہا گیا ہے کہ یہاں ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ سے مراد زوجین میں سے ہر ایک ہے، نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ»

''میں تمھیں عورتوں سے حسن سلوک کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ وہ تمھارے ماتحت ہیں۔''[3]

▲ شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو (ناپسند کرنے کے باوجود) اپنے ہاں بسانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۝﴾

''اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش رکھو، گو تم انھیں ناپسند کرو لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا جانو اور اللہ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔''[4]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں کہ ''شاید اللہ تعالیٰ اس عورت کے ذریعے سے ایسی اولاد عطا فرمائے جو خیر کثیر اور سکون کا باعث ہو۔''[5] ایک صحیح حدیث میں ہے:

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها، حديث: 5194، وصحيح مسلم، النكاح، باب تحريم امتناعها من فراش زوجها، حديث: 1436 واللفظ له. [2] النسآء 4:36. [3] جامع الترمذي، الرضاع، باب ماجاء في حق المرأة على زوجها، حديث: 1163، و سنن ابن ماجه، النكاح، باب حق المرأة على الزوج، حديث: 1851 واللفظ له. [4] النسآء 4:19. [5] تفسير ابن كثير: 1/639، النسآء 4:19.

«لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُّؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَّضِيَ مِنْهَا آخَرَ»

''مومن شوہر مومنہ بیوی سے نفرت نہ کرے، اگر کسی ایک خصلت کے سبب وہ ناراض ہے تو ممکن ہے کسی دوسری خصلت کے باعث اس سے راضی ہو جائے۔''[1]

- زوجین میں سے ہر ایک پر حرام ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے یا حقوق کی ادائیگی میں کراہت کا اظہار کرے۔
- جب عقد نکاح ہو جائے اور مرد اپنے گھر میں اسے بلائے تو اسے سپرد کرنا لازم ہے بشرطیکہ اس کی عمر اتنی ہو کہ اس سے وطی کی جا سکتی ہو الا یہ کہ عورت نے عقد نکاح کے وقت اپنے گھر یا اپنے شہر میں رہنے کی شرط لگائی ہو۔
- شوہر کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بیوی کو سفر میں لے کر جائے بشرطیکہ اس میں کوئی معصیت شامل نہ ہو یا اس کے دین کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی بیویوں کو سفر میں اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

آج کے دور میں غیر اسلامی ممالک اور دیگر اباحات وفساد کے ممالک کی طرف سفر کرنے میں بہت سی اخلاقی قباحتیں اور دین کے لیے خطرات ہیں، اس لیے ان ممالک میں سیر و تفریح یا کھیل تماشہ دیکھنے کی خاطر بیوی کو لے کر وہاں جانا درست نہیں، لہٰذا بیوی کو چاہیے کہ وہ دیار اغیار میں جانے سے انکار کر دے اور اس کے ولی کو چاہیے کہ وہ عورت کو شوہر کے ساتھ ان ممالک کا سفر کرنے سے انکار کر دے۔

- آج کے دور میں دولت مند لوگ شادی کرنے کے بعد ''ہنی مون'' منانے کے لیے کافر ممالک کا رخ کرتے ہیں، حقیقت میں ان کے لیے یہ لمحات زہر قاتل ہیں کیونکہ عام انسان وہاں کے ماحول کی خرابیوں کا شکار ہو جاتا ہے، مثلاً: عورت کے پردے کا ختم ہونا، کفار کا لباس پہن کر خود کو اچھا بلکہ برتر سمجھنا، کافروں کے اطوار و عادات کو دیکھنا اور پھر انھیں اپنانا، خلاف شرع امور میں ان کی تقلید کرنا، لہو ولعب کے مقامات کو دیکھنا وغیرہ۔ خاص طور پر صنف نازک ان کے رذیل کاموں کو دیکھ کر متاثر ہو جاتی ہے حتی کہ وہ اسلامی معاشرے کے آداب واخلاق کو ناپسند کرنے لگتی ہے، لہٰذا ایسا سفر حرام ہے۔ بہر صورت خود کو اور اپنے اہل وعیال کو بچانا از حد ضروری ہے۔ جو دوست یا بھائی ایسے سفر کا ارادہ رکھتے ہوں انھیں روکنا چاہیے یا عورت کے ولی کو چاہیے کہ وہ عورت کو ان ممالک میں ہرگز نہ جانے دے۔ اگر کوئی بے غیرت مرد ایسا کرے تو ورثاء کو چاہیے کہ اپنی بہن یا بیٹی کو روک لیں، چاہے طلاق تک ہی نوبت پہنچ جائے کیونکہ عورت اپنے سرپرستوں کے پاس اللہ کی امانت ہے جس کی حفاظت ان کا فرض ہے۔ اگر

[1] صحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، حديث: 1467، ومسند أحمد: 329/2.

عورت وہاں جانے پر رضامند ہو تو بھی اسے نہ جانے دیا جائے کیونکہ عورت فطرتاً کمزور ہے، وہ اپنی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے سے قاصر ہے۔ عورت پر ولی مقرر کرنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اسے برے کاموں سے بچایا جائے۔

▲ شوہر پر حرام ہے کہ وہ اپنی بیوی سے اس وقت وطی کرے جب وہ حالت حیض میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ○ ﴾

''اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجیے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ، ہاں! جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''[1]

▲ اگر عورت نظافت وصفائی کا خیال نہیں رکھتی تو خاوند اس پر سختی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے جسم کو میل کچیل سے صاف رکھے۔ اپنے ان بالوں کا ازالہ کرے جس کا ازالہ درست ہے ناخنوں کو کاٹے اور صاف رکھے، نیز اسے ایسی کوئی شے کھانے سے روک سکتا ہے جو بدبودار ہو کیونکہ یہ چیزیں نفرت کا باعث بن جاتی ہیں۔

▲ شوہر اپنی بیوی کو نجاست کے دھونے، فرائض کی ادائیگی، مثلاً: فرض نمازوں کی ادائیگی پر مجبور کرے گا بلکہ کوتاہی کی صورت میں شوہر اس کا اہتمام کروائے اور اسے مناسب سرزنش کرے۔ اگر وہ نہ مانے تو اسے اپنے ہاں رکھنا حرام ہے۔ علاوہ ازیں شوہر اسے حرام کام کے ارتکاب سے بھی سختی کے ساتھ روکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔''[2]

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ ﴾

''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جس پر سخت دل مضبوط فرشتے مقرر ہیں جنھیں جو حکم اللہ دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو

[1] البقرۃ 2:222. [2] النسآء 4:34.

حکم دیا جاتا ہے وہی بجالاتے ہیں۔''[1]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾

''اپنے گھرانے کے لوگوں کو نماز کا حکم دیجیے اور (خود بھی) اس پر قائم رہیے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ﴾

''اس کتاب میں اسماعیل کا واقعہ بھی بیان کریں بے شک وہ بڑا ہی وعدے کا سچا تھا اور تھا بھی رسول اور نبی، وہ اپنے گھر والوں کو برابر نماز اور زکاۃ کا حکم دیتا تھا۔''[3]

✍ بیوی کے بارے میں خاوند پر مسئولیت عائد ہوتی ہے، وہ اس پر نگران (حاکم) ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔ اسی طرح وہ دینی امور کے بارے میں بھی ذمے دار اور نگران ہے بالخصوص اس لیے بھی کہ عورت نے اس کی اولاد کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے اور وہ خاوند کے بعد گھر کی ذمے دار ہوتی ہے، اس لیے اس کا تربیت یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ اس کے دین و اخلاق کی خرابی سے مرد کی اولاد اور اس کے اہل بیت میں فساد و خرابی لازم آئے گی۔

تمام مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں، ان کے روزمرہ کاموں پر نظر رکھیں، نیز ان کے حقوق و تصرفات کا خیال رکھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا» ''عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت و تلقین قبول کرو۔''[4]

✍ شوہر کو چاہیے کہ بیوی اگر آزاد ہے تو اس کے پاس چار راتوں میں سے ایک رات ضرور رہے بشرطیکہ بیوی کی طلب ہو کیونکہ وہ اس کے ساتھ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ تین عورتیں اور رکھ سکتا ہے، (چنانچہ ہر بیوی کی باری چوتھے دن بنتی ہے۔) امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاں سیدنا کعب بن سوار رضی اللہ عنہ نے یہی فیصلہ دیا تھا۔ بعض فقہاء کی بھی یہی رائے ہے، البتہ شیخ تقی الدین رحمہ اللہ کے ہاں یہ فیصلہ محل نظر ہے وہ فرماتے ہیں کہ چار عورتوں سے نکاح جائز ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ایک ہی بیوی ہو تو بھی اس کا حق اتنا ہی ہوگا جتنا چار عورتوں

---

[1] التحریم 6:66. [2] طٰهٰ 132:20. [3] مریم 55,54:19. [4] صحیح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، قبل حدیث: 1467-(61).

کی موجودگی میں ہوتا ہے۔[1]

شوہر پر لازم ہے کہ طاقت وقدرت کے ہوتے ہوئے چار ماہ میں کم از کم ایک مرتبہ بیوی سے مجامعت ضرور کرے بشرطیکہ بیوی کا میلان اور رغبت ہو۔ اس مدت کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والے کے حق میں چار ماہ کی مدت مقرر کی ہے، لہٰذا دوسرے شخص کے حق میں بھی یہی حکم سمجھا جائے گا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خاوند پر اس قدر عمل زوجیت کی ادائیگی واجب ہے جس سے عورت کی خواہش جائز حد تک پوری ہوتی رہے، یعنی خاوند کو نقصان نہ پہنچے یا روزی کمانے کا عمل متاثر نہ ہو۔ اس سلسلے میں کسی خاص مدت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔''

اگر خاوند نصف سال سے زائد عرصے کے لیے سفر پر رہا، پھر بیوی نے اسے واپس آنے کو کہا تو اسے لازماً واپس پلٹ آنا چاہیے الا یہ کہ وہ سفر فرض حج یا فرض جہاد وقتال کا ہو یا وہ واپس آنے پر قادر نہ ہو۔ اگر اس نے بلا عذر شرعی واپس آنے سے انکار کر دیا اور بیوی نے اس انکار کی بنیاد پر خلع کا مطالبہ کیا تو حاکم اس کے شوہر سے مراسلت کرے۔ اگر شوہر قصور وار ہو تو حاکم دونوں میں تفریق کر دے کیونکہ شوہر ایسے حق کا تارک ثابت ہوا ہے جو بیوی کے لیے نقصان دہ ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ترک وطی سے بیوی کا نقصان اس امر کا متقاضی ہے کہ نکاح کو ہر حال میں فسخ قرار دیا جائے۔ اس میں خاوند کا قصد وارادہ شامل ہو یا نہ ہو خاوند کو مجامعت پر قدرت ہو یا نہ ہو جیسا کہ بیوی کے نان ونفقہ کے بارے میں حکم ہے۔''[2]

زوجین پر حرام ہے کہ کسی کے ہاں ان اقوال وافعال کا تذکرہ کریں جو مجامعت کے دوران ہوں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، اَلرَّجُلُ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا»

''روز قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے برا مرتبہ اس شخص کا ہو گا جو اپنی بیوی سے مجامعت کرتا ہے اور بیوی اس سے لطف اندوز ہوتی ہے، پھر مرد اپنی بیوی کے راز (دوسروں کے آگے) کھولتا ہے۔''[3]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ خاوند اور بیوی پر حرام ہے کہ وہ کسی اور کے سامنے دوران مجامعت ہونے والے

---

① الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب عشرة النسآء: 481/5. ② الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب عشرة النسآء: 482,481/5. ③ صحيح مسلم، النكاح، باب تحريم إفشاء سر المرأة، حديث: 1437.

امور، واقعات اور کیفیات کے بارے میں باتیں کریں۔

■ خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بلاوجہ بغیر ضرورت کے گھر سے نکلنے کی صورت میں روک دے۔ اسے آزاد نہ چھوڑے کہ وہ جہاں چاہے چلی جائے۔ عورت پر بھی حرام ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بغیر ضرورت کے گھر سے نکلے، البتہ خاوند کو چاہیے کہ کسی ضروری اور جائز کام کے لیے اگر اس کی بیوی اجازت طلب کرے تو اسے اجازت دے دے، مثلاً: اس کا کوئی محرم جیسے بھائی، چچا وغیرہ بیمار ہو اور اس کی تیمارداری کرنا مقصود ہو کیونکہ اس میں صلہ رحمی ہے۔

■ شوہر کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کے والدین کو اس سے ملاقات کے لیے آنے سے روکے، البتہ اگر اس میں کوئی نقصان یا خرابی کا اندیشہ ہو تو وہ انھیں اس سے ملنے سے منع کر سکتا ہے۔

■ شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی کے ہاں محنت و مزدوری کرنے یا ملازمت کرنے سے روک دے کیونکہ وہ اسے خود نان ونفقہ مہیا کرتا ہے۔ اس میں شوہر کے حقوق پامال ہونے کا خطرہ ہے اور اولاد کی تربیت میں تعطل پیدا ہو سکتا ہے بلکہ اس میں اس کے اخلاق و کردار کے لیے خطرات موجود ہیں۔ خاص طور پر موجودہ دور نہایت پرفتن دور ہے کہ جس میں شرم و حیا نہایت کم ہو چکی ہے، بے حیائی اور جرائم کی دعوت دینے والوں کی کثرت ہے۔ دفاتر اور کام کاج کرنے کے ہر میدان میں عورتیں مردوں سے مل جل کر کام کرتی ہیں جن میں اکثر طور پر دونوں کے لیے خلوت محرّمہ کے مواقع میسر آ جاتے ہیں، جن کی وجہ سے خطرات مزید بڑھ جاتے ہیں، لہٰذا خود کو اور اپنی عورتوں کو ان خطرناک مواقع سے محفوظ اور دور رکھنا واجب ہے۔

■ شوہر اپنی بیوی کو پہلے خاوند کے بچے کو دودھ پلانے سے روک سکتا ہے الا یہ کہ کوئی شدید ضرورت اور عذر پیدا ہو جائے۔

■ اگر کسی عورت کو اس کے والدین مجبور کریں کہ وہ اپنے خاوند سے علیحدہ ہو جائے تو عورت اپنے والدین کی اطاعت نہ کرے۔ اسی طرح اگر والدین اپنی بیٹی کو اپنی زیارت کے لیے آنے کو کہیں لیکن اس کا شوہر رضامند نہ ہو تو عورت والدین کا کہا نہ مانے کیونکہ شوہر کی اطاعت کا حق والدین کی اطاعت سے بڑھ کر ہے، چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ سیدنا حصین رضی اللہ عنہ کی پھوپھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی کام کے لیے حاضر ہوئی۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا:

«أَذَاتُ زَوْجٍ أَنْتِ؟ قَالَتْ: نَعَمْ! قَالَ: كَيْفَ أَنْتِ لَهُ؟ قَالَتْ: مَاآلُوهُ إِلَّا مَا عَجَزْتُ عَنْهُ، قَالَ: فَانْظُرِي أَيْنَ أَنْتِ مِنْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ جَنَّتُكِ وَنَارُكِ»

''کیا تم شوہر والی ہو؟'' اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے پوچھا: ''کیا تو اس کی خدمت کرتی ہے؟'' وہ کہنے لگی: میں مقدور بھر اس کی خدمت بجا لاتی ہوں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم غور کرنا اس (شوہر) کا مقام و مرتبہ تیرے مقابلے میں کس قدر بلند ہے کہ وہ تیری جنت ہے یا جہنم ہے۔''[1]

▲ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو خاوند پر فرض ہے کہ ان میں وقت کی تقسیم، حقوق کی ادائیگی اور رات گزارنے میں مساوات رکھے ورنہ ظلم و زیادتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ ''ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش رکھو۔''[2]

اور ارشاد ہے:

﴿فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾

''پھر تم بالکل ایک ہی طرف مائل ہو کر دوسری کو بیچ میں لٹکتی ہوئی نہ چھوڑ دو۔''[3]

واضح رہے باری کی ادائیگی رات گزارنے سے سمجھی جائے گی کیونکہ انسان رات کو گھر آتا ہے اور بیوی سے راحت حاصل کرتا ہے، البتہ جس آدمی کی ڈیوٹی یا کاروبار رات کو ہو جیسے چوکیدار وغیرہ تو وہ اپنی بیویوں کے درمیان دن کو باری تقسیم کرے کیونکہ اس کے لیے دن ایسے ہے جیسے دوسروں کے لیے رات۔

▲ اگر کوئی بیوی حیض یا نفاس کے ایام میں ہو یا بیمار ہو تو بھی اس کے ہاں رات بسر کرے کیونکہ مقصود محبت و پیار اور سکون ہے جو بیوی کو شوہر کے پاس رات گزارنے سے حاصل ہوتا ہے، خواہ صحبت و مجامعت نہ بھی ہو۔ ایام کی تقسیم میں ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دے بلکہ ان میں قرعہ اندازی کا طریقہ اپنائے یا ان کی رضامندی سے ابتدا کرے۔ رضامندی کے بغیر کسی سے تقسیم ایام کی ابتدا کرنا اسے دوسری بیویوں پر ترجیح اور فضیلت دینے کے مترادف ہے جو ناجائز ہے۔ ان میں مساوات رکھنا فرض ہے۔ اسی طرح اگر سفر میں کسی بیوی کو لے جانا چاہتا ہے تو قرعہ اندازی سے یا ان کی باہمی رضامندی سے ایسا کرے کیونکہ حدیث میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا أَقْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ، فَأَيَّتُهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا خَرَجَ بِهَا مَعَهُ»

''رسول اللہ ﷺ جب سفر میں جانے کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے جس کے نام کا قرعہ نکلتا، اسے ساتھ لے جاتے تھے۔''[4]

---

[1] مسند أحمد: 341/4. [2] النسآء 19:4. [3] النسآء 129:4. [4] صحيح البخاري، الهبة، باب هبة المرأة لغير زوجها......، حديث: 2593.

بیوی کا نفقہ اور باری کب ساقط ہوتی ہے؟

جو عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر سفر پر روانہ ہو جائے یا اس کے شوہر کی اجازت تو ہو لیکن وہ اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لیے سفر پر جائے تو اس کی باری اور نفقے کا حق ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ اگر اس کا سفر خاوند کی اجازت کے بغیر ہے تو وہ نافرمان واقع ہوگی اور اگر اسے خاوند کی اجازت حاصل ہے تو عورت کی جانب سے اور اس کے ذاتی کام کی وجہ سے اس میں تعطل پیدا ہوا ہے۔

- اگر مرد نے اپنی بیوی کو سفر میں اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا تب بھی وہ نفقے کی حق دار نہ ہو گی کیونکہ اس نے شوہر کی حکم عدولی کی ہے۔
- اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ شب بسری کرنے سے انکار کر دیا تو بھی وہ نفقے اور اپنی باری سے محروم ہو گی کیونکہ وہ اس انکار کے سبب نافرمان قرار پائے گی اور وہ خودسر اور نافرمان شخص کی طرح ہے۔
- اگر کوئی اپنی بیوی کے پاس ایسی رات یا دن کو جائے جس میں اس کی باری نہ تھی تو ایسا کرنا ناجائز ہے الا یہ کہ اسے کوئی انتہائی ضروری کام پڑ جائے۔
- اگر کسی عورت نے شوہر کی اجازت سے اپنی باری اپنی کسی سوکن کو ہبہ کر دی یا اس نے اپنے شوہر کو ہبہ کر دی کہ جس بیوی کو چاہے اس کی باری دے دے تو ایسا کرنا جائز ہے کیونکہ ایسا کرنے کا حق دونوں کو حاصل ہے نیز دونوں راضی ہو چکی ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں دو دن گزارا کرتے تھے۔[1]

اگر عورت اپنی باری کسی کو ہبہ کر دے، پھر اس سے رجوع کر لے اور اپنی باری کی بحالی کا مطالبہ کر دے تو شوہر کو چاہیے کہ مستقبل کے ایام میں اس کا مطالبہ پورا کرے۔

- عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی باری اور نفقے کے حق سے اس لیے دست بردار ہو جائے کہ خاوند اسے طلاق نہ دے اور وہ اس کے نکاح میں رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب المرأة تهب يومها ......، حديث: 5212.

''اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بد دماغی اور بے پروائی کا خوف ہو تو دونوں آپس میں جو صلح کر لیں اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں اور صلح بہت بہتر چیز ہے۔''[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس (مذکورہ) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت آدمی کے نکاح میں ہوتی ہے لیکن اس کا شوہر عورت کی کسی کمزوری کے سبب اس سے زیادہ استمتاع نہیں کر پاتا جس کے سبب اسے طلاق دینا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہے: تم مجھے طلاق نہ دو، اپنے ہاں رکھو، میرے نفقے اور باری کے حقوق میں تمھیں اپنی مرضی کرنے کا اختیار ہے۔ جب سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا عمر رسیدہ ہوگئیں تو انھیں خدشہ محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں طلاق دے کر جدا کر دیں گے تو انھوں نے کہا: میں اپنا دن (رات گزارنے کی باری) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیتی ہوں۔

▲ جو شخص دیگر بیویوں کی موجودگی میں کسی کنواری عورت سے شادی کرے تو اس کے پاس مسلسل سات راتیں گزارے، پھر اس کے لیے باری مقرر کر دے۔ ان سات دنوں کو باری میں شمار نہ کرے۔ اسی طرح اگر کسی بیوہ یا مطلقہ سے شادی کرے تو اس کے پاس مسلسل تین راتیں رہے، پھر اس کے لیے باری مقرر کر دے اور یہ تین راتیں باری میں شمار نہ کرے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا وَّقَسَمَ، وَإِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ عَلَى الْبِكْرِ أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَسَمَ»

''سنت یہ ہے کہ جب آدمی (دیگر بیویوں کے ہوتے ہوئے) کسی کنواری سے شادی کرے تو اس کے ساتھ سات راتیں گزارے۔ اس کے بعد (تمام) بیویوں کے درمیان باری قائم کرے۔ جب کسی ثَیِّبَہ مطلقہ یا بیوہ سے شادی کرے تو اس کے ہاں تین راتیں گزارے، پھر باری تقسیم کرے۔''

اس روایت کے راوی ابوقلابہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ''مرفوع حدیث'' کے حکم میں ہے۔[2]

▲ اگر ثیبہ عورت پسند کرے کہ اس کا شوہر اس کے ہاں سات روز رہے تو اسے ایسا کر لینا چاہیے لیکن دوسری سوکنوں کو بھی اتنے ہی دن دے، پھر ہر ایک کے ہاں ایک ایک رات گزارنے کی تقسیم کرے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے شادی کی تو آپ تین دن تک میرے ہاں رہے اور فرمایا:

«إِنَّهُ لَيْسَ بِكِ عَلَى أَهْلِكِ هَوَانٌ إِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ وَإِنْ سَبَّعْتُ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَائِي»

[1] النسآء 4:128. [2] صحيح البخاري، النكاح، باب إذا تزوج الثيب على البكر، حديث: 5214، وصحيح مسلم، الرضاع، باب قدر ما تستحقه البكر و الثيب من إقامة الزوج عندها عقب الزفاف، حديث: 1461.

"تو اپنے خاوند (رسول اللہ ﷺ) کی نظر میں بے قدر نہیں، اگر تو چاہے تو میں تیرے ہاں سات دن گزاروں، اگر تیرے ہاں سات دن گزاروں گا تو باقی بیویوں کے ہاں بھی سات دن ہی بسر کروں گا۔"[1]

عورت پر حرام ہے کہ وہ اپنے شوہر کی جائز امور میں نافرمانی کرے، اگر شوہر نے اپنی بیوی میں نافرمانی اور معصیت کی علامات محسوس کیں، مثلاً: وظیفۂ زوجیت کے لیے اس کا قریب نہ آنا یا بوقت طلب اس کا بے رخی کا مظاہرہ کرنا تو ان حالات میں اولاً اسے پند ونصائح کرے، خشیت الٰہی پیدا کرنے کی تلقین کرے، اس کی ذمے داریوں سے اسے آگاہ کرے۔ شوہر کی مخالفت کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں جو گناہ وسزا ہے اسے یاد دلائے۔ اگر پھر بھی باز نہ آئے تو تین دن تک اس کو بستر سے الگ کر دے اور بول چال بند رکھے اگر پھر بھی اپنا رویہ نہ بدلے تو اسے تادیباً مار سکتا ہے لیکن چہرے پر نہ مارے اور باقی رہنے والی چوٹ یا زخم نہ لگائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ﴾

"اور جن عورتوں کی نافرمانی اور بد دماغی کا تمھیں خوف ہو تو انھیں نصیحت کرو اور انھیں الگ بستروں پر چھوڑ دو اور انھیں ہلکی سزا دو۔"[2]

جب زوجین میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہو کہ فریق ثانی اس پر ظلم کر رہا ہے اور باہم صلح و اصلاح مشکل دکھائی دے تو حاکم وقت کو چاہیے کہ دونوں کے خاندانوں میں سے ایک ایک فیصلہ کرنے والا عادل شخص مقرر کرے کیونکہ اقارب کو باطنی حالات کا زیادہ علم ہوتا ہے اور وہ امانت داری اور میاں بیوی کی اصلاح میں زیادہ مناسب ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں پر واجب ہے کہ وہ صلح کروانے کی نیت سے بھرپور جدوجہد اور کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۝ ﴾

"اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان آپس کی اَن بَن کا خوف ہو تو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں میں ملاپ کرا دے گا، یقیناً اللہ بہت علم والا، خوب خبردار ہے۔"[3]

---

[1] صحیح مسلم، الرضاع، باب قدر ما تستحقه البكر و الثيب ......، حديث: 1460. [2] النسآء 4:34. [3] النسآء 4:35.

اس آیت کی روشنی میں دونوں نمائندے پوری کوشش کریں کہ زوجین کے حق میں کوئی بہتر صورت نکل آئے، وہ مل کر رہنے کی صورت ہو یا تفریق کی صورت۔ یہ فیصلہ کسی معاوضے کے ساتھ ہو یا بغیر معاوضے کے، بہرحال جو بہتر صورت نظر آئے اس پر عمل کیا جائے تاکہ یہ مشکل حل ہو جائے۔
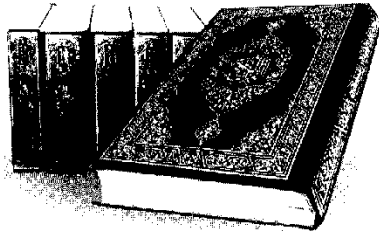
باب 13

طلاق کے مسائل

خلع کے احکام

خلع یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو اس کے مطالبے کے سبب مخصوص الفاظ کے ذریعے سے الگ کر دے۔ خلع کے لغوی معنی ہیں: ''الگ کرنا اور اتار دینا'' چونکہ عورت اپنی ذات کو لباس کی طرح خاوند سے الگ کر لیتی ہے، اس لیے اسے ''خلع'' کہا جاتا ہے۔ واضح رہے زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے بمنزلہ لباس کے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ (بیویاں) تمھارا لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''[1]

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نکاح مرد اور عورت کو باہم جوڑتا ہے اور اچھے طریقے سے زندگی گزارنے کا سبب ہے (اور یہ محبت کی بنیاد ہے) جس سے ایک کنبے کی تشکیل ہوتی ہے اور ایک نئی نسل پروان چڑھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾

''اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''[2]

اگر نکاح کے بعد درج بالا مقاصد حاصل نہ ہوں اور باہمی محبت پیدا نہ ہو یا محبت و پیار قائم نہ رہے یا خاوند کی جانب سے محبت والفت کا اظہار نہ ہو، زوجین کی زندگی کے لمحات برے طریقے سے گزرتے ہوں اور اس کی اصلاح اور علاج بھی نہ ہو سکے تو خاوند کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو اچھے طریقے سے چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ ''پھر یا تو اچھائی سے روکنا یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''[3]

ایک اور فرمان درج ذیل ہے:

﴿وَإِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ○﴾

''اور اگر میاں بیوی جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا، اللہ وسعت والا، حکمت والا ہے۔''[4]

اگر خاوند کو اس سے محبت ہو لیکن بیوی کے دل میں خاوند کی محبت نہ ہو، وہ خاوند کی کسی اخلاقی کمزوری سے نالاں

---

[1] البقرة 2:187. [2] الروم 30:21. [3] البقرة 2:229. [4] النسآء 4:130.

ہو یا اس کی شکل وصورت کو پسند نہ کرے یا اس کی کسی دینی کمزوری کے سبب اس سے نفرت کرے یا کسی وجہ سے اسے اندیشہ ہو کہ وہ خاوند کے حقوق ادا نہ کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہ گار ہو گی تو ان حالات میں عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنے خاوند سے کسی شے کے عوض معاہدہ کر کے فسخ نکاح کا مطالبہ کرے اور حاکم اس کے مطالبے کو تسلیم کر کے نکاح کو ختم کر دے اور انھیں الگ کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾

''اگر تمھیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لیے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔''[1]

▲ خلع کے جواز میں حکمت یہ ہے کہ بیوی خود کو خاوند سے اس طرح الگ کر لیتی ہے کہ اس میں رجوع کی گنجائش باقی نہیں رہتی، یہ دونوں کی مشکل کا ایک عادلانہ حل ہے۔ خاوند کو چاہیے کہ اس صورت میں عورت کا مطالبہ تسلیم کر لے۔ اور اگر خاوند کو اس سے محبت ہے تو عورت کو چاہیے کہ صبر کرے اور اس سے خلع نہ لے۔

▲ خلع مباح ہے بشرطیکہ درج بالا آیت میں مذکور سبب موجود ہو، یعنی خاوند اور بیوی کو خوف ہو کہ وہ نکاح میں منسلک رہنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اگر یہ سبب موجود نہ ہو تو بیوی کی جانب سے خلع کا مطالبہ ناپسندیدہ ہے اور بعض علماء کے نزدیک ایسی حالت میں حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا الطَّلَاقَ مِنْ غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ»

''جس عورت نے اپنے خاوند سے بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کیا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔''[2]

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شریعت نے جس خلع کی اجازت دی وہ یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کسی اہم وجہ سے ناپسند کرے اور اس سے اپنی ذات کو قیدی کی طرح فدیہ دے کر آزاد کروالے۔''[3]

▲ اگر خاوند بیوی سے محبت نہیں کرتا لیکن اس نے بیوی کو اس لیے اپنے ہاں روک رکھا ہے کہ عورت اکتا کر فدیہ دینا قبول کر لے تو وہ عنداللہ ظالم ہو گا اور اس پر حرام ہے کہ بیوی کو چھوڑنے کے عوض معاوضہ لے، شرعاً یہ خلع درست نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ﴾

---

[1] البقرة 2:229. [2] سنن أبي داود، الطلاق، باب في الخلع، حديث: 2226، وجامع الترمذي، الطلاق، باب ما جاء في المختلعات، حديث: 1187، وسنن ابن ماجه، الطلاق، باب كراهية الخلع للمرأة، حديث: 2055، ومسند أحمد: 277/5. [3] مجموع الفتاوى: 397/16.

''اور انھیں اس لیے روک نہ رکھو کہ جو (مہر) تم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے کچھ لے لو۔''[1]
یعنی انھیں تکلیف نہ دو کہ وہ اپنا بعض یا سارا حق مہر واپس کر دیں یا اپنا کوئی حق چھوڑ دیں، البتہ اگر عورت کا فاحشہ ہونا ظاہر ہو جائے تو خاوند اپنا مہر واپس لینے کی خاطر ایسا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ اِلَّآ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ ''ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی کھلی برائی اور بے حیائی کریں۔''[2]
سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی نقطۂ نظر ہے۔
▲ اسباب کے وقوع پذیر ہونے پر خلع کے جواز کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع ہے۔ قرآن مجید میں ہے:
﴿ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ﴾
''اگر تمھیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لیے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔''[3]
سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دلیل، ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی سے متعلق وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے خاوند ثابت بن قیس میں کوئی دینی اور اخلاقی امور میں عیب نہیں نکالتی، البتہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں مسلمان ہو کر خاوند کی ناقدری کروں اور گناہ گار بنوں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
«أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟ قَالَتْ: نَعَمْ! قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: اِقْبَلِ الْحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً»
''کیا تم اس کا باغ (جو اس نے مہر میں دیا تھا) واپس کر دو گی؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خاوند کو فرمایا کہ باغ واپس لے لو اور اسے ایک طلاق دے کر الگ کر دو۔''[4]
باقی رہا اجماع تو علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''ہمیں نہیں علم کہ کسی نے خلع کے جواز کی مخالفت کی ہو۔ سوائے ''مزنی رحمہ اللہ'' کے۔ ان کا خیال ہے کہ خلع کے جواز والی آیت اللہ کے فرمان:
﴿ وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـًٔا ﴾
''اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ بھر مال دے رکھا ہو تو بھی

① النسآء 4:19. ② النسآء 4:19. ③ البقرة 2:229. ④ صحيح البخاري، الطلاق، باب الخلع وكيف الطلاق فيه؟...... ، حديث: 5273.

اس میں سے کچھ نہ لو''[1] کے ساتھ منسوخ ہے۔

◣ خلع کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مالی معاوضہ دیا جائے اور معاوضہ دینے والا ایسا ہو جس کے لیے مالی تصرف شرعاً درست ہو۔ اور خلع ایسے خاوند کی طرف سے ہو جس کا طلاق دینا صحیح ہو اور بیوی کو ناحق تنگ نہ کرے کہ وہ معاوضہ دے کر خلع لینے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اور خلع دینے کے لیے خلع کا لفظ استعمال کیا جائے۔

اگر خاوند نے صراحتاً طلاق کے الفاظ یا کنایتاً طلاق کے الفاظ نیت طلاق کے ساتھ استعمال کیے تو وہ طلاق ہو گی خلع نہیں جس میں اسے رجوع کا حق نہیں، البتہ وہ عقد جدید کے ساتھ اسے دوبارہ نکاح میں لا سکتا ہے۔ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی کوئی شرط و پابندی نہیں بشرطیکہ اس نے پہلے دو طلاقیں نہ دی ہوں۔

اگر اس نے خلع، فسخ نکاح یا فدیے کے الفاظ کہے اور طلاق کی نیت نہ کی تو نکاح فسخ ہو گا طلاق شمار نہ ہو گی اور اس سے طلاق کی گنتی میں کمی نہ ہو گی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ ''طلاق رجعی دو مرتبہ ہے۔''[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾

''پھر جو وہ اپنی رہائی پانے کے لیے کچھ دے ڈالے اس میں دونوں پر گناہ نہیں۔''[3]

پھر آگے فرمایا:

﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾

''پھر اگر وہ اس کو (تیسری) طلاق دے دے تو اب اس کے لیے وہ (عورت) حلال نہیں جب تک کہ وہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔''[4]

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو طلاقوں کا ذکر کر کے خلع کا بیان کیا، پھر اس کے بعد طلاق کا ذکر کیا۔ اگر خلع طلاق ہوتی تو آخری طلاق چوتھی طلاق قرار پاتی اور یہ درست نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

طلاق کے احکام

طلاق کے لغوی معنی ہیں: ''چھوڑنا آزاد کرنا'' اور اسی سے ہے طَلُقَتِ النَّاقَةُ ''اونٹنی آزاد ہو گئی'' یہ اس وقت

① النسآء4:20. ② البقرة2:229. ③ البقرة2:229. ④ البقرة2:230.

کہتے ہیں جب وہ جہاں چاہے چرے۔

اور شرعی معنی ''نکاح کی گرہ کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر کھول دینے'' کے ہیں۔

طلاق احوال وظروف کے مختلف ہونے کے لحاظ سے کبھی مباح، کبھی مکروہ، کبھی مستحب، کسی وقت واجب اور کسی وقت حرام ہوتی ہے۔ اس پر پانچوں احکام لاگو ہوتے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

① بیوی کا اخلاق برا ہو جو خاوند کے لیے نقصان کا باعث ہو، نیز نکاح قائم رکھنے سے مقصد نکاح حاصل نہ ہو رہا ہو تو شوہر کے لیے طلاق دینا مباح ہے۔

② زوجین کے حالات درست ہوں، طلاق دینے کی کوئی ضرورت و وجہ نہ ہو تو طلاق دینا مکروہ ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک ایسی صورت میں طلاق دینا حرام ہے۔ حدیث میں ہے:

«أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ الطَّلَاقُ»

''اللہ عزوجل کے ہاں حلال اشیاء میں سے سب سے زیادہ ناپسند شے طلاق ہے۔''[1]

اس حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے طلاق کو حلال کہا ہے، باوجود اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ ہے جس سے ثابت ہوا کہ اس حالت میں طلاق مباح ہونے کے باوجود مکروہ ہے۔ وجہ کراہت یہ ہے کہ طلاق کے سبب نکاح جو معاشرتی مصالح وفوائد پر مشتمل تھا، ختم ہو گیا۔

③ جب طلاق دینے کی ضرورت ہو اور نکاح قائم رکھنے سے بیوی کو نقصان ہو رہا ہو، مثلاً: زوجین کے درمیان نزاع واختلاف پیدا ہو چکا ہو، عورت خاوند کو پسند نہ کرے تو اس صورت حال میں نکاح کو قائم رکھنا بیوی کے حق میں نقصان دہ ہے، لہٰذا اسے طلاق دینا مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ۔''[2]

④ اگر عورت دینی اعتبار سے کمزور ہو، مثلاً: نماز کی تارک ہو یا نماز بلاوجہ اپنے وقت سے تاخیر سے ادا کرنے کی عادی ہو، سمجھانے سے نہ سمجھے یا اپنی عزت کی حفاظت نہ کرے تو درست بات یہی ہے کہ ایسی صورت میں اسے طلاق دینا واجب ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب بیوی زانیہ ہو تو ایسی صورت میں بیوی کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں ورنہ اس صورت میں اسے اپنے ہاں رکھنے والا شخص دیوث ہے۔''[3]

① [ضعيف] سنن أبي داود، الطلاق، باب في كراهية الطلاق، حديث: 2178، وسنن ابن ماجه، الطلاق، باب حدثنا سويد بن سعيد، حديث: 2018. ② سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، حديث: 2340. ③ الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب المحرمات في النكاح: 5/460.

اسی طرح اگر خاوند دینی لحاظ سے صحیح نہ ہو تو عورت پر واجب ہے کہ وہ طلاق کا مطالبہ کرے یا خلع کی صورت میں خود کو الگ کرلے اور ایسی حالت میں ہرگز اس کے ساتھ نہ رہے۔

اگر ایلاء کی صورت ہو، یعنی خاوند ترک مجامعت پر قسم اٹھالے اور چار ماہ کا عرصہ بیت جانے کے بعد وہ ترک مجامعت پر مصر رہے اور قسم کا کفارہ نہ دے تو اس صورت میں شوہر کے لیے طلاق دینا واجب ہے ورنہ اسے طلاق دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ﴾

"جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کے لیے چار مہینے کی مدت ہے، پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق ہی کا قصد کرلیں تو اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"[1]

⑤ بیوی کو حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا جس طہر میں وطی کی گئی ہو اور حمل کی صورت حال واضح نہ ہو، طلاق دینا حرام ہے۔ اسی طرح شوہر جب بیوی کو تین طلاقیں دے چکا تو پھر طلاق دینا حرام ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ إن شاء الله.

طلاق کی مشروعیت کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ "(رجعی) طلاقیں دو مرتبہ ہیں۔"[2]

اور ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾

"اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔"[3]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ أَخَذَ بِالسَّاقِ» "طلاق وہی دے جس نے عورت سے نکاح کیا ہے۔"[4]

طلاق کی مشروعیت پر اجماع کئی ایک اہل علم سے منقول ہے۔

① البقرة 2:226,227. ② البقرة 2:229. ③ الطلاق 65:1. ④ سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق العبد، حديث: 2081.

▲ طلاق کی مشروعیت میں حکمت ظاہر و باہر ہے۔ یہ دین اسلام کے محاسن اور خوبیوں میں سے ایک ہے کیونکہ طلاق بوقت ضرورت نکاح میں پیدا ہونے والی مشکلات کا حل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ﴾ ''پھر یا تو اچھے طریقے سے روکنا یا عمدگی سے چھوڑ دینا ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِۦ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَٰسِعًا حَكِيمًا﴾

''اور اگر میاں بیوی جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا، اللہ وسعت والا، حکمت والا ہے۔''[2]

اگر نکاح کو قائم رکھنے میں مصلحت نہ ہو یا خاوند کے ساتھ رہنے میں بیوی کا نقصان ہو رہا ہو یا زوجین میں سے ایک دینی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت کمزور ہو تو اس صورت میں طلاق دینا مشکل سے نکلنے کا حل اور بہترین طریقہ ہے۔

بہت سے معاشرے مشکلات سے اس لیے دو چار ہیں کہ وہ طلاق سے روکتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ تباہی و بربادی، خودکشی اور خاندانی بگاڑ جیسی مشکلات کا شکار ہیں۔ دین اسلام نے طلاق کو مباح قرار دیا ہے اور اس کے لیے ایسے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں جن کی بدولت ایسے مصالح کا حصول اور مفاسد کا خاتمہ یقینی ہے جو جلد یا بدیر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم پر اپنا فضل واحسان فرمایا۔

▲ طلاق دینے کا مجاز خاوند ہے جو صاحب اختیار اور صاحب عقل ہو یا وہ شخص جسے یہ اپنا وکیل بنا دے تو وہ طلاق دے سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ أَخَذَ بِالسَّاقِ» ''طلاق اسی کی طرف سے ہے جس نے عورت سے نکاح کیا ہے۔''[3]

▲ جس شخص کی عقل زائل ہو چکی ہو اور اس بارے میں معذور ہو، مثلاً: دیوانہ، بے ہوش، سویا ہوا یا کسی مرض کی وجہ سے اس کا شعور ختم ہو گیا ہو، مثلاً: برسام کا مرض یا جسے نشہ آور شے پینے پر مجبور کیا گیا ہو یا جس نے دوا کی خاطر بھنگ پی (اور عقل جاتی رہی) تو اگر یہ لوگ درج بالا اسباب کی وجہ سے طلاق کا لفظ بیوی سے کہیں گے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ إِلَّا طَلَاقَ الْمَعْتُوهِ ''غیر عاقل کے علاوہ ہر ایک کی طلاق جائز (درست) ہے۔''[4]

اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام کا دارومدار عقل پر ہے۔ واللہ أعلم.

① البقرة 2:229. ② النسآء 4:130. ③ سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق العبد، حديث :2081. ④ صحيح البخاري، الطلاق، باب الطلاق في الإغلاق والكره والسكران ......، قبل حديث :5269 تعليقًا.

▲ اگر اپنی مرضی اور اختیار سے نشہ آور اشیاء استعمال کرنے کی وجہ سے کسی شخص کی عقل جاتی رہی تو اگر ایسے شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اہل علم میں اختلاف ہے کہ طلاق مؤثر ہوگی یا نہیں؟ ایک قول کے مطابق طلاق واقع ہو جائے گی۔ ائمۂ اربعہ کے علاوہ اہل علم کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔

▲ اگر کسی کو ڈرا دھمکا کر طلاق دینے پر مجبور کیا گیا اور اس نے جبر وظلم کے خوف سے بیوی کو طلاق دے دی تو اس کی طلاق واقع اور مؤثر نہ ہوگی کیونکہ حدیث میں ہے:

«لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ» ''جبر واکراہ میں نہ طلاق ہے نہ آزادی۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾

''جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، سوائے اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر (مطمئن و) برقرار ہو۔''[2]

واضح رہے کفر طلاق سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جب جبر واکراہ میں کفر کی معافی ہے اور شمار میں نہیں آتا تو طلاق بالاولیٰ معاف ہے اور شمار نہ ہوگی، البتہ جن صورتوں میں طلاق دینے پر مجبور کرنا جائز ہے، ان صورتوں میں جبری طلاق واقع ہو جائے گی، مثلاً: ایلاء کرنے والا شخص چار ماہ کے بعد بیوی سے تعلقات بحال نہ کرے تو اسے بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

▲ اگر غصے کی کیفیت یہ ہو کہ آدمی کو اپنی بات سمجھ میں آتی ہو تو غصہ کی اس حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی، اگر غصہ اس قدر شدید ہے کہ اسے علم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

مذاق میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے کیونکہ طلاق بولنے میں اس کا قصد وارادہ شامل ہے اگرچہ وقوع طلاق کا ارادہ نہ تھا۔ واللہ أعلم.

مسنون اور غیر مسنون طلاق

مسنون طلاق سے مراد ایسی طلاق ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو مدنظر رکھ کر دی جائے۔

---

[1] سنن أبي داود، الطلاق، باب في الطلاق على غلط، حديث: 2193، وسنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المكره والناسي، حديث: 2046، ومسند أحمد: 276/6. [2] النحل 106:16.

اس کی صورت یہ ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے اور وہ بھی ایسے طہر میں جس میں بیوی سے مجامعت نہ کی ہو، پھر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے حتی کہ عدت تمام ہو جائے۔ یہ طلاق عدت کے اعتبار سے ''طلاق مسنون'' ہے کہ ایک ہی طلاق دی گئی یہاں تک کہ عدت پوری ہوگئی، نیز وقت کے اعتبار سے ''مسنون'' ہے کہ خاوند نے اسے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں مجامعت نہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

''اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔''[1]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿لِعِدَّتِهِنَّ﴾ کا مفہوم یوں بیان کیا: ''وہ حالت طہر میں ہوں اور جماع نہ کیا گیا ہو۔''[2]

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر لوگ طلاق کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل پیرا ہوں تو مرد کبھی عورت کے پیچھے پیچھے نہ پھرے۔ اسے چاہیے کہ صرف ایک طلاق دے، پھر اسے تین حیض تک چھوڑ دے، اگر چاہے تو دوران عدت میں اس سے رجوع کر لے۔''[3] اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے والے کو موقع دیا ہے کہ اگر وہ طلاق دے کر نادم ہے تو بیوی سے رجوع کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ تیسری طلاق نہ ہو اور عدت کا دورانیہ ہو۔ اگر طلاق کا عدد مکمل ہوگیا، یعنی تیسری طلاق دے دی تو اس نے اپنے آپ پر رجوع کا دروازہ بند کرلیا۔

▲ غیر مسنون طلاق دینے سے مراد ایسی طلاق ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے دی جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی ایک ہی مجلس میں یکبار تین طلاقیں کہہ دے یا بیوی کو اس وقت طلاق دے جب وہ حالت حیض یا نفاس میں ہو یا ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے مجامعت کی ہو اور حمل کی کیفیت واضح نہ ہو۔ طلاق کی پہلی صورت عدد کے اعتبار سے ''غیر مسنون'' ہے دوسری اور تیسری صورت وقت کے اعتبار سے ''غیر مسنون'' کہلاتی ہے۔

① عدد کے اعتبار سے غیر مسنون طلاق مؤثر ہو جاتی ہے۔[4] عورت مرد پر حرام ہو جاتی ہے الا یہ کہ وہ کسی دوسرے

[1] الطلاق 65:1. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 325/7. [3] المحلى لابن حزم: 173/10.

[4] ایک ہی مجلس میں دی گئیں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوگی، تین نہیں، لہٰذا خاوند کو رجوع کا حق حاصل ہوگا۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں بیک وقت تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا...... باقی رہے آیت کریمہ کے کلمات: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا ......﴾ تو حدیث شریف کی روشنی میں اس ◄◄

شخص سے نکاح کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾

''پھر اگر وہ اس کو (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے لیے وہ (عورت) حلال نہیں جب تک کہ وہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔''[1]

② وقت کے اعتبار سے غیر مسنون طلاق میں خاوند کے لیے مستحب امر رجوع کرنا ہے۔ حدیث میں ہے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ حالت حیض میں تھی تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں رجوع کرنے کا حکم دیا۔[2]

واضح رہے رجوع کے بعد لازم ہے کہ اسے اپنے ہاں روک لے حتی کہ حیض سے پاک ہو جائے، پھر اگر چاہے تو حالت طہر میں جماع کیے بغیر اسے طلاق دے دے۔

▲ شوہر پر حرام ہے کہ وہ غیر مسنون طلاق دے، وہ عدد کے اعتبار سے ہو یا وقت کے اعتبار سے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾

''یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں، پھر یا تو اچھائی سے روکنا یا عمدگی سے چھوڑ دینا ہے۔''[3]

نیز ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

''اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔''[4]

رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو یکبار تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ نے فرمایا:

«أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ»

''تعجب ہے! میرے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے (مذاق کرکے) کھیلا جا رہا ہے؟''[5]

◄◄ کا مطلب یہ ہے کہ اگر خاوند نے تیسری مجلس میں یا تیسرے موقع پر تیسری طلاق دے دی تو اس کے لیے وہ حلال نہ ہوگی جب تک کسی اور شخص سے اس کا نکاح نہ ہو اور وہ اسے طلاق نہ دے یا فوت نہ ہو جائے۔ (صارم)

① البقرة 230:2. ② صحيح البخاري، التفسير، سورة الطلاق، حديث: 4908، وصحيح مسلم، الطلاق، باب تحريم طلاق الحائض ...... ، حديث: 1471. ③ البقرة 229:2. ④ الطلاق 1:65. ⑤ سنن النسائي، الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ، حديث: 3430.

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی ایسا شخص لایا جاتا جس نے یکبارتین طلاقیں دی ہوتیں تو آپ اس کی پٹائی کرتے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے ہاں ذکر ہوا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی ہے تو آپ ﷺ غصہ میں آ گئے اور انھیں رجوع کرنے کا حکم دیا۔

یہ تمام واقعات اور روایات اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کہ طلاق کے احکام کی پاسداری کریں اور طلاق کی حرام صورتوں سے اجتناب کریں۔ سننے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر لوگ ان احکامات کو نہیں سمجھتے یا ان کا خیال نہیں رکھتے جس کے نتیجے میں وہ مشکل اور ندامت سے دوچار ہوتے ہیں، پھر اس بھنور سے نکلنے کی راہیں ڈھونڈتے ہیں، خود بھی تنگ و پریشان ہوتے ہیں اور علماء کو بھی تنگ کرتے ہیں اور یہ ساری صورت حال اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلنے کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ طلاق کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یعنی جب بیوی سے کوئی اہم کام کروانا یا کوئی خاص فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اسے کسی کام سے روکنا چاہتے ہیں تو طلاق کی دھمکی دے کر اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں سے معاملہ کرتے وقت یا گفتگو میں طلاق کو قسم کی جگہ استعمال کرتے ہیں، مثلاً: اگر میں فلاں کام نہ کرسکوں یا میں نے فلاں کام کیا تو میری بیوی کو طلاق۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور اپنی زبانوں کو طلاق کا کلمہ استعمال کرنے سے بچانا چاہیے الاّ یہ کہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہو لیکن اس میں بھی وقت اور عدد ضرور ملحوظ رکھا جائے۔

الفاظِ طلاق دو قسم کے ہیں:

① واضح اور صریح الفاظ، یعنی ایسے الفاظ استعمال کرنا جن میں طلاق کے سوا کسی دوسرے معنی کا احتمال نہیں ہوتا، جیسے ''طلاق'' کا لفظ بولنا، مثلاً: کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا ''تو طلاق والی ہے'' یا ''تجھے طلاق دے دی گئی ہے۔''

② اشارے کنایے کے الفاظ، یعنی ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن میں طلاق کے علاوہ کسی دوسرے معنی کا احتمال بھی ہو، مثلاً: کوئی اپنی بیوی سے کہے: ''تو الگ ہے۔'' یا ''تو بری ہے۔'' یا ''تو جدا ہے، آزاد ہے'' یا ''یہاں سے نکل جا اور اپنے گھر والوں کے ہاں چلی جا۔'' یا ''میں نے تجھے چھوڑ دیا۔''[1] وغیرہ۔

[1] مصنف نے عرب کے ماحول کے مطابق مثالیں دی ہیں۔ دوسری زبانوں میں ان کے محاورات اور الفاظ کا اعتبار ہوگا، یعنی جو الفاظ طلاق کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور اپنی آغوش میں دوسرے معانی بھی رکھتے ہیں وہ سب ''طلاق کنایہ'' میں شامل ہیں۔ (صارم)

▲ طلاق کے موقع پر واضح الفاظ اور اشارے کے الفاظ کے استعمال میں فرق ہے کہ واضح الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اگرچہ بولنے والے کی نیت شامل نہ بھی ہو، اس نے سنجیدگی میں کہا ہو یا مذاق میں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَّهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ»

''تین باتیں پکی ہو جاتی ہیں وہ سنجیدگی میں کہی جائیں یا مذاق میں: نکاح، طلاق اور رجوع کرنا۔''[1]

باقی رہے اشارے کنایے کے الفاظ تو ان کے استعمال سے طلاق واقع نہیں ہوتی الا یہ کہ اس میں نیت شامل ہو کیونکہ یہ الفاظ طلاق کے علاوہ دوسرے (ظاہری) معنی کا بھی احتمال رکھتے ہیں، لہٰذا طلاق کی تعیین نیت کے بغیر نہ ہو گی، یعنی اگر نیت طلاق میں شامل نہیں ہو گی تو طلاق واقع نہ ہو گی، البتہ تین حالات میں طلاق شمار ہو جاتی ہے ان میں نیت کا اعتبار نہ ہو گا:

① شوہر نے طلاق میں کنایے کا لفظ اس وقت استعمال کیا جب اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا۔

② شوہر نے غصے کی حالت میں کنایے کا لفظ استعمال کیا۔

③ جب بیوی نے طلاق مانگی اور مرد نے طلاق دیتے وقت کنایے کا استعمال کیا۔ ان حالات میں اشارے کنایے کے الفاظ سے بھی طلاق واقع ہو جائے گی اگرچہ طلاق دینے والا کہے: ''میری نیت طلاق دینے کی نہ تھی۔'' کیونکہ قرینہ (صورت حال) اس کی نیت پر دلیل ہے، لہٰذا اس کے دعوے کو سچ نہ سمجھا جائے گا۔ واللّٰه أعلم.

▲ شوہر طلاق دینے کے لیے کسی کو اپنا وکیل (نائب) بنا لے تو بھی جائز ہے۔ وکیل اجنبی شخص ہو یا خود اس کی بیوی، یعنی بیوی کی طلاق کا معاملہ اس کے ہاتھ اور اختیار میں دے دے۔ وکیل صریح، کنایہ اور عدد میں اپنے مؤکل کا نائب ہو گا الا یہ کہ مؤکل وکیل کے لیے کوئی تعیین یا حد بندی کر دے۔

▲ طلاق دینے والا خود شوہر ہو یا اس کا وکیل اس کے لیے ضروری ہے کہ زبان سے بولے اور آواز نکالے، محض دل کی نیت سے طلاق واقع نہ ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ»

''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ان امور میں درگزر کیا ہے جو دل میں خیالات کی صورت میں ہوں، جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یا انھیں زبان پر نہ لایا جائے۔''[2]

---

① سنن أبي داود، الطلاق، باب في الطلاق على الهزل، حديث: 2194، وجامع الترمذي، الطلاق، باب ماجاء في الجد والهزل في الطلاق، حديث: 1184. ② صحيح البخاري، الطلاق، باب الطلاق في الإغلاق والكره والسكران ◄◄

لہٰذا ثابت ہوا کہ طلاق تب واقع ہوگی جب زبان کو حرکت میں لا کر الفاظ بآواز بولے جائیں مگر دو حالتوں میں زبان استعمال کیے بغیر طلاق واقع ہو جائے گی:

① جب صریح کلمات کے ساتھ طلاق لکھ دی جائے اور اسے واضح طور پر پڑھا جا سکے اور نیت بھی شامل ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر نیت شامل نہ ہو تو اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ اکثریت کی رائے کے مطابق طلاق واقع ہو جائے گی۔

② طلاق دینے والا شخص گونگا ہو لیکن اس کا اشارہ وضاحت کر رہا ہو کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔

عورت کو کتنی طلاقیں دی جا سکتی ہیں؟ اس کا دارومدار مرد کی حالت پر ہے کہ وہ آزاد ہے یا غلام کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کے سلسلے میں مردوں ہی سے خطاب فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

''اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔''[1]

اور فرمایا:

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ﴾ ''جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت ختم کرنے پر آئیں۔''[2]

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ أَخَذَ بِالسَّاقِ»

''طلاق اسی کی طرف سے ہے جس نے عورت سے نکاح کیا ہے۔''[3]

آزاد شخص تین طلاقیں دینے کا مالک ہے اگرچہ اس کے تحت لونڈی ہی ہو اور غلام دو طلاقوں کا مالک ہے اگرچہ اس کی بیوی آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ اگر زوجین دونوں آزاد ہوں تو بالاتفاق خاوند تین طلاقیں دینے کا مالک ہے۔ اور اگر دونوں غلام اور لونڈی ہوں تو شوہر بلا اختلاف دو طلاقوں کا اختیار رکھتا ہے۔

کلمۂ طلاق میں استثنا جائز ہے۔ اس کا تعلق طلاقوں کی تعداد سے ہو، مثلاً: کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: ''تمھیں تین طلاقیں ہیں مگر ایک کم'' یا مُطَلَّقَاتُ کی تعداد سے تعلق ہو، مثلاً: کوئی کہے: ''میری تمام بیویوں کو طلاق سوائے فاطمہ کے۔ استثنا کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مستثنیٰ کی مقدار مستثنیٰ منہ سے نصف یا اس سے کم ہو جیسا

◀◀ ......، حدیث: 5269. ① الطلاق 65:1. ② البقرة 2:231. ③ سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق العبد، حديث: 2081.

کہ اوپر مثال میں بیان ہو چکا ہے۔ اگر مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کے نصف سے زائد ہو تو جملہ مؤثر نہ ہوگا، مثلاً: کوئی کہے: ''تمھیں تین طلاقیں مگر دو کم۔''

استثنا کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ دل میں نہ ہو بلکہ الفاظ کی صورت میں ذکر ہو، لہٰذا اگر کسی نے کہا: ''تمھیں تین طلاقیں اور دل میں کہا مگر ایک'' تو اس کی بیوی کو تین طلاقیں ہی ہوں گی۔[1] یہاں دل کی نیت کا اعتبار کرتے ہوئے الفاظ کا حکم ساقط نہ ہوگا کیونکہ الفاظ کا اعتبار دل کی نیت سے قوی تر ہے، البتہ نیت کے ذریعے سے عورتوں کا استثنا جائز ہے۔ اگر کسی نے کہا: ''میری بیویاں طلاق والی ہیں۔'' اور دل میں ایک بیوی کو مستثنیٰ کر لیا تو درست ہے، لہٰذا جسے دل میں مستثنیٰ کیا اسے طلاق نہ ہوگی کیونکہ بیویوں کا اطلاق سب پر بھی ہوتا ہے اور بعض پر بھی، لہٰذا نیت کا اعتبار ہوگا۔

▲ طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا جائز ہے، مثلاً: کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: ''اگر تو فلاں گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق۔'' لہٰذا جب وہ مقررہ گھر میں داخل ہوگی تو وہ مطلقہ ہو جائے گی۔

▲ طلاق میں مرد کی شرط تب معتبر ہوگی جب اس کی حیثیت خاوند کی ہو۔ اگر اس نے کہا: ''اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق۔'' پھر اس نے اس سے شادی کر لی تو طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ شرط لگاتے وقت وہ شخص اس کا خاوند نہ تھا۔ حدیث میں ہے:

«لَا نَذْرَ لِابْنِ آدَمَ فِيمَا لَا يَمْلِكُ، وَلَا عِتْقَ لَهُ فِيمَا لَا يَمْلِكُ، وَلَا طَلَاقَ لَهُ فِيمَا لَا يَمْلِكُ»

''ابن آدم کے لیے اس امر میں نذر درست نہ ہوگی جس کا وہ مالک نہیں نہ اس کی آزادی ہوگی جس کا وہ مالک نہیں اور نہ اسے طلاق ہی ہوگی جس کا وہ مالک نہیں۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ﴾

''اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم انھیں طلاق دے دو۔''[3]

آیت اور حدیث وضاحت کرتی ہیں کہ اجنبی عورت کو طلاق نہیں ہوتی جب وہ غیر مشروط طور پر کہی جائے، اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اگر اجنبی عورت کے لیے مشروط طور پر طلاق کا لفظ بولا جائے تو اکثر کے نزدیک یہ طلاق بھی

① ہم پیچھے حاشیے میں ثابت کر چکے ہیں کہ ایک وقت کی تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوگی۔ (صارم)

② سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب اليمين في قطيعة الرحم، حديث: 3274، وجامع الترمذي، الطلاق واللعان، باب ما جاء لا طلاق قبل النكاح، حديث: 1181 واللفظ له. ③ الأحزاب 33:49.

نہیں ہوتی۔

◢ جب کسی نے طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مشروط قرار دیا تو وجود شرط سے قبل طلاق نہ ہوگی۔ جب طلاق میں شک ہو اور یہ شک طلاق کا لفظ بولنے کے بارے میں ہو یا تعداد طلاق میں شک ہو یا حصول شرط میں شک ہو تو اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① اگر اسے اس کے بارے میں شک ہو کہ اس نے طلاق کا لفظ بولا ہے یا نہیں تو محض شک سے طلاق نہ ہوگی کیونکہ نکاح یقینی تھا اور یہ یقین شک سے ختم نہیں ہوتا۔

② اگر طلاق میں لگائی ہوئی شرط کے حصول میں شک ہو، مثلاً: وہ کہے: ''اگر تو فلاں گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے۔'' پھر اسے شک ہوا کہ عورت اس گھر میں داخل ہوئی ہے یا نہیں تو عورت کو طلاق نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل بھی وہی ہے جو پہلے ذکر ہوئی۔

③ اگر طلاق کا یقین ہو لیکن اس کی تعداد میں شک ہو تو ایک طلاق واقع ہوگی کیونکہ ایک طلاق کا وقوع یقینی امر ہے اور زیادہ کا ہونا مشکوک ہے۔ یقین شک سے ختم نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ عامہ ہے جو تمام احکام شرعیہ میں فائدہ دیتا ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ماخوذ ہے:

«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ» ''جو چیز تمھیں شک وشبہے میں ڈالے اسے چھوڑ کر وہ اختیار کرو جو شک وشبہے میں نہ ڈالے۔''[1]

علاوہ ازیں جس نے یقینی طور پر طہارت حاصل کی، پھر اسے نقض طہارت میں شک ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا:

«لَا يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»

''وہ واپس نہ پلٹے حتی کہ وہ آواز سن لے یا بو محسوس کرے۔''[2]

اس مضمون کی اور روایات بھی ہیں۔

یہ جملہ احکام شریعت اسلامیہ کی بہتری اور اس کے کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہ نعمت عظمیٰ عطا کی۔

① صحيح البخاري، البيوع، باب تفسير المشبهات، قبل حديث:2052 معلقًا، وجامع الترمذي، صفة القيامة، باب حديث اعقلها وتوكل ......، حديث: 2518. ② صحيح البخاري، الوضوء، باب لا يتوضأ من الشك حتى يستيقن، حديث: 137.

رجوع کا بیان

جس عورت کو ایک یا دو طلاقیں ہوں، دوران عدت میں (نکاح کے بغیر) اس سے ازدواجی تعلقات بحال کرنے کو رجوع کہتے ہیں۔

رجوع کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾

''ان کے خاوند اس مدت میں انھیں لوٹا لینے کے (پورے) حقدار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔''[1]

نیز ارشاد ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾

''یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں، پھر یا تو اچھائی سے روکنا یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

''پس جب یہ عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو انھیں یا تو قاعدے کے مطابق اپنے نکاح میں رہنے دو یا دستور کے مطابق انھیں الگ کر دو۔''[3]

سنت رسول ﷺ میں اس کی دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا وہ قصہ ہے جس میں آپ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

«مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا» ''اسے کہو کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے۔''[4]

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تھی، پھر آپ نے ان سے رجوع کیا تھا۔[5]

باقی رہا اجماع تو ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ جب آزاد شخص تین سے کم اور

---

[1] البقرة2:228. [2] البقرة2:229. [3] الطلاق65:2. [4] صحيح البخاري، الطلاق، باب و قول الله تعالى:﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ﴾، حديث:5251، و صحيح مسلم، الطلاق، باب تحريم طلاق الحائض ......، حديث:1471.
[5] سنن أبي داود، الطلاق، باب في المراجعة، حديث: 2283، والسنن الكبرى للنسائي، الطلاق، باب الرجعة، حديث:5755، و سنن ابن ماجه، الطلاق، باب حدثنا سويد بن سعيد، حديث: 2016.

غلام دو سے کم طلاقیں دے تو انھیں دوران عدت میں رجوع کا حق حاصل ہے۔"

▲ خاوند کو رجوع کے لیے فرصت دینے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ طلاق دینے کے بعد شرمندہ ہے اور بیوی کو ازسرنو آباد کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے آگے بحالی تعلقات کا دروازہ کھلا پائے اور رجوع کر کے اپنا گھر پھر سے آباد کر لے۔ یہ سراسر رحمت باری تعالیٰ کا ایک حصہ ہے۔

▲ رجوع کے درست ہونے کی شرائط درج ذیل ہیں:

① طلاقوں کی تعداد اس سے کم ہو جتنی طلاقیں دینے کا اسے اختیار ہے، یعنی آزاد شخص نے تین طلاقوں سے کم طلاقیں دی ہوں۔ اور اگر وہ غلام ہے تو اس نے دو طلاقوں سے کم دی ہوں۔ اگر آزاد نے بیوی کو تین اور غلام نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دیں تو ان کا حق رجوع ختم ہو گیا، پھر اس وقت تک بیوی کو نکاح میں لانا جائز نہیں جب تک کسی دوسرے مرد سے اس کی شادی نہ ہو۔

② مطلقہ عورت مدخولہ ہو۔ اگر قبل از دخول اسے طلاق دی گئی ہو تو اس کے لیے حق رجوع نہیں ہے کیونکہ اس میں عورت پر عدت نہیں۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾

"اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان پر تمھارے لیے کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو۔"[1]

③ طلاق بلا معاوضہ ہو۔ اگر بیوی نے معاوضہ دے کر طلاق حاصل کی ہو تو خاوند کے لیے وہ حلال نہ ہوگی جب تک خاوند اس سے اس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح نہ کرے کیونکہ اس عورت نے خاوند سے آزاد ہونے کے لیے فدیہ یا معاوضہ دیا ہے، لہٰذا خاوند کو رجوع کا اختیار دینے سے عورت کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

④ نکاح صحیح طریقے سے ہوا ہو۔ اگر غیر شرعی نکاح کے بعد طلاق دی تو رجوع کا حق نہ ہوگا کیونکہ اس کے لیے یہ طلاق بائن ہوتی ہے۔

⑤ رجوع عدت کے اندر اندر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾

"ان کے خاوند اس مدت میں انھیں لوٹا لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔"[2]

① الأحزاب 49:33. ② البقرة 228:2.

⑥ رجوع کو کسی شرط کے ساتھ مشروط قرار دینا درست نہیں، مثلاً: کوئی کہے: ''جب فلاں مقصد حاصل ہو گا تو تجھ سے رجوع کرلوں گا۔''

▲ کیا رجوع کے لیے یہ شرط ہے کہ زوجین کا ارادہ اصلاح کا ہو؟

بعض علماء کے نزدیک یہ شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنْ أَرَادُوٓا۟ إِصْلَـٰحًا﴾ ''اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجوع کی اجازت اسی کو دی جائے گی جو اصلاح کا ارادہ کر کے بیوی کو اچھے طریقے سے رکھنا چاہتا ہو۔''[2]

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اصلاح احوال کا عزم شرط نہیں کیونکہ آیت اصلاح احوال کی طرف رغبت دلاتی ہے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے روکتی ہے، شرط عائد نہیں کرتی۔ ہمیں پہلی رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ واللہ أعلم۔

▲ رجوع کے لیے کوئی مخصوص کلمہ نہیں ہے بلکہ کوئی بھی ایسا کلمہ کہا جا سکتا ہے جو رجوع پر دلالت کرے، مثلاً: ''میں نے بیوی سے رجوع کرلیا۔'' یا ''میں نے اس کو واپس لے لیا۔'' یا ''میں نے اسے اپنے ہاں روک لیا۔'' وغیرہ۔ اسی طرح رجوع کی نیت سے بیوی سے مجامعت کرلی تو صحیح قول کے مطابق اسے رجوع پر محمول کیا جائے گا۔

▲ مناسب یہ ہے کہ بوقت رجوع کسی کو گواہ بنا لیا جائے بلکہ بعض علماء کے نزدیک رجوع کے موقع پر کسی کو گواہ بنانا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَشْهِدُوا۟ ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ ''اور اپنے میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ مقرر کرلو۔''[3]

امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی رائے کے حق میں ہے۔

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجوع کے معاملے کو خفیہ رکھنا کسی حالت میں بھی درست نہیں ہے۔''[4]

▲ جس عورت کو رجعی طلاق ہو جب تک وہ عدت میں ہے طلاق دینے والے کی بیوی ہے۔ خاوند کے ذمے ہے کہ وہ اسے نان ونفقہ دے، لباس و رہائش دے اور بیوی کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں رہے اور خاوند کو مائل کرنے کے لیے زینت و زیبائش کا اہتمام کرے۔ طلاق رجعی کی عدت کے دوران میں زوجین میں سے کوئی ایک فوت ہو گیا تو دوسرا اس کا وارث ہو گا۔ دوران عدت میں دونوں اکٹھے سفر کر سکتے ہیں، خلوت اختیار

① البقرة 2:228. ② الفتاوی الكبرى، الاختيارات العلمية، باب الإيلاء: 5/504. ③ الطلاق 65:2. ④ الفتاوی الكبرى، الاختيارات العلمية، الرجعة: 5/503.

کر سکتے ہیں حتی کہ خاونداس سے وطی بھی کر سکتا ہے، (البتہ وطی کرنے کی صورت میں رجوع سمجھا جائے گا۔)

▲ عدت ختم ہو جائے تو رجوع کا اختیار بھی ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے گی تو اب رجوع نہیں ہو سکے گا، البتہ اگر وہ تعلقات کی بحالی کے خواہش مند ہوں تو ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح جدید ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے:

﴿وَ بُعُوْ لَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾

''ان کے خاونداس مدت میں انھیں لوٹا لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ عدت کے دوران میں خاوند رجوع کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ عدت سے فارغ ہو جائے تو خاوند کے لیے رجوع کرنا مباح نہیں الا یہ کہ عقد جدید منعقد ہو۔ اگر شوہر دوران عدت شرعی طریقے سے رجوع کر لے تو اس کے بعد اسے باقی طلاقیں دینے کا اختیار ہے، یعنی جس طلاق کے بعد رجوع کیا ہے وہ شمار ہوگی۔

▲ اگر خاوند مکمل تین طلاقیں دے چکا ہے تو اب دونوں کے ازدواجی تعلقات قائم کرنے حرام ہیں الا یہ کہ کوئی دوسرا شخص اس سے صحیح شرعی نکاح کرے (جو صرف حلالہ کے لیے نہ ہو) اور اس سے فطری راستے میں مجامعت کرے اور طلاق دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾

''پھر اگر اس کو طلاق دے دے تو اب اس کے لیے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے علاوہ دوسرے سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ یہ جان لیں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔''[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دوسرے خاوند کے نکاح کرنے اور پھر وطی کر کے طلاق دینے کے بعد پہلے شوہر کے لیے اس کا حلال ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم احسان ہے۔ تورات کی شریعت کی روشنی میں پہلے شوہر کے پاس آنے کے لیے بیوی کا دوسرے آدمی سے شادی کرنا (پھر اس کا طلاق دینا) ہی کافی تھا وطی کی شرط نہ تھی اور انجیل کی شریعت میں طلاق سے مطلقاً روک دیا گیا ہے۔ ہماری شریعت اسلامیہ کامل شریعت ہے جس میں بندوں کی مصلحتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی، حسب

[1] البقرة 2:228. [2] البقرة 2:230.

مثلاً لونڈیاں رکھنے کی اجازت دی، طلاق کا حق مرد کے پاس رکھا۔ اگر وہ دوبارہ اس کی طرف میلان محسوس کرے تو رجوع کی گنجائش رکھی، البتہ تیسری طلاق کے بعد عورت سے دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم کرنا ممکن نہیں سوائے اس صورت کے کہ کوئی دوسرا مرد اس عورت سے اپنی رضا و رغبت کے ساتھ نکاح کرے، یعنی یہ ضروری ہے کہ دوسرا آدمی واقعی رغبت کی بنا پر نکاح کرے۔ اس غرض سے نکاح کا حیلہ اختیار نہ کرے کہ طلاق دے کر پہلے مرد سے اس کا نکاح جائز کر دے۔ حیلے کے طور پر نکاح کرنے والے کو اللہ کے نبی ﷺ نے "عاریتاً لیا ہوا سانڈ" قرار دیا ہے، لہٰذا اس کا اس نیت سے کیا ہوا نکاح کالعدم ہے اور اس کے ساتھ عورت پہلے مرد کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ واللہ أعلم.

ایلاء کے احکام

ایلاء کے لغوی معنی ہیں "قسم اٹھانا" جبکہ شرعی معنی ہیں: "کوئی شخص قسم اٹھالے کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا۔" فقہائے کرام نے ایلاء کی تعریف یوں کی ہے:

"وطی کے قابل شوہر اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفت کی قسم اٹھائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے یا چار ماہ سے زیادہ عرصے تک اپنی بیوی سے قُبُل (شرمگاہ) کے راستے مجامعت نہیں کرے گا۔"

اس تعریف سے واضح ہوا کہ صحت ایلاء کے لیے ضروری ہے کہ اس میں درج ذیل پانچ شرائط موجود ہوں:

① ایلاء کرنے والا ایسا شخص ہو جو وطی کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

② وہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی کسی صفت کی قسم ایلاء کے لیے اٹھائے طلاق، آزادی یا نذر مقصد نہ ہو۔

③ وہ قسم اٹھائے کہ بیوی سے قُبُل کے راستے جماع نہیں کرے گا۔

④ وہ ترک جماع میں چار ماہ سے زائد عرصے کی قسم اٹھائے۔

⑤ بیوی ایسی حالت میں ہو کہ اس سے وطی کرنا ممکن ہو۔

جب یہ پانچ شرائط مکمل ہوں گی تو وہ شرعاً "ایلاء" کرنے والا قرار پائے گا، یعنی اس پر ایلاء کے احکام جاری ہوں گے۔ اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کا ایلاء معتبر نہ ہوگا۔

◼ ایلاء کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں ان کے لیے چار مہینے کی مدت ہے، پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ بھی بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور اگر طلاق ہی کا قصد کر لیں تو اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔''[1]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں سے ترک مجامعت پر قسم اٹھاتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ اس مدت تک اپنی بیویوں سے مجامعت کر لیں اور اپنی قسموں کا کفارہ ادا کر دیں تو ٹھیک ہے اور اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرنے والا ہے اور اگر چار ماہ کی مدت گزر جائے اور وہ اپنی بیویوں سے ترک مجامعت پر بضد رہیں تو انھیں کسی پنچایت میں کھڑا کیا جائے اور بیویوں سے تعلقات بحال کرنے پر اور قسم کا کفارہ دینے پر آمادہ کیا جائے۔[2] اگر وہ انکار کر دیں تو عورت کے مطالبے پر انھیں طلاق دینے کا کہا جائے گا۔

اس آیت میں اس جاہلی قانون کا ابطال وارد ہے جس کے تحت شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی خاطر ایک طویل عرصہ ایلاء کے ذریعے سے ازدواجی تعلقات منقطع کر لیتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف پر مبنی شریعت اسلامیہ میں عورت کو نقصان و ظلم سے بچا لیا۔

- اسلام میں (چار ماہ سے زیادہ) ایلاء حرام ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے واجب کا ترک لازم آتا ہے۔
- ایلاء ہر اس شوہر کی طرف سے منعقد ہو جاتا ہے جس کا طلاق دینا درست ہو، وہ مسلمان ہو یا کافر، آزاد ہو یا غلام، بالغ ہو یا کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا نابالغ، البتہ اس سے بعد از بلوغت بحالیٔ تعلقات کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اسی طرح ایلاء کرنے والا حالت غصہ میں ہو یا ایسا مریض جسے شفا پانے کی امید ہے۔ حتی کہ ایلاء کا اطلاق اس عورت پر بھی ہوگا جس سے وطی نہیں کی گئی کیونکہ آیت کریمہ کے الفاظ میں عموم ہے۔

خاوند دیوانہ ہو یا بے ہوش اس حالت میں ایلاء کا حکم نافذ نہیں ہوتا کیونکہ اس کو اپنی باتوں کی سمجھ نہیں ہوتی اور اس کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

اگر شوہر جماع کرنے سے عاجز ہے، مثلاً: نامرد ہو یا اس کا عضو مخصوص کٹا ہوا ہو تو ایلاء منعقد نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں اس کا وطی نہ کرنا قسم کی وجہ سے نہیں ہے۔

- اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ ''اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تجھ سے کبھی مجامعت نہ کروں گا یا چار ماہ سے زیادہ مدت

---

[1] البقرۃ 227,226:2.

[2] اگر ایلاء میں قسم چار ماہ سے کم عرصے کی ہو جس کو اس نے پورا کر دیا تو اس پر قسم کا کفارہ نہیں۔ اگر ایلاء میں قسم چار ماہ سے زائد عرصے کی ہے تو وہ قسم کا کفارہ دے جو سورۂ مائدہ 89:5 میں مذکور ہے۔ (صارم)

تک کے لیے جماع نہ کرنے کی قسم اٹھالے یا جماع کرنے کے لیے کوئی ایسی شرط عائد کرے جس کے حصول کی توقع چار ماہ تک نہ کی جا سکتی ہو، مثلاً: نزول عیسیٰ علیہ السلام کی شرط یا دجال کے نکلنے کی شرط تو ان صورتوں میں ایلاء کا حکم جاری ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی پر ایسی شرط عائد کر دی جس کا کرنا حرام ہو یا اس کا چھوڑنا واجب ہو، مثلاً: کوئی کہے: اللہ کی قسم! میں تجھ سے اس وقت تک جماع نہیں کروں گا جب تک تو نماز چھوڑ نہیں دیتی، یا شراب نہیں پیتی تو اس صورت میں شوہر کا ایلاء ہی ثابت ہوگا کیونکہ اس نے شرعاً ممنوع کام کی شرط لگائی ہے جو حسی ممنوع کے مشابہ ہے۔

▲ ان مذکورہ احوال میں ایلاء کی مدت مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کے لیے چار مہینے کی مدت ہے۔''[1]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: چار ماہ سے زیادہ مدت کی قسم کھانے کی صورت میں جب چار ماہ گزر جائیں تو اس ایلاء کرنے والے کو کسی مجلس یا پنچایت میں کھڑا کر کے بیوی کو طلاق دینے کا کہا جائے گا۔ واضح رہے طلاق دینے ہی سے طلاق واقع ہوگی محض ایلاء سے طلاق نہیں ہوتی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں چودہ صحابۂ کرام کا یہی مسلک بیان کیا ہے۔ جناب سلیمان بن یسار رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ میں دس سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ملا جو یہی نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ ایلاء کرنے والے کو مجلس میں کھڑا کیا جائے گا۔ جمہور علماء کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ آیت کریمہ کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔

▲ جب ایلاء کے چار ماہ گزر جائیں (واضح رہے کہ اس مدت میں وہ ایام شمار نہ ہوں گے جن میں عورت کو عذر لاحق ہو) تو:

① اگر اس نے اپنی بیوی سے وطی کر لی تو سمجھ لیا جائے گا کہ اس نے قسم سے رجوع کر لیا ہے کیونکہ جماع کرنا ''رجوع'' کا نام ہے۔ ابن منذر رحمہ اللہ نے اس پر علماء کا اجماع بیان کیا ہے۔ اور آیت کے الفاظ: ﴿ فَإِن فَآءُو ﴾ میں فاء کے معنی ایسے کام کی طرف رجوع کرنے کے ہیں جسے ترک کر دیا گیا تھا۔ اور اس طرح عورت خاوند سے اپنا حق وصول کر لیتی ہے۔

② اگر اس نے (مدت مذکورہ کے بعد) بھی جماع کرنے سے انکار کر دیا تو حاکم یا قاضی اسے طلاق دینے کا حکم دے گا بشرطیکہ عورت مطالبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] البقرة 226:2.

﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○﴾

''اگر وہ طلاق ہی کا قصد کر لیں تو اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔''[1]

یعنی اگر خاوند رجوع نہ کرے بلکہ طلاق دینے کا عزم کر چکا ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر وہ رجوع نہ کرے اور طلاق بھی نہ دے تو اس کی طرف سے قاضی طلاق دے گا یا نکاح فسخ کر دے گا کیونکہ طلاق نہ دینے کی شکل میں وہ ایلاء کرنے والے کے قائم مقام ہے۔ اور طلاق میں نیابت جائز ہے، (لہٰذا قاضی ایلاء کرنے والے کی طرف سے طلاق دے سکتا ہے۔)

▲ فقہائے کرام نے ایلاء کرنے والے کے ساتھ اس شخص کو بھی شامل کیا ہے جو کسی شرعی عذر کے بغیر اپنی بیوی کو محض تکلیف دینے کی خاطر جماع سے اجتناب کرتا ہے لیکن قسم کا لفظ نہیں بولتا۔

اسی طرح جو شخص اپنی بیوی سے ''ظہار'' کرتا ہے، یعنی اسے اپنی ماں کہہ دیتا ہے اور پھر کفارہ ادا کر کے ازدواجی تعلقات بحال نہیں کرتا حتی کہ چار ماہ سے زائد کا عرصہ بیت گیا تو وہ بھی ایلاء کرنے والے کے حکم میں ہے۔ واللہ أعلم.

▲ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر ایلاء کی مدت (چار ماہ) گزر گئی اور زوجین میں سے کوئی ایک جماع کے عمل سے معذور ہے تو خاوند کو حکم دیا جائے گا کہ وہ فی الحال زبان سے رجوع کے کلمات کہے، مثلاً: ''جب مجھے قدرت و طاقت ہو گی تو اس سے جماع کروں گا۔'' کیونکہ رجوع کا عزم اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس نے بیوی کو تنگ کرنے کا ارادہ ختم کر دیا ہے۔ اس کے معذرت کر لینے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، پھر جب اس کا عذر ختم ہو جائے اور جماع پر قدرت ہو تو جماع کر لے یا پھر طلاق دے دے کیونکہ جس سبب سے اس نے بحالی تعلقات میں تاخیر کی تھی اب وہ موجود نہیں رہا۔

ظہار کے احکام

ظہار کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات منقطع کرنا چاہتا ہے تو اسے کہتا ہے: ''تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔'' یا ''میری بہن کی پشت کی طرح ہے۔'' یا کسی ایسی عورت کا نام لیتا ہے جس کے ساتھ نسب کے اعتبار سے یا رضاعت یا سسرالی رشتوں کے اعتبار سے نکاح کرنا حرام ہے۔[2]

[1] البقرة 2:227.

[2] حق یہ ہے کہ ظہار صرف (أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي) ''تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔'' سے ثابت ہوتا ہے۔

ظہار کرنا حرام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا﴾

''تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں دراصل وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے، یقیناً یہ لوگ ایک نامعقول اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔''[1]

اس آیت سے واضح ہوا کہ ظہار کرنے والا شخص فحش کلام کرتا ہے جو شرعاً مناسب نہیں بلکہ اس کی بات محض جھوٹ، حرام اور انتہائی بری ہے کیونکہ ظہار کرنے والا اپنی ذات پر ایک ایسی شے حرام کر رہا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار نہیں دیا اور اپنی بیوی کو ماں کی مثل قرار دے رہا ہے، حالانکہ وہ ایسی نہیں۔

دور جاہلیت میں ظہار طلاق شمار ہوتی تھی۔ جب اسلام کا دور آیا تو اس نے ظہار کو غلط اور بری بات قرار دیا اور قسم کی طرح اس کا کفارہ مقرر کیا (بلکہ اس سے بھی سخت اور زیادہ کفارہ۔) خاوند بیوی دونوں کو حکم دیا کہ ان کے لیے اس وقت تک جماع اور علاقات جماع حرام ہیں جب تک شوہر ظہار کا کفارہ ادا نہیں کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

''اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں تو ان کے ذمے آپس میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ اس کے ذریعے سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ تمھارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ ہاں جو شخص (غلام) نہ پائے اس کے ذمے دو مہینوں کے لگاتار روزے ہیں اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جس شخص میں یہ طاقت بھی نہ ہو اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ کی اور اس کے رسول کی حکم برداری کرو، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور کفار ہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔''[2]

نیز ظہار کرنے والے سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَلَا تَقْرَبْهَا حَتّٰى تَفْعَلَ مَا أَمَرَكَ اللّٰهُ»

---

[1] المجادلة 2:58. [2] المجادلة 4,3:58.

''تو اپنی بیوی کے قریب نہ جا حتی کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ کفارہ ادا کر لے۔''[1]

اکثر اہل علم کا قول ہے کہ ظہار کرنے والے پر بیوی سے وطی کرنے سے قبل کفارہ ادا کرنا واجب ہے، یعنی کفارہ ادا کرنے تک اس کی بیوی اس پر حرام رہے گی۔

ظہار کا کفارہ اس ترتیب سے واجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے، یعنی ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا یا اس کی قیمت دینا، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا، اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُظٰهِرُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ○ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ أَن يَتَمَآسَّا ۖ فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں تو ان کے ذمے آپس میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہے، اس کے ذریعے سے تم نصیحت کیے جاتے ہو۔ اور اللہ تمھارے تمام اعمال سے باخبر ہے، ہاں! جو شخص (غلام) نہ پائے اس کے ذمے دو مہینوں کے لگا تار روزے ہیں اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جس شخص میں یہ طاقت بھی نہ ہو تو اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''[2]

﴿يُظٰهِرُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ﴾ کے معنی ہیں: ''کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح حرام ہے یا اس جیسا کوئی کلمہ کہہ دے۔'' اور ﴿ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا﴾ کے معنی ہیں: ''جن عورتوں سے ظہار کر چکے ہیں، پھر انھی سے جماع کا ارادہ کریں۔'' اور ﴿فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَآسَّا﴾ کے معنی ہیں: ''پھر ان پر واجب ہے کہ جماع سے قبل ایک گردن (غلام) آزاد کریں، اگر ان کے پاس اپنے غلام ہیں یا خریدنے کی سکت ہے کہ کچھ مال زائد بچ بھی جائے اور غلام بھی خریدا جا سکے تو آزاد کریں۔''

▲ لونڈی یا غلام آزاد کرنا ہو تو اس کا صاحب ایمان ہونا شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفارۂ قتل میں لونڈی یا غلام کے لیے مومن کی شرط رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾

''جو شخص کسی مومن کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا ہے۔''[3]

---

[1] سنن أبي داود، الطلاق، باب في الظهار، حديث: 2221، و جامع الترمذي، الطلاق، باب ما جاء في المظاهر يواقع قبل أن يكفر، حديث: 1199 واللفظ له. [2] المجادلة 58: 3، 4. [3] النسآء 4: 92.

لہٰذا ظہار کا کفارہ بھی اس پر قیاس کیا جائے گا۔ مطلق مقید پر محمول ہو گا، نیز غلام یا لونڈی کا تندرست اور صحت مند ہونا بھی شرط ہے، یعنی اس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو جو اس کے کام کاج اور عمل کے لیے واضح طور پر رکاوٹ کا سبب ہو کیونکہ آزاد کرنے کا مقصد غلام یا لونڈی کو اپنے مفادات کا مالک بنانا ہے اور اپنی ذات میں اسے مکمل اختیار دینا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب وہ تندرست ہو اور جسمانی نقص وعیب سے سلامت ہو، مثلاً: اندھا ہونے یا ہاتھ پاؤں کے لحاظ سے معذور ہونے سے سلامت ہو۔

◣ کفارۂ ظہار میں روزے رکھنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ:

① غلام یا لونڈی آزاد کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

② وہ مسلسل روزے رکھے، ناغہ نہ کرے الا یہ کہ کوئی فرض روزہ آ جائے، مثلاً: رمضان کے روزے شروع ہو جائیں یا ایسا دن آ جائے جس میں روزہ چھوڑنا واجب ہو، مثلاً: عید کا دن یا ایام تشریق کا آ جانا یا کسی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑنا مباح ہو، مثلاً: سفر یا مرض۔ ان ایام واحوال میں روزہ نہ رکھنے سے تسلسل میں خلل واقع نہ ہو گا۔

③ کفارے کے روزے کی رات کو نیت کرے۔

◣ اگر کھانا کھلانے کی صورت میں کفارہ دینا ہو تو اس کی درستی کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

① روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو۔

② جسے کھانا کھلایا جائے وہ مسکین، مسلمان اور آزاد ہو جس کو زکاۃ دینا درست ہو۔

③ ہر مسکین کو جو کھانا دیا جائے گا اس کی مقدار ایک ''مد'' (نصف کلو) گندم یا کسی دوسری شے سے نصف ''صاع'' (ایک کلو) سے کم نہ ہو۔

◣ کفارے کی درستی کے لیے نیت کا ہونا شرط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى»

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی۔''[1]

کفارۂ ظہار میں ترتیب کی دلیل آیت مذکورہ کے علاوہ سنت مطہرہ میں سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا کا قصہ ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

«ظَاهَرَ مِنِّي زَوْجِي أَوْسُ بْنُ الصَّامِتِ، فَجِئْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَشْكُو إِلَيْهِ وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُجَادِلُنِي فِيهِ وَيَقُولُ: اِتَّقِي اللهَ فَإِنَّهُ ابْنُ عَمِّكِ، فَمَا بَرِحْتُ

[1] صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ ......، حديث:1.

حَتّٰی نَزَلَ الْقُرْآنُ: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ إِلَى الْفَرْضِ، فَقَالَ: يَعْتِقُ رَقَبَةً، قَالَتْ: لَا يَجِدُ، قَالَ: فَيَصُومُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، قَالَتْ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّهُ شَيْخٌ كَبِيرٌ مَّا بِهِ مِنْ صِيَامٍ، قَالَ: فَلْيُطْعِمْ سِتِّينَ مِسْكِينًا، قَالَتْ: مَا عِنْدَهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَصَدَّقُ بِهِ، قَالَتْ: فَأُتِيَ سَاعَتَئِذٍ بِعَرَقٍ مِّنْ تَمْرٍ، قُلْتُ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! فَإِنِّي أُعِينُهُ بِعَرَقٍ آخَرَ، قَالَ: قَدْ أَحْسَنْتِ، اِذْهَبِي فَأَطْعِمِي بِهَا عَنْهُ سِتِّينَ مِسْكِينًا، وَارْجِعِي إِلَى ابْنِ عَمِّكِ»

''میرے خاوند اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ظہار کیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور خاوند کی شکایت کی۔ میں آپ سے بحث وتکرار کرنے لگی تو آپ نے فرمایا: ''خولہ! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، وہ تو تیرے چچے کا بیٹا ہے۔'' میں ابھی وہیں تھی کہ قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں: ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سنی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں تکرار کر رہی تھی.....آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا خاوند ایک غلام آزاد کرے۔'' حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔'' وہ کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول! وہ تو بہت بوڑھا ہے۔ اس میں روزے رکھنے کی قوت کہاں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔'' وہ کہنے لگیں: اس کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ فرماتی ہیں: اسی دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا لایا گیا تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک ٹوکرا میں بھی اسے دے دوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہت بہتر ہے۔ جاؤ! اس کی جانب سے یہ ساٹھ مساکین کو کھلا دو اور اپنے چچے کے بیٹے (خاوند) سے کہو کہ وہ تجھ سے تعلقات بحال کرے۔''[1]

الحمدللہ! ہمارا دین ایک عظیم دین ہے جس میں ہر مشکل کا حل ہے۔ اسی طرح اس میں ازدواجی تعلقات کا حل بھی ہے جیسا کہ یہاں ظہار کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

ظہار زمانہ جاہلیت میں بھی بہت بڑی مشکل اور مصیبت تھی جس کا نتیجہ زوجین کی جدائی اور خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں نکلتا تھا تو یہ دین کس قدر عظیم ہے!

علاوہ ازیں کفارے میں خاوند کی استعداد وگنجائش بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ وہ غلام آزاد کرنے، روزے رکھنے یا کھانا کھلانے میں سے جس کی طاقت رکھے اسے سرانجام دے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ.

[1] سنن أبي داود، الطلاق، باب في الظهار، حديث: 2214.

لعان کے احکام

اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص کسی پاکدامن عورت یا مرد پر زنا کا الزام لگائے، نیز ایسا کرنے والے کو سخت سزا کا مستحق قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ○ ﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاکدامن بھولی بھالی ایمان والی عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا وآخرت میں ملعون ہیں اور ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے، اس دن اللہ انھیں پورا پورا بدلہ حق وانصاف کے ساتھ دے گا اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے (اور وہی حق کو) واضح کرنے والا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ زنا کی تہمت لگانے والا شخص اگر اپنے بیان کے حق میں چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے اسی (80) کوڑے لگائے جائیں۔ علاوہ ازیں وہ شخص فاسق شمار ہوگا اور آئندہ اس کی گواہی بھی قبول نہ ہوگی الا یہ کہ وہ توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ ﴾

''جو لوگ پاکدامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسی (80) کوڑے لگاؤ اور تم کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، یہ فاسق لوگ ہیں۔ ہاں! جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو بے شک اللہ بخشنے والا، مہربانی کرنے والا ہے۔''[2]

یہ جملہ احکام اس صورت میں ہیں جب کوئی اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت پر تہمت لگائے، اس صورت میں اس کے خلاف یہ سخت کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔ اگر وہ اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے گا تو اس کا حل اور علاج

[1] النور24:23-25. [2] النور24:4، 5.

اور ہے جس کا نام ''لعان'' ہے، یعنی دونوں طرف سے پختہ قسمیں اٹھائی جائیں گی اور اس میں لعنت وغضب کے الفاظ کا استعمال بھی ہوگا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

▲ جب کوئی آدمی اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور اس پر کوئی دلیل وشہادت پیش نہ کر سکے تو اگر دونوں لعان کے لیے تیار ہو جائیں تو کسی پر بھی حد جاری نہ ہوگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور ان کا کوئی گواہ سوائے ان کی ذات کے نہ ہو تو ان میں سے ایک کی شہادت اس طرح ہوگی کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ سچوں میں سے ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔ اور اس عورت سے سزا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یقیناً اس کا خاوند جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے اور پانچویں دفعہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہو اگر اس کا خاوند سچوں میں سے ہو۔''[1]

خاوند چار مرتبہ کہے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میری اس بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ واضح رہے کہ اگر بیوی سامنے ہو تو اس کی طرف اشارہ بھی کرے اور اگر وہ غیر حاضر ہو تو اس کا نام لے تاکہ امتیاز ہو جائے۔ مرد شہادت دیتے ہوئے پانچویں مرتبہ کہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر وہ اس دعوے میں جھوٹا ہو، پھر اسی طرح اس کی بیوی چار مرتبہ قسم اٹھا کر کہے: میرے خاوند نے مجھ پر جو تہمت لگائی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے، پھر پانچویں مرتبہ کہے: اگر یہ سچ کہہ رہا ہو تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو۔

واضح رہے لعان میں عورت کے لیے ''غضب'' کا لفظ مقرر کیا گیا ہے کیونکہ مغضوب علیہ وہ شخص ہوتا ہے جو حق وسچ جانتا ہو لیکن اسے قبول نہ کرے۔

▲ صحت لعان کے لیے یہ شرط ہے کہ زوجین مکلف ہوں، یعنی عاقل و بالغ ہوں، نیز تہمت بھی زنا کی لگائی گئی ہو اور عورت خاوند کی مسلسل تکذیب کر رہی ہو حتی کہ لعان کا عمل مکمل ہو جائے اور حاکم لعان کی تکمیل کا فیصلہ دے دے۔

[1] النور24:6-9.

▲ جب درج بالا صورت اور شرائط کے ساتھ لعان کا عمل مکمل ہو جائے تو اس پر یہ احکام مرتب ہوں گے:

① خاوند پر الزام تراشی کی حد نہیں لگے گی۔

② خاوند اور بیوی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے، یعنی ان کے لیے باہم ازدواجی تعلقات قائم رکھنے حرام ہو جائیں گے۔

③ اگر مرد نے لعان کے دوران میں عورت کے بچے کو اپنا ماننے سے انکار کر دیا تو وہ بچہ اس مرد کی طرف منسوب نہ ہوگا۔

▲ خاوند لعان کا عمل تب اختیار کرے گا جب وہ اپنی بیوی کو زنا کا مرتکب پائے لیکن اس کے پاس دلیل وشہادت نہ ہو جو عدالت میں پیش کر سکے یا اس کے پاس قوی قرائن وشواہد موجود ہوں جو عورت کے زانیہ ہونے کو ظاہر کرتے ہوں، مثلاً: اس نے کسی بدکار مرد کو اپنی بیوی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہو۔

▲ لعان کا عمل اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ زانیہ بیوی کو اپنے ہاں رکھنا خاوند کے لیے باعث عار ہے اور غیر کے بچے کا نسب اس کے ساتھ ملنے کا خطرہ ہے، نیز اسے بیوی کے برا ہونے پر یقین ہے اگرچہ اس پر دلیل یا شہادت پیش نہیں کر سکتا اور وہ خود اپنے جرم کا اعتراف نہیں کر رہی بلکہ اپنے خاوند کو جھوٹا ثابت کر رہی ہے، لہٰذا اب سخت قسموں کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تو شریعت نے اس موقع پر ''لعان'' کی صورت پیش کی ہے جو اس مشکل کا حل ہے اور خاوند کی الجھن کی سلجھن ہے۔

جب شوہر کے پاس سوائے اپنی ذات کے کوئی گواہ نہ ہو تو عورت کو یہ موقع دیا جائے گا کہ اپنے شوہر کی قسموں کے جواب میں قسمیں کھا کر اس الزام کے سچ ہونے سے انکار کرے، جس کے نتیجے میں اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اگر خاوند قسمیں کھانے سے انکار کرے تو اسے قذف (الزام تراشی) کی سزا (80 کوڑے) دی جائے گی۔ اگر مرد کے قسم کھانے کے بعد عورت نے قسمیں کھانے سے انکار کر دیا تو مرد کی قسمیں اور عورت کا انکار اس بات کی قوی دلیل ہے کہ اس سے جرم سرزد ہوا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دلائل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے اور امام احمد، شافعی اور مالک رحمہم اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ اگر عورت قسمیں کھانے سے انکار کر دے تو اس پر زنا کی حد جاری کی جائے گی۔ یہی قول صحیح ہے جس کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔''

▲ لعان کی مشروعیت کی دلیل سنت رسول میں سے وہ واقعہ ہے جو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے دو لعان کرنے والوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ ''کیا لعان کے بعد خاوند اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کر دی

جائے؟ تو انھوں نے فرمایا: سبحان اللہ! کیوں نہیں، پھر انھوں نے کہا کہ فلاں بن فلاں (صحابی) نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی مرد کے ساتھ زنا کی حالت میں دیکھے تو کیا کرے؟ اگر وہ اس کے بارے میں (گواہوں کے بغیر) زبان سے کچھ کہتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر چپ رہتا ہے تو اتنی بڑی بات پر خاموشی برداشت نہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے اور اسے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک وقت کے بعد وہی شخص پھر آ گیا اور کہا: میں نے آپ سے جو سوال کیا تھا اب خود مجھے اس سے واسطہ پڑ گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ...... اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝﴾ ''جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں ...... اگر اس کا خاوند سچوں میں سے ہو۔'' نازل فرما دیں جو آپ ﷺ نے اسے پڑھ کر سنائیں اور اسے وعظ و نصیحت کی اور کہا کہ دنیا کی سزا آخرت کی سزا کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ اس شخص نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں اپنی بیوی کے بارے میں جھوٹ نہیں بول رہا، پھر آپ ﷺ نے اس کی بیوی کو بلوایا، اسے وعظ و نصیحت کی اور کہا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے۔ اس عورت نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے! یہ شخص میرے بارے میں جھوٹ سے کام لے رہا ہے، چنانچہ پہلے مرد نے چار قسمیں اٹھائیں کہ وہ سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہا اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، پھر آپ ﷺ عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی چار قسمیں اٹھائیں اور کہا کہ میرا خاوند جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کا (مجھ پر) غضب نازل ہو اگر میرا خاوند سچا ہو۔ اس عمل کے بعد آپ ﷺ نے خاوند اور بیوی کے درمیان تفریق ڈال دی۔''[1]

نسب کے اثبات کا بیان

جب کسی شخص کی بیوی یا لونڈی نے بچہ جنا اور یہ ممکن ہو کہ بچہ اسی کا ہے تو بچے کا نسب اس شخص کے ساتھ جوڑا جائے گا جس کی وہ بیوی یا لونڈی ہے۔ یہ ایسے ہی ہو گا جیسے اس نے بچے کو اس کے بستر پر جنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: [اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ] ''بچہ اسی کا ہے جس کا بستر ہے۔'' یعنی جس کی بیوی یا لونڈی سے پیدا ہوا ہے۔[2]

[1] صحيح مسلم، اللعان، حديث: 1493. [2] صحيح البخاري، الحدود، باب للعاهر الحجر، حديث: 6818، وجامع الترمذي، الرضاع، باب ما جاء أن الولد للفراش، حديث: 1157.

مندرجہ ذیل صورتوں میں بچے کو اسی شخص کی جائز اولاد تسلیم کیا جائے گا جس کی بیوی یا لونڈی سے وہ پیدا ہوا ہے:

① عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہو اور وہ اس وقت سے لے کر جس میں جماع کرنے کا امکان تھا کم از کم چھ ماہ کی مدت میں بچہ جنے۔ اس عرصے میں مرد بیوی کے پاس موجود ہو یا غائب ہو۔ اس صورت میں بچے کا اس شخص سے ہونا ممکن الثبوت ہے اور اس کے منافی کوئی قوی قرینہ موجود نہیں۔

② عورت اپنے خاوند کے نکاح میں نہ رہی ہو، یعنی خاوند نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہو اور عورت وقت علیحدگی سے لے کر چار سال سے کم مدت میں بچے کو جنم دے تو بچے کو سابقہ خاوند کی جائز اولاد تسلیم کیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہی ہوتی ہے، لہٰذا اگر عورت نے چار سال سے کم مدت میں بچہ جنا تو قوی امکان ہے کہ بچہ اسی کا ہے جس نے اسے طلاق دے کر الگ کیا تھا، لہٰذا اس بچے کا نسب اس سے ملایا جائے گا۔

ان دو حالتوں میں بچے کو موجودہ یا طلاق دینے والے شوہر کے ساتھ ملانے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ دونوں بچہ پیدا کرنے کی پوزیشن میں ہوں، یعنی ان کی عمر دس سال یا اس سے زائد ہو کیونکہ ارشاد نبوی ہے:

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»

''اپنے بچوں کو نماز کا حکم کرو جب ان کی عمریں سات سال ہوں اور جب ان کی عمر دس سال ہو جائے اور نماز نہ پڑھیں تو ان کو مارو اور ان کے بستر جدا جدا کر دو۔''[1]

نبی ﷺ نے اس عمر کے بچوں کو الگ الگ سلانے کا حکم دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمر میں وطی ممکن ہے جس کے نتیجے میں اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ ثابت ہوا کہ دس سال کے لڑکے کو باپ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس عمر میں اگرچہ اس پر بلوغت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ بالغ ہونا تو بلوغت کی علامات سے ثابت ہوتا ہے اور یہاں نسب کے الحاق کے لیے وطی کے امکان کو کافی سمجھا گیا ہے کیونکہ اس سے نسب کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔[2]

③ جب کسی نے اپنی بیوی کو رجعی طلاق دی، پھر وقت طلاق سے لے کر چار سال گزرنے پر اور عدت ختم ہونے سے پہلے اس نے بچے کو جنم دیا تو نومولود کا نسب طلاق دینے والے آدمی سے ملایا جائے گا۔ اسی طرح اگر چار سال

① سنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، حديث:495.

② مؤلف ﷾ کے استدلال کو جمہور علماء نے تسلیم نہیں کیا، لہٰذا یہ محل نظر ہے۔ (صارم)

مکمل ہونے سے پہلے بھی بچہ جنے گی تو اس بچے کے ساتھ نسب ثابت ہوگا کیونکہ رجعیہ عورت بیوی کے حکم میں ہوتی ہے، لہٰذا طلاق کے بعد بھی وہ طلاق سے پہلے والے حکم میں ہے۔

◣ جن امور کی بنیاد پر لونڈی کے پیٹ سے جنم لینے والے بچے کا نسب اس کے آقا سے ملایا جاتا ہے درج ذیل ہیں۔

اولاً یہ کہ آدمی اعتراف کرے کہ اس نے اپنی لونڈی سے وطی کی تھی یا اس کے وطی کرنے پر واضح دلیل گواہ وغیرہ مل جائے۔ ثانیاً یہ کہ جس وطی کا اعتراف ہوا یا اس پر دلیل ملی، عورت اس کے چھ ماہ بعد یا اس سے زیادہ مدت میں بچے کو جنے تو اس مولود کا نسب اس شخص سے ملایا جائے گا کیونکہ اس کا صاحب فراش ہونا ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا وہ حدیث: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ ''بچہ اس بستر والے کے لیے ہے جس کے گھر وہ پیدا ہوا۔''[1] کے عمومی حکم میں شامل ہے۔

اسی طرح اگر مالک نے اپنی لونڈی سے وطی کرنے کا اعتراف کیا، پھر اسے بیچ دیا یا آزاد کر دیا اور اس عورت نے وقت بیع یا وقت آزادی سے چھ ماہ گزرنے سے پہلے بچے کو جنم دیا جو زندہ رہا تو اس مولود کا نسب آقا (اعتراف کرنے والے) کے ساتھ ملایا جائے گا کیونکہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہوتی ہے۔ جب اس نے چھ ماہ گزرنے سے پہلے ہی بچے کو جنم دیا تو سمجھا جائے گا کہ عورت فروخت ہونے یا آزاد ہونے سے قبل ہی حاملہ تھی، لہٰذا مالک صاحب فراش قرار پائے گا اور اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ کے تحت بچے کا والد وہی ہوگا۔

◣ دو حالتوں میں بچے کا نسب خاوند کے ساتھ نہ ملے گا:

① جب بیوی نے اپنے خاوند کے نکاح میں آنے کے بعد چھ ماہ سے پہلے ہی بچہ جنا جو زندہ رہا کیونکہ اس قلیل مدت میں قطعاً امکان نہیں کہ وہ نکاح کے بعد حاملہ ہو اور اس میں بچے کو جنم دے (اور وہ زندہ بھی رہے)، لہٰذا یہی سمجھا جائے گا کہ عورت نکاح سے پہلے ہی حاملہ تھی۔

② جب آدمی نے بیوی کو طلاق بائن دی، پھر عورت نے وقت طلاق سے لے کر چار سال کی مدت کے بعد بچہ جنا تو بچے کا نسب طلاق دینے والے کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا کیونکہ عورت نے بچے کو زیادہ سے زیادہ مدت حمل کے بعد جنا ہے، لہٰذا سمجھا جائے گا کہ بچہ طلاق دینے والے سے پیدا نہیں ہوا۔

◣ جب مالک نے لونڈی سے وطی کے بعد استبرائے رحم کا دعویٰ کیا، پھر لونڈی نے ایک مدت کے بعد بچے کو جنم دیا تو اس مولود کا نسب مالک کے ساتھ نہ ملایا جائے گا کیونکہ اسے استبرائے رحم کا یقین تھا لہٰذا یہ بچہ کسی اور شخص کا سمجھا جائے گا۔ واضح رہے استبرائے رحم ایک مخفی امر ہے جس پر فیصلہ دینا انتہائی مشکل امر ہے، لہٰذا اس کے دعوے کو قسم

① صحيح البخاري، الحدود، باب للعاهر الحجر، حديث: 6818.

کے ساتھ قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ نسب کا معاملہ ہے جو نہایت اہم ہے۔

جب کسی مولود کے ملانے میں اشکال ہو تو صاحب فراش کو مقدم کیا جائے گا، مثلاً: لونڈی کے بچے کے بارے میں مالک کہتا ہے: یہ بچہ میرا ہے۔ ایک اور آدمی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اس سے شبہے کی بنا پر وطی کی تھی، لہٰذا اس سے پیدا ہونے والا بچہ میرا ہے۔ تو اس صورت میں بچہ مالک کا ہوگا کیونکہ حدیث میں ہے: [اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ] ''بچہ اسی کا ہے جس کا بستر (لونڈی) ہے۔''[1]

بچہ نسب میں باپ کے تابع ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ ﴾ ''لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ۔''[2]

دینی اعتبار سے بچہ ماں باپ میں سے جو دین کے اعتبار سے بہتر ہے اس کے تابع ہوگا، مثلاً: اگر کسی نصرانی نے بت پرست عورت سے شادی کی یا اس کے برعکس ہوا تو بچہ نصرانی مذہب رکھنے والے کے تابع ہوگا۔

آزادی اور غلامی میں بچہ ماں کے تابع ہوگا الا یہ کہ آزاد کرنے والا شرط لگا دے اسی طرح کسی دھوکے کی صورت میں بھی وہ ماں کے تابع نہیں ہوگا۔

حسب ونسب کے ان احکام کو دین اسلام اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ انساب کی حفاظت رہے کیونکہ اس میں بہت سی مصلحتیں کارفرما ہیں، مثلاً: صلہ رحمی، وراثت اور سرپرستی وغیرہ کے احکام۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ ﴾

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھارے کنبے اور قبیلے بنا دیے ہیں تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے، یقین مانو کہ اللہ دانا اور خوب باخبر ہے۔''[3]

الغرض حسب ونسب کی معرفت کا مقصد تفاخر اور جاہلیت کی حمیت نہیں بلکہ اس کا مقصد باہمی تعاون، صلہ رحمی اور ایک دوسرے پر رحمت وشفقت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جو اسے محبوب اور پسندیدہ ہوں۔ (آمین)

[1] صحيح البخاري، الحدود، باب للعاهر الحجر، حديث: 6818. [2] الأحزاب 33:5. [3] الحجرات 49:13.

عدت کے احکام

طلاق کے بعد عدت گزاری جاتی ہے۔اس سے مراد عورت کا شریعت کی طرف سے عائد کردہ بعض پابندیاں ملحوظ رکھتے ہوئے ایک محدود مدت تک انتظار کرنا ہے۔عدت کی دلیل کتاب اللہ،سنت رسول ﷺ اور اجماع امت ہے۔قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾

"طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔"[1]

نیز ارشاد ہے:

﴿وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

"تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہوگئی ہوں،اگر تمھیں شبہ ہوتو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنھیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے۔"[2]

ان آیات میں اس عدت کا ذکر ہے جو زندگی میں مفارقت کی صورت میں ہوتی ہے۔اور اگر عدت کا تعلق شوہر کی وفات سے ہو تو اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾

"تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں،وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔"[3]

احادیث رسول اللہ ﷺ میں عدت کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے،وہ فرماتی ہیں:

«أُمِرَتْ بَرِيرَةُ أَنْ تَعْتَدَّ بِثَلَاثِ حِيَضٍ» "بریرہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا گیا کہ وہ تین حیض عدت گزارے۔"[4]

▲ عدت کی مشروعیت میں حکمت یہ ہے کہ عورت کے رحم میں حمل کی صورت حال واضح ہو جائے تاکہ نسب کا اختلاط نہ ہو۔اسی طرح رجعی طلاق کی صورت میں طلاق دینے والے شوہر کو مہلت دینا ہے کہ اگر وہ طلاق دے کر

[1] البقرة2:228. [2] الطلاق65:4. [3] البقرة2:234. [4] سنن ابن ماجه، الطلاق، باب خيار الأمة إذا أعتقت، حديث:2077.

نادم ہے تو رجوع کرلے، نیز عدت میں عقد نکاح کی حرمت واحترام بھی پنہاں ہے اور طلاق دینے والے شوہر کے حق کی تعظیم بھی ہے۔ اگر عدت گزارنے والی حاملہ ہے تو اس کے حمل کے حق میں حفاظت بھی ہے۔ الغرض عدت نکاح کی حرمت وعزت کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

▪ عدت ہر اس عورت پر لازم ہے جو اپنے شوہر سے الگ ہو۔ مفارقت کی وجہ طلاق ہو یا خلع، فسخ نکاح ہو یا شوہر کی وفات لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے شوہر نے اس سے خلوت ومجامعت کی ہو، خواہ بیوی آزاد ہو یا لونڈی۔ اسی طرح وہ بالغ ہو یا ایسی نابالغ کہ اس جیسی سے مجامعت ہو سکتی ہو۔

▪ اگر کسی نے اپنی زندگی میں بیوی کو مجامعت کیے بغیر طلاق دے کر الگ کر دیا تو اس عورت پر عدت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ﴾

''اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم انھیں ہاتھ لگانے سے قبل (ہی) طلاق دے دو تو ان پر تمھارے لیے کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو۔''[1]

▪ آیت میں کلمہ: ﴿ تَمَسُّوهُنَّ ﴾ سے مراد ''جماع'' ہے، لہٰذا آیت مذکورہ سے واضح ہوا کہ جس عورت کو مجامعت سے قبل طلاق دی گئی ہو اس پر عدت نہیں۔ اہل علم کا اس مسئلے پر اجماع ہے۔ واضح رہے آیت میں کلمہ: ﴿ الْمُؤْمِنَاتِ ﴾ کا استعمال تغلیباً ہوا ہے کیونکہ اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ حکم جس طرح مومنہ عورت کے لیے ہے اسی طرح اہل کتاب سے تعلق رکھنے والی عورت کے لیے بھی ہے۔

▪ جس عورت کا شوہر فوت ہو گیا ہو، اس کی وفات بیوی سے مجامعت سے قبل ہو یا اس کے بعد دونوں صورتوں میں عورت پر عدت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ﴾

''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔''[2] میں عموم ہے اور آیت کے حکم میں تخصیص کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔

▪ عدت گزارنے والی خواتین کی چھ قسمیں ہیں: ① حاملہ عورت ② وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ نہ ہو۔ ③ غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو۔ ④ مطلقہ جسے حیض نہ آتا ہو۔ ⑤ بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے جس کے

① الأحزاب 33:49. ② البقرة 2:234.

ایام حیض ختم ہو چکے ہوں یا ایسی کم سن ہو کہ حیض شروع نہ ہوا ہو اور جس کا حیض بند ہو جائے اور معلوم نہ ہو کہ کیوں بند ہوا۔ ⑥ وہ عورت جس کا خاوند گم ہو جائے۔

حاملہ وضع حمل تک عدت گزارے گی۔ اس کی علیحدگی کا سبب خاوند کی طلاق ہو یا اس کی وفات۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے وضع حمل تک ہے۔''[1]

آیت کریمہ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، چاہے اس کا خاوند فوت ہوا ہو یا اس نے زندگی ہی میں اسے طلاق کے ذریعے سے الگ کر دیا ہو۔ بعض سلف صالحین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو، وہ دو عدتوں، یعنی وضع حمل یا چار ماہ دس دن میں سے جو مدت لمبی ہو اس کے مطابق عدت گزارے گی، البتہ بعد میں علماء کا اتفاق ہو گیا کہ وضع حمل کے بعد عدت لازماً ختم ہو جاتی ہے۔

واضح رہے ہر وضع حمل سے عدت ختم متصور نہیں ہو گی بلکہ یہاں وضع حمل سے مراد یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اس حال میں ہوئی ہو کہ اس میں انسانی صورت واضح ہو۔ اگر عورت کے رحم سے ایسی چیز نکلی جو بچے کے بجائے گوشت کا لوتھڑا محسوس ہوتی ہو، جس میں انسان کی خلقت واضح نہ تھی تو حاملہ کی عدت ختم نہ ہو گی۔

اسی طرح عدت اس حمل کے وضع سے ختم ہو گی جو الگ کرنے والے شوہر سے ہو۔ اگر حمل طلاق دینے والے شوہر کا نہ ہو، یعنی شوہر اپنی عمر کے اعتبار سے اس قدر چھوٹا ہو کہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں یا اسے پیدائشی اور تخلیقی کمزوری ہے جس کی بنا پر بچہ پیدا کرنے کی اس میں اہلیت نہیں یا عورت نے عقد نکاح سے چھ ماہ سے پہلے ہی بچہ جن دیا، جو زندہ ہے تو اس سے اس کی عدت کی مدت ختم نہ ہو گی کیونکہ بچے کا نسب اپنے باپ سے نہیں ملتا۔

حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ ''اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔''[2]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ ''مائیں اپنی اولادوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔''[3]

اگر تیس ماہ کی مدت میں سے ''مدت رضاعت'' 24 ماہ (دو سال) منفی کر دیں تو باقی چھ ماہ ہی رہ جاتے ہیں جو کہ

① الطلاق 65:4. ② الأحقاف 46:15. ③ البقرة 2:233.

حمل کی کم از کم مدت ہے۔ یاد رہے رحم مادر میں چھ ماہ سے کم مدت رہنے والا بچہ زندہ نہیں رہتا۔

حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ راجح مسلک یہ ہے کہ اس مسئلے میں دنیا میں موجود مثالوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جہاں نص نہ ہو وہاں وجود کی طرف رجوع کیا جائے گا، لہٰذا دنیا میں پانچ سال بلکہ اس سے زیادہ مدت تک رحم مادر میں حمل برقرار رہنے کی مثالیں موجود ہیں لیکن عموماً نو ماہ مدت تک حمل ہوتا ہے کیونکہ عام خواتین کے حمل کی مدت غالباً نو ماہ ہی ہوتی ہے۔

شریعت اسلامیہ میں حمل کی قدر و منزلت ہے، اس کے بارے میں کسی قسم کی زیادتی کرنا یا اسے نقصان پہنچانا قطعاً جائز نہیں۔ اگر روح داخل ہو جانے کے بعد کسی کی زیادتی کے سبب حمل ساقط ہو جائے تو اس میں دیت و کفارہ لازمی ہوتا ہے۔

اگر حاملہ عورت پر کسی شرعی حد کا لگنا یا رجم کرنا واجب ہو گیا تو حد کے نفاذ میں تاخیر کی جائے گی حتی کہ وہ عورت بچے کو جنم دے، دوائی وغیرہ استعمال کر کے حمل گرانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایسی شریعت کے ذریعے سے ہماری راہنمائی کی ہے جس میں ہر قسم کے احکام موجود ہیں حتی کہ اسلام عورت کے پیٹ میں موجود بچے سے متعلق بھی اپنے احکام کے ذریعے سے ہماری راہنمائی کرتا ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلام کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے اور اپنی اطاعت میں خلوص کی دولت دے اگرچہ کافر لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ چار ماہ دس دن کی عدت گزارے بشرطیکہ وہ حمل والی نہ ہو۔ اس کا خاوند مجامعت سے قبل وفات پا گیا ہو یا بعد میں، نیز عورت وطی کے قابل ہو یا نہ ہو، بہر صورت اس کی عدت یہی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾

''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔''[1] کا عموم ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عورت پر چار ماہ دس دن کی عدت اس کے شوہر کی موت کے سبب ہے، شوہر نے بیوی سے مجامعت کی ہو یا نہ کی ہو کیونکہ قرآن وسنت کے دلائل میں عموم ہے، نیز اہل علم کا اس پر اتفاق ہے۔

[1] البقرۃ 2:234.

واضح رہے عدت وفات سے مقصود استبرائے رحم نہیں اور نہ یہ محض تعبدی حکم ہے کیونکہ شریعت کے ہر حکم میں جو معنی اور حکمت پنہاں ہیں وہ بعض پر آشکارا ہو جاتے ہیں اور دوسروں پر مخفی رہتے ہیں۔''[1]

علامہ وزیر اور دیگر فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ''علمائے کرام اس امر پر متفق ہیں کہ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے وہ چار ماہ دس دن تک عدت گزارے بشرطیکہ وہ حاملہ نہ ہو۔''

◣ لونڈی کا آقا یا شوہر فوت ہو جائے تو اس کی عدت آزاد عورت کی نسبت نصف ایام ہیں، یعنی دو ماہ اور پانچ دن۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اس امر پر اجماع تھا کہ لونڈی کی عدت طلاق اور عدت وفات آزاد عورت کی نسبت نصف ہے۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہی قول عام اہل علم کا ہے۔ ان میں امام مالک، امام شافعی رحمہما اللہ اور دیگر فقہاء بھی شامل ہیں، نیز اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا۔''[2]

◣ عدت وفات سے متعلق چند مخصوص احکام مندرجہ ذیل ہیں:

① عورت عدت وفات اس گھر میں گزارے جہاں وہ اپنے خاوند کی وفات کے وقت رہ رہی تھی، بغیر کسی شرعی عذر کے اس جگہ کو چھوڑنا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو فرمایا تھا: ''تم اس گھر میں عدت گزارو جہاں تمھیں تمھارے خاوند کی موت کی خبر دی گئی تھی۔''[3]

② اگر عورت عدت وفات گزارنے کے لیے شوہر کے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ جانے پر مجبور ہو تو حسب خواہش جہاں چاہے عدت گزارے تاکہ اسے تکلیف یا نقصان نہ ہو، مثلاً: جہاں خاوند فوت ہوا تھا اس گھر میں رہنے سے اس کی جان کو خوف وخطرہ لاحق ہو یا اسے وہاں سے زبردستی نکال دیا جائے یا مالک مکان کی طرف سے کرایہ بڑھ جانے کی وجہ سے اس عورت نے مکان چھوڑ دیا ہو وغیرہ۔

③ اسی طرح خاوند کی وفات پر عدت گزارنے والی عورت دن کے وقت کسی ضروری کام کے لیے گھر سے باہر جا سکتی ہے، رات کو نہیں کیونکہ رات کو جانے میں خرابی وفساد کا اندیشہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«تَحَدَّثْنَ عِنْدَ إِحْدَاكُنَّ مَا بَدَا لَكُنَّ، فَإِذَا أَرَدْتُنَّ النَّوْمَ فَلْتَأْتِ كُلُّ امْرَأَةٍ إِلٰى بَيْتِهَا»

① إعلام الموقعين 76:2. ② المغني والشرح الكبير: 108/9. ③ سنن أبي داود، الطلاق، باب في المتوفى عنها تنتقل، حديث: 2300، وسنن النسائي، الطلاق، باب مقام المتوفى عنها زوجها في بيتها حتى تحل، حديث: 3560,3559، وجامع الترمذي، الطلاق، باب ما جاء أين تعتد المتوفى عنها زوجها، حديث: 1204.

''تم ایک دوسری کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے (دن کے وقت) اکٹھی ہو سکتی ہو لیکن جب سونے کا ارادہ ہو تو ہر ایک اپنے گھر واپس آ جائے۔''[1]

④ عدت وفات کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ عورت عدت وفات میں ''سوگ'' کی کیفیت میں رہے، اپنی ایسی صورت حال اور وضع قطع نہ بنائے کہ حسن و زیبائش اور بناؤ سنگھار کیے ہوئے ہو کہ دعوت نظارہ دے رہی ہو۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ شریعت مطہرہ کے محاسن اور حکمتوں میں سے ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ شریعت میں بندوں کی ضروریات کا بدرجہ اتم لحاظ اور خیال رکھا گیا ہے۔ میت پر سوگ منانا موت کی گھناؤنی مصیبت کی وجہ سے ہے جس میں زمانہ جاہلیت کے لوگ انتہائی مبالغہ کرتے تھے یہاں تک کہ سوگ والی عورت حالت سوگ میں ایک سال تک تنگ و تاریک مکان میں رہتی جو گھر سے الگ تھلگ ہوتا تھا، وہ نہ خوشبو وغیرہ استعمال کرتی اور نہ وہ غسل کرتی تھی، اس کے علاوہ ایسے امور انجام دیتی جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ناراضی کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و حکمت سے یہ (غلط) طریقہ باطل قرار دیا اور اس کے بجائے ہمیں صبر اور شکر کی تعلیم دی اور ایسے موقع پر ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ﴾ کہنے کا حکم دیا ہے۔

چونکہ موت سے انسان کو گہرا دکھ، حزن و ملال اور تکلیف پہنچتی ہے اور انسانی طبیعت کے یہ عین مطابق ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر نے عورت کو کچھ گنجائش عطا کی کہ وہ خاوند کے سوا کسی دوسری میت پر تین دن تک سوگ منا کر اپنے غم کو ہلکا کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ وقت سوگ میں گزارنا چونکہ خرابی اور نقصان کا باعث تھا، اس لیے اس سے روک دیا گیا۔ گویا کہ عام میت پر سوگ تین دن ہوگا اور خاوند پر سوگ مہینوں کے حساب سے ہوگا۔

مقصد یہ ہے کہ عورت کی کم عقلی اور بے صبری کی بنا پر اسے قریبی رشتے داروں کے مرنے پر تین دن تک سوگ منانے کی اجازت دی گئی ہے اور خاوند کی موت پر سوگ محض سوگ ہی نہیں بلکہ عدت بھی ہے۔

چونکہ عورت کو خاوند کی موجودگی میں خوشبو وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ خاوند سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کی ضرورت نہ رہی اور چونکہ وہ عورت ابھی پہلے خاوند کی وفات کی عدت گزار رہی ہے اور کسی دوسرے خاوند کے عقد میں نہیں گئی تو اس کا تقاضا ہے کہ وہ ابھی پہلے خاوند (کی عدت) کا حق پورا کرے اور عدت مکمل کرنے تک ایسے تمام امور ترک کیے رکھے جنھیں بیویاں اپنے خاوندوں کے لیے بجالاتی

[1] [ضعیف] منار السبیل، ص: 613,612، حدیث: 2135، والسنن الکبری للبیهقي: 436/7. تاہم شدید ضرورت کے پیش نظر عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عورت کا زینت اور رنگ وخوشبو کے استعمال سے اپنی حرص اور خواہش کا اظہار کرنے اور اس کی زینت وخوشبو کو دیکھ کر مردوں کا اس میں دلچسپی ظاہر کرنے کا سد باب بھی ہے۔[1]

عورت پر واجب ہے کہ عدتِ سوگ میں زیب وزینت اختیار کرنے سے اجتناب کرے، اپنے بال خضاب سے نہ رنگے، زینت پیدا کرنے والے رنگوں کو استعمال نہ کرے، مختلف ڈیزائنوں کا زیور نہ پہنے اور ہر قسم کی خوشبو کے استعمال سے خود کو دور رکھے، شوخ لباس نہ پہنے بلکہ ایسا سادہ لباس پہنے جو زینت کا باعث نہ ہو۔ ان تمام باتوں کا تب تک خیال رکھے جب تک عدت وفات بیت نہ جائے۔

⑤ عدت وفات کے لیے شریعت نے کوئی ایسا ایک لباس متعین اور مخصوص نہیں کیا، وہ حسب عادت اور عام معمول کا لباس پہنے، البتہ وہ زینت کا لباس نہ ہو۔

⑥ جب اس کی عدت وفات مکمل ہو جائے تو اس موقع پر کوئی مخصوص کام کرنا یا خاص الفاظ ادا کر کے عدت ختم کرنا شرعاً ثابت نہیں اگرچہ بعض لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں۔

▲ جس عورت کو حیض نہیں آتا وہ تین ماہ طلاق کی عدت پوری کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ﴾

''تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں اگر تمھیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔''[2]

▲ مطلقہ عورت جسے حیض آتا ہو وہ تین حیض کی عدت گزارے بشرطیکہ وہ حاملہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّکْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ ﴾

''طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں، انھیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہو، اسے چھپائیں۔''[3]

واضح رہے آیت میں کلمہ قُرُوءٌ کے معنی ''حیض'' کے ہیں۔ صحابۂ کرام میں سے حضرت عمر، علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے۔ علاوہ ازیں حدیث میں بھی قَرْءٌ کا لفظ حیض کے معنی میں آیا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحاضہ عورت کو فرمایا:

«إِذَا أَتٰى قَرْءُكِ فَلَا تُصَلِّي» ''جب تجھے حیض آئے تو نماز ادا نہ کرنا۔''[4]

① إعلام الموقعين :2/145-147. ② الطلاق 65:4. ③ البقرة 2:228. ④ سنن أبي داود، الطهارة، باب في ◄◄

- عدت میں تینوں حیض مکمل ہونے ضروری ہیں، لہٰذا اگر حالت حیض میں طلاق دی گئی (اگرچہ یہ حرام کام ہے) تو یہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا۔
- اگر مطلقہ عورت لونڈی ہے تو اس کی عدت دو حیض ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے: ''لونڈی کی عدت دو حیض ہیں۔''

سیدنا عمر، علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک تھا، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اس فتوے کا کوئی مخالف معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے عام فرمان کا مخصص ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾

''طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔''[1]

قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ لونڈی کی عدت ڈیڑھ حیض ہوتی لیکن حیض کا اجزا میں تقسیم ہونا ناممکن ہے، اس لیے عدت دو حیض قرار پائی۔

- ایسی عورت جس کا بڑھاپے کی وجہ سے حیض بند ہو چکا ہو یا بچی جسے ابھی حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا، دونوں تین ماہ عدت گزاریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالّٰٓئِيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾

''تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں، اگر تمھیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور (اسی طرح) ان کی بھی جنھیں ابھی حیض نہیں آیا۔''[2]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ''اہل علم کا اجماع ہے کہ بڑی عمر کی آزاد عورت اور بچی، جسے ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، کی عدت تین ماہ ہے۔''[3]

- جو عورت بالغ ہو گئی لیکن کسی وجہ سے اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہے کیونکہ وہ بھی آیت مذکورہ کے عام حکم میں شامل ہے۔
- اگر کسی اولاد والی لونڈی کا حیض بند ہو گیا یا وہ عمر میں ابھی چھوٹی ہے تو اس کی عدت طلاق دو ماہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«عِدَّةُ أُمِّ الْوَلَدِ حَيْضَتَانِ وَلَوْ لَمْ تَحِضْ كَانَتْ عِدَّتُهَا شَهْرَيْنِ»

◄ المرأة تستحاض ...... ، حديث: 280، وسنن النسائي، الحيض، باب ذكر الأقراء، حديث: 358. [1] البقرة 228:2. [2] الطلاق 4:65. [3] المغني والشرح الكبير لابن قدامة: 90/9.

''ام ولد کی عدت دو حیض ہے، اگر اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تو اس کی عدت دو ماہ ہے۔''[1]

کیونکہ اس صورت میں ''مہینہ'' حیض کا بدل قرار پائے گا۔ بعض علماء ایسی عورت کی ڈیڑھ ماہ کی عدت کے قائل ہیں کیونکہ لونڈی کی عدت آزاد عورت کی نسبت نصف ہے۔ تو جب آزاد عورت، جسے حیض نہیں آتا، کی عدت تین ماہ ہے تو لونڈی کی عدت لازماً ڈیڑھ ماہ ہوگی۔[2]

▲ ایسی مطلقہ عورت جسے پہلے حیض آتا رہا، پھر کسی عارضہ کی وجہ (نہ کہ بڑھاپے کی وجہ) سے رک گیا تو ایسی عورت کی دو حالتیں ہوں گی:

① اسے حیض کے رک جانے کا سبب معلوم نہ ہو۔ ایسی عورت کی عدت طلاق ایک سال ہے۔ اس میں نو ماہ حمل کے لیے تین ماہ طلاق کی عدت کے ہوں گے جو حیض سے مایوس عورت کی عدت ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ فیصلہ (کہ مذکورہ عورت کی عدت ایک سال ہے) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تھا جو انصار و مہاجرین میں جاری و ساری تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی انکار کرنے والے نے اس کا انکار نہیں کیا۔ یاد رہے ایک سال کی عدت میں غرض یہ ہے کہ عورت کے رحم میں حمل کی صورت حال واضح ہو جائے، لہٰذا جب نو ماہ گزر جائیں تو حمل کے بارے میں کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔ اگر حمل نہ ہوا تو تین ماہ عدت گزارے جو حیض سے مایوس عورت کی عدت ہے۔ اس طرح اس عورت کی مجموعی عدت ایک سال ہوگی۔''[3]

② عورت کو حیض رک جانے کا سبب معلوم ہو، مثلاً: بیماری یا رضاعت یا ایسی ادویات کا استعمال جو مانع حیض ہیں۔ ایسی عورت اولاً رکاوٹ حیض کے سبب کے ختم ہونے کا انتظار کرے۔ سبب زائل ہو جانے کے بعد حیض آ جائے تو تین حیض عدت پوری کرے۔ اگر سبب زائل ہو جانے کے باوجود حیض آنا شروع نہیں ہوا تو صحیح بات یہی ہے کہ وہ اس عورت کی طرح ایک سال کی عدت پوری کرے جس کا حیض کسی ایسی وجہ سے رک گیا ہے جس کا اسے علم نہیں جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی موقف کو پسند کیا ہے، نیز امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

▲ مستحاضہ عورت کی درج ذیل تین صورتیں ہیں:

---

① منار السبیل، ص: 608، حدیث: 2122، السنن الکبریٰ للبیھقي بلفظ: [عِدَّةُ الْأَمَةِ إِذَا لَمْ تَحِضْ شَهْرَيْنِ ، وَإِذَا حَاضَتْ حَيْضَتَيْنِ]: 425/7.

② اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر منقول ہے، دیکھیے: السنن الکبریٰ للبیھقي: 425/7.

③ المغني والشرح الکبیر: 98/9.

① استحاضہ شروع ہونے سے قبل اسے ایام حیض کی تعداد اور وقت کا علم ہو۔ایسی عورت اپنے معمول اور عادت کے مطابق طلاق کی عدت تین حیض پورے کرے۔

② اگر اسے ایام حیض کی تعداد بھول گئی ہو لیکن وہ حیض کے خون اور استحاضہ کے خون میں فرق وامتیاز کر سکتی ہو تو اس امتیاز کو پیش نظر رکھ کر طلاق کی عدت تین حیض پوری کرے۔

③ اسے ایام حیض بھول گئے ہوں اور وہ حیض اور استحاضہ دونوں کے خون میں فرق وامتیاز نہ کر سکتی ہو تو وہ حیض سے مایوس عورت کی طرح تین مہینے عدت گزارے گی۔

عدت سے متعلق احکام میں سے ایک مسئلہ ''خِطبہ'' یعنی پیغام نکاح کا ہے۔اگر عورت اپنے شوہر کی وفات کی عدت پوری کر رہی ہو یا اسے طلاق بائن ہو چکی ہو تو ان دونوں قسم کی عورتوں کو دوران عدت میں صاف اور واضح الفاظ میں نکاح کا پیغام دینا حرام ہے، مثلاً: کوئی کہے: ''میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔'' البتہ اشارے کنایے سے نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے، مثلاً: کوئی کہے: ''میں نکاح کے لیے تم جیسی عورت چاہتا ہوں۔'' اس کے جواز کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ﴾

''تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارے کنایے سے ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو۔''[1]

جب کسی شخص نے بیوی کو تین طلاقوں سے کم طلاقیں دیں یا اس نے بیوی کو رجعی طلاق دی تو اس آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ عدت پوری ہونے کی صورت میں دوبارہ نکاح کے لیے کہے یا دوران عدت میں صاف لفظوں میں یا اشارے کنایے سے جیسے چاہے پیغام نکاح دے کیونکہ اس کا اس عورت سے نکاح کرنا مباح ہے اور جب تک عدت میں ہے اس سے رجوع کا حق حاصل ہے۔

جس عورت کا خاوند گم ہو گیا ہو، یعنی اس کا اتا پتا نہ مل رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا فوت ہو گیا ہے تو قاضی یا حاکم کو چاہیے کہ اس کے حالات کے پیش نظر ایک مدت مقرر کرے جس میں عورت خاوند کے لوٹ کر آنے کا انتظار کرے یا پھر اس کی زندگی یا موت کی ایسی خبر ملے جس سے صورت حال واضح ہو جائے۔عورت اس عدت کے دوران میں گم شدہ کے نکاح میں متصور ہو گی کیونکہ خاوند کا زندہ ہونا اصل حکم ہے۔جب مقررہ مدت ختم ہو جائے تو قاضی اس کی وفات کا فیصلہ جاری کرے گا۔اس فیصلے کے بعد عورت شوہر کی وفات والی عدت، یعنی چار ماہ دس دن گزارے۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا یہی فیصلہ ہے۔

① البقرة2:235.

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے مفقود (گم شدہ) کی بیوی کو چار سال انتظار کرنے کا حکم دیا، اس کے بعد اس کو شادی کی اجازت دی، کچھ مدت بعد گم شدہ خاوند واپس آ گیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرد کو اختیار دیا کہ وہ اپنی بیوی کو لوٹائے یا حق مہر واپس لے لے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ اپنی کتاب ''المسائل'' میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے سنا وہ فرماتے ہیں: ''مجھے اس مسئلے میں کوئی شک نہیں کیونکہ پانچ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ وہ (چار سال) انتظار کرے۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول سب سے صحیح قول ہے اور عقل کے زیادہ قریب ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہی قول درست ہے۔''

جب ایسی عورت کی عدت گزر جائے تو کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا مباح ہو جاتا ہے۔ عورت کو عدتِ وفات کے بعد گم شدہ شخص کے ولی سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے دوسری جگہ شادی کر لی، پھر اس کا پہلا شوہر آ گیا تو اسے اختیار ہے کہ وہ شوہر ثانی سے طلاق کا مطالبہ کرے یا اپنی بیوی کو اس شخص کے نکاح میں رہنے دے اور اپنا ادا شدہ حق مہر واپس لے لے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ پہلے شوہر کی واپسی دوسرے شوہر کے جماع کرنے کے بعد ہو یا پہلے ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''گم شدہ شخص کی بیوی کی عدت کے بارے میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مذہب درست ہے اور وہ یہ کہ اولاً چار سال گزارے، پھر (قاضی کے فیصلے کے بعد) عدت وفات چار ماہ دس دن پورے کرے۔ اس کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔ نکاح کی صورت میں ظاہر و باطن دوسرے شخص کی بیوی ہو گی پہلے گم شدہ شخص کی نہیں، دوسرے آدمی سے نکاح کر لینے کے بعد اگر عورت کا پہلا شوہر لوٹ آیا تو اسے اختیار ہو گا کہ وہ اپنی بیوی کو دوبارہ حاصل کرے یا اس سے ادا شدہ حق مہر واپس لے اور اسے دوسرے آدمی کے نکاح میں رہنے دے۔ شوہر ثانی نے اس عورت سے مجامعت کر لی ہو یا نہ کی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب یہی ہے۔''

شیخ موصوف فرماتے ہیں: ''شوہر اول کو عورت اور مہر کے بارے میں جو اختیار دیا گیا ہے، وہ عدل و انصاف سے پوری طرح مطابقت و موافقت رکھتا ہے۔''[2]

---

[1] إعلام الموقعين: 49/2. [2] الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، العدد: 512,511/5.

استبرائے رحم کا بیان

استبرائے رحم کا مطلب یہ ہے کہ لونڈی کے حصول کے بعد اور اس سے جماع کرنے سے پہلے کچھ وقت انتظار کرنا تاکہ اس کے رحم میں حمل ہونے یا نہ ہونے کی صورت حال واضح ہو جائے۔

جس نے کوئی لونڈی خریدی یا اسے ہبہ کی گئی یا قیدی بنی اور پھر اسے حاصل ہو گئی اور وہ وطی کے قابل ہو تو اس سے وطی و استفادہ تب تک حرام ہے جب تک استبرائے رحم (رحم کے خالی ہونے) کا یقین نہ ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَسْقِي مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ»

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لائق نہیں کہ وہ کسی کی کھیتی کو اپنا پانی دے۔''[1]

ایک روایت میں ہے:

«لَا تُوطَأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعَ»

''حاملہ (لونڈی) سے وطی نہ کی جائے جب تک اس کے ہاں ولادت نہ ہو جائے۔''[2]

- حاملہ لونڈی کا ''استبرا'' وضع حمل سے ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان عام ہے:

﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے۔''[3]

- اگر وہ حاملہ نہیں اور اسے حیض آتا ہے تو ایک حیض کا آنا ''استبرائے رحم'' کے لیے کافی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اوطاس کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا:

«لَا تُوطَأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعَ وَلَا غَيْرُ ذَاتِ حَمْلٍ حَتَّى تَحِيضَ حَيْضَةً»

''حاملہ سے وطی نہ کی جائے حتی کہ وہ حمل کو جنم دے اور غیر حاملہ سے وطی نہ کی جائے حتی کہ اسے ایک مرتبہ

[1] جامع الترمذي، النكاح ، باب ما جاء في الرجل يشتري الجارية وهي حامل، بلفظ:[وَلَدَ غَيْرِهِ]،حديث: 1131، ومسند أحمد : 108/4،و سنن أبي داود بلفظ:[لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ......] النكاح، باب في وط ء السبايا، حديث: 2158. [2] سنن أبي داود، النكاح، باب في وطء السبايا، حديث: 2157. [3] الطلاق 65:4.

حیض آ جائے۔''[1]

اس روایت سے واضح ہوا کہ قیدی بن جانے والی عورت لونڈی بن جائے یا کسی اور طریقے سے لونڈی حاصل ہو تو وطی سے قبل استبرائے رحم کے لیے ایک حیض کا انتظار کرنا واجب ہے۔

▲ لونڈی حیض کے ایام سے مایوس ہوگئی ہو یا وہ ابھی چھوٹی عمر میں ہو جسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تو استبرائے رحم کے لیے ایک مہینہ گزرنے کا انتظار کیا جائے کیونکہ عدت میں ایک حیض ایک ماہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔

▲ لونڈی کے بارے میں وطی سے قبل استبرائے رحم کی ہدایت میں حکمت، رسول اللہ ﷺ کے فرمان:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَسْقِي مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ»

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے لائق نہیں کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی کو دے۔''[2]

سے خود واضح ہو رہی ہے کہ استبرائے رحم کی غرض پانی (مادہ منویہ) کے اختلاط سے احتراز کرنا اور نسب میں اشتباہ سے بچنا ہے۔

رضاعت کے احکام

اللہ تعالیٰ نے ''محرمات'' (جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے) کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ وَأَخَوَٰتُكُم مِّنَ ٱلرَّضَٰعَةِ﴾

''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں (بھی تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔)''[3]

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»

''رضاعت سے وہ عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو نسب سے حرام ہوتی ہیں۔''[4]

① سنن أبي داود، النكاح، باب في وطء السبايا، حديث: 2157، ومسند أحمد: 62/3 و87. ② جامع الترمذي، حديث: 1131، سنن أبي داود، حديث: 2158، ومسند أحمد: 108/4. ③ النسآء 23:4. ④ صحيح البخاري، الشهادات، باب الشهادة على الأنساب والرضاع ......، حديث: 2645، وصحيح مسلم، الرضاع، باب تحريم الرضاعة من ماء الفحل، حديث: 1445.

ایک روایت میں ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ»

''رضاعت سے وہ عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو ولادت سے حرام ہوتی ہیں۔''[1]

- رضاعت کے لغوی معنی ہیں ''بچے کا عورت کے پستان سے دودھ پینا۔'' شرعی معنی ہیں: ''دو سال سے کم عمر کے بچے کا عورت کے پستان سے کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینا۔''
- نکاح، خلوت، محرم ہونے اور عورت کو دیکھنے وغیرہ میں رضاعت کا وہی حکم ہے جو نسبی رشتے کا ہوتا ہے۔
- رضاعت تب ثابت ہوگی جب دو شرطیں پائی جائیں:

① بچے نے ایک عورت کا کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پیا ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں:

«كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَّعْلُومَاتٍ فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ»

''قرآن مجید میں اول حکم یہ نازل ہوا تھا کہ ایک عورت کا دس مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، پھر پانچ مرتبہ دودھ پینے والا حکم نازل ہوا جس سے پہلا حکم منسوخ ہو گیا، رسول اللہ ﷺ جب فوت ہوئے تو یہی حکم جاری وساری تھا۔''[2]

واضح رہے پانچ مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہونے کا حکم منسوخ نہیں ہوا، اگرچہ قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ یہ حکم آیت کے اِجمال اور رضاعت کی احادیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔

② دوسری شرط یہ ہے کہ بچہ دو سال سے کم عمر میں پانچ مرتبہ یا زیادہ دودھ پیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

''مائیں اپنی اولادوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو۔''[3]

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ رضاعت تب معتبر ہوگی جب بچے کی عمر دو سال یا اس سے کم ہو۔ رسول اللہ

---

① صحيح البخاري، النكاح، باب ما يحل من الدخول والنظر إلى النساء في الرضاع؟ حديث: 5239، وصحيح مسلم، الرضاع، باب يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة، حديث: 1444. ② صحيح مسلم، الرضاع، باب التحريم بخمس رضعات، حديث: 1452. ③ البقرة 2:233.

ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ فِي الثَّدْيِ، وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ»

''رضاعت سے حرمت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی جب تک دودھ انتڑیوں کو پھلا نہ دے اور یہ عمل دودھ چھڑانے کی عمر سے پہلے پہلے ہو۔''[1]

یعنی دودھ کی وہ مقدار جو بچے کے پیٹ میں پہنچ کر انتڑیوں کو پھلائے، بھوک ختم کرے اور اس سے گوشت بنے، اس سے رضاعت ثابت ہوتی ہے اس سے کم سے نہیں۔

◣ ایک رضعہ (ایک بار دودھ پینے) سے مراد یہ ہے کہ بچہ پستان سے دودھ پینا شروع کرے، پھر اپنی مرضی سے سانس وغیرہ لینے کی خاطر دودھ پینا چھوڑ دے یا پھر دوسرے پستان سے پینا شروع کر دے۔ یہ ایک رضعہ (ایک بار دودھ پینا) شمار ہوگا۔ اگر بچے نے پھر دوبارہ اسی طرح کیا تو دو رضعے، یعنی دو بار پینا شمار ہوگا اگرچہ مجلس ایک ہی ہو۔ اس توضیح کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ''رضعہ'' کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی، لہٰذا اس کی حد بندی کے لیے ہم عرف کی طرف رجوع کریں گے۔

◣ اگر کسی عورت نے پستان کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اپنا دودھ بچے کے پیٹ میں پہنچا دیا تو اس پر بھی رضاعت کا حکم لگ جائے گا کیونکہ اس عمل سے غذا حاصل ہوگئی جو رضاعت کا مقصود تھا بشرطیکہ یہ عمل پانچ مرتبہ کیا جائے۔

◣ رضاعت سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے، یعنی جب کسی عورت نے دو سال سے کم عمر والے بچے کو پانچ یا زیادہ مرتبہ دودھ پلا دیا تو دودھ پینے والا بچہ اس اعتبار سے عورت کا بچہ کہلائے گا اور اس بچے کا اس عورت سے نکاح کرنا حرام ہوگا، نیز اس عورت کو دیکھنا اور اسے علیحدگی میں ملنا اس بچے کے لیے جائز ہوگا۔ یہ بچہ عورت کا محرم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أُمَّهَٰتُكُمُ الَّٰتِىٓ أَرْضَعْنَكُمْ﴾

''تمھاری مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو (وہ بھی تمھارے لیے حرام ہیں۔)''[2]

واضح رہے مذکورہ امور کے علاوہ دیگر احکام میں یہ اس عورت کا بچہ شمار نہ ہوگا، یعنی بچے پر اس عورت کا نان ونفقہ واجب نہ ہوگا۔ دونوں میں کوئی ایک دوسرے کا وارث نہ ہوگا۔ بصورت جنایت بچہ دیت دینے والوں میں شامل نہ

[1] جامع الترمذي، الرضاع، باب ما جاء [ما ذكر] أن الرضاعة لا تحرم إلا في الصغر دون الحولين، حديث: 1152.

[2] النسآء 4:23.

ہوگا اور نہ ولی بن سکے گا کیونکہ نسب رضاعت سے قوی تر ہوتا ہے۔ دونوں میں برابری ان امور میں مسلّم ہوگی جن میں شریعت کی نص وارد ہوئی ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

◀ جس طرح دودھ پینے والا لڑکا اور لڑکی عورت کے بچے کہلائیں گے جس کا انھوں نے دودھ پیا ہے اسی طرح عورت کے دودھ کے مالک، یعنی خاوند یا آقا کے بھی بچے کہلائیں گے کیونکہ دودھ پلانے والی عورت بوقت رضاعت اس کے نکاح میں یا اس کی ملکیت میں تھی، لہٰذا مذکورہ احکام عورت کے خاوند یا آقا اور دودھ پینے والے کے درمیان بھی جاری وساری ہوں گے، مثلاً: دودھ پینے والی لڑکی ہے تو دودھ پلانے والی عورت کے خاوند یا لونڈی ہو تو اس کے مالک کے ساتھ اس کا نکاح حرام ہوگا۔ ان کا ایک دوسرے کو دیکھنا جائز ہوگا اور خلوت میں ان کی ملاقات مباح ہوگی۔

◀ نسب میں جو رشتے محرم ہیں، رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے محرم بن جاتے ہیں، مثلاً: جس عورت سے رضاعت ثابت ہوئی ہو تو اس کا باپ، دادا، اولاد، ماں، نانی، بہنیں، چچے، پھوپھیاں، ماموں، خالائیں دودھ پینے والے کے لیے محرم ہیں۔ اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کے خاوند کے تمام رشتے دار رضاعی بیٹے، بیٹی کے لیے محرم ہیں۔

◀ جس طرح دودھ پینے والے بچے کے لیے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے اسی طرح اس بچے کی اولاد یا اولاد کی اولاد پر بھی حرمت ثابت ہوگی الا یہ کہ وہ اصول (باپ، دادا) وحواشی (بھائی وغیرہ) ہوں، لہٰذا اس بچے کے اوپر درجے کے اقارب، یعنی آباء واجداد، مائیں، چچے، ماموں اور خالاؤں کے لیے حرمت ثابت نہ ہوگی، جیسا کہ اس کے برابر کے درجے کے حواشی کے لیے حرمت ثابت نہیں ہوتی، یعنی بچے کے دوسرے بہن بھائی اس رضاعی ماں یا رضاعی باپ کے محرم نہیں ہوں گے۔

◀ جس بچے نے ایسی عورت کا دودھ پیا جس سے باطل طریقے یا زنا سے وطی کی گئی تو وہ بچہ صرف دودھ پلانے والی کا بیٹا کہلائے گا کیونکہ جب مرد کا نسب کے اعتبار سے باپ ہونا ثابت نہیں تو رضاعت سے بھی باپ ثابت نہ ہوگا کیونکہ رضاعت نسب کی فرع ہے۔

◀ ایک جانور کا دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، مثلاً: کسی بچے اور بچی نے ایک جانور کا دودھ پیا ہے تو اس بنیاد پر ان کا آپس میں نکاح حرام نہ ہوگا۔

◀ اگر بچے نے کسی عورت کا ایسا دودھ پیا جو وطی اور وضع حمل کے بغیر اتر آیا تو اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ حرمت کا باعث نہیں کیونکہ وہ حقیقتاً دودھ ہی نہیں بلکہ وہ نکلنے والی ایک رطوبت ہے، نیز

دودھ وہ ہوتا ہے جو بچے کی ہڈیوں اور اس کے گوشت کی نشوونما کا موجب بنے جبکہ یہ دودھ ایسا نہیں ہے۔ اہل علم کی دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے حرمت و رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔

◀ ایک عورت (جس نے بچے کو اپنا دودھ پلایا ہے) کی شہادت سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ دین اسلام کے احکام کی پیروکار ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب عورت سچ بولنے میں معروف ومشہور ہو اور وہ بتائے کہ اس نے فلاں کو پانچ بار دودھ پلایا تھا تو صحیح بات یہی ہے کہ اس کی بات قبول ہوگی اور رضاعت کا حکم ثابت ہوگا۔''[1]

◀ اگر رضاعت کے ثابت ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو یا رضاعت کے کامل ہونے میں تردد ہو، یعنی پانچ بار دودھ پیا تھا یا کم اور اس کی واضح دلیل بھی نہ ہو تو حرمت و رضاعت ثابت نہ ہوگی کیونکہ دودھ کا نہ پینا اصل امر ہے۔ واللہ أعلم.

حق پرورش کے احکام

حَضَانَتُ لغوی معنی ''حق پرورش'' کے ہیں۔ شرعی معنی ''بچے یا جو بچے کے حکم میں ہے، کو نقصان دہ امور سے بچانے اور اس کی جسمانی وروحانی مصلحتوں اور فوائد کا لحاظ کرتے ہوئے پرورش اور تربیت کرنے'' کے ہیں۔

بچہ یا جو شخص بچے کی طرح کم عقل، دیوانہ وغیرہ ہو، اسے پرورش میں لینے میں یہ حکمت ہے کہ ایسے افراد اپنی مصلحتوں کا خیال نہیں رکھ سکتے تو لازماً انھیں کسی سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی حفاظت ونگرانی کر سکے اور ان کے منافع وفوائد کا لحاظ رکھے، انھیں نقصان دہ امور سے بچائے اور ان کی اچھے انداز میں پرورش اور تربیت کر سکے۔

◀ ہماری شریعت، شریعت اسلامیہ نے ایسے لوگوں کی تربیت و پرورش کے اصول وضوابط بیان فرمائے ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنی صورت احوال کے پیش نظر شفقت ورحمت کے نہایت مستحق ہیں اور اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ احسان اور بھلائی کی جائے۔ اگر انھیں نظر انداز کر دیا جائے گا تو ان کا نقصان ہوگا بلکہ وہ ضائع ہو جائیں گے ہمارا دین انھیں ضائع کرنے سے روکتا ہے، ان کی کفالت کا ہمیں ذمے دار ٹھہراتا ہے اور یہ پرورش پانا زیر کفالت بچے کا حق

[1] مجموع الفتاوىٰ: 34/52.

ہے جو اس کے قرابت داروں پر عائد ہوتا ہے۔ اور پرورش کنندہ کا یہ حق ہے کہ اپنے قریبی (بچے) کے معاملات کا اسی طرح خیال رکھے جس طرح وہ باقی ذمے داریاں نبھاتا ہے۔

پرورش کرنا جن اقرباء پر لازم ہے ان کی ترتیب یوں ہے:

① بچے کی پرورش کرنے کی سب سے زیادہ حقدار اس کی ماں ہے۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب خاوند اور بیوی کے درمیان علیحدگی ہو جائے اور ان کی چھوٹی اولاد ہو یا بچہ بچی بڑا ہو لیکن کم عقل ہو تو ان کی کفالت کی سب سے زیادہ حق دار بچے کی ماں ہے بشرطیکہ ماں میں بچے کی کفالت کی تمام شرائط موجود ہوں۔ امام مالک رحمہ اللہ اور اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اس رائے کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔''[1]

اگر بچے کی ماں کسی اور شخص سے شادی کر لے تو ماں کا حق پرورش ختم ہو کر کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میں نے اپنے پیٹ میں اسے اٹھایا، یہ میرے سینے سے دودھ پیتا رہا، اس نے میری گود میں پرورش پائی، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب اس بچے کو بھی مجھ سے چھیننا چاہتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي»

''بچے کو لینے کی حقدار تو ہی ہے جب تک تو کسی دوسرے آدمی سے شادی نہیں کرتی۔''[2]

اس روایت سے واضح ہوا کہ بچے کی ماں پرورش کی زیادہ حقدار ہے، البتہ اگر وہ کسی دوسری جگہ شادی کر لے تو اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔

بچے کی پرورش میں ماں کو دوسروں پر ترجیح دینے میں حکمت یہ ہے کہ وہ بچے پر زیادہ مہربان، اور رشتے میں قریب ترین ہے۔ رشتے میں ماں کے ساتھ باپ بھی شریک ہے لیکن باپ کے سینے میں شفقت ماں کے برابر نہیں ہوتی اور وہ خود پرورش کر بھی نہیں سکتا۔ لازماً وہ بچے کو اپنی بیوی ہی کے سپرد کرے گا، لہٰذا بچے کو اس کی ماں کے حوالے کرنا اس کی سوتیلی ماں کی نسبت زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک شخص سے کہا: ''بچے کے لیے ماں کی خوشبو، اس کا بستر اور اس کی گود تجھ سے بہتر ہے حتی کہ وہ جوان ہو جائے اور اپنے لیے

① المغني والشرح الكبير: 9/300,299. ② سنن أبي داود، الطلاق، باب من أحق بالولد؟ حديث: 2276، ومسند أحمد: 2/182.

کسی ایک کا انتخاب کر لے۔'' [1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''چھوٹے بچے کی پرورش کے لیے ماں موزوں ترین ہے کیونکہ عورتیں چھوٹے بچوں پر زیادہ شفیق، ان کی خوراک کا انتظام کرنے میں اور پرورش کرنے میں زیادہ باصلاحیت ہوتی ہیں اور پیش آمدہ تکالیف پر زیادہ صابر اور بچے کے حق میں زیادہ مہربان ہوتی ہیں، لہٰذا ماں اس موقع پر زیادہ خبر گیری کرنے، رحمت وشفقت کرنے اور صبر کرنے کی وجہ سے زیادہ لائق ہے، اسی لیے نابالغ بچے کی پرورش کے لیے ماں کو متعین کیا گیا ہے۔'' [2]

② اگر کسی وجہ سے بچے کی پرورش میں ماں کا حق ساقط ہو جائے تو یہ حق نانی، پرنانی وغیرہ کو حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ماں کے قائم مقام ہیں اور بچے کا خیال دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر رکھ سکتی ہیں۔

③ ان کے بعد یہ حق بچے کے باپ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ بچے کا اصلی اور نسبی تعلق باپ کے ساتھ ہی ہے، نیز دوسروں کی نسبت وہ قریبی ہے۔ بچے کے حق میں وہ شفیق اور مہربان ہے، لہٰذا اسے دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔

④ اگر باپ کا حق ساقط ہو جائے تو بچے کی دادی، پردادی کو حق پرورش حاصل ہوگا کیونکہ ان کا بچے سے تعلق قریبی عصبہ، یعنی باپ کی وجہ سے ہے۔ واضح رہے دادی، پردادی بچے کے دادا، پردادا پر مقدم ہوگی جس طرح بچے کی ماں اس کے باپ سے مقدم ہوتی ہے۔

⑤ دادی، پردادی کے بعد یہ حق دادا، پردادا کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ باپ کے قائم مقام ہے۔

⑥ دادا، پردادا نہ ہوتو بچے کی پرورش کا حق دادا کی ماں کو حاصل ہوگا۔ جو زیادہ قریبی ہوگی وہ دور والی سے مقدم ہو گی کیونکہ وہ بھی ایک لحاظ سے جننے والیاں ہیں گویا بچہ ان کا ایک جز ہے۔

⑦ دادا کی ماں کے بعد بچے کی حضانت بچے کی بہنوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بچے کے والدین یا کسی ایک سبب سے اس سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں سگی بہن مقدم ہوگی وہ نہ ہوتو مادری (اخیافی) بہن کیونکہ اس کا تعلق ماں کی نسبت سے ہے اور ماں، باپ پر مقدم ہے۔ اگر وہ نہ ہوتو پدری (علاتی) بہن حقدار ہے۔ بعض علماء نے پدری بہن کو مادری بہن پر ترجیح دی ہے کیونکہ اصل ولایت باپ کے لیے ہے اور یہ وراثت میں قوی ترین سبب ہے۔ علاوہ ازیں علاتی (پدری) بہن یہاں حقیقی بہن کے قائم مقام ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] سبل السلام، باب الحضانة: 1562/3، تحت حدیث: 1079. [2] مجموع الفتاوی: 216/17.

⑧ پھران کے بعد خالائیں حقدار ہیں کیونکہ وہ ماں کے قائم مقام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ» ''خالہ ماں کے مرتبے میں ہے۔''[1]

اس میں سگی خالہ کو ترجیح ہوگی، پھر اخیافی خالہ کا حق ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو علاتی خالہ بچے کی کفالت کرے گی جیسا کہ بہنوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔

⑨ خالائیں نہ ہوں تو ''حق حضانت'' پھوپھیوں کی طرف چلا جاتا ہے کیونکہ وہ بچے کے ساتھ باپ کے واسطے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس معاملے میں باپ کا درجہ ماں کے بعد ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پھوپھی خالہ پر مقدم ہوگی۔ اسی طرح باپ کے واسطے سے تعلق رکھنے والی عورتیں، مثلاً: دادیاں ان عورتوں سے مقدم ہوں گی جن کا تعلق بچے کی ماں کے واسطے سے ہے، مثلاً: نانیاں کیونکہ اولاً سرپرستی کا حق باپ کو ہے، پھر اسی طرح اس کے اقارب کو۔ باقی رہا ماں کو باپ پر ترجیح دینا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچے کی مصلحتوں اور فوائد و بھلائی کو دوسروں کی نسبت زیادہ سمجھتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی کفالت میں خالہ کو پھوپھی پر مقدم رکھا تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بچی کی پھوپھی (صفیہ رضی اللہ عنہا) نے پرورش کرنے کا مطالبہ ہی نہیں کیا تھا۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے بچی کی خالہ کا نائب بن کر مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔''

شیخ موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں: ''اصول شریعت باپ کے اقارب کو ماں کے اقارب پر ترجیح دیتے ہیں، لہٰذا جو شخص بچے کی پرورش میں اس کے برعکس کرتا ہے وہ اصول اور شریعت کی مخالفت کرتا ہے۔''[2]

⑩ پھوپھیوں کے بعد حضانت کا حق بھتیجیوں کو حاصل ہے۔

⑪ پھر بھانجیاں حقدار ہیں۔

⑫ ان کے بعد چچے کی بیٹیاں حق رکھتی ہیں۔

⑬ پھر پھوپھیوں کی بیٹیوں کا حق ہے۔

⑭ پھر ان کے بعد قربت میں درجہ بدرجہ باقی عصبات کو حق حضانت حاصل ہوگا، یعنی بھائی اور ان کے بیٹے، پھر چچے، پھر ان کے بیٹے۔

جس کی پرورش و کفالت مقصود ہے اگر وہ لڑکی ہے تو پرورش کرنے والے مرد کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اس کا محرم

---

① صحيح البخاري، الصلح، باب كيف يكتب: هذا مَا صَالح فلان بن فلان و فلان بن فلان ......؟ حديث: 2699.

② مجموع الفتاوى: 34/122، 123.

ہو۔ اگر محرم میسر نہ ہو تو اسے کسی بھی بااعتماد شخص کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔

حق پرورش کے موانع کا بیان

حق پرورش کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ غلامی ہے، لہٰذا جب تک کوئی غلام ہے اگرچہ غلامی ناقص ہی کیوں نہ ہو، وہ پرورش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا کیونکہ پرورش کرنا ایک قسم کی سرپرستی ہے اور غلامی کی وجہ سے کوئی سرپرست نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں وہ ہمہ وقت اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہتا ہے، نیز اس کے تمام منافع مالک کی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر غلام پرورش کرنے کا اہل نہیں۔

▲ فاسق و فاجر شخص بھی پرورش کرنے کا اہل نہیں کیونکہ وہ قابل اعتماد نہیں۔ علاوہ ازیں بچے کے ایسے شخص کی سرپرستی میں رہنے سے اس کا دینی نقصان ہے۔ وہ اس کی تربیت غلط انداز سے کرے گا اور اسے اپنے طریقے پر لگائے گا۔

▲ کوئی کافر مسلمان بچے کا سرپرست نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ فاسق سے بھی زیادہ غیر مستحق ہے، لہٰذا اس کی طرف سے پہنچنے والا نقصان بھی زیادہ ہوگا۔ وہ بچے کو کفریہ تعلیم و تربیت دے کر اسے اسلام سے خارج کر دے گا۔[1]

▲ اگر کوئی عورت دوسری جگہ کسی ایسے مرد سے شادی کر لے جو اس بچے کے لیے اجنبی ہے تو وہ بھی اس بچے کی پرورش کی اہل نہیں کیونکہ رسول اللہ نے ایک عورت کو، جو بچے کی ماں تھی فرمایا:

«أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي»

''جب تک تو کسی اور شخص سے شادی نہیں کرتی بچے کی تربیت کرنا تیرا ہی حق ہے۔''[2]

---

[1] 1990ء کی دہائی میں سرب نصرانی دہشت گردوں نے بوسنیا ہرزی گوینا میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تو ان کے ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ اس دوران میں ''قیام امن'' کے لیے وہاں نیٹو کے فوجی دستے آ گئے اور نصرانی این جی اوز اور مشنری ادارے ہزاروں یتیم مسلمان بچوں کو مختلف یورپی ممالک میں لے گئے جہاں انھیں نصرانی بنا لیا گیا۔ بعض دیگر علاقوں میں بھی ان گنت مسلم بچے نصرانی مشنریوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ یہ ایک المیہ اور لمحۂ فکریہ ہے۔ اسلامی ممالک بالخصوص تنظیم اسلامی کانفرنس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یتیم اور لاوارث مسلمان بچوں کی اسلامی ماحول میں تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کریں تاکہ مسلمانوں کی اولاد نصرانیت کے دام ہمہ رنگ زمین سے بچائی جا سکے۔ (محسن فارانی)

[2] سنن أبي داود، الطلاق، باب من أحق بالولد؟ حديث: 2276، ومسند أحمد: 182/2.

اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کے منافع کا مالک ہے اور وہ اپنی بیوی کو سابق شوہر سے پیدا ہونے والے بچے کی پرورش سے روک سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ''اجنبی شخص'' سے مراد وہ ہے جو بچے کا عصبہ نہیں۔ اگر عورت بچے کے کسی عصبہ (رشتے دار) سے دوسری شادی کر لیتی ہے تو بچے کا حق پرورش ماں سے ساقط نہ ہوگا۔

▪ اگر مذکورہ موانع زائل ہو جائیں، یعنی غلام آزاد ہو جائے، فاسق توبہ کر لے، کافر مسلمان ہو جائے یا دوسری جگہ شادی کرنے والی عورت کو طلاق ہو جائے تو ہر ایک کو ''حق پرورش'' حاصل ہو جائے گا کیونکہ اب رکاوٹ موجود نہیں رہی۔

▪ اگر بچے کے والدین میں سے کوئی ایک طویل سفر کا ارادہ رکھتا ہو تاکہ کسی دوسرے شہر یا ملک میں رہائش اختیار کرے اور اس کا مقصد نقصان پہنچانا نہ ہو، راستہ اور نیا شہر یا ملک بھی پر امن ہوں تو باپ مسافر ہو یا مقیم بہر صورت پرورش کی ذمے داری اسی پر ہوگی کیونکہ بچے کی حفاظت وتربیت اور پرورش کا وہی ذمے دار ہے جبکہ وہ دور رہ کر اپنی ذمے داری کو پورا نہ کر سکے گا تو بچے کا نقصان ہوگا۔

▪ اگر سفر قریب شہر کا ہو کہ جس میں احکام قصر لازم نہیں ہوتے اور جانے والے کا مقصد وہاں رہائش رکھنا ہے تو پرورش کی ذمے داری ماں پر ہوگی وہ مسافر ہو یا مقیم کیونکہ وہ بہتر طور پر پرورش کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں باپ کے لیے نگرانی کرنا بھی ممکن ہے۔

▪ اگر سفر کسی ضرورت کے پیش نظر ہو کہ ضرورت پوری ہونے پر واپس آ جانا ہو یا راستے میں خطرہ ہو یا جس شہر میں جانا مقصود ہے وہاں کے حالات امن وامان کے لحاظ سے خطرناک ہیں تو پرورش کی ذمے داری مقیم پر ہوگی، وہ والد ہو یا والدہ کیونکہ ان صورتوں میں بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر والد نے والدہ کا حق پرورش ساقط کرنے کے لیے نقصان پہنچانے کی کوشش کی یا کوئی حیلہ سازی کی، مثلاً: سفر پر چلا گیا تاکہ بچہ اس کے پیچھے آ جائے تو یہ حیلہ شریعت کے خلاف ہے کیونکہ شریعت نے بچے کی پرورش میں ماں کو باپ کی نسبت زیادہ حقدار قرار دیا ہے باوجودیکہ رہائش قریب ہے اور ہر وقت ملاقات کا امکان ہے۔''[1]

نیز فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الْوَالِدَةِ وَوَلَدِهَا ، فَرَّقَ اللهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَحِبَّتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

[1] إعلام الموقعين: 3/257.

’’جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان جدائی ڈالی تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کے اور اس کے پیاروں کے درمیان جدائی ڈالے گا۔‘‘[1]

اسی طرح آپ ﷺ نے ماں (لونڈی) کو بچے کے بغیر یا بچے کو ماں کے بغیر فروخت کرنے سے منع کیا ہے اگر چہ ایک ہی شہر میں ہوں۔ ان فرامین کے ہوتے ہوئے اس امر کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے کہ کسی حیلے بہانے سے والدہ اور اس کے بچے میں تفریق کی جائے جس کے نتیجے میں ماں کے لیے بچے کو دیکھنا اور اس سے ملاقات کرنا مشکل ہو؟ ماں کے لیے اس جدائی پر صبر کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اس فیصلے کو تسلیم کریں کہ باپ سفر پر جائے یا اسی شہر میں اقامت اختیار کرے، بچہ ماں کے پاس رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت سے فرمایا:

«أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي»

’’تو بچے کی کفالت کی زیادہ حقدار ہے جب تک کسی دوسری جگہ شادی نہیں کرتی۔‘‘[2]

حدیث میں یہ نہیں ہے کہ تو بچے کی زیادہ حق دار ہے جب تک بچے کا باپ سفر پر روانہ نہیں ہو جاتا۔ یہ بات قرآن مجید کی کس آیت میں ہے یا کون سی حدیث میں ہے؟ کیا کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے فتوے میں ہے یا کسی قیاس صحیح میں ہے؟ درحقیقت نہ نص ہے، نہ قیاس اور نہ اس میں کوئی مصلحت ہی ہے۔‘‘[3]

◄ باقی رہا بچے کو والدین میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے اختیار دینا تو وہ تب ہے جب وہ سات برس کا ہو جائے اور سات برس کا بچہ عقل مند ہوتا ہے وہ جسے پسند کرے گا اس کے پاس رہے گا۔ خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہما کا یہی فیصلہ تھا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میرا شوہر مجھ سے میرا بچہ چھیننا چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«هٰذَا أَبُوكَ وَهٰذِهِ أُمُّكَ ، فَخُذْ بِيَدِ أَيِّهِمَا شِئْتَ ، فَأَخَذَ بِيَدِ أُمِّهِ فَانْطَلَقَتْ بِهِ»

’’(اے بچے!) یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہے تھام لے، چنانچہ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے گئی۔‘‘[4]

اس روایت سے واضح ہوا کہ جب بچہ والدین میں سے کسی کا محتاج نہ رہے تو اسے اختیار ہو گا کہ والدین میں

---

[1] جامع الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية الفرق بين الأخوين أو بين الوالدة وولدها في البيع، حديث: 1283. [2] سنن أبي داود، الطلاق، باب من أحق بالولد؟ حديث: 2276، ومسند أحمد: 182/2. [3] إعلام الموقعين: 258,257/3. [4] سنن أبي داود، الطلاق، باب من أحق بالولد، حديث: 2277.

سے جس کے ساتھ چاہے رہے۔ جب بچہ سمجھدار عمر کو پہنچ جائے گا تو اس کا کسی ایک کی طرف میلان اور اس کا انتخاب دلالت کرتا ہے کہ وہ اسے اپنے حق میں دوسرے سے زیادہ رحیم وشفیق سمجھتا ہے۔

الغرض سمجھدار بچے کو والدین میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار تب ہوگا جب دو شرطیں موجود ہوں گی:

① والدین میں سے ہر ایک پرورش کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

② بچہ سمجھدار اور عقل مند ہو۔ اگر وہ کم عقل (معتوہ) ہے تو وہ ماں کے پاس رہے گا کیونکہ ماں اسے زیادہ شفقت کرنے والی اور اس کی مصلحتوں کا خیال رکھنے والی ہوتی ہے۔

جب سمجھدار بچہ باپ کا انتخاب کرے گا تو دن رات اس کے ہاں رہے گا تاکہ باپ اس کی حفاظت کر سکے اور تعلیم وادب سکھانے کا بندوبست کر سکے لیکن وہ اسے ماں سے ملاقات کرنے سے نہ روکے کیونکہ ایسا کرنے سے بچہ والدہ کو ناراض کرنے اور قطع رحمی کا سبق سیکھتا ہے۔ اسی طرح ماں کا انتخاب کرنے کی صورت میں وہ رات کو اس کے پاس دن کو باپ کے پاس رہے گا تاکہ وہ اس کی تعلیم وتربیت جاری رکھ سکے۔ اگر وہ کسی کا بھی انتخاب نہ کرے تو والدین میں قرعہ اندازی کر لی جائے کیونکہ اب کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کی صورت قرعہ کے سوا اور کوئی نہیں۔

لڑکی سات برس کی ہو جائے تو وہ باپ کے پاس رہے گی حتی کہ اس کی شادی ہو جائے کیونکہ باپ اپنی بیٹی کی حفاظت اور سرپرستی دوسروں کی نسبت بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ ماں کو لڑکی کے ہاں آنے جانے سے روکا نہیں جائے کیونکہ وہ اس کی بیٹی ہے بشرطیکہ ملاقات سے کوئی خرابی اور بگاڑ پیدا نہ ہوتا ہو۔ اگر باپ بیٹی کی حفاظت کرنے سے عاجز ہو یا وہ مشغولیت یا دین کی کمی کی وجہ سے بے پروا ثابت ہوا ہو اور ماں نگرانی وحفاظت کر سکتی ہو تو بچی اپنی ماں کے پاس رہے گی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام احمد اور ان کے رفقاء کا یہی (درج بالا) نقطۂ نظر ہے۔ نیز فرماتے ہیں: ''جب یقین ہو کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کو دوسری بیوی کے پاس رکھے گا جو اس کے مصالح کا خیال نہیں رکھے گی بلکہ اسے تکلیف دے گی اور اس کی ضروریات زندگی پوری کرنے میں کوتاہی کرے گی جبکہ بچی کی حقیقی ماں اس کے مصالح وفوائد کا خیال رکھے گی اور اسے تکلیف نہ پہنچنے دے گی تو اس صورت میں پرورش کا قطعی حق ماں کو حاصل ہے۔''[1] واللہ أعلم.

① مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 34/132.

بیوی کے نان ونفقہ کا بیان

لغوی طور پر نفقے سے مراد درہم و دینار اور اس کے مثل اموال ہیں جبکہ شرعی طور پر نفقے سے مراد جس شخص کی کفالت کی ذمہ داری ہو اسے کھانا، پینا، لباس اور رہائش وغیرہ دینا ہے۔

انسان پر سب سے پہلے بیوی کا نفقہ واجب ہے، یعنی اسے کھانے، پینے، لباس اور ایسی رہائش دے جو اس کے لیے مناسب ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ﴾ ''کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

''اور دستور کے مطابق عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ»

''تم پر لازم ہے کہ اپنی بیویوں کو نان ونفقہ اور لباس جو مناسب ہو، مہیا کرو۔''[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ میں وہ تمام حقوق اور فرائض داخل ہیں جو بیوی سے متعلق ہیں، یعنی جو بیوی پر لازم ہیں اور جو بیوی کے لیے لازم ہیں۔ ان کا دارو مدار اور معیار وہ ہوگا جو لوگوں میں معروف ہے اور جسے وہ اہمیت دیتے ہیں اور جس پر خرچ کی بار بار ضرورت پیش آتی ہے۔''[4]

■ اگر خاوند اور بیوی میں نفقے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو حاکم زوجین یا کسی ایک کی امیری یا غریبی کو ملحوظ رکھ کر بیوی کا نفقہ متعین کرے گا۔

اگر کوئی مالدار عورت مالدار آدمی کی بیوی ہے تو اسے وہ حقوق ملیں گے جو اس جیسی امیر عورت کو اس معاشرے

---

[1] الطلاق 65:7. [2] البقرة 2:228. [3] صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: 1218، وسنن أبي داود، المناسك، باب صفة حجة النبي ﷺ، حديث: 1905. [4] مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 193/17، بتصرف.

میں حاصل ہیں، مثلاً: اچھے معیار کا نان ونفقہ، لباس ورہائش کی بہتر سہولتیں، گھر کا سامان اور قالین وغیرہ جو اس شہر میں معروف ہیں جہاں وہ رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر غریب عورت غریب آدمی کی بیوی ہو یا کوئی متوسط درجے کی عورت متوسط درجے کے شوہر کی بیوی ہو تو اسے اپنے شوہر کی حیثیت کے مطابق کھانے، پینے اور رہن سہن کے وہ حقوق حاصل ہوں گے جو اس علاقے میں معروف ہیں جہاں ان کا بسیرا ہے۔

اگر کوئی مالدار عورت غریب شخص کے نکاح میں ہے یا کوئی غریب عورت مالدار شخص کی بیوی ہے تو اسے متوسط درجے کی ضروریات زندگی دی جائیں۔

- خوراک، لباس اور رہائش کے علاوہ شوہر اپنی بیوی کو وہ اشیاء بھی مہیا کرے جو اس کی جسمانی صفائی کے لیے ضروری ہیں، مثلاً: تیل، صابن، پینے اور طہارت حاصل کرنے کے لیے صاف پانی وغیرہ۔
- مذکورہ اشیاء کا مہیا کرنا تب ہے جب عورت اس کے نکاح میں ہو اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی ہو تو اگر طلاق رجعی ہو تو جب تک عورت عدت میں ہو اس کے اخراجات اور حقوق ادا کرنا مرد پر واجب ہیں کیونکہ وہ اس کی بیوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ﴾ ''اور ان کے خاوند انھیں لوٹا لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔''[1]

- جس عورت کو طلاق بائن ہو چکی ہو اسے خاوند کی طرف سے نفقہ اور رہائش وغیرہ میں سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو جب ان کے خاوند نے طلاق بائن دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا نَفَقَةَ لَكِ وَلَا سُكْنٰى» ''تجھے نہ نفقہ ملے گا اور نہ رہائش۔''[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''جسے طلاق بائنہ ہو چکی ہو، اسے صحیح حدیث کے مطابق نان ونفقہ اور رہائش نہیں ملے گی بلکہ یہ مسئلہ کتاب اللہ اور قیاس کے عین مطابق ہے، نیز فقہائے محدثین کا بھی یہی مسلک ہے۔''[3]

- اگر مطلقہ بائنہ حاملہ ہو تو اسے نفقہ ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

''اگر وہ حمل سے ہوں تو جب تک وضع حمل نہ ہو، انھیں خرچ دیتے رہا کرو۔''[4]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① البقرة 228:2. ② صحيح البخاري، الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قيس رضى الله عنها...... ، حديث: 5324,5323، وصحيح مسلم، الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقه لها، حديث: 1480 واللفظ له. ③ إعلام الموقعين: 321/3. ④ الطلاق 6:65.

﴿ اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ ﴾

''تم اپنی طاقت کے مطابق جہاں رہتے ہو وہاں ان عورتوں کو بھی رکھو۔''[1]

نیز حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں:

«لَا نَفَقَةَ لَكِ إِلَّا أَنْ تَكُونِي حَامِلاً»

''تیرے لیے کوئی نفقہ نہیں، البتہ اگر تو حاملہ ہوتی تو تجھے نفقہ ضرور ملتا۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ''حمل'' طلاق دینے والے کی اولاد ہے، لہٰذا اس کے لیے اس کے باپ پر نفقہ واجب ہے۔ اب اس کی یہی صورت ہے کہ بچے کی ماں پر مال خرچ کرے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلے پر اہل علم کا اجماع ہے، البتہ اس مسئلے میں علماء میں اختلاف یہ ہے کہ نفقہ حمل کا حق ہے یا حمل کی وجہ سے حاملہ کا۔''[3]

اس اختلاف کی تفصیل اور دلائل معلوم کرنے کے لیے فقہ کی بڑی کتب کی طرف رجوع کیا جائے۔

▲ متعدد اسباب کی وجہ سے بیوی حق نفقہ سے محروم ہو جاتی ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

① جب عورت کو خاوند کے پاس جانے سے روک دیا جائے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمے نہ رہے گا کیونکہ نفقہ فائدہ اٹھانے کے عوض میں تھا جو اب حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

② جب عورت خاوند کی نافرمان ہو جائے تو اس کا ''حق نفقہ'' ساقط ہو جائے گا، مثلاً: وہ شوہر کے بستر پر نہ آئے یا شوہر کے ساتھ ایسی جگہ رہائش اختیار نہ کرے جو اس کے لیے مناسب ہے یا وہ خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلتی ہو۔

③ اگر عورت اپنے کسی خاص کام کے لیے سفر پر چلی گئی تب بھی اسے نفقہ نہیں ملے گا کیونکہ اس نے اپنے وجود کو خاوند سے ایسے سبب کی بنا پر دور کیا ہے جو اس کی ذات کی طرف سے تھا نہ کہ شوہر کی طرف سے۔

▲ جس عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو اسے خاوند کے ترکہ سے نفقہ نہیں ملے گا کیونکہ اس کے خاوند کا مال اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنے اخراجات خود برداشت کرے یا اگر تنگ دست ہو تو اس کا ولی اسے نفقہ دے گا۔

▲ جس حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہو اسے شوہر کے ترکہ میں سے حمل کا حصہ بطور نفقہ ملے گا بشرطیکہ فوت شدہ شوہر کا ترکہ ہو ورنہ حمل کا مالدار وارث حاملہ کا نفقہ برداشت کرے گا۔

① الطلاق 6:65. ② سنن أبي داود، الطلاق، باب في نفقة المبتوتة، حديث: 2290. ③ المغني والشرح الكبير: 292/9.

▲ اگر خاوند اور بیوی نفقے کی ایک مقدار یا قیمت پر متفق ہو جائیں یا اس کی ادائیگی میں نقد یا زیادہ یا تھوڑے عرصے تک ادھار پر رضامند ہو جائیں تو جائز ہے کیونکہ یہ خالص ان کا حق ہے۔ اگر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے تو روزانہ صبح کے وقت اس دن کا مطلوبہ خرچ دے دیا جائے۔ اور اگر اناج لینے پر متفق ہو جائیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس میں تکلف بھی ہوتا ہے اور خرچ بھی آتا ہے، اس لیے اگر عورت اس پر راضی ہو تو قبول کر سکتی ہے۔

▲ خاوند پر لازم ہے کہ ہر سال شروع ہی میں پورے سال کے لیے لباس مہیا کر دے۔ اگر کوئی شخص غائب ہو گیا اور اس نے بیوی کے لیے نفقہ وغیرہ کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا یا وہ خود موجود تھا لیکن اس نے بیوی کو نفقہ نہیں دیا تو ایسی حالت میں گزرے ہوئے تمام ایام کا خرچہ دینا اس پر واجب ہے کیونکہ یہ خاوند کی ذمہ داری ہے، وہ امیر ہو یا غریب، لہٰذا ایام بیت جانے کی وجہ سے حق نفقہ ختم نہیں ہوگا۔

▲ شوہر پر بیوی کا نفقہ اس وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب اس نے خود کو شوہر کے حوالے کر دیا۔ اگر اس کے پاس نفقہ دینے کی گنجائش نہ ہو تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو نفقہ نہیں دے سکتا، فرمایا: [يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا] ''ان میں تفریق کر دی جائے۔''[1]

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ ''یا تو اچھائی سے روکے یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دے۔''[2]

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کو بسانے کے لیے اپنے پاس رکھنا لیکن نفقہ وغیرہ نہ دینا یہ صورت معروف طریقے سے بسانے والی نہیں ہے۔

▲ اگر شوہر امیر ہے لیکن وہ غائب ہو گیا اور وہ بیوی کے لیے کوئی نفقہ چھوڑ کر بھی نہیں گیا اور وہ اس کے مال میں سے وصول کرنے یا اس کے نام سے قرض لینے کی طاقت نہیں رکھتی تو حاکم کی اجازت کے ساتھ بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا۔ اگر اس کے ہاتھ میں شوہر کا مال آ جائے تو بقدر ضرورت لے سکتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے سیدہ ہند رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا:

«خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ»

''جس قدر تجھے اور تیری اولاد کو مال کفایت کرے اس قدر مناسب طریق سے لے سکتی ہو۔''[3]

واضح رہے یہ بات آپ ﷺ نے اس وقت فرمائی جب سیدہ ہند رضی اللہ عنہا نے کہا تھا کہ اس کا شوہر اسے اور اس کی

[1] السنن الكبرى للبيهقي:7/470,469. [2] البقرة2:229. [3] صحيح البخاري، النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل ......، حديث:5364.

اولاد کو بقدر ضرورت اخراجات کے لیے مال نہیں دیتا۔

یہ جملہ احکام ''شریعت اسلامی'' کے کامل ہونے پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ہر حق والے کو اس کا حق دینے کی رغبت دلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شریعت کا مقام دوسری شریعتوں سے بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا دے جو اسے چھوڑ کر کافرانہ قوانین اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ ﴾

''کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔''[1]

اقرباء اور غلاموں کو نان ونفقہ دینے کا بیان

یہاں اقرباء سے مراد انسان کے وہ قریبی رشتے دار ہیں جو صاحب فرض یا عصبہ کی حیثیت سے وارث ہوتے ہیں۔ اور ''مملوک'' سے مراد غلام، لونڈی اور چوپائے وغیرہ ہیں۔

اقرباء پر خرچ کرنا تب واجب ہے جب وہ:

① بنیادی نسبی تعلق رکھتے ہوں، مثلاً: خرچ کرنے والے کے والدین، دادا اور پردادا وغیرہ۔ اسی طرح اس کی اولاد بیٹا، بیٹی، پوتا اور پوتی وغیرہ۔

② جس پر خرچ کیا جائے وہ اس قدر تنگ دست ہو کہ کسی شے کا مالک نہ ہو یا بقدر کفایت مال کا مالک نہ ہو اور کام کاج کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

③ خرچ کرنے والا مالدار ہو، اس کے پاس اس قدر مال ہو جو اس کے اور اس کے اہل وعیال اور مملوک کی حاجت وضرورت سے زائد ہو۔

④ خرچ کرنے والے اور جس پر خرچ کیا جا رہا ہے دونوں کا دین ایک ہو۔

⑤ جس فرد پر خرچ کیا جائے اگر وہ خرچ کرنے والے کی اولاد یا آباء واجداد میں سے نہیں تو ایک اضافی شرط یہ ہے کہ خرچ کرنے والا اس کے ورثاء میں سے ہو۔

▲ والدین پر بقدر ضرورت خرچ کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

① المآئدة 5:50.

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ ''اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔''①

واضح رہے والدین پر مال خرچ کرنا حسن سلوک میں شامل ہے بلکہ ان کے ساتھ بہت بڑا احسان ہے۔

◄ والدین پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی اولاد پر مال خرچ کریں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ﴾

''اور باپ کے ذمے ہے کہ ان (کی ماؤں) کو دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا دے۔''②

واضح رہے والدین کے ذمے اولاد کا خرچ اس قدر واجب ہے جو ان کی حسب طاقت ہو اور اس شہر کے باشندوں میں معروف ہو۔ اس میں نہ فضول خرچی ہو اور نہ کنجوسی سے کام لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ ہند رضی اللہ عنہا سے کہا تھا:

«خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ»

''خاوند کے مال میں سے اس قدر لے سکتی ہو جو تجھے اور تیری اولاد کے لیے مناسب اور کافی ہو۔''③

◄ خرچ کرنے والا اپنے جن اقرباء کا صاحب فرض یا عصبہ کی حیثیت سے وارث ہوتا ہے اگر وہ محتاج ہوں تو بقدر استطاعت ان کی ضروریات کو پورا کرنا اس پر فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ﴾ ''وارث پر بھی اس جیسی ذمے داری ہے۔''④

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ باہم وارث بننے والوں کے درمیان جو قرابت ہے وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ خرچ کرتے وقت وارث کا غیر وارث کی نسبت زیادہ خیال رکھا جائے۔ علاوہ ازیں اس میں صلہ رحمی بھی ہے، جس کی دین اسلام میں نہایت اہمیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ ﴾ ''اور رشتے داروں کا حق ادا کرتے رہو۔''⑤

مزید برآں بہت سی ایسی آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مالدار لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے محتاج اقرباء پر خرچ کریں۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ . . . » ''تیری والدہ، تیرا والد، تیری بہن اور تیرا بھائی......''⑥

ایک اور روایت میں ہے:

① الأنعام 6:151. ② البقرة 2:233. ③ صحيح البخاري، النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل......، حديث: 5364.
④ البقرة 2:233. ⑤ بنى إسرآء يل 17:26. ⑥ سنن أبي داود، الأدب، باب في برالوالدين، حديث: 5140.

«وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، أُمَّكَ وَأَبَاكَ وأُخْتَكَ وَأَخَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ»

''اس سے ابتدا کر جس کا نان ونفقہ تیرے ذمے ہے، یعنی تیری والدہ، تیرا والد، تیری بہن اور تیرا بھائی، پھر اس کے بعد کے قریبی رشتے دار کو دو۔''[1]

درحقیقت یہ روایت اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ کی وضاحت کر رہی ہے۔

◢ والد کا فرض ہے کہ وہ اکیلا اپنی اولاد کے جملہ اخراجات (نان ونفقہ وغیرہ) پورے کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ ہند رضی اللہ عنہا کو یہی بات کہی تھی کہ [خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ] اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ اکیلے باپ پر لازم ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا نفقہ برداشت کرے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

''اور باپ کے ذمے ہے کہ ان (کی ماؤں) کو دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا دے۔''[2]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾

''اگر تمھارے کہنے سے وہی دودھ پلائیں تو تم ان کو ان کی اجرت دے دو۔''[3]

اس آیت سے واضح ہوا کہ بچے کی رضاعت کے اخراجات اس کے باپ کے ذمے ہیں ماں کے ذمے نہیں۔

◢ اگر کسی فقیر شخص کے اقرباء مالدار ہوں (ان میں باپ نہ ہو) تو اسے نان ونفقہ مہیا کرنے میں سب رشتے دار شریک ہوں گے اور وہ اس قدر حصہ ڈالیں گے جس قدر اس کی وراثت میں ان کا حصہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نفقہ مہیا کرنے کی مقدار کا دارومدار اس کے حق وراثت پر رکھا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ ''وارث پر بھی اسی جیسی ذمے داری ہے۔''[4]

مثلاً: کسی شخص کی دادی اور اس کا سگا بھائی دونوں مالدار ہوں تو دادی اس فقیر شخص کی ضروریاتِ زندگی کا چھٹا حصہ پورا کرے باقی مال سگا بھائی مہیا کرے گا کیونکہ یہ فقیر شخص اگر مال چھوڑ کر مر گیا تو اس کے ترکہ میں سے ان دونوں کا حصہ اسی قدر ہے۔

◢ جہاں تک غلاموں اور لونڈیوں کے نفقہ ولباس وغیرہ اور جانوروں کو خوراک وغیرہ مہیا کرنے کا مسئلہ ہے تو اس کی ذمے داری ان کے مالک پر ہے کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

① سنن النسائي، الزكاة، باب أيتهما اليد العليا، حديث: 2533. ② البقرة 233:2. ③ الطلاق 6:65. ④ البقرة 233:2.

«لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ، وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ مَا لَا يُطِيقُ»

''مملوک کا کھانا اور اس کا لباس وغیرہ اس کے مالک کے ذمے ہے جو معروف طریقے سے ہو اور اس پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالا جائے۔''[1]

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَّا يَغْلِبُهُمْ»

''تمھارے خدام تمھارے بھائی ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے ماتحت کیا ہے، اگر تمھارا کوئی بھائی تمھارے ماتحت ہو تو اسے وہ کچھ کھلاؤ جو خود کھاؤ اور ویسا ہی لباس پہناؤ جیسا خود پہنو اور انھیں ایسے کاموں کی تکلیف نہ دو جن کا سرانجام دینا ان کی طاقت سے بڑھ کر ہو۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾

''ہم اسے بخوبی جانتے ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں (احکام) مقرر کر رکھے ہیں۔''[3]

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ غلام اور لونڈی کا نان ونفقہ ان کے مالک کے ذمے ہے۔

- اگر غلام نے نکاح کا مطالبہ کیا تو اس کے مالک کو چاہیے کہ اس کی شادی کرے یا اسے فروخت کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ﴾

''تم میں سے جو مرد وعورت بے نکاح کے ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیکو کار غلام اور لونڈیوں کا بھی۔''[4]

آیت میں صیغۂ امر وجوب کا متقاضی ہے۔

- اگر لونڈی کا بھی اسی قسم کا مطالبہ ہو تو اس کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ اس سے وطی کرے یا اس کی کسی دوسری

---

[1] صحیح مسلم، الأیمان، باب إطعام المملوك مما يأكل ......، حدیث: 1662، ومسند أحمد: 247/2 واللفظ له.

[2] صحیح البخاري، الإیمان، باب المعاصي من أمر الجاهلية ......، حدیث: 30. [3] الأحزاب 50:33. [4] النور 32:24.

جگہ شادی کر دے یا اسے فروخت کر دے تاکہ اس کے فطری جذبات کی تسکین ہو۔

◄ جو شخص کسی جانور، چوپائے کا مالک ہو اس پر لازم ہے کہ اسے چارہ کھلائے، پانی پلائے اور اس کی جملہ امور میں حفاظت ونگرانی کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ جُوعًا ، فَلَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا وَلَا هِيَ أَرْسَلَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ»

''ایک عورت کو اس لیے عذاب دیا گیا کہ اس نے بلی کو باندھ کر رکھا حتی کہ وہ بھوک سے مرگئی، نہ اس نے اسے کچھ کھلایا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا پی لیتی۔''[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی حیوان کسی کی ملکیت میں ہے تو وہ اس کا پورا پورا خیال رکھے اور اسے بلاوجہ تکلیف نہ دے۔ اگر بلی کو تکلیف دینے کی وجہ سے جہنم کا عذاب ہو سکتا ہے تو دیگر حیوانات میں تو بالاولی عذاب ہوگا۔

◄ جانور کے مالک کو چاہیے کہ اس پر اس کی طاقت سے زیادہ وزن نہ ڈالے کیونکہ اس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے اور بلاوجہ تکلیف دینا جائز نہیں۔

◄ مالک اپنے جانور کا دودھ اس قدر نہ دوہے کہ اس کے بچے کو تکلیف ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ تکلیف اٹھاؤ اور نہ تکلیف پہنچاؤ۔''[2]

◄ جانور پر لعنت کرنا، اس کے چہرے پر مارنا یا چہرے کو آگ سے داغنا حرام ہے۔ اگر جانور کا مالک جانور کی ضروریات پوری کرنے سے عاجز ہو تو اسے مجبور کیا جائے گا کہ اسے فروخت کرے یا اجرت پر دے یا پھر اسے ذبح کرے بشرطیکہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہو کیونکہ اسے اپنی ملکیت میں برقرار رکھ کر اس کی طبعی وفطری ضروریات کو پورا نہ کرنا ظلم ہے اور ظلم کا خاتمہ ضروری ہے۔

① صحيح البخاري، المساقاة، باب فضل سقي الماء، حديث:2365,2364، وصحيح مسلم، السلام، باب تحريم قتل الهرة، حديث:2242، ومنار السبيل، حديث: 2182 واللفظ له. ② سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، حديث:2340.

باب 14

قصاص اور جرائم کا بیان

قتل کے احکام اور اس کی اقسام

جنایات، جنایة کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں: ''کسی کے بدن، مال یا عزت پر تجاوز کرنا۔'' فقہائے کرام نے جسمانی نقصان سے متعلق شرعی مسائل کو کتاب الجنایات کے تحت بیان کیا ہے جبکہ باقی دو قسموں (کسی کے مال یا عزت کو نقصان پہنچانا) کو کتاب الحدود کا عنوان دیا ہے۔

کسی شخص کو بدنی طور پر نقصان پہنچایا جائے تو اس میں قصاص یا دیت اور کفارہ لازم آتا ہے۔ تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا حرام ہے۔ اس کی دلیل کتاب وسنت میں موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾

''اور جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اسے قتل مت کرو، ہاں! مگر حق کے ساتھ۔''[1]

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ . . . إِلَّا بِإِحْدٰى ثَلَاثٍ : اَلثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ»

''کسی مسلمان آدمی کا خون بہانا حلال نہیں سوائے تین قسم کے گناہوں میں سے کسی ایک گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے: شادی شدہ زنا کرے یا کوئی کسی کو قتل کر دے یا دین کو چھوڑ دے اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو جائے۔''[2]

جس شخص نے کسی مسلمان کو ناجائز قتل کیا، اس کے بارے میں انتہائی سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾

''اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[3]

① الأنعام 151:6. ② صحيح مسلم، القسامة، باب ما يباح به دم المسلم؟ حديث: 1676. ③ النسآء 93:4.

◄ مسلمان کو ناجائز قتل کرنے والا شخص فاسق ہے کیونکہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے، نیز اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، چاہے تو عذاب دے اور اگر چاہے تو اسے معاف کردے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾

''یقیناً اللہ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جو چاہے بخش دیتا ہے۔''[1]

یہ سزا تب ہے جب وہ توبہ نہ کرے اگر توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○﴾

''(میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش (اور) بڑی رحمت والا ہے۔''[2]

واضح رہے کہ توبہ کرنے سے آخرت میں مقتول کا حق قاتل کے ذمے سے ختم نہ ہوگا بلکہ مقتول قاتل کی نیکیوں میں سے اس قدر حصہ لے گا جس قدر اس پر ظلم ہوا تھا یا پھر اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے مقتول کو قاتل کی طرف سے خاص جزا و انعام دے دے گا۔

یاد رہے مقتول کا حق قصاص لینے سے بھی ختم نہ ہوگا کیونکہ قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا حق ہے جو ان کو صدمہ اور نقصان پہنچانے کے عوض میں ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تحقیقی بات یہ ہے کہ قتل سے متعلق تین حقوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حق، مقتول کا حق اور ولی کا حق۔ جب قاتل نادم ہو کر اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے خود کو ولی کے حوالے کردے اور صحیح توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ اولیاء کا حق قصاص لینے یا صلح کرنے یا قاتل کو معاف کر دینے سے ادا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا مقتول کا حق تو اللہ تعالیٰ اپنے توبہ کرنے والے (قاتل) بندے کی طرف سے مقتول کو عوض ادا کردے گا اور ان کے درمیان صلح کرا دے گا۔''[3]

◄ اکثر اہل علم کے ہاں قتل کی تین قسمیں ہیں: قتل عمد، قتل شبہ عمد، قتل خطا۔ قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ

[1] النسآء 48:4. [2] الزمر 53:39. [3] الجواب الكافي لابن القيم، ص: 208,207.

مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ط وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ز تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○﴾

’’کسی مومن کو دوسرے مومن کا قتل کر دینا زیبا نہیں مگر غلطی سے ہو جائے (تو اور بات ہے۔) جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں اور اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا ہو اور وہ مسلمان ہو تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنا لازمی ہے اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (بھی ضروری ہے) پس جو نہ پائے اس کے ذمے دو مہینے کے لگاتار روزے ہیں، اللہ سے بخشوانے کے لیے اور اللہ بخوبی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے، اور اس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار رکھا ہے۔‘‘[1]

البتہ قتل شبہ عمد سنت مطہرہ سے ثابت ہے، چنانچہ عمرو بن شعیب کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

«عَقْلُ شِبْهِ الْعَمْدِ مُغَلَّظٌ، مِثْلُ عَقْلِ الْعَمْدِ وَلَا يُقْتَلُ صَاحِبُهُ . . . وَذٰلِكَ أَنْ يَنْزُوَ الشَّيْطَانُ بَيْنَ النَّاسِ فَتَكُونَ دِمَاءٌ فِي عِمِّيًّا فِي غَيْرِ ضَغِينَةٍ وَّلَا حَمْلِ سِلَاحٍ»

’’قتل شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی طرح سخت ہے، البتہ اس میں قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا...... اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان دو آدمیوں کے درمیان کود پڑتا ہے جس کے نتیجے میں قتل کا ارتکاب ہو جاتا ہے، حالانکہ ان دونوں (قاتل اور مقتول) کے درمیان پہلے سے دشمنی نہیں تھی اور ہتھیار بھی نہیں اٹھائے گئے۔‘‘[2]

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’(بعض صورتوں میں) غلطی سے ہو جانے والا قتل جو قتل عمد سے مشابہ ہو اسے شبہ عمد کہتے ہیں، مثلاً: جو کوڑا یا عصا لگنے سے قتل ہو جاتا ہے۔ اس میں دیت سو

[1] النسآء 4:92، 93. [2] سنن أبي داود، الديات، باب ديات الأعضاء، حديث:4565، ومسند أحمد 2:183.

اونٹ ہیں جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی۔''[1]

قتل عمد یہ ہے کہ مجرم کسی بے گناہ شخص کو یہ جانتے ہوئے قتل کر دے کہ وہ انسان ہے اور وہ ایسی شے (آلہ) استعمال کرے جس سے قتل ہو جانے کا گمان غالب ہو۔

اس تعریف سے ثابت ہوا کہ کوئی بھی قتل ''قتل عمد'' تب ہوگا جب اس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

① قاتل نے قتل ارادے کے ساتھ کیا ہو۔

② قاتل کو معلوم ہو کہ اس نے جسے قتل کیا ہے وہ انسان ہے اور (فی الحقیقت) قصوروار نہ تھا بلکہ معصوم تھا۔

③ قتل میں جو آلہ استعمال کیا گیا وہ ایسا ہو جس سے عام طور پر آدمی قتل ہو سکتا ہو، وہ آلہ دھار والا ہو یا بغیر دھار کے۔

اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی کم ہو تو قتل عمد نہ ہوگا کیونکہ عدم ارادہ سے قصاص لازم نہیں آتا۔ اگر کوئی ایسے ہتھیار کے سبب قتل ہوا جس سے عام طور پر کوئی قتل نہیں ہو سکتا تو اسے اتفاقی قتل قرار دیا جائے گا، یعنی قتل خطا قرار پائے گا قتل عمد نہیں۔

تحقیق واستقرا سے معلوم ہوا کہ قتل عمد کی درج ذیل نو صورتیں ہیں:

① کسی کو ایسے ہتھیار کے ساتھ زخم لگایا جائے جو جسم میں داخل ہو جاتا ہو، مثلاً: چھری، کانٹا یا تیز آلات وغیرہ۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس صورت کے قتل عمد ہونے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

② کسی کو بھاری بھرکم شے سے زخمی کیا جائے، مثلاً: پتھر وغیرہ۔ اگر پتھر چھوٹا ہو تو مر جانے کی صورت میں قتل عمد نہ ہوگا الا یہ کہ پتھر جسم کے اس حصے پر مارا جائے جہاں چوٹ لگنے سے موت واقع ہو جاتی ہے یا وہ پہلے ہی انتہائی کمزور ہو، مثلاً: بیمار ہو، بچہ ہو، بوڑھا ہو یا گرمی سردی لگنے سے کمزور ہو گیا ہو یا اسے چھوٹا پتھر بار بار مارا گیا حتی کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ اسی طرح کسی نے ایک شخص پر دیوار گرا دی یا گاڑی چڑھا دی یا دھکا دے کر بلندی سے گرا دیا اور وہ مر گیا تو یہ قتل عمد ہے۔

③ کوئی کسی کو چیر پھاڑ کرنے والے خونخوار جانور کے آگے پھینک دے، مثلاً: شیر، سانپ وغیرہ۔ ان جانوروں کے آگے کسی کو جان بوجھ کر اور ارادتاً پھینکنا اسے عمداً قتل کرنے کے مترادف ہے۔

④ کسی کو ایسی آگ یا پانی میں ڈال دیا جائے جس سے اس کا نکلنا ناممکن ہو۔

---

① سنن أبي داود، الديات، باب في دية الخطأ شبه العمد، حديث :4547، وسنن النسائي، القسامة، باب كم دية شبه العمد ......؟ حديث:4795، وسنن ابن ماجه، الديات، باب دية شبه العمد مغلظة، حديث :2627.

⑤ کسی کا رسی وغیرہ سے گلا گھونٹ دینا یا اس کی ناک اور منہ بند کر دینا حتی کہ وہ مر جائے، قتل عمد ہے۔

⑥ کسی کو باندھ دینا یا کمرے میں بند کر دینا اور اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دینا حتی کہ وہ مر جائے قتل عمد ہے۔

⑦ جادو کا ایسا طریقہ اختیار کرنا جو عموماً موت کا سبب ہو اور جادو کرنے والے کو علم بھی ہو کہ اس سے انسان مر جاتے ہیں، قتل عمد ہے۔

⑧ کسی کو زہر پلا دینا یا کھانے پینے کی اشیاء میں عمداً زہر ملا کر کسی کو کھلا پلا دینا جس سے وہ مر جائے اور پینے والے کو علم نہ ہو کہ اس میں زہر تھا، قتل عمد ہی کی شکل ہے۔

⑨ کچھ افراد جھوٹی گواہی دے کر کسی پر ایسے جرم کے ارتکاب کا الزام لگا دیں جس کی حد قتل ہو، مثلاً: زنا، مرتد ہونا یا کسی کو قتل کرنا اور ان لوگوں کی گواہی کے سبب ملزم کو قتل کر دیا جائے، پھر گواہان اپنی گواہی سے رجوع کر لیں اور تسلیم کریں کہ ہم نے ارادتاً ایسا کیا تھا تو وہ سب قتل کیے جائیں گے کیونکہ وہ اسے قتل کروانے کا سبب بنے ہیں۔

▲ فقہائے کرام نے قتل شبہ عمد کی تعریف یوں کی ہے: ''کوئی کسی کو ناحق یا تادیباً سزا دینے کی خاطر ایسی شے سے ضرب لگائے جس سے عموماً آدمی مرتا نہ ہو لیکن وہ مر جائے۔'' جنایات کی اس قسم کو شبہ عمد اس لیے کہا جاتا ہے کہ جنایت کرنے والے نے سزا دینے کا تو ارادہ کیا تھا لیکن قتل کرنا مقصد نہ تھا۔

ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے کسی کو ایسی شے سے ضرب لگائی جس سے عام طور پر آدمی قتل نہیں ہوتا لیکن وہ مر گیا تو اس کا حکم قتل عمد اور قتل خطا کے درمیان ہے۔ وہ قتل عمد ہے کیونکہ اس کا مقصد اسے ہتھیار سے ضرب لگانا تھا اور قتل خطا بھی ہے کیونکہ اس سزا سے اس کا مقصد قتل کرنا نہ تھا۔''[1]

''شبہ عمد'' کی چند مثالیں یہ ہیں: کسی کو کوڑا مارا گیا یا چھوٹی لاٹھی سے ضرب لگائی (جس سے عادتاً انسان قتل نہیں ہوتا)۔ مکا یا تھپڑ مارا یا اس کے ساتھ اپنا سر ٹکرایا جس کے نتیجے میں وہ مر گیا تو یہ شبہ عمد ہے۔ اس صورت میں قصوروار کے مال میں سے کفارہ دینا لازم آتا ہے۔ اور وہ ہے غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا ہے جیسا کہ قتل خطا میں واجب ہوتا ہے اور شبہ عمد میں قتل خطا کی نسبت بھاری دیت ہے جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہُذیل قبیلے کی دو عورتیں باہم لڑ پڑیں تو ایک نے دوسری کو پتھر مارا جس سے وہ عورت اور اس کے پیٹ میں موجود بچہ دونوں ہی مر گئے۔

«قَضٰى أَنَّ دِيَةَ الْمَرْأَةِ عَلٰى عَاقِلَتِهَا»

① بداية المجتهد :2/704.

''رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ دیا کہ عورت کی دیت قتل کرنے والی عورت کے عصبہ ادا کریں۔''[1]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ قتل شبہ عمد میں قصاص نہیں ہوتا، نیز اس کی دیت قصور وار کے عاقلہ (عصبہ) پر ہے۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دیت عاقلہ پر ہے۔'' اور ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔

- فقہائے کرام نے قتل خطا کی تعریف یوں کی ہے: ''کسی انسان سے جائز اور مباح کام کرتے وقت بلا ارادہ غلطی سے کوئی آدمی قتل ہو گیا یا زخمی ہوا، پھر مر گیا، مثلاً: وہ شکار کو گولی مار رہا تھا یا نشانہ بازی کر رہا تھا کہ غلطی سے معصوم جان قتل ہو گئی یا دوران جنگ میں کسی مسلمان کو کافر سمجھ کر قتل کر دیا گیا۔
- بچہ یا دیوانہ عمداً قتل کر دے تو وہ قتل خطا میں شمار ہو گا کیونکہ ان کے کام میں ارادہ شامل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کا قتل عمد عاقل بالغ شخص کے قتل خطا کے مساوی ہے۔
- قتل سبب بھی قتل خطا کے حکم میں ہے، مثلاً: کسی نے کنواں بنایا یا راستے میں کوئی گڑھا کھودا یا راستے میں گاڑی کھڑی کر دی جس کے سبب کوئی انسان مر گیا۔[2]
- قتل خطا میں قاتل کے مال سے کفارہ ادا ہو گا اور وہ ہے مومن غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو وہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے دیت اس کے ''عاقلہ'' یعنی مذکر عصبات ادا کریں گے۔
- جس نے میدان جنگ میں کفار کی صف میں کسی مسلمان کو کافر سمجھ کر قتل کر دیا تو اس پر صرف کفارہ لازم آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝﴾

[1] صحيح البخاري، الديات، باب جنين المرأة وأن العقل على الوالد ......، حديث: 6910، وصحيح مسلم، القسامة، باب دية الجنين ......، حديث: 1681.

[2] جمہور علمائے کرام نے بچے یا دیوانے کے قتل کو یا ''قتل سبب'' کا باعث بننے والے کو مرفوع القلم قرار دیا ہے، یعنی ان پر کچھ بھی لازم نہیں آتا۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لیے ''تفہیم المواریث'' دیکھیے۔ (صارم)

’’جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے، ہاں! یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں اور اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنا لازمی ہے۔ اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (بھی ضروری ہے) پس جو نہ پائے اس کے ذمے دو مہینے کے لگا تار روزے ہیں اللہ سے بخشوانے کے لیے اور اللہ بخوبی جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔‘‘[1]

اس آیت میں قتل خطا کو تین صورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

① جس میں قاتل پر کفارہ اور اس کے عاقلہ (عصبات) پر دیت فرض ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی مومن کو کفار کی صف کے سوا کسی اور جگہ خطأً قتل کر دے۔ یا مقتول ایسی کافر قوم میں سے ہو کہ ان کے درمیان اور ہمارے درمیان معاہدہ ہو۔

② جس میں قاتل پر صرف کفارہ (مومن غلام کی آزادی) ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافروں کی صف میں کھڑا دیکھے اور پھر اسے لاعلمی میں کافر سمجھ کر قتل کر دے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی کتاب ’’تفسیر فتح القدیر‘‘ میں آیت: ﴿فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ’’اگر مقتول کا تعلق ایسی دشمن قوم سے ہو جو حربی کافر ہوں لیکن وہ مسلمان ہو کر انھی میں رہے اور ہجرت نہ کرے۔ مسلمان سمجھیں کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا اور اپنے آبائی دین پر قائم ہے، پھر اسے کسی موقع پر قتل کر دیں تو قاتل پر دیت لازم نہ ہوگی بلکہ وہ ایک مومن غلام یا مومنہ لونڈی آزاد کرے گا۔ اہل علم کے درمیان یہاں نکتہ اختلاف یہ ہے کہ دیت کے ساقط ہونے کی وجہ کیا ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ مقتول کے سرپرست کافر ہیں، لہٰذا دیت میں ان کا کوئی حق نہیں۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مقتول شخص ایمان لایا لیکن اس نے ہجرت نہیں کی، لہٰذا اس کا مقام و مرتبہ دوسرے مسلمانوں کی نسبت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾

’’اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی تمھارے لیے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں۔‘‘[2]

اس کے بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ مقتول کی دیت ادا کی جائے گی جو بیت المال میں جمع ہوگی۔‘‘[3]

① النسآء4:92. ② الأنفال8:72. ③ تفسیر فتح القدیر، النسآء4:92.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آیت کریمہ کا یہ حکم اس مسلمان شخص کے لیے ہے جو کافروں میں رہنے پر مجبور اور معذور ہو، مثلاً: قیدی ہو یا وہ مسلمان جو کفار کی صفوں سے نہیں نکل سکتا اور ہجرت بھی نہیں کر سکتا، البتہ ایسا مسلمان شخص جو اپنی مرضی سے کفار کی صفوں میں کھڑا ہے تو اس کی کوئی ضمان نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس نے خود اپنے آپ کو بغیر کسی عذر کے معرض ہلاکت میں رکھا ہے۔''

◣ قاتل کے عاقلہ، یعنی برادری پر دیت واجب ہونے کی دلیل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنولحیان کی ایک عورت کے بچے کے بارے میں فیصلہ دیا، جسے اس کی ماں کے پیٹ میں مار دیا گیا کہ اس کے بدلے غلام یا لونڈی ادا کی جائے، پھر یوں ہوا کہ جس عورت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے غلام یا لونڈی کا فیصلہ کیا تھا وہ عورت بھی مر گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مرنے والی عورت کی میراث اس کے بیٹوں اور خاوند کو ملے گی۔ باقی رہی دیت تو وہ اس (قاتلہ) کے عصبہ ادا کریں گے۔''[1]

اس حدیث شریف سے واضح ہوا کہ قتل خطا میں دیت عاقلہ پر ہے، اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس شخص سے غلطی سرزد ہوئی ہے اس شخص پر دیت لازم کرنے میں عظیم نقصان ہے کیونکہ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہ تھا۔ محض خطا سے قتل کا صدور ہوا ہے اور خطائیں تو انسان سے اکثر وقوع پذیر ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس کی غلطی کا بوجھ اس اکیلے پر ڈال دینا اس پر مالی زیادتی ہے۔

اسی طرح مقتول کی جان بھی تو محترم تھی، لہٰذا اس کا بدل و معاوضہ بھی ضروری ہے۔ اگر اس کا خون رائیگاں قرار دیا جائے تو اس کے ورثاء کا نقصان ہے بالخصوص اس کے اہل و عیال کا، لہٰذا شارع نے دیت ان لوگوں پر واجب قرار دی ہے جو قاتل کے سرپرست اور مددگار ہیں۔ وہ مل کر ادائیگی دیت میں اس کی مدد کریں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی فقیر کو نان و نفقہ دینا یا قیدی ہو تو اس کے عصبہ رشتے داروں کا فرض ہے کہ اسے چھڑانے کی کوشش کریں۔ قاتل مر جائے گا تو وارث بھی عاقلہ ہی ہوں گے، لہٰذا اب قتل خطا میں بوجھ بھی وہی برداشت کریں۔ مثل مشہور ہے ''جو فائدہ حاصل کرے وہ تاوان بھی بھرے۔'' واللّٰہ أعلم.

◣ قاتل پر کفارے کا بوجھ درج ذیل امور کی وجہ سے ہے:

① مرنے والی جان قابل احترام تھی۔

② قتل میں قاتل کی کوتاہی ضرور شامل ہے، وہ اس سے مبرا نہیں۔

[1] صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث المرأة والزوج مع الولد وغيره، حديث: 6740، وصحيح مسلم، القسامة، باب دية الجنين ...... ، حديث: 1681.

③ اگر قاتل کے ذمے دیت نہیں تو اس پر کچھ نہ کچھ تاوان پڑنا چاہیے اور یہ کفارے کا بوجھ ہے۔

▲ عاقلہ کو دیت کی ادائیگی کا ذمے دار بنانے اور قاتل پر کفارہ ڈالنے میں کئی ایک حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔اللہ تعالیٰ جو عظیم و برتر ہے اس نے اپنے بندوں کی دینی و دنیاوی مصلحتوں اور منافع کا کس قدر خیال رکھا ہے۔

▲ عاقلہ (عصبہ) میں غلام ، بچہ ، نادار ، دیوانہ ،عورت اور دوسرے مذہب کا آدمی شامل نہیں کیونکہ یہ افراد مدد و تعاون کرنے والوں میں داخل وشامل نہیں ہوتے۔

▲ قتل خطا کی دیت تین سال کے اندر اندر ادا کرنا ضروری ہے۔حاکم کو چاہیے کہ وہ قاتل کے ہر عصبہ پر دیت کا اس قدر حصہ دینا مقرر کرے جو اس کی استطاعت میں ہو، نیز سب سے پہلے قاتل کے قریب ترین عصبہ پر ذمے داری ڈالے اگر وہ نہ ہوں تو اس سے دور والوں پر بوجھ ڈالے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب دیت جلد لینے میں مصلحت ہو تو عاقلہ کو ادائیگی دیت میں مہلت نہ دی جائے بلکہ نقد وصول کی جائے۔''[1]

قصاص کے احکام

قتل عمد کی صورت میں شرائط مکمل ہوں تو قصاص کی مشروعیت پر علماء کا اجماع ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ﴾

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔''[2]

نیز ارشاد ہے:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾

''اور ہم نے (یہودیوں کے ذمے) تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان ہے۔''[3]

قرآن مجید کا یہ حکم تورات میں بھی تھا۔یاد رہے سابقہ شریعت کا ہر حکم ہمارے لیے بھی قابل عمل ہے الا یہ کہ جسے ہماری شریعت منسوخ قرار دے دے۔قصاص کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

① الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، الديات:5/525. ② البقرة2:178. ③ المآئدة5:45.

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ﴾

''عقل مندو! قصاص میں تمھارے لیے زندگی ہے، اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے قصاص میں زندگی رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی کو یہ علم ہوگا کہ کسی آدمی کو قتل کی صورت میں قصاص کے طور پر اسے بھی قتل کیا جاسکتا ہے تو وہ قتل کرنے سے باز آ جائے گا۔ اسی طرح جب ہر انسان کی یہ سوچ ہوگی تو معاشرے میں قتل کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اس طرح ہر شخص کو زندگی مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک طویل مضمون کو فصیح و بلیغ انداز میں اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہاں پر بلاغت کا یہ نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصاص کو زندگی قرار دیا ہے، حالانکہ بظاہر وہ موت کی ایک صورت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز رہتے ہیں، اس طرح ان کی زندگی محفوظ رہتی ہے، پھر اس حکم میں خطاب کا رخ اہل عقل کی طرف ہے کیونکہ وہی لوگ ہیں جو نتائج اور انجام پر نگاہ رکھتے ہیں اور نقصان دہ امور اور کاموں سے خود کو بچاتے ہیں لیکن جو لوگ نادان جوشیلے اور جذباتی ہوتے ہیں وہ جوش و جذبات کی رو میں بہ کر مستقبل کے عواقب و نتائج کی کوئی پروا نہیں کرتے جیسا کہ ایک شاعر کا کہنا ہے:

سَأَغْسِلُ عَنِّي الْعَارَ بِالسَّيْفِ جَالِبًا عَلَيَّ قَضَاءُ اللهِ مَا كَانَ جَالِبًا

''میں اپنے متعلق عار اور طعنوں کو تلوار کے ساتھ دھو ڈالوں گا۔ اس حال میں کہ میں اپنے اوپر اللہ کی قضا کو لاگو کر رہا ہوں جو نافذ کرے سو کرے۔''

دھو ڈالوں گا عار زمانے کی اپنی تلوار سے
نہیں ہے پروا مجھ کو تقدیر کے ہر وار سے

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے قصاص کا جو حکم جاری فرمایا ہے اس کی وجہ یوں بیان کی: ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾، یعنی قصاص کو ذہن نشین رکھو گے تو قتل کرنے سے باز آ جاؤ گے اور یہ چیز حصول تقویٰ کا سبب ہے۔''[2]

سنت نبویہ میں وارد ہے کہ قصاص لینے والے کو اختیار حاصل ہے کہ وہ قصاص لے یا دیت قبول کرے یا قاتل کو بلاعوض معاف کر دے اور یہ افضل ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ إِمَّا يُودٰى وَإِمَّا يُقَادُ»

[1] البقرة 2:179. [2] تفسير فتح القدير، البقرة 2:179.

''جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو دیت قبول کرے اور چاہے تو قصاص لے لے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ﴾

''ہاں! جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع اور اچھے طریقے سے دیت کی ادائیگی کرنی چاہیے۔''[2]

نیز ارشاد ہے:

﴿وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ ''اور تمھارا معاف کر دینا تقوے کے بہت نزدیک ہے۔''[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَلَا عَفَا رَجُلٌ عَنْ مَظْلِمَةٍ إِلَّا زَادَهُ اللهُ عِزًّا»

''جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کا ظلم معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرے گا۔''[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دھوکے سے قتل کرنے والے کو معاف کرنا مناسب نہیں کیونکہ ایسے شخص سے بچنا مشکل ہوتا ہے، جیسے محاربہ میں قتل کرے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا۔ عام حالات میں قصاص لینے کے بجائے معاف کر دینا بہتر ہے بشرطیکہ اس میں کوئی فساد و خرابی لازم نہ آئے۔''

قاضی ابویعلی رحمہ اللہ نے ایک اور صورت بتاتے ہوئے کہا کہ ''اگر کسی نے مسلمانوں کے امام و امیر کو قتل کیا تو قاتل کو قصاص میں قتل کرنا لازم ہے کیونکہ اس میں موجود فساد اور بگاڑ واضح ہے۔''

ابن قیم رحمہ اللہ نے قبیلہ عرینین کے واقعے کو ملحوظ رکھ کر کہا ہے کہ کسی کو دھوکے سے قتل کرنے والے پر حد نافذ کر کے قتل کیا جائے، یعنی اس عمل سے اسے قتل کرنا حد ہے جسے معافی کے ذریعے سے بھی ساقط نہیں کیا جا سکے گا اس میں برابری کا لحاظ بھی ضروری نہیں۔ یہ اہل مدینہ کا مسلک ہے۔ امام احمد کے مذہب کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے جبکہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسے اختیار کیا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔''

◣ مقتول کے سرپرست کے لیے قصاص لینے کا استحقاق تب ہے جب چار شرائط موجود ہوں:

---

[1] صحيح البخاري، الديات، باب من قتل له قتيل فهو بخير النظرين، حديث:6880، وصحيح مسلم، الحج، باب تحريم مكة و تحريم صيدها وخلاها ...... ، حديث: 1355. [2] البقرة 178:2. [3] البقرة 237:2. [4] صحيح مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع، حديث:2588، ومسند أحمد :235/2 واللفظ له.

① مقتول کو بلا وجہ ناجائز قتل کیا گیا ہو۔ اگر اسے قتل کرنا جائز ہو تو اس میں قصاص نہیں، مثلاً: کسی مسلمان نے کسی حربی کافر کو یا مرتد کو (جب کہ اس نے توبہ نہ کی) یا کسی زانی کو قتل کر دیا تو قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا، البتہ اسے سزا ضرور دی جائے گی کہ اس نے حاکم سے فیصلہ کیوں نہ حاصل کیا؟

② قاتل عاقل اور بالغ ہو کیونکہ قصاص ایک اہم اور سخت سزا ہے جس کا نفاذ بچے اور پاگل پر نہ ہوگا کیونکہ دونوں کے کاموں میں قصد وارادہ شامل نہیں ہوتا، نیز ان کے پیش نظر کوئی واضح اور صحیح مقصد نہیں ہوتا اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ»

''تین اشخاص سے قلم اٹھا لیا گیا ہے: سوئے ہوئے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو اور مجنون سے جب تک وہ ہوش وعقل میں نہ آئے۔''[1]

ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس نقطۂ نظر پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔

③ جنایت (ارتکاب جرم) کے وقت مقتول اور قاتل برابر درجے کے ہوں، یعنی مسلمان ہونے، آزاد یا غلام ہونے میں مساوی ہوں، یعنی قاتل ایسا نہ ہو جو مقتول سے اسلام یا آزادی میں افضل ہے، لہٰذا اس معیار کی روشنی میں۔ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ» ''کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔''[2]

اسی طرح آزاد شخص کو مقتول غلام کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَّا يُقْتَلَ حُرٌّ بِعَبْدٍ» ''یہ سنت میں سے ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔''[3]

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب مقتول قاتل کے برابر کا نہیں تو مقتول کے ورثاء کا قاتل کو قتل کرنا حق سے زیادہ لینے کے مترادف ہے۔

درج بالا معیار کے علاوہ قاتل اور مقتول میں کوئی برتری اثر انداز نہ ہوگی، لہٰذا خوبصورت کو بدصورت کے

---

① سنن أبي داود، الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حداً، حديث:4403، والتلخيص الحبير: 183/1، حديث: 253. ② صحيح البخاري، العلم، باب في كتابة العلم، حديث: 111، وسنن أبي داود بلفظ:[لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ ......]، الديات، باب أيقاد المسلم من الكافر؟ حديث: 4530. ③ [ضعيف] سنن الدارقطني: 133/3، حديث: 3227، وإرواء الغليل: 267/7، حديث: 2211.

بدلے قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح معزز اور غیر معزز، بڑے اور چھوٹے یا مرد اور عورت یا عقل مند اور کم عقل میں بسلسلۂ قصاص کوئی فرق و امتیاز نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾

''اور ہم نے یہودیوں کے ذمے تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان ہے۔''[1]

نیز ارشاد الٰہی: ﴿ الْحُرُّ بِالْحُرِّ ﴾ ''آزاد کے بدلے آزاد (کا قصاص ہے۔)''[2] میں عموم ہے۔

قاتل والد نہ ہو، یعنی مقتول قاتل کا بیٹا، پوتا یا بیٹی، پوتی وغیرہ نہ ہو۔ اگر والدین یا دادا، نانا وغیرہ اپنے کسی بچے کو قتل کر دیں گے تو انھیں قصاص میں قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

[لَا يُقْتَلُ وَالِدٌ بِوَلَدِهِ] ''اولاد کے بدلے والد کو قتل نہ کیا جائے۔''[3]

ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ روایت حجاز اور عراق کے علمائے حدیث کے ہاں معروف مشہور ہے۔''

اس حدیث سے اور اسی مفہوم کی دوسری احادیث سے ان نصوص کے عموم میں تخصیص ہو جاتی ہے، جن میں وجوب قصاص کا حکم وارد ہوا ہے اور یہ جمہور اہل علم کا مسلک ہے، البتہ اولاد کو والدین کے بدلے میں بطور قصاص قتل کرنا درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں عموم ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ﴾

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔''[4]

یاد رہے اگر باپ اولاد کو قتل کر دے تو قصاص میں اسے قتل نہ کرنے کی دلیل موجود ہے جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے، اس لیے والد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ جب یہ چار شرائط موجود ہوں تو مقتول کے وارث قصاص لینے کا حق رکھتے ہیں۔

▲ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قصاص کی مشروعیت کا مقصد لوگوں کے ساتھ رحمت و شفقت کرنا اور ان کی جانوں کو محفوظ رکھنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ ﴾

''عقل مندو! قصاص میں تمھارے لیے زندگی ہے اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے۔''[5]

ستیاناس ہو ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ قصاص وحشی اور ظالمانہ سزاؤں کا نام ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں جانتے اور

---

[1] المآئدة 5:45. [2] البقرة 2:178. [3] جامع الترمذي، الديات، باب ما جاء في الرجل يقتل ابنه ، يقاد منه أم لا؟ حديث: 1401، وسنن ابن ماجه، الديات، باب لا يقتل الوالد بولده ، حديث: 2662. [4] البقرة 2:178. [5] البقرة 2:179.

دیکھتے کہ مجرم نے کس طرح وحشت اور ظلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بے قصور شخص کو قتل کرنے کا اقدام کیا، شہر میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی کوشش کی، کئی عورتوں کو بیوہ کیا، مقتول کے بچوں کو یتیم کیا، کئی گھروں کو ویران اور متاثر کیا۔ درحقیقت یہ لوگ ظالم پر ترس کھاتے ہیں بے قصور اور مظلوم سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کی سوچ پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے!

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝﴾

''کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟'' [1]

✍ قصاص میں مجرم سے اس کے کیے ہوئے جرم کی مثل یا اس کے مشابہ بدلہ لیا جاتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ قصاص لینے سے مظلوم یا اس کے ورثاء کا جوش وجذبہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے، ان کے دل کو تشفی ہوجاتی ہے، ظلم کا سدباب ہوجاتا ہے، دل و دماغ میں اٹھنے والے طوفانوں کا تدارک ہوجاتا ہے، نیز اہم بات یہ ہے کہ نظام قصاص کے نفاذ میں نوع انسانی کی بقا مضمر ہے۔

✍ عہد جاہلیت میں انتقام لینے میں مبالغے سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کی ایک صورت یہ تھی کہ زیادہ تر مجرم کے ساتھ ساتھ غیر مجرم سے بھی بدلہ لیا جاتا۔ یہ ایسا ظلم تھا جس سے مقصد حاصل نہ ہوتا تھا بلکہ فتنہ اور خونریزی بڑھتی تھی۔ جب دین اسلام آیا تو اس نے دیگر احکام کے ساتھ نظام قصاص بھی دیا اور بتایا کہ قصاص صرف قصوروار سے لیا جائے۔ ان احکام سے لوگوں کو عدل و انصاف ملا اور خونریزی رک گئی۔ معاشرے میں امن وسکون کے پھول کھل گئے۔

✍ قصاص تب واجب ہوگا جب مذکورہ شرائط موجود ہوں۔ علاوہ ازیں فقہائے کرام نے چند مزید شرائط کا ذکر بھی کیا ہے جو قصاص لینے والے وارث میں ہوں اور وہ تین ہیں:

① قصاص کا مطالبہ کرنے والا عاقل و بالغ ہو اگر وہ بچہ یا دیوانہ ہوگا تو اس حال میں قصاص کا مطالبہ کرنا اس کے لیے درست نہ ہوگا کیونکہ قصاص لینے سے مظلوم یا مظلوم کے ورثاء کو ان کے انتقامی جذبات کی تشفی و تسکین حاصل ہوجاتی ہے یہ چیز بچے یا دیوانے کو حاصل نہیں ہوتی، لہٰذا قصاص کے اجرا میں انتظار کرلیا جائے اور مجرم کو اس وقت تک جیل میں بند رکھا جائے جب تک بچہ بالغ نہ ہوجائے یا دیوانہ صحیح نہ ہوجائے۔ ایک روایت میں ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہدبہ بن خشرم کو اس وقت تک جیل میں بند رکھا جب تک مقتول کا بیٹا بالغ نہ ہوگیا۔ یہ کام صحابہ کرام کے دور میں ہوا اور کسی نے اعتراض نہ کیا، لہٰذا اس مسئلے پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا

---

[1] المآئدۃ 5:50.

اجماع ثابت ہوا۔

اگر مقتول کا وارث بچہ ہے یا مجنون شخص اور انھیں نان ونفقہ کی ضرورت ہے تو صرف مجنون کے ولی کو چاہیے کہ اس کی پرورش کی خاطر مقتول کی دیت قبول کر لے کیونکہ کوئی علم نہیں کہ دیوانہ کب صحیح ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح نہ ہو۔ بچے کے بالغ ہونے یا نہ ہونے میں تردد نہیں ہوتا۔

② جن لوگوں کو قصاص لینے کا حق حاصل ہے وہ قصاص لینے پر متفق ہوں، یعنی وہ دو رائے نہ رکھتے ہوں کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو مشترک ہے اور اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی، لہٰذا اگر بعض ورثاء قصاص کی صورت میں اپنا حق وصول کر لیں گے تو دیگر ورثاء کے (دیت لینے یا معاف کرنے کے) حق میں مداخلت کے مرتکب ہوں گے جس کا انھیں اختیار نہ تھا۔ قصاص کے مستحقین میں سے اگر کوئی غیر حاضر ہو یا نابالغ ہو یا مجنون ہو تو انتظار کیا جائے گا کہ غیر حاضر آدمی حاضر ہو جائے، بچہ بالغ ہو جائے اور مجنون صحت یاب ہو جائے۔ اگر قصاص کے مستحقین میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کا وارث اس کا قائم مقام ہو گا۔ اگر قصاص کا حق رکھنے والوں میں سے کوئی ایک معاف کر دے تو مجرم سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

▲ استحقاق قصاص میں تمام نسبی اور سببی ورثاء شریک ہیں وہ مرد ہوں یا عورتیں، بڑے ہوں یا چھوٹے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ معاف کرنے کا حق صرف عصبہ کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی ملتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی رائے کو پسند کیا ہے۔

③ قصاص کی صورت میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ جو قصور وار نہیں اس پر زیادتی نہ ہونے پائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ۝﴾

''اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے، چنانچہ وہ قتل (قصاص لینے) میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا گیا ہے۔''[1]

جب قصاص میں زیادتی ہو گی تو (آیت کے مطابق) یہ ''اسراف'' ہے جس سے آیت مبارکہ منع کر رہی ہے۔

اگر کسی حاملہ عورت سے قصاص لینا واجب ہو یا قصاص واجب ہونے کے بعد وہ حاملہ ہو جائے تو جب تک وضع حمل نہ ہو گا اس عورت کو قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ اس کو قتل کرنے سے اس کے پیٹ کا بچہ بھی قتل ہو گا، حالانکہ وہ بے قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

① بنی إسرآء یل 33:17.

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى﴾ ''کوئی بوجھ والا کسی اور کا بوجھ اپنے اوپر نہ لادے گا۔''[1]

بچے کی ولادت کے بعد دیکھا جائے گا کہ آیا بچے کو دودھ پلانے کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی بندوبست کردے تو بچہ اس کے حوالے کیا جائے گا اور عورت کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ اب قصاص کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ اگر بچے کو دودھ پلوانے کا انتظام نہ ہو سکے تو عورت کی سزا دو سال تک مؤخر کر دی جائے گی حتی کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے۔ رسول اللہ کا فرمان ہے:

«اَلْمَرْأَةُ إِذَا قَتَلَتْ عَمْدًا لَّا تُقْتَلُ حَتَّى تَضَعَ مَا فِي بَطْنِهَا إِنْ كَانَتْ حَامِلاً، وَحَتَّى تُكَفِّلَ وَلَدَهَا . وَإِنْ زَنَتْ، لَمْ تُرْجَمْ حَتَّى تَضَعَ مَا فِي بَطْنِهَا وَحَتَّى تُكَفِّلَ وَلَدَهَا»

''اگر کوئی عورت کسی کو عمداً قتل کر دے تو اسے اس وقت تک قتل نہ کیا جائے جب تک حمل کی صورت میں پیٹ میں موجود بچے کو جنم نہ دے اور بچے کی کفالت نہ کر لے۔ اسی طرح اگر زنا کا ارتکاب کرے تو حاملہ ہونے کی صورت میں جب تک بچے کو جنم نہ دے اسے رجم نہ کیا جائے، نیز بچے کی کفالت نہ کر لے۔''[2]

اسی طرح ایک اور عورت نے جب زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

«اِرْجِعِي حَتَّى تَضَعِي مَا فِي بَطْنِكِ» ''تو واپس چلی جا حتی کہ پیٹ میں موجود بچے کو جنم دے۔''[3]

پھر (بچے کی ولادت کے بعد) اسے فرمایا:

«اِرْجِعِي حَتَّى تُرْضِعِيهِ» ''تو واپس جا حتی کہ بچے کو مکمل مدت تک دودھ پلا لے۔''[4]

درج بالا دونوں حدیثوں اور آیت قرآنی سے واضح ہوا کہ حمل کی وجہ سے عورت کو قصاص میں اس وقت تک قتل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے، اس پر علماء کا اجماع ہے، نیز ان احکام سے شریعت اسلامی کا کمال واضح ہوتا ہے کہ اس نے پیٹ میں موجود بچے کا کس قدر خیال رکھا ہے کہ اسے ہر قسم کی تکلیف و نقصان سے بچایا ہے بلکہ اس کی زندگی کو بچانے کے لیے سزا دینے میں تاخیر کی، پھر اس کی کفالت کا بندوبست کیا۔ بندوں کی مصلحتوں اور فوائد پر محیط شریعت کے مل جانے پر ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں۔

▲ جب کسی سے قصاص لینے کا وقت آئے تو ضروری ہے کہ حاکم یا اس کے نائب کی نگرانی میں یہ کام ہوتا کہ قصاص

---

① بنی إسرآء یل 15:17. ② [ضعیف] سنن ابن ماجة، الدیات، باب الحامل یجب علیها القود، حدیث:2694. ③ هذا معنی الحدیث وأصله في صحیح مسلم، الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی، حدیث: 1695. ④ المصدر السابق.

کے فیصلے میں زیادتی نہ ہو جائے اور شریعت کے تقاضے بھی پورے ہوں۔

◄ قصاص لینے کے لیے ایسا ہتھیار استعمال میں لایا جائے جو تیز دھار ہو، مثلاً: تلوار یا چھری وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ» ''جب تم (کسی) کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو۔''[1]

◄ قصاص لینے کے لیے ایسا آلہ استعمال نہ کیا جائے جو کند ہو کیونکہ یہ قصاص میں زیادتی کرنے کے مترادف ہے جو ممنوع ہے۔

◄ اگر مقتول کا سرپرست شرعی طریقے سے اور اچھے انداز میں قصاص لے سکتا ہو تو ٹھیک ورنہ حاکم مقتول کے ولی کو حکم دے گا کہ کسی کو وکیل بنائے تا کہ وہ اس کے لیے قصاص لے۔

◄ اہل علم کا صحیح قول یہی ہے کہ مجرم سے قصاص لیتے وقت وہی صورت اختیار کی جائے جو مجرم نے اختیار کی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ﴾

''اور اگر تم بدلہ لو تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمھیں پہنچایا گیا ہو۔''[2]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾

''پھر جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو اس نے تم پر کی ہے۔''[3]

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ یہودی کا سر اسی طرح پتھروں سے کچلا جائے جیسے اس نے ایک (انصاری لڑکی) کا سر کچلا تھا۔[4] امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''شریعت اور انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ مجرم جیسا کرے، ویسا بھرے۔ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اس پر متفق ہیں۔''

اگر مجرم نے کسی کے پہلے ہاتھ کاٹے، پھر اسے قتل کیا تو قصاص بھی اسی طرح لیا جائے گا۔ اس نے پتھر کے ساتھ یا پانی میں ڈبو کر یا کسی اور صورت سے قتل کیا تو مجرم کو بھی اسی طرح قتل کیا جائے گا، البتہ مذکورہ صورتوں میں اگر وارث صرف تلوار سے قتل کرنے پر راضی ہو تو اسے اختیار ہے اور یہ افضل بھی ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی کو حرام

---

[1] صحیح مسلم، الصید، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرة، حدیث: 1955. [2] النحل 126:16. [3] البقرة 194:2. [4] صحیح البخاري، الخصومات، باب مایذکر في الإشخاص والخصومة بین المسلم والیهود، حدیث: 2413.

کام کے ارتکاب کے ذریعے سے قتل کیا تو اسے تلوار ہی کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ آج کے دور میں کسی کو گولی مار کر قتل کرنا تلوار کے ساتھ قتل کرنے کے مترادف ہے بشرطیکہ مارنے والا اچھا نشانہ باز ہو۔

اعضاءاور زخموں میں قصاص کا حکم

جسمانی اعضاء اور زخموں کا قصاص لینا کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ﴾

''اور ہم نے یہودیوں کے ذمے تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔''[1]

صحیحین میں یہ واقعہ موجود ہے کہ سیدہ رُبَیِّع رضی اللہ عنہا کے دانت توڑنے کے واقعے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كِتَابُ اللهِ الْقِصَاصُ» ''کتاب اللہ میں اللہ کا قانون قصاص ہے۔''[2]

◣ جس شخص سے جان کا قصاص لینا درست ہے اس سے اعضاء اور زخموں کا قصاص لینا بھی درست ہے بشرطیکہ اس میں مذکورہ شرائط موجود ہوں: ① یعنی جسے زخم لگایا گیا ہو یا جس کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا ہو وہ شخص بے قصور ہو۔ ② جنایت کرنے والا مکلّف ہو۔ ③ مظلوم (آزادی اور غلامی میں) جنایت کرنے والے کے برابر کا ہو اور جنایت کرنے والا باپ، دادا، نانا نہ ہو۔ اور جس شخص سے جان کا بدلہ لینا درست نہیں اس سے زخم کا یا عضو کے کاٹ دینے کا بدلہ لینا بھی درست نہیں۔ اس باب میں یہی قاعدہ چلتا ہے، مثلاً: باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا یا زخمی کر دیا تو قصاص نہیں۔

◣ جو صورتیں جان کے قصاص کو واجب قرار دیتی ہیں وہی صورتیں اعضاء کے قصاص کو واجب قرار دیتی ہیں، یعنی جنایت کرنے والا عمداً جنایت کا مرتکب ہو، لہٰذا ''شبہ عمد'' یا ''خطا'' کی صورت میں زخموں اور اعضاء میں قصاص نہیں۔ اعضاء میں قصاص کی صورت یہ ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان،

① المآئدة 5:45. ② صحيح البخاري، الصلح، باب الصلح في الدية، حديث: 2703، وصحيح مسلم، القسامة، باب إثبات القصاص في الأسنان وما في معناها، حديث: 1675.

ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ، دائیں عضو کے بدلے دایاں عضو اور بائیں عضو کے بدلے بایاں عضو ہے۔ جنایت کرنے والے نے جس قسم کے دانت توڑے ہیں قصاص میں بھی اسی قسم کے دانت توڑے جائیں گے۔ آنکھ کا پپوٹا اوپر والا یا نیچے والا کاٹا گیا یا زخمی کیا گیا تو قصاص میں مجرم کا بھی وہی پپوٹا کاٹا یا زخمی کیا جائے گا۔ اسی طرح ہونٹ اوپر والا ہو یا نیچے والا قصاص میں مجرم کا بھی وہی ہونٹ کاٹا یا زخمی کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ''اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔''[1]

انگلی کے بدلے وہی انگلی کاٹی جائے گی جو جگہ اور نام میں اس سے مشابہ ہے اور ہتھیلی کے بدلے ہتھیلی کاٹی جائے گی جو اس کے مشابہ ہے، داہنی کے بدلے داہنی ہتھیلی اور بائیں ہتھیلی کے بدلے بائیں ہتھیلی اور کہنی بھی اسی طرح دائیں کے بدلے دائیں اور بائیں کے بدلے بائیں کاٹی جائے گی۔ اور شرم گاہ کے بدلے شرم گاہ کاٹی جائے گی کیونکہ ان اعضاء کی حد بندی ہے اور حد سے تجاوز کیے بغیر قصاص لینا ممکن بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ''اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔''[2]

مجرم سے عضو میں قصاص لینے کی تین شرائط ہیں:

① عضو کے زیادہ ٹوٹنے یا اس کے زیادہ کٹ جانے کا اندیشہ نہ ہو، یعنی قصاص میں مجرم کا کوئی عضو جوڑ سے کاٹنا ہو یا اس کی کوئی حد ہو جہاں جا کر ختم ہو تو وہ ٹھیک ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس میں قصاص لینا جائز نہیں، لہٰذا ایسے زخم میں قصاص نہیں جس زخم کے لگانے کا اثر غیر منتہی ہو، مثلاً: جائفہ، یعنی ایسا زخم جس کا اثر پیٹ کے اندر تک ہو، دانت کی ہڈی کے سوا پنڈلی، ران یا بازو کی ہڈی توڑنا ہو، اس میں بھی مماثلت کا امکان نہیں، لہٰذا قصاص نہیں، البتہ دانت کی ہڈی میں قصاص ممکن ہے کہ جنایت کرنے والے کا مطلوبہ دانت ریتی وغیرہ سے رگڑ کر اتنا اتار دیا جائے جتنا دانت اس نے توڑا تھا۔

② قصاص میں ظالم اور مظلوم دونوں کے عضو کے نام اور جگہ میں مماثلت کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور کان وغیرہ اعضاء میں سے دایاں دائیں کے بدلے اور بایاں بائیں کے بدلے کاٹا جائے گا، برعکس نہ ہوگا کیونکہ ہر حصے اور عضو کی ایک خاص منفعت ہے اور خاص نام ہے، لہٰذا دایاں اور بایاں حصہ دونوں مساوی نہیں ہو سکتے۔ ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی ساتھ والی انگلی کے برابر نہیں ہو سکتی جو انگلی کاٹی جائے گی قصاص میں بھی وہی انگلی کاٹ دی جائے گی۔ اسی طرح قصاص میں اصلی عضو کے بدلے میں کسی کا کوئی زائد عضو نہیں کاٹا جائے گا۔

① المآئدة 45:5. ② المآئدة 45:5.

③ ظالم اور مظلوم دونوں کے عضو صحیح یا مریض ہونے میں اور کامل یا ناقص ہونے میں برابر ہوں، لہٰذا کامل اور صحت مند ہاتھ یا ٹانگ کے بدلے میں ظالم کا بیمار یا ناکارہ ہاتھ یا ٹانگ نہیں کاٹی جائے گی۔ پوری انگلیوں اور پورے ناخن والا ہاتھ یا پاؤں کم انگلیوں یا کم ناخنوں والے ہاتھ یا پاؤں کے بدلے میں نہیں کاٹا جائے گا، اس میں دیت ہوگی۔ قصاص میں دیکھنے والی اور نہ دیکھنے والی آنکھ یا بولنے والی اور نہ بولنے والی زبان برابر نہیں۔ اس صورت میں اگر مظلوم چاہے تو اپنے کامل عضو کے بدلے مجرم کا ناقص عضو کاٹ کر قصاص لے سکتا ہے ورنہ دیت قبول کر لے۔

زخموں میں قصاص ہر وہ زخم جو ہڈی تک اثر کر جائے اس میں قصاص ہے کیونکہ اس میں کمی بیشی کے بغیر پورا پورا بدلہ لینے کی صورت ممکن ہے، مثلاً: سر یا چہرے کا ایسا زخم جس سے ہڈی ننگی ہو جائے یا بازو، پنڈلی، ران اور قدم کا زخم ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ﴾ ''اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔''[1]

جو زخم ہڈی تک نہ پہنچ پائے اس میں قصاص بھی نہیں، مثلاً: سر وغیرہ کا معمولی زخم یا پیٹ کا گہرا زخم کیونکہ اس میں کمی بیشی ضرور ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا قَوَدَ فِي الْمَأْمُومَةِ وَلَا الْجَائِفَةِ وَلَا الْمُنَقِّلَةِ» ''مامومہ، جائفہ اور منقلہ میں قصاص نہیں۔''[2]

یاد رہے! مامومہ سے مراد ایسا زخم ہے جو دماغ تک پہنچ جائے۔ جائفہ وہ زخم ہے جو پیٹ کے اندر تک پہنچے اور منقلہ وہ زخم ہے جس سے سر پھٹ جائے اور ہڈی سرک جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''زخموں میں قصاص کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے بشرطیکہ دونوں شخصوں میں مساوات ہو۔ اگر کسی نے سر پھوڑ دیا تو قصاص میں بھی سر پھوڑا جائے گا۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً: کسی نے اندرونی ہڈی توڑ دی یا سر میں زخم لگایا جو گہرا نہ تھا تو اس میں قصاص نہیں بلکہ دیت واجب ہے۔''[3]

▪ ہاتھ، لاٹھی یا کوڑے وغیرہ کی ضرب میں قصاص سے متعلق شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ اس میں قصاص نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ خلفائے راشدین اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ مذکورہ صورتوں میں قصاص ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر فقہائے کرام سے یہی منقول ہے۔ سنت رسول ﷺ میں یہی وارد ہے۔ اور (ہمارے ہاں) یہی نقطۂ نظر درست ہے۔''[4]

① المآئدة 5:45. ② سنن ابن ماجه، الديات، باب مالاقود فيه، حديث: 2637. ③ مجموع الفتاوٰی: 475/1. ④ ملاحظہ کیجیے سابقہ حوالہ۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اپنے عمال کو اس لیے نہیں بھیج رہا کہ وہ لوگوں کو ماریں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس نے ایسا کیا میں اس سے قصاص لوں گا...... اور میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ قصاص کے لیے خود اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔''[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ (حاکم سے) قصاص تب لیا جائے گا جب حاکم کسی کو ناجائز سزا دے۔ اگر جائز سزا ہو تو اس میں بالا جماع قصاص نہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شافعیہ، حنفیہ، مالکیہ اور متاخرین حنابلہ وغیرہ کا یہ مسلک ہے کہ تھپڑ اور ضربہ (مارنے) میں قصاص نہیں۔ بعض نے اس پر اجماع کا دعویٰ نقل کیا ہے، حالانکہ یہ قول قیاس صریح، نصوص اور اجماع صحابہ کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾

''اور تم اگر بدلہ لو تو بالکل اتنا ہی بدلہ لو جتنا صدمہ تمھیں پہنچایا گیا ہو۔''[2]

''مظلوم کو چاہیے کہ تھپڑ کے بدلے تھپڑ رسید کرے اور اسی جگہ پر مارے جہاں پر مارا گیا تھا اور ویسی ہی چیز سے ضرب لگائے جس چیز سے اسے ضرب لگائی گئی۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا اور خلفائے راشدین کا بھی یہی عمل ہے اور قیاس کا بھی یہی تقاضا ہے۔''[3]

ایک شخص کا قصاص پوری جماعت سے لینے کا بیان

اگر لوگوں کی ایک جماعت مل کر ایک شخص کو ارادتاً وظلماً قتل کر دے تو ان سب سے قصاص لیا جائے گا۔ علماء کی صحیح رائے کے مطابق مقتول کے بدلے میں سب قتل کیے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○﴾

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے، ہاں! جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی

[1] مسند أحمد: 41/1 باختصار، ومجموع الفتاوى: 380,379/28. [2] النحل 126:16. [3] إعلام الموقعين: 294/1.

جائے تو اسے معروف طریقے سے اتباع (دیت کا مطالبہ) کرنا چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے، تمھارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے، اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اسے دردناک عذاب ہوگا۔ عقل مندو! قصاص میں تمھارے لیے زندگی ہے اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے۔''[1]

میں عموم ہے۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس مسئلے میں اجماع ہے، جناب سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سات افراد کو ایک آدمی کے قصاص میں اس لیے قتل کروا دیا تھا کہ وہ سب ایک آدمی کو دھوکے سے قتل کرنے میں شریک تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر صنعاء شہر کے سارے باشندے اس آدمی کے قتل میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔''[2]

علاوہ ازیں دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ایک آدمی کے قتل میں انھوں نے ایک سے زیادہ افراد جو قتل میں شریک تھے سب کو قتل کیا ہے۔ اس مسئلے کی مخالفت کسی صحابی سے منقول نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع تھا۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایک آدمی کے قتل میں شریک پوری جماعت کو قتل کرنے پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اکثر فقہائے عظام کا اتفاق ہے اگرچہ یہ قصاص ظاہری ضابطہ (ایک شخص کے بدلے میں ایک شخص کو قتل کیا جائے) کے خلاف ہے لیکن اس میں حکمت اور مقصد یہ ہے کہ دوسروں سے قصاص نہ لینا ناجائز خونریزی میں تعاون کا ذریعہ نہ بن جائے۔''[3]

علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قتل کا بدلہ قتل معاشرے میں خونریزی کو روکنے کے لیے ہے جیسا کہ قرآن مجید نے اس پر تنبیہ کی ہے۔ اگر ایک فرد کے قتل میں شریک جماعت کو قتل نہ کیا جائے تو قتل و غارت کا خطرناک دروازہ کھل جائے گا کہ کسی بھی آدمی کو قتل کرنے کے لیے متعدد افراد اس لیے اکا کر لیں گے کہ انھیں قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا، نیز زجر و توبیخ کا مقصد تبھی حاصل ہوگا اور مقتول کے ورثاء کی تسلی تبھی ہوگی جب قتل میں شریک تمام افراد سے قصاص لیا جائے گا۔''[4]

ایک فرد کے قتل میں شریک جماعت کے تمام افراد کو تب قتل کیا جائے گا جب ہر ایک نے ایسا کام کیا ہو جس سے

[1] البقرة 2:178، 179. [2] صحيح البخاري، الديات، باب إذا أصاب قوم من رجل......، حديث: 6896، والموطأ للإمام مالك، العقول، باب ما جاء في الغيلة والسحر، حديث: 1671 واللفظ له. [3] إعلام الموقعين: 3/128. [4] بداية المجتهد: 2/710.

آدی قتل ہو جائے۔ اگر ہر شخص کا انفرادی عمل جان لینے کا موجب نہ ہو لیکن وہ سب باہمی مشورے میں شریک تھے اور کچھ افراد نے قتل کیا تو سب سے قصاص لینا واجب ہوگا کیونکہ قتل میں ہر ایک دوسرے کا معاون تھا۔

▲ اگر ایک شخص نے کسی کو مجبور کیا کہ فلاں کو قتل کر دو، چنانچہ اس نے مجبوری میں اسے قتل کر دیا تو مجبور کرنے والے اور جسے مجبور کیا گیا ہے دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا بشرطیکہ دونوں میں قصاص کی مذکورہ جملہ شرائط موجود ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل نے خود کو زندہ رکھنے کے لیے قتل کیا ہے، باقی رہا مجبور کرنے والا تو وہ قتل کا سبب بنا ہے۔

▲ جس نے بچے یا دیوانے شخص کو حکم دیا کہ فلاں شخص کو قتل کر دو اور اس نے قتل کر دیا تو اس صورت میں قصاص صرف اسی شخص سے لیا جائے گا جس نے قتل کا حکم دیا ہے کیونکہ اس میں قاتل حکم دینے والے کا آلہ بنا ہے، نیز بچہ اور دیوانہ شرعاً مکلّف نہیں، اس لیے ان سے قصاص بھی نہیں لیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی نے ایسے عاقل و بالغ شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا جسے یہ علم نہ تھا کہ مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے، جیسے کوئی شخص غیر مسلم ملک میں پیدا ہوا اور اسے احکام شریعت سے واقفیت نہیں۔ اگر اس نے مقرر شخص کو قتل کر دیا تو قصاص صرف اسی سے لیا جائے گا جس نے حکم دیا کیونکہ وہی قتل کا سبب بنا ہے۔ باقی رہا قاتل تو وہ عدم علم کی وجہ سے معذور سمجھا جائے گا۔ اگر مامور شخص عاقل و بالغ ہو اور حرمت قتل سے واقف ہو تو اگر وہ کسی کو قتل کر دے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ» ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔''[1]

یاد رہے حکم دینے والا بادشاہ ہو یا مالک یا کوئی اور شخص، حکم دینے والے کو وقت و حالات کے مطابق عبرتناک سزا دی جائے گی کیونکہ یہ شخص گناہ کے ارتکاب کا سبب ثابت ہوا ہے۔

▲ اگر ایک شخص کو عمداً قتل کرنے میں دو آدمی شریک تھے لیکن ایک میں وجوب قصاص کی شرائط موجود نہیں دوسرے میں وہ شرائط پائی جاتی ہیں تو دوسرے شخص سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ وہ قتل میں شریک ہے، پہلے سے نہیں کیونکہ اس میں قصاص نہ لیے جانے کا سبب موجود ہے۔

▲ جس نے کسی کو پکڑ کر رکھا حتی کہ دوسرے نے اسے قتل کر دیا تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا پکڑنے والے کو جیل میں قید رکھا جائے گا حتی کہ وہ وہیں مر جائے۔[2]

[1] مسند أحمد: 131/1، والمصنف لابن أبي شيبة، السير، باب في إمام السرية يأمرهم بالمعصية، من قال : لا طاعة له: 549/6، حديث:33706 واللفظ له.

[2] مؤلف ؒ نے جیل میں قید رکھنے کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

ایک شخص کا قصاص پوری جماعت سے لینے کا بیان

◄ جس طرح چند افراد مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو سب سے قصاص لیا جاتا ہے اسی طرح اگر کچھ افراد مل کر کسی کو زخم لگائیں یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیں گے تو ان سب کو زخم لگایا جائے گا یا عضو کاٹنے کی صورت میں سب کا وہی عضو کاٹا جائے گا جو انھوں نے مل کر کاٹا تھا اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس جرم میں کس نے کتنا حصہ لیا، مثلاً: کچھ لوگوں نے ایک شخص کے ہاتھ پر تیز دھار آلہ رکھا، پھر انھوں نے مل کر زور لگایا جس سے ہاتھ کٹ گیا تو اسی طرح ان تمام مجرموں کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دو آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص نے چوری کی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے گواہی کی بنیاد پر ملزم کا ہاتھ کاٹ دیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایک اور شخص کو پکڑ کر لے آئے اور کہا: اصل چور تو یہ ہے۔ پہلے شخص کے بارے میں ہم سے غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے شخص کے خلاف دونوں کی گواہی رد کر دی اور پہلے شخص پر غلط الزام لگانے کی وجہ سے ان دونوں پر دیت عائد کر دی اور فرمایا:

«لَوْ عَلِمْتُ أَنَّكُمَا تَعَمَّدْتُّمَا لَقَطَعْتُكُمَا»

''اگر مجھے علم ہوتا کہ تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو میں تم دونوں کے ہاتھ کاٹ دیتا۔''[1]

◄ کسی عضو پر جنایت کی وجہ سے اس کا اثر دوسرے عضو تک پہنچ جائے یا اس کے نتیجے میں جان چلی جائے تو یہ اثر بھی جنایت میں شامل سمجھا جائے گا کیونکہ جس چیز کی ذمے داری قبول کی جائے گی اس کے اثرات کی ذمے داری بھی اس میں شامل ہوتی ہے، مثلاً: اگر ایک انگلی کاٹی، پھر زخم خراب ہو جانے کی وجہ سے دوسری انگلی یا اس کا پورا ہاتھ ضائع ہو گیا تو قصاص میں پورا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور اگر کسی چھوٹی جنایت کے نتیجے میں جان ضائع ہو گئی تو قصاص واجب ہو گا۔

◄ کسی عضو یا زخم میں اس وقت تک قصاص لینا درست نہیں جب تک وہ درست نہ ہو جائے کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

«أَنَّ رَجُلاً جُرِحَ فَأَرَادَ أَنْ يَّسْتَقِيدَ، فَنَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُّسْتَقَادَ مِنَ الْجَارِحِ حَتّٰى يَبْرَأَ الْمَجْرُوحُ»

''ایک شخص کو زخمی کر دیا گیا۔ جب مظلوم نے بدلہ لینا چاہا تو آپ ﷺ نے اسے منع کر دیا کہ وہ تندرست ہونے سے پہلے بدلہ لے۔''[2]

---

① صحيح البخاري، الديات باب إذا أصاب قوم من رجل، هل يعاقب أو يقتص منهم كلهم؟ قبل حديث: 6896 معلقًا. ② [ضعيف] سنن الدارقطني: 87/3، حديث: 3092.

اس میں حکمت یہ ہے کہ ممکن ہے مظلوم کا زخم خراب ہو جائے اور وہ خرابی آگے سرایت کر جائے جس کی وجہ سے پورا عضو ناکارہ ہو جائے یا اس کی جان چلی جائے۔ اگر اس نے زخم کے لگنے کے فوراً بعد قصاص لے لیا، پھر بعد میں اس کے زخم نے سارے عضو کو ضائع کر دیا تو اسے مزید قصاص نہیں دلوایا جائے گا کیونکہ اس نے قصاص لینے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«قَضٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي رَجُلٍ طَعَنَ رَجُلاً بِقَرْنٍ فِي رِجْلِهِ، فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَقِدْنِي، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَا تَعْجَلْ حَتّٰى يَبْرَأَ جُرْحُكَ، قَالَ: فَأَبَى الرَّجُلُ إِلَّا أَنْ يَّسْتَقِيدَ، فَأَقَادَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْهُ، قَالَ: فَعَرَجَ الْمُسْتَقِيدُ وَبَرَأَ الْمُسْتَقَادُ مِنْهُ، فَأَتَى الْمُسْتَقِيدُ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَالَ لَهُ: يَارَسُولَ اللهِ! عَرَجْتُ وَبَرَأَ صَاحِبِي، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَلَمْ آمُرْكَ أَنْ لَّا تَسْتَقِيدَ حَتّٰى يَبْرَأَ جُرْحُكَ فَعَصَيْتَنِي، فَأَبْعَدَكَ اللهُ وَبَطَلَ جُرْحُكَ»

''ایک شخص نے دوسرے کے گھٹنے کی ہڈی میں نیزے کا بھالا مار دیا، مضروب آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: مجھے قصاص چاہیے، آپ ﷺ نے فرمایا: جلدی نہ کر جب تو تندرست ہوگا تب قصاص لے لینا لیکن اس نے قصاص لینے پر اصرار کیا تو آپ نے اسے قصاص دلوا دیا۔ جس نے قصاص لیا تھا وہ لنگڑا ہو گیا اور جس سے قصاص لیا گیا تھا وہ تندرست ہو گیا۔ چند دن بعد وہ آیا اور کہا: میں تو لنگڑا ہو گیا ہوں اور میرا صاحب ٹھیک ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تجھے منع کیا تھا کہ زخم درست ہونے سے پہلے بدلہ نہ لو لیکن تو نے میری بات نہ مانی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تیرے لنگڑے پن کو باطل قرار دے دیا ہے۔''[1]

ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شریعت محاسن کا مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ احکام عدل و رحمت پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ﴾

''آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔''[2]

ستیاناس ہو اس قوم کا جو ان بہترین احکام کے بدلے طاغوتی اور من گھڑت بلکہ ظالمانہ احکام کا نفاذ چاہتے ہیں:

﴿ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ ﴾ ''ایسے ظالموں کا کیا ہی برا بدل ہے۔''[3]

[1] مسند أحمد: 217/2. [2] الأنعام 115:6. [3] الكهف 50:18.

دیتوں کے احکام

دیات، دیت کی جمع ہے۔ دیت اس مال کو کہتے ہیں جو جنایت کرنے والا مظلوم کو یا اس کے وارث کو جنایت کے سبب ادا کرتا ہے۔ دیت کے وجوب کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ﴾

''جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے......۔''[1]

حدیث شریف میں ہے:

«مَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ: إِمَّا أَنْ يُّفْدٰى وَإِمَّا أَنْ يُّقْتَلَ»

''جس کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا اسے دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنے کا حق ہے کہ وہ دیت قبول کر لے یا قاتل سے انتقام لے۔''[2]

▪ ہر اس شخص پر دیت واجب ہے جس نے بلا واسطہ کسی انسان کو ختم کر دیا، مثلاً: کسی کو مارا پیٹا جس سے وہ مر گیا یا اسے کار کے نیچے کچل دیا یا وہ اس کے قتل کا سبب بنا جیسا کہ اس نے راستے میں گڑھا کھودا یا وہاں بھاری بھر کم پتھر رکھ دیا جس کے سبب کوئی انسان چلتا بنا، ان تمام صورتوں میں دیت ادا کرنا ضروری ہے، خواہ تلف ہونے والا مسلمان ہو یا ذمی، مستأمن یا اس قوم کا فرد ہو جس سے مسلمانوں کا جنگ بندی کا معاہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَـٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ﴾

''اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیماں ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے۔''[3]

▪ اگر ایک شخص نے کسی کو عمداً قتل کیا تو دیت قاتل کے مال سے فوری طور پر دی جائے گی کیونکہ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کو تلف کرنے والے ہی پر اس چیز کا بدل (قیمت وغیرہ) ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔

① النسآء4:92. ② صحيح البخاري، اللقطة، باب كيف تعرف لقطة أهل مكة؟ حديث:2434، وصحيح مسلم، الحج، باب تحريم مكة و تحريم صيد ها ...... ، حديث:1355 واللفظ له. ③ النسآء4:92.

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اس مسئلے پر اجماع ہے، اصول وضابطہ اس کا متقاضی ہے[1] کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ﴾ ''کوئی (بوجھ اٹھانے والا) کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''[2]

چونکہ خطائیں اکثر طور پر انسان سے سرزد ہوتی رہتی ہیں جس میں انسان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا، چنانچہ قتل خطا میں قاتل پر دیت کا بوجھ ڈالنا زیادتی ہے، اس لیے حکمت کا تقاضا ہوا کہ اس کی ادائیگی عاقلہ (عصبہ ورثاء) پر ڈال دی جائے تا کہ قاتل کے ساتھ ہمدردی اور تعاون ہو سکے۔ یہ تخفیف اس لیے کی گئی ہے کہ وہ معذور ہے جبکہ عمداً قتل کرنے والا معذور نہیں، اس لیے اس پر تخفیف بھی نہیں، پھر ایسے شخص پر تو قصاص تھا جب اسے معافی مل گئی تو اسے اپنی جان کے عوض میں دیت کی ادائیگی بھی خود برداشت کرنا ہوگی اور یہ دیت فوری ادا کی جائے گی جس طرح دیگر امور میں ہونے والے نقصانات کا تاوان ادا کیا جاتا ہے۔

▲ اسی طرح قتل شبہ عمد ہو یا قتل خطا دونوں میں دیت قاتل کے عاقلہ (عصبات) کے ذمے ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں لڑ پڑیں۔ ایک نے دوسری کو پتھر مار کر اسے اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو قتل کر دیا۔

«قَضٰی أَنَّ دِیَةَ الْمَرْأَةِ عَلٰی عَاقِلَتِھَا»

''رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ دیا کہ مقتولہ کی دیت قاتلہ عورت کے عصبہ ورثاء پر ہے۔''[3]

اس روایت سے واضح ہوا کہ قتل شبہ عمد کی دیت قاتل کے عصبہ ورثاء کے ذمے ہے۔ الغرض قتل شبہ عمد ہو یا قتل خطا ان دونوں صورتوں میں دیت کی ذمے داری قاتل کے عصبہ ورثاء پر ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔'' ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی یہی بات نقل کی ہے۔

اسی طرح کوئی سویا ہوا شخص پہلو بدلتے ہوئے کسی انسان پر گر پڑے جس سے دوسرا مر جائے یا کسی نے راستے میں تعدی کر کے گڑھا کھودا جس میں کوئی گر کر مر گیا تو اس میں ضمان اور تاوان نہ ہوگا۔

▲ اگر ایک شخص نے کسی کو ایسی سزا دی جس کی اسے شرعاً اجازت تھی لیکن سزا کی وجہ سے آدمی ہلاک ہو گیا تو سزا دینے والا شرعاً ضامن نہ ہوگا، مثلاً: باپ نے بیٹے کو یا شوہر نے بیوی کو تمیز سکھانے کی خاطر سزا دی یا حاکم نے اپنی رعایا میں سے کسی کو سزا دی جو معمول کے مطابق تھی، یعنی اس میں زیادتی سے کام نہ لیا گیا تھا تو سزا دینے والے پر

[1] المغني والشرح الكبير: 482/9. [2] الأنعام 164:6۔ [3] صحیح البخاري، الديات، باب جنين المرأة وأن العقل على الوالد......، حديث: 6910، وصحيح مسلم، القسامة والمحاربين، باب دية الجنين......، حديث: 1681.

ضمان نہ ہوگا کیونکہ اس نے جو کچھ کیا ہے اسے اس کی شرعاً اجازت تھی، البتہ اگر اس نے ادب و تمیز سکھانے کے لیے مناسب حد سے زیادہ سزا دی تو وہ ضامن ہوگا۔

▪ اگر کسی عورت کو ایسی سزا دی جس سے اس کا حمل ضائع ہو گیا تو مؤدِّب شخص پر حمل کا ضمان واجب ہوگا جو ایک غلام یا لونڈی کی ادائیگی کی صورت میں ہوگا، چنانچہ روایت ہے کہ ''آپ ﷺ نے ایک ایسے ہی واقعے میں ایک غلام یا لونڈی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔''[1] اہل علم کی اکثریت کا یہی قول ہے۔

▪ اگر کسی نے حاملہ عورت پر خوف اور گھبراہٹ طاری کی جس کے سبب اس کا حمل ضائع ہو گیا تو وہ شخص ضامن ہو گا، مثلاً: کسی حاکم نے حاملہ عورت کو اپنے ہاں طلب کیا۔ اس طلبی کے سبب عورت پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ اس کا حمل ضائع ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ''ایک عورت کا خاوند پردیس میں تھا۔ اس کے پاس کچھ لوگ آتے جاتے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے طلب فرمالیا، اس عورت نے کہا: ہائے افسوس! عمر رضی اللہ عنہ کو مجھ سے کیا کام ہے؟ وہ عورت اس قدر گھبرا گئی کہ خوف میں آکر راستے ہی میں اس نے قبل از وقت بچے کو جنم دیا جس نے دو سانسیں لیں اور فوراً مر گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے بارے میں مشورہ کیا، بعض نے کہا کہ اے امیر المومنین! آپ کے ذمے کچھ ضمان نہیں آتا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المومنین! اگر شوریٰ کے بعض اراکین نے آپ کی محبت کے پیش نظر یہ بات کہی ہے تو انھوں نے آپ کی خیر خواہی نہیں کی۔ اس بچے کی دیت آپ کے ذمے ہے کیونکہ آپ کے خوف ہی کی وجہ سے بچہ ضائع ہوا ہے۔''[2]

▪ اگر ایک شخص نے دوسرے (عاقل و بالغ) شخص کو حکم دیا کہ وہ کنویں میں اترے یا درخت پر چڑھے۔ اس نے ایسا ہی کیا لیکن وہ اترنے یا چڑھنے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا تو حکم دینے والا ضامن نہ ہوگا کیونکہ اس نے جنایت کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ کوئی زیادتی کی ہے، البتہ اگر یہ حکم چھوٹے بچے کو دیا گیا ہو تو حکم دینے والا اس کی ہلاکت کا ذمہ دار ہوگا کیونکہ وہ اس کی موت کا سبب بنا ہے۔

اسی طرح کسی نے ایک شخص سے اجرت مقرر کی، پھر اسے کنویں میں اتارا یا درخت پر چڑھایا لیکن وہ اس سبب سے ہلاک ہو گیا تو اجرت پر رکھنے والا شخص ضامن نہ ہوگا کیونکہ اس کا کوئی قصور نہیں۔

▪ جس نے کسی شخص سے معاہدہ کیا کہ وہ اس کے گھر میں کنواں تیار کر دے۔ اگر اس کام کے دوران میں اس پر مٹی گری یا کنواں بیٹھ گیا جس کی وجہ سے کنواں تیار کرنے والا مر گیا تو اس کی دیت کسی پر واجب نہیں ہوگی۔

---

[1] صحيح البخاري، الديات، باب جنين المرأة، حديث: 6905. [2] المصنف لعبدالرزاق، باب من أفزعه السلطان: 458/9، حديث: 18010.

ان مسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بے گناہوں کی جان کی حفاظت کا کس قدر اہتمام کیا ہے۔ آج کل بہت سے لوگ اس ذمے داری کا بالکل احساس نہیں کرتے، وہ اتنی لاپروائی سے ڈرائیونگ کرتے ہیں کہ اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں اور دوسروں کی جانوں کو بھی۔ بعض اوقات ایک شخص کی لاپروائی کی وجہ سے پورا خاندان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کی ذمے داری ایسے مہم جو لڑکوں کے والدین پر بھی عائد ہوتی ہے جو عمداً گاڑیاں ان کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں کہ بے گناہ افراد کی جانیں لیتے پھریں، یعنی انھیں ہلاک کریں۔ یہ گاڑیاں ان کے ہاتھوں میں ایسے ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو غیر ذمے دارانہ طور پر استعمال کر کے وہ لوگوں کو ہلاک کرتے اور دہشت پھیلاتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنی اولاد اور عام مسلمانوں کے بارے میں اللہ سے ڈریں۔ اور حکمرانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے افراد کو لگام دیں تاکہ سب لوگوں کی سلامتی یقینی ہو سکے اور امن قائم ہو جائے کیونکہ حکمرانوں کے ذریعے سے ان امور کا سدباب ہو جاتا ہے جن کا سدباب محض وعظ و تلقین کے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔

دیتوں کی مقدار کا بیان

اسلامی قانون میں انسان کے مختلف حالات، یعنی مسلمان، آزاد، غلام، مذکر اور مؤنث ہونے کے اعتبار سے یا مقتول شخص کے بنفسہ زندہ ہونے یا ماں کے پیٹ میں جنین ہونے کے اعتبار سے الگ الگ دیت مقرر ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① آزاد مسلمان شخص کی دیت کی مقدار سب سے زیادہ ہے جو تقریباً ایک ہزار مثقال سونے کی قیمت تک پہنچتی ہے یا بارہ ہزار اسلامی درہم ہیں (واضح رہے دس درہم کا وزن سات مثقال ہے۔) یا پھر سو اونٹ یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں بطور دیت ادا کرنا ہوں گی۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الدِّيَةِ عَلٰى أَهْلِ الْإِبِلِ مِائَةً مِّنَ الْإِبِلِ وَعَلٰى أَهْلِ الْبَقَرِ مِئَتَيْ بَقَرَةٍ وَّعَلٰى أَهْلِ الشَّاءِ أَلْفَيْ شَاةٍ»

”رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں والوں پر سو اونٹ اور گائیوں کے مالک پر دو سو گائیں بکریوں والوں کے ذمے دو ہزار بکریاں بطور دیت ادا کرنا فرض قرار دیں۔“[1]

① [ضعيف] سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي؟ حديث: 4544,4543.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَجُلاً مِّنْ بَنِي عَدِيٍّ قُتِلَ ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ دِيَتَهُ اثْنَيْ عَشَرَ أَلْفًا»

''بنو عدی کا ایک آدمی قتل ہو گیا تو آپ ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار (درہم) مقرر فرمائی۔''①

عمرو بن حزم کی کتاب (خط) میں ہے:

«وَعَلٰى أَهْلِ الذَّهَبِ أَلْفُ دِينَارٍ» ''سونا ادا کرنے والوں پر ایک ہزار دینار ہے۔''②

اہل علم اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ کیا یہ مذکورہ اشیاء (سونا، چاندی، اونٹ، گائیں، بکریاں وغیرہ) سب اصل اشیاء ہیں کہ ان میں سے جو شے بھی ادا کر دی جائے تو مقتول کے وارث پر لازم ہے کہ اسے قبول کرے، چنانچہ اہل علم کی ایک رائے یہی ہے کہ مذکورہ اشیاء میں سے کوئی ایک چیز مقرر مقدار کی صورت میں دے دی تو جائز ہے کیونکہ جو اس پر واجب تھا اس نے ادا کر دیا ہے۔ یہ قول اہل علم کی ایک جماعت کا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اصل دیت صرف اونٹ ہی ہیں دیگر انواع نہیں۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«فِي النَّفْسِ الْمُؤْمِنَةِ مِائَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ» ''مومن جان کی دیت سو اونٹ ہیں۔''③

نیز ایک اور روایت میں فرمان نبوی ہے:

«أَلَا ! إِنَّ قَتِيلَ الْعَمْدِ الْخَطَأِ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا شِبْهُ الْعَمْدِ ، فِيهِ مِائَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ»

''خبردار! قتل شبہ عمد جو کوڑے یا لاٹھی کے ساتھ ہو، اس میں مقتول کی دیت سو اونٹ ہے۔''④

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: لوگو! اونٹ بہت مہنگے ہو چکے ہیں، لہٰذا سو اونٹ کی قیمت کے پیش نظر سونے کا مالک ایک ہزار دینار دیت دے گا، چاندی کا مالک بارہ ہزار درہم، گائیوں کا مالک دو سو گائیں، بکریوں کا مالک دو ہزار بکریاں اور کپڑے کا مالک دو سو جوڑے دیت میں ادا کرے گا۔''⑤

یاد رہے رسول اللہ ﷺ نے ''شبہ عمد'' میں دیت کے اونٹوں میں ایک مزید کڑی شرط لگائی ہے جو قتل خطا کی دیت میں نہیں (تفصیل آگے آ رہی ہے) تو اس سے ثابت ہوا کہ اصل دیت اونٹ ہی ہیں۔ تقریباً تمام اہل علم کا

---

① [ضعيف] سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي؟ حديث : 4546. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي؟ حديث: 4542، وسنن النسائي، القسامة والديات، باب ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول...... ،حديث :4857 واللفظ له. ③ السنن الكبرى للبيهقي: 100/8 . ④ سنن النسائي، القسامة، باب كم دية شبه العمد ......؟ وذكر الاختلاف على خالد الحذاء، حديث:4803 . ⑤ سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي؟ حديث:4542 .

اس پر اجماع ہے اور یہی قول راجح ہے کیونکہ اونٹ کے علاوہ دیت میں دی جانے والی تمام اشیاء کی قیمت ہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

◣ قتل خطا کی نسبت قتل عمد اور قتل شبہ عمد میں دیت کڑی ہے کہ سو اونٹوں کو چار حصوں میں یوں تقسیم کر دیا گیا ہے کہ پچیس اونٹنیاں بنت مخاض ہوں، یعنی ان کی عمر ایک سال کی ہو چکی ہو اور پچیس اونٹنیاں بنت لبون ہوں، یعنی ان کی عمر دو سال مکمل ہو چکی ہو اور پچیس اونٹنیاں حِقہ ہوں، یعنی جو تین سال کی ہو چکی ہوں اور پچیس اونٹنیاں جذعہ ہوں، یعنی چار سال کی ہو چکی ہوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس مقدار کی تائید ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں:

«فِي الْخَطَأِ أَرْبَاعًا: خَمْسٌ وَّعِشْرُونَ حِقَّةً، وَخَمْسٌ وَّعِشْرُونَ جَذَعَةً، وَخَمْسٌ وَّعِشْرُونَ بَنَاتِ لَبُونٍ، وَخَمْسٌ وَّعِشْرُونَ بَنَاتِ مَخَاضٍ»

''قتل خطا'' کی دیت میں پچیس حِقے (جو چوتھے سال میں داخل ہوں) اور پچیس جذعے (جو پانچویں سال میں داخل ہوں) اور پچیس تیسرے سال میں داخل اور پچیس دوسرے سال میں داخل اونٹنیاں شامل ہوں گی۔''[1]

اگر قاتل مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق دیت ادا کر دے تو مقتول کے ورثاء کو چاہیے کہ وہ اسے قبول کریں، البتہ اگر قاتل چاہے تو اونٹوں کی موجودہ قیمت بھی بطور دیت ادا کر سکتا ہے۔

◣ ''قتل خطا'' کی دیت میں تخفیف ہے کہ سو اونٹوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس حقے، بیس جذعے اور بیس ابن مخاض۔ دیت میں یہ اقسام یا ان کی وہ قیمت ادا کی جائے گی جو رائج الوقت ہو۔

◣ آزاد اہل کتاب شخص، خواہ ذمی ہو یا امن حاصل کرنے والا یا حلیف، اس کی دیت آزاد مسلمان آدمی کی دیت سے نصف دیت ہے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَضٰى أَنَّ عَقْلَ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ نِصْفُ عَقْلِ الْمُسْلِمِينَ»

''نبی ﷺ نے فیصلہ دیا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی دیت مسلمانوں کی دیت کا نصف ہے۔''[2]

◣ مجوسی ذمی ہو، حلیف یا پناہ لینے والا، اسی طرح کوئی بت پرست حلیف ہو یا پناہ لینے والا ان کی دیت آٹھ سو

---

① [ضعيف] سنن أبي داود، الديات، باب في دية الخطأ شبه العمد، حديث:4552. ② سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي؟ حديث:4542، وسنن النسائي، حديث:4811,4810، وسنن ابن ماجه، حديث:2644 واللفظ له، ومسند أحمد :183/2و224.

اسلامی درہم ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«دِيَةُ الْمَجُوسِيِّ ثَمَانُ مِائَةِ دِرْهَمٍ» ”مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہیں۔“[1]

یہ قول اہل علم کی اکثریت کا ہے۔

◢ اہل کتاب، مجوس اور بت پرستوں کی عورتوں کی دیت ان کے مردوں کی دیت سے نصف ہے جیسا کہ مسلمان عورتوں کی دیت مسلمان مردوں سے نصف ہے۔“

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اہل علم کا اجماع ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔“[2]

عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب (خط) میں بھی درج ہے کہ ”عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔“[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ بات واضح ہے کہ عورت مرد سے ناقص ہے اور مرد عورت سے زیادہ نفع مند ہے کیونکہ دینی اور سیاسی مناصب، سرحدوں کی حفاظت، جہاد، زمین کی آبادی اور وہ جملہ احکام جن کے ساتھ عالم انسانی کی مصلحتیں وابستہ ہیں، اسی طرح دین و دنیا کے دفاع کے جملہ امور جس قدر مرد سرانجام دے سکتا ہے اس قدر عورت نہیں کر سکتی، لہٰذا عورت کی دیت مرد کے مساوی نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آزاد انسان کی دیت غلام یا کسی دوسری چیز کی قیمت کے قائم مقام ہے، لہٰذا شارع علیہ السلام کی طرف سے حکمت کا تقاضا ہوا کہ عورت کی قیمت مرد کی قیمت سے نصف مقرر کی جائے تاکہ دونوں میں فطری فرق برقرار رہے۔“[4]

◢ اگر دیت ایک تہائی سے کم واجب ہو تو مرد اور عورت کی دیت برابر ہو گی، چنانچہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«عَقْلُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ عَقْلِ الرَّجُلِ حَتَّى يَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِيَتِهَا»

”عورت اور مرد کی دیت برابر ہے جب وہ تہائی حصہ تک ہو۔“[5]

سیدنا سعید بن مسیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہی سنت ہے۔“

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس مذکورہ مسئلے میں امام ابوحنیفہ، شافعی اور علماء رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا اختلاف ہے، انھوں نے کہا ہے: مرد اور عورت کی قلیل اور کثیر دیت میں برابری نصف تک ہے۔ تاہم سنت پر عمل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ ایک تہائی سے کم اور اس سے زیادہ کا حکم اس لیے الگ الگ ہے کہ ایک تہائی سے کم قلیل

① [ضعيف] الكامل لابن عدي: 347/5، في ترجمة عبدالله بن صالح، والسنن الكبرى للبيهقي: 101/8. ② المغني والشرح الكبير: 532/9. ③ المغني والشرح الكبير: 533/9. ④ إعلام الموقعين: 148/2. ⑤ [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، عقل المرأة، حديث: 4809.

مقدار ہے، لہٰذا اس میں عورت کی مصیبت کو مرد کے برابر قرار دیا گیا، اسی بنا پر مذکر اور مؤنث جنین میں دیت برابر ہوتی ہے کیونکہ اس کی دیت تھوڑی سی ہے، یعنی ایک غلام یا لونڈی، چنانچہ ایک تہائی سے کم پر جنین والے قانون کا اطلاق کر دیا گیا۔''[1]

▲ غلام یا لونڈی کی دیت وہی ہے جو اس کی مناسب قیمت ہو، خواہ وہ کتنی ہی ہو۔ اگر یہ قیمت آزاد آدمی کی دیت سے کم ہو تو متفقہ طور پر علماء کا یہی موقف ہے لیکن اگر غلام کی قیمت آزاد کی دیت کے برابر یا زیادہ ہو جائے تو امام احمد، مالک، شافعی اور ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اس کی قیمت ہی ادا کی جائے گی، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو۔

▲ جنین (پیٹ میں بچہ) لڑکا ہو یا لڑکی، جب وہ جنایت کرنے والے کی جنایت کے سبب مر جائے تو اس میں ایک غلام یا لونڈی دیت ہے یا اس کی قیمت پانچ اونٹ ادا کرنا ہوں گے، خواہ عمداً ایسا ہو یا خطأ کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«قَضٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي جَنِينِ امْرَأَةٍ مِّنْ بَنِي لِحْيَانَ سَقَطَ مَيِّتًا بِغُرَّةٍ: عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ»

''رسول اللہ ﷺ نے بنولحیان کی ایک عورت کے بارے میں فیصلہ دیا جس کے پیٹ میں بچہ قتل کر دیا گیا کہ اسے ایک غلام یا لونڈی دی جائے۔''[2]

وہ غلام یا لونڈی جنین کی طرف سے ترکہ قرار پائے گی۔ گویا وہ سقوط کے وقت زندہ تھا، پھر مر گیا کیونکہ یہ جنین کی دیت ہے۔ یہ جمہور کا مذہب ہے۔ غلام یا لونڈی کی قیمت کا اندازہ پانچ اونٹ ہیں، یعنی اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ۔

اعضاء اور ان کے فوائد کی دیت کا حکم

بعض علماء کا قول ہے کہ انسانی جسم کے اعضاء پینتالیس ہوتے ہیں۔ ان میں بعض اعضاء ایک ایک ہیں اور بعض دو دو کئی دو سے زیادہ ہیں۔ جسم کا جو عضو صرف ایک ہی ہے، مثلاً: ناک، زبان، آلۂ تناسل اگر کوئی جنایت کر کے اسے کاٹ دے تو اس کی دیت اتنی ہی ہے جتنی اس پورے انسان کی دیت ہے اور اس کی مقدار آدمی کی مختلف

[1] إعلام الموقعين: 2/148و149. [2] صحيح البخاري، الديات، باب جنين المرأة وأن العقل على الوالد ......، حديث: 6909، وصحيح مسلم، القسامة، باب دية الجنين ......، حديث: (35)-1681 واللفظ له.

حیثیتوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ حیثیت سے مراد یہ ہے کہ وہ مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام، لونڈی ہو یا ذمی وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عضو انسانی بدن میں اکیلا پیدا کیا ہے اس کے ضائع ہونے سے اس کا فائدہ بالکل ختم ہو جاتا ہے تو گویا وہ جان جانے کے مترادف ہے، لہٰذا اس کی دیت بھی جان کی دیت ہے۔ اس مسئلے میں علماء کا اتفاق ہے۔ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَفِي الْأَنْفِ إِذَا أُوعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَـةُ، وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَةُ . . . وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَةُ»

''اور ناک میں مکمل دیت ہے جب اسے جڑ سے کاٹ دیا جائے اور زبان میں پوری دیت ہے...... اور آلۂ تناسل کے کاٹنے سے مکمل دیت ہے۔''[1]

جسم کے جو اعضاء جوڑا جوڑا ہیں، مثلاً: آنکھیں، کان، ہونٹ، جبڑے، عورت کے پستان، مرد کی چھاتی، ہاتھ، ٹانگیں اور خصیتین، اگر ایسے اعضاء دونوں ہی کاٹ دیے جائیں تو پورے انسان کی دیت ادا کرنا پڑے گی اور اگر ایک کاٹ دیا جائے تو اس میں آدھی دیت ہوگی کیونکہ اس قسم کے دونوں اعضاء کی موجودگی میں انسان کی منفعت اور حسن و جمال ہے، نیز بدن میں ویسا عضو مزید تو ہے نہیں۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہمارے علم کے مطابق اس مسئلے میں کسی نے مخالفت نہیں کی۔''

سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں تحریر ہے کہ دیت کے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھ کر بھیجے تھے:

«وَفِي الْأَنْفِ إِذَا أُوعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَةُ، وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَةُ وَفِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ وَفِي الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَةُ . . . وَفِي الصُّلْبِ الدِّيَةُ وَفِي الْعَيْنَيْنِ الدِّيَةُ وَفِي الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّيَةِ»

''جب ناک جڑ سے کاٹ دی جائے تو اس میں مکمل دیت ہے۔ زبان میں پوری دیت ہے، دونوں ہونٹوں میں مکمل دیت ہے، خصیتین میں پوری دیت ہے، پشت میں مکمل دیت ہے، دونوں آنکھوں میں پوری دیت ہے اور ایک ٹانگ کے کاٹ دینے میں نصف دیت ہے۔''[2]

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب (خط) اہل علم میں معروف ہے اور جو احکام اس میں درج تھے ان میں سے چند کے سوا باقی پر علماء کا اتفاق ہے۔

[1] [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول ...... ، حديث: 4857. [2] [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول ...... ، حديث: 4857.

▲ ایک ہی قسم کے جو اعضاء تین ہیں۔ ان تینوں کے کاٹ دینے سے پوری دیت دینا ہو گی اور اگر ایک حصہ کاٹ دیا جائے تو اس کی دیت ایک تہائی ہے، مثلاً: ناک جو دو نتھنوں اور ان کی درمیانی ہڈی پر مشتمل ہے۔

▲ انسان کے وجود میں جو اعضاء چار ہیں۔ ان چاروں کے کاٹ دینے سے پوری دیت ہے اور اگر کم ہوں تو دیت بھی اسی قدر کم ہو گی، مثلاً: چاروں پلکیں جن کا مقصد ظاہری خوبصورتی بھی ہے اور آنکھوں کو سردی و گرمی سے بچانا بھی ہے، ان میں دیت ہے۔ ایک میں چوتھائی حصہ چاروں میں مکمل دیت ہے۔

▲ دونوں ہاتھوں کی مکمل انگلیوں میں مکمل دیت ہے۔ اسی طرح پاؤں کی انگلیوں میں مکمل دیت ہے، یعنی جب دس کی دس کاٹ دی جائیں گی تو دیت سو اونٹ ہے ایک انگلی میں دس اونٹ دیت ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«دِيَةُ أَصَابِعِ الْيَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَاءٌ عَشَرَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ لِكُلِّ أُصْبُعٍ»

''ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے، ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہے۔''[1]

صحیح بخاری میں یہ لفظ بھی منقول ہیں:

«هٰذِهِ وَهٰذِهِ سَوَاءٌ، يَعْنِي الْخِنْصَرَ وَالْإِبْهَامَ» ''یہ انگلی اور یہ انگلی برابر ہیں، یعنی چھنگلی اور انگوٹھا۔''[2]

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں دیت ہے اور ہر انگلی کی دیت دس اونٹ بنتی ہے۔

▲ ہر انگلی میں تین جوڑ ہیں، لہٰذا ایک جوڑ تک انگلی کاٹ دینے سے انگلی کا تیسرا حصہ دیت ہے انگوٹھے میں دو جوڑ ہوتے ہیں، اس لیے اس کے ایک جوڑ کی دیت ایک انگلی کا نصف، یعنی پانچ اونٹ ہیں۔

▲ ہر دانت کی دیت پانچ اونٹ ہے کیونکہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«وَفِي السِّنِّ خَمْسٌ مِّنَ الْإِبِلِ» ''ہر دانت میں پانچ اونٹ دیت ہے۔''[3]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر ہر دانت کی دیت پانچ پانچ اونٹ ہے اور ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔''[4]

▲ منافع سے مراد وہ فوائد ہیں جو اعضائے جسمانی سے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً: سننا، دیکھنا، سونگھنا، گفتگو کرنا اور چلنا

① جامع الترمذي، الديات، باب ما جاء في دية الأصابع، حديث: 1391. ② صحيح البخاري، الديات، باب دية الأصابع، حديث: 6895. ③ [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول...... ، حديث: 4857. ④ المغني والشرح الكبير: 612/9.

وغیرہ جو ہر عضو کا ایک مخصوص مقصد اور فائدہ ہے۔

◢ انھی منافع میں سے حواس اربعہ، مثلاً: سننا، دیکھنا، سونگھنا اور چکھنا ہیں، چنانچہ مذکورہ چاروں حواس میں سے کوئی ایک حس جنایت کے سبب ختم کر دی جائے تو اس میں کامل دیت ہے۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عام اہل علم کا اجماع ہے کہ سماعت (کان) کے ضائع ہو جانے سے دیت ادا کی جائے گی۔''[1]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔[2] سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں ہے:

«وَفِي الْمَشَامِ الدِّيَةُ» ''سونگھنے کی قوت ضائع کر دینے کی صورت میں دیت ہے۔''[3]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک شخص نے ایک آدمی کو اس قدر مارا پیٹا کہ اس کی سننے، دیکھنے اور جماع کرنے کی تینوں قوتیں، نیز عقل جاتی رہی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی چار دیتوں کی ادائیگی کا فیصلہ صادر فرمایا، حالانکہ وہ مضروب شخص زندہ رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس فیصلے کی مخالفت نہ کی۔

◢ کسی کے بولنے، سمجھنے، چلنے، کھانے یا نکاح (جماع) کرنے اور بول و براز کو کنٹرول کرنے کی قوت ختم کر دی گئی تو اس میں ہر ایک کی مکمل دیت ہے کیونکہ ہر ایک کا بہت اہم اور بڑا فائدہ ہے، نیز بدن میں مذکورہ قوتوں میں سے ہر ایک قوت ایک ہی ہوتی ہے دو نہیں۔

◢ جسم میں بال اگنے کے چار مقامات میں سے اگر کسی ایک مقام کو اس قدر متاثر کیا گیا کہ اس میں بال اگنے کی استعداد نہ رہی تو اس میں بھی مکمل دیت ہے، یعنی سر کے بال، ڈاڑھی کے بال، ابرو کے بال اور پلکوں کے بال۔ اگر ایک ابرو ہو تو اس میں نصف دیت ہے۔ ایک پلک میں چوتھائی حصہ دیت ہے کیونکہ پلکیں چار ہیں۔

ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ڈاڑھی کا کس قدر احترام اور قیمت ہے کہ اس کے تلف کرنے میں مکمل دیت مقرر کی ہے کیونکہ اس کا بہت فائدہ ہے اور اس میں مرد کے لیے حسن اور وقار ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بڑھانے اور اس کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اسے مونڈنے، کاٹنے اور اس پر زیادتی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ستیاناس ہو ان لوگوں کا جو عورتوں سے مشابہت اختیار کر کے اور کافروں اور منافقوں کی نقالی کرتے ہوئے ڈاڑھی سے برسر پیکار ہیں، وہ مردانہ شان کو چھوڑ کر زنانہ نزاکت اختیار کرتے ہیں۔ شاعر نے سچ کہا ہے:

يُقْضٰى عَلَى الْمَرْءِ فِي أَيَّامِ مِحْنَتِهِ حَتّٰى يَرٰى حَسَنًا مَّا لَيْسَ بِالْحَسَنِ

[1] المغني والشرح الكبير:596/2. [2] المغني والشرح الكبير:596/2. [3] المغني والشرح الكبير:600/9.

''آدمی پر مصیبت کے ایام میں ایسی کیفیت بھی آ جاتی ہے کہ وہ بری چیز کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔''

علامہ اقبال کا شعر ہے:

جو ناخوب تھا بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لہٰذا ایسے لوگوں کو چاہیے کہ عقل سے کام لیں، دانش مندی کی روش اختیار کریں اور اپنے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرتے ہوئے پوری ڈاڑھی رکھیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس کی مردانگی کی علامت اور حسن و جمال کا مظہر بنایا ہے۔

سر کے زخم اور ہڈی توڑنے کے احکام

شِجَاجٌ ، شَجَّةٌ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی کٹنے اور پھٹنے کے ہیں اصطلاحی طور پر سر یا چہرے کے ایسے زخم کو کہا جاتا ہے جس سے سر پھٹ جائے یا چہرے کی جلد کٹ جائے۔ اگر سر اور چہرے کے سوا کسی اور جگہ زخم ہو تو اسے جُرحٌ کہتے ہیں، شَجَّۃٌ نہیں۔ اہل عرب کے نزدیک شَجَّۃٌ (سر اور چہرے کے زخم) کی دس قسمیں ہیں اور ہر قسم کا ایک خاص نام اور حکم ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

① حارصہ: یعنی ایسا زخم جس سے جلد معمولی طور پر چھل جائے لیکن خون نہ نکلے۔ ایسے زخم کو قَاشِرہ بھی کہتے ہیں۔

② بازلہ: ایسا زخم جس سے معمولی سا خون نکل آئے اسے دامعہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زخم آنکھ کے آنسو نکلنے سے مشابہت رکھتا ہے۔

③ باضعہ: وہ زخم جس سے جلد چھل جائے اور گوشت کٹ جائے۔

④ متلاحمہ: وہ زخم جو گوشت میں گہرائی تک چلا جائے۔

⑤ محاق: وہ زخم جو گوشت میں گہرائی تک چلا جائے حتی کہ ہڈی کے اوپر بنی ہوئی جھلی تک پہنچ جائے۔

مذکورہ پانچ اقسام کے زخموں میں شرعی طور پر دیت کی خاص مقدار مقرر نہیں، لہٰذا اس میں ''حکومۃ'' ہو گا جسے حاکم اپنے اجتہاد سے مقرر کرے گا۔[1]

[1] ''حکومۃ'' یہ ہے کہ جس شخص پر جنایت ہوئی ہے اس کو ایک صحیح غلام تصور کر کے قیمت لگائی جائے، پھر اس کو ایک جنایت والا تصور کر کے (جبکہ جنایت ٹھیک ہو چکی ہو) قیمت لگائی جائے تو جو کمی ہو گی اس کی مثل اس کو دیت دی جائے گی، مثلاً: ایک صحیح غلام ◄◄

⑥ موضحہ: وہ زخم جس سے ہڈی نظر آنے لگے۔ اس کی دیت پانچ اونٹ ہے جیسا کہ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت میں فرمان نبوی ﷺ ہے:

«وَفِي الْمُوْضِحَةِ خَمْسٌ مِّنَ الْإِبِلِ» ''موضحہ زخم میں دیت پانچ اونٹ ہیں۔''[1]

⑦ ہاشمہ: وہ زخم جو نہ صرف ہڈی کو ظاہر کر دے بلکہ اسے توڑ دے۔ ایسے زخم کی دیت دس اونٹ ہے۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔

⑧ منقلہ: جو زخم نہ صرف ہڈی کو ظاہر کر دے اور توڑ دے بلکہ اس کی وجہ سے ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ جائے اور اس کے ٹوٹے ہوئے حصوں کو جوڑ کر اور باندھ کر واپس لانا پڑے۔ اس قسم کے زخم میں پندرہ اونٹ دیت ہے۔ اس کا ذکر بھی حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب (خط) میں موجود ہے کہ ''منقلہ میں پندرہ اونٹ (دیت) ہیں۔''[2]

⑨ مامومہ: وہ زخم جو دماغ کی جھلی تک پہنچ جائے، یعنی اس جھلی تک پہنچ جائے جس میں دماغ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

⑩ دامغہ: وہ زخم جو دماغ کی جھلی کو پھاڑ دے۔

ان دونوں زخموں میں ایک تہائی دیت ہے جیسا کہ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«وَفِي الْمَأْمُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ» ''مامومہ زخم میں تہائی دیت ہے۔''[3]

واضح رہے دامغہ، مامومہ سے گہرا زخم ہوتا ہے، لہٰذا اس میں بالاولیٰ تہائی دیت ہے۔ عام طور پر اس زخم سے انسان زندہ نہیں رہتا، اس لیے اس کی دیت مقرر نہیں کی گئی۔

◄ جائفہ ایسا گہرا زخم جو جسم کے اندر کسی خلا تک پہنچ جائے، مثلاً: پیٹ، پشت، سینہ، حلق اور مثانہ کا خلا، اس میں بھی تہائی دیت ہے کیونکہ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«وَفِي الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ» ''جائفہ زخم میں تہائی دیت ہے۔''[4]

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ عام اہل علم کا قول ہے، ان میں اہل مدینہ، اہل کوفہ، اہل الحدیث اور دیگر بعض اصحاب الرائے بھی شامل ہیں۔''[5]

◄◄ کی قیمت دس ہزار روپے ہے اور جنایت والے کی قیمت نو ہزار (9000) ہے تو دیت کا عشر اسے ملے گا۔ دیکھیے: المغني: 661/9. ① [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول......، حديث: 4857. ② دیکھیے سابقہ حوالہ۔ ③ [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول......، حديث: 4857. ④ [ضعيف] سنن النسائي، القسامة، ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول......، حديث: 4857. ⑤ المغني والشرح ◄◄

ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں دیت کی تفصیل درج ذیل ہے:

① اگر کسی نے ایک شخص کی پسلی کی ہڈی توڑ دی جو علاج کے بعد صحیح طور پر جڑ گئی تو اس میں ایک اونٹ دیت ہے۔ اسی طرح ہنسلی کی ہر ہڈی میں دیت ایک ایک اونٹ ہے کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

«أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَضٰی . . . فِي التَّرْقُوَةِ بِجَمَلٍ وَّفِي الضِّلْعِ بِجَمَلٍ»

''انھوں نے ہنسلی کی ہڈی اور پسلی کی ہڈی میں ایک ایک اونٹ دیت کا فیصلہ فرمایا۔''[1]

② کلائی کی ہڈی توڑنے کی صورت میں اگر وہ صحیح جڑ جائے تو اس کی دیت دو اونٹ ہے۔ کلائی کی ہڈی سے مراد وہ ہے جو ہاتھ سے لے کر کہنی تک ہوتی ہے۔ ایسے ہی ران، پنڈلی اور گٹے (ہاتھ یا پاؤں کے جوڑ) کی ہڈی توڑنے میں دو اونٹ دیت ہے۔

سیدنا عمرو بن شعیب سے روایت ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ایک شخص نے کسی کے بازو کی ایک ہڈی توڑ دی تو اس میں کتنی دیت ہے؟ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس میں دو اونٹ ہیں۔ اور اگر بازو کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ جائیں تو اس میں چار اونٹ ہیں۔[2] اس مسئلے میں کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔

یہ ان زخموں اور ہڈیوں کو توڑنے اور ان کی دیت کا بیان تھا جن کا ذکر شریعت میں وارد ہوا ہے اور جو اس کے علاوہ ہڈی ٹوٹنے یا زخم آنے کی صورتیں ہیں ان میں ''حکومہ'' ہے، مثلاً: ریڑھ کی ہڈی کے مہرے اور پیڑو (ناف کے نیچے) کی ہڈی میں۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پسلی، ہنسلی کی دونوں ہڈیوں اور بازو کی دونوں ہڈیوں کے سوا دیگر زخموں میں دیت کی تعیین نہیں کیونکہ تعیین کسی شرعی دلیل سے ثابت ہوتی ہے اور دلیل کا تقاضا ہے کہ ان باطنی ہڈیوں کے زخموں میں ''حکومہ'' واجب ہو (سوائے پانچ کے) ان میں ''حکومہ'' اس لیے نہیں ہے کہ ان کی بابت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ موجود ہے، البتہ ان کے سوا دیگر باطنی زخموں کی تعیین زخم کی کیفیت کے مطابق اجتہاد سے کی جائے گی۔''[3]

◄◄ الكبير: 629/9. ① الموطأ للإمام مالك، العقول، باب جامع عقل الأسنان، حديث: 1654. اگر پسلی یا ہنسلی کی ہڈی ٹیڑھی جڑ گئی تو اس میں حکومہ ہے۔ ''حکومہ'' کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے۔ ② [ضعيف] منار السبيل، ص: 665، المصنف لابن أبي شيبة، الديات، باب الزنديكسر: 436/5، حديث: 27770، وإرواء الغليل: 328/7، حديث: 2292. ③ المغني والشرح الكبير: 657/9.

فقہائے کرام فرماتے ہیں: اگر زخم میں ''حکومہ'' مقرر ہو اور وہ زخم اس جگہ ہو جس کی شریعت میں دیت مقرر ہے، جیسے سر کا وہ زخم جس میں ہڈی ظاہر نہ ہوئی ہو تو اس میں فیصلہ کرتے وقت اس کی دیت ہڈی کے ظاہر ہونے والے زخم کی دیت تک نہ پہنچے کیونکہ ہڈی ظاہر ہونے والے زخم میں دیت پانچ اونٹ ہے۔ اور جو زخم اس سے کم ہو اس میں دیت بالا والی کم ہونی چاہیے۔

▲ اگر مظلوم جنایت کے بعد بالکل تندرست ہو گیا کہ علاج کے بعد جنایت نے کوئی کمی پیدا نہ کی تو اس کی وہ قیمت لگائی جائے گی جو زخم سے خون جاری ہونے کے وقت کی ہو سکتی تھی۔ اس وقت زخمی پر جنایت کا اثر ہوتا ہے اور وہ خوف زدہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کیفیت میں اس کی قیمت لازماً کم ہو جائے گی اور اسی کمی کی نسبت سے مجرم سے دیت وصول کی جائے گی۔

کفارۂ قتل کا بیان

کَفَّارة، کَفَر سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ''پردہ ڈالنے'' کے ہیں تو اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ گناہ پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اسے ڈھانپ لیتا ہے۔ کفارۂ قتل کے وجوب کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِــيْمًا ۝ ﴾

''جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے تو اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے، ہاں! یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں اور اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنا لازم ہے اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (بھی ضروری ہے) پس جو نہ پائے اس کے ذمے دو مہینے کے لگاتار روزے ہیں یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے بخشوانے کے لیے اور اللہ بخوبی جاننے والا اور حکمت والا

ہے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے قاتل سے متعلق فرمایا:

«أَعْتِقُوا عَنْهُ يُعْتِقِ اللهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِّنْهُ عُضْوًا مِّنْهُ مِنَ النَّارِ»

"اس قاتل کی طرف سے غلام یا لونڈی آزاد کرو۔ اللہ تعالیٰ مقتول کے ہر عضو کے بدلے قاتل کا ہر عضو آگ سے آزاد کرے گا۔"[2]

▲ قتل خطا اور قتل شبہ عمد دونوں میں کفارہ ہے قتل عمد میں کفارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○﴾

"اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"[3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کا کفارہ بیان نہیں کیا۔ ایک روایت ہے کہ سوید بن صامت نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر قصاص کو واجب قرار دیا، کفارہ نہیں۔

عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے دو آدمیوں کو عمداً قتل کر دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی دیت ادا کی لیکن کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کرنا تب لازم ہوتا ہے جب کوئی کام غلطی سے سرزد ہوتا کہ گناہ مٹ جائے، نیز اس میں کوتاہی کو دخل ہوتا ہے جس کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔ قتل عمد اس قدر بڑا گناہ ہے کہ وہ کفارے سے زائل نہیں ہو سکتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "قتل عمد میں کفارہ نہیں۔ اسی طرح جھوٹی قسم عمداً اٹھائی گئی ہو تو جس کسی کے حق پر ناجائز قبضہ کیا گیا ہو اس میں بھی کفارہ نہیں کیونکہ اس موقع پر دیا گیا کفارہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے لیے تخفیف کا باعث نہیں بن سکتا۔"[4]

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "قتل خطا کو حرام یا مباح کے ساتھ متصف قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ مجنون شخص کے قتل کی طرح ہے لیکن مقتول جان معصوم تھی، لہٰذا اس میں کفارہ واجب قرار دیا گیا۔"[5]

---

① النسآء4:92. ② [ضعیف] سنن أبي داود، العتق، باب في ثواب العتق، حدیث:3964، والسنن الکبرٰی للنسائي، العتق، حدیث:4890-4892. ③ النسآء4:93. ④ مجموع الفتاوٰی لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 34/139. ⑤ المغني والشرح الکبیر:9/670.

▲ قتل خطا میں کفارے کے مشروع ہونے میں جو حکمت ہے اس میں دو باتیں اہم ہیں: ① قتل خطا میں قاتل کی کوتاہی لازماً شامل ہوتی ہے۔ ② کفارے میں قتل ہونے والی جان کا احترام اور بے گناہی پیش نظر رہے۔

▲ قتل عمد میں کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اس قدر بڑا ہے کہ کفارے سے زائل نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسا شخص اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور معافی کا طلبگار ہو اور خود کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دے تا کہ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لے لیں تو اس صورت میں اس کے گناہ میں تخفیف ہو جائے گی۔ توبہ سے اللہ تعالیٰ کا حق ساقط ہو جائے گا قصاص یا معافی سے مقتول کے ورثاء کا حق ادا ہو جائے گا۔ باقی رہ گیا مقتول کا حق تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے خوش کر دے گا یا وہ قاتل کی نیکیوں کا ایک حصہ مقتول کو دے دے گا۔ بہر حال جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہی ہوگا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الجواب الکافي میں اس کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔

▲ جس نے کسی ایسی بے گناہ جان کو قتل کیا جو اس کا غلام تھا یا ذمی کافر یا پناہ لینے والا کافر یا نو مولود بچہ یا رحم میں موجود بچہ جسے حاملہ کے پیٹ میں ضرب لگا کر ختم کر دیا گیا اور پھر عورت نے اسے مردہ جنا۔ ان مذکورہ اشخاص میں سے کوئی ایک قتل ہو جائے تو قاتل کے ذمے کفارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِــيْمًا ۝ ﴾

''جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے تو اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے، ہاں! یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں اور اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنا لازم ہے اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (بھی ضروری ہے) پس جو نہ پائے اس کے ذمے دو مہینے کے لگا تار روزے ہیں اللہ سے بخشوانے کے لیے اور اللہ بخوبی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''[1] میں عموم ہے۔

① النسآء 4:92.

▲ قتل کرنے والا، خواہ اکیلا ہو یا اس کے ساتھ کوئی اور شخص شریک ہو، بلاواسطہ قتل ہو یا بالواسطہ ہو، مثلاً: کسی نے عام راستے میں زیادتی کرتے ہوئے کنواں کھودا تو کوئی شخص اس میں گر کر مر گیا یا راستے میں چھری گاڑ دی وغیرہ یا ایسا کوئی کام جس کے نتیجے میں کسی کی جان چلی جائے۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایک قتل میں جتنے افراد شریک ہوں گے سب پر کفارہ ہے۔ یہ قول اہل علم کی اکثریت کا ہے جن میں امام مالک، شافعی اور دیگر فقہاء رحمہم اللہ شامل ہیں۔''[1]

▲ قاتل جس قسم کا بھی ہو اس پر کفارہ واجب ہے، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا یا مجنون، آزاد ہو یا غلام کیونکہ آیت کے حکم میں عموم ہے۔

▲ کفارے میں ایک مومن غلام یا مومنہ لونڈی کو آزاد کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہے۔ اس کفارے میں کھانا کھلانے کی صورت شامل نہیں۔ اگر روزے رکھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو کفارہ اس کے ذمے ہوگا۔ کھانا کھلانے سے کفارہ ادا نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یاد رہے کفارے کی صورتیں نصوص شرعیہ سے ثابت ہوتی ہیں، قیاس سے نہیں۔

▲ اگر قتل کرنے والا غلام ہو تو وہ صرف روزے رکھ کر کفارہ دے کیونکہ اس کی ملکیت میں مال نہیں ہوتا کہ وہ کسی غلام کو آزاد کر سکے۔

▲ اگر قاتل مجنون یا چھوٹا بچہ ہے تو اس کا سرپرست صرف غلام یا لونڈی آزاد کرنے کی صورت میں کفارہ دے کیونکہ ان دونوں کے لیے روزے رکھنا ممکن نہیں، نیز اس میں نیابت کو بھی دخل نہیں۔ الغرض! کفارہ دونوں میں سے ہر فرد پر ہے کیونکہ یہ ایک مالی حق ہے جو دیت کے مشابہ ہے، نیز زکاۃ کی طرح یہ مالی عبادت ہے۔

▲ قتل ہونے والے افراد کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر کفارات کی تعداد بھی زیادہ ہوگی جیسا کہ متعدد قتل میں متعدد دیتیں ادا کرنا پڑتی ہیں، مثلاً: ایک آدمی نے چار افراد کے قتل ''قتل خطا'' کا ارتکاب کیا تو اس پر کفارے بھی چار ہوں گے جس طرح دیتیں چار ہوں گی۔

▲ اگر قتل مباح ہو، مثلاً: باغی، مرتد، شادی شدہ زانی یا کسی کو کسی مقتول کے قصاص یا کسی حد میں قتل کیا گیا یا کسی نے اپنی ذات کے دفاع میں حملہ آور کو قتل کر دیا تو ان صورتوں میں کفارہ نہ ہوگا کیونکہ مقتول کی حرمت قائم نہیں۔

تنبیہ: آج کے دور میں لوگ کفارۂ قتل میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ خاص طور پر اگر کسی سے گاڑی (کار) کے

[1] المغني والشرح الكبير: 9/668.

حادثے میں کئی جانیں ختم ہو جائیں تو وہ مالی تاوان تو ادا کر دیتا ہے لیکن روزے رکھنے کا کفارہ ادا نہیں کرتا۔ خاص طور پر جب اس پر ایک سے زیادہ کفارے واجب ہوں۔ اس طرح اس پر شرعی ذمے داری اور اللہ تعالیٰ کا حق قائم رہتا ہے۔ اسی طرح اور بھی لوگوں میں کمزوریاں ہیں، مثلاً: قاتل کے عصبہ ورثاء ''قتل خطا'' کی دیت کی ذمے داری قبول نہیں کرتے۔ اگر ذمے دار بن جائیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ مقتول کے ورثاء کے ساتھ نفلی طور پر تعاون کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قتل خطا کی دیت ادا کرنے کے لیے لوگوں سے مالی تعاون مانگتے ہیں۔ یہ صورت انتہائی افسوس ناک ہے کیونکہ اس طرح ایک عظیم شرعی حکم معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ اس مسئلے سے واقف ہی نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے ذمے دیت واجب ہونے کا بہانہ بنا کر خیرات مانگتا رہے، لہٰذا اسے لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے سے منع کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ غیر قانونی اور جعلی کاغذات اٹھائے پھرتے ہیں یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادائیگی ہو جانے کے بعد بھی طویل عرصے تک وہ اسی بہانے مانگتے رہتے ہیں۔

قسامت کے احکام

قَسَامَة قسم سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہیں: ''قسمیں اٹھانا'' اور یہاں قسامت سے مراد کسی بے گناہ شخص کے قتل کے دعوے میں کسی ایک فریق سے قسمیں لینا ہے۔ جب کوئی شخص قتل ہو جائے اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو سکے اور قتل کا الزام کسی ایک شخص یا زیادہ افراد پر لگا دیا جائے تو اس صورت میں قسامت مشروع ہے۔ قسامت کی دلیل سنت اور اجماع سے ثابت ہے:

صحیحین میں سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن سہل اور محیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہما خیبر کی جانب نکلے، یہ صلح کے زمانے کی بات ہے۔ ایک جگہ دونوں الگ ہو گئے، پھر تھوڑی دیر بعد محیصہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو ایک جگہ خون میں لت پت مقتول پایا، (چنانچہ وہ یہود کے پاس آئے اور کہا کہ اس شخص کو لازماً تمھی نے قتل کیا ہے کیونکہ تمھاری سرزمین میں قتل ہوا ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔) یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں آیا تو عبدالرحمٰن بن سہل بات کرنے لگا تو آپ نے فرمایا: ''بڑے کو بات کا موقع دیں۔'' اور وہ ان سب سے چھوٹا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے ورثاء سے فرمایا: ''اگر تم قسمیں اٹھا لو تو اپنے ساتھی کے خون کی دیت کے مستحق ہو سکتے ہو۔'' (ایک روایت میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے دعوے پر گواہ پیش کر سکتے ہو؟'' تو انھوں نے کہا:

ہمارے پاس گواہ تو نہیں ہیں۔) آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قسمیں اٹھا لو گے؟'' انھوں نے کہا: ہم قسمیں کیسے اٹھائیں کیونکہ نہ ہم وہاں تھے اور نہ ہم نے قتل ہوتے دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہودیوں کے پچاس افراد قسمیں اٹھالیں گے تو وہ بری ہو جائیں گے۔'' انھوں نے کہا: وہ کافر قوم ہیں ہم ان کی قسموں پر کیسے اعتبار کر لیں؟ تب آپ ﷺ نے مقتول کی دیت سو اونٹ بیت المال سے ادا کی۔''[1]

یہ حدیث قسامت کی مشروعیت پر دلیل ہے اور یہ شریعت کا ایک بنیادی ضابطہ ہے اور احکام دین میں ایک مستقل قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔

قسامت کی شرائط درج ذیل ہیں:

① مقتول شخص اور جس پر قتل کا الزام ہو دونوں میں عداوت و دشمنی موجود ہو جیسا کہ بعض قبائل باہمی دشمنی کی وجہ سے ایک دوسرے سے انتقام لیتے ہیں۔ اگر ملزم اور مقتول کے درمیان عداوت ہو تو ملزم کے قتل کرنے کا قوی امکان ہوتا ہے، لہٰذا اس صورت میں مقتول کے ورثاء اگرچہ موقع پر موجود نہ ہوں غالب گمان کی بنا پر قسمیں اٹھائیں گے کہ ملزم ہی قاتل ہے۔

مقتول کے ورثاء کو چاہیے کہ وہ اس وقت تک قسمیں نہ اٹھائیں جب تک انھیں اپنے دعوے کی سچائی پر گمان غالب نہ ہو اور حاکم یا قاضی کو چاہیے کہ انھیں آگاہ کرے کہ جھوٹی قسم اٹھانے کی آخرت میں کیا سزا ہے۔

② مدعا علیہ عاقل و بالغ ہو، لہٰذا بچے یا مجنون کے بارے میں دعویٰ قابل تسلیم نہ ہوگا۔

③ قسامت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مدعا علیہ ایسا شخص ہو جس سے قتل کے سرزد ہونے کا امکان ہو ورنہ دعویٰ قابل سماعت نہ ہوگا، مثلاً: مدعا علیہ شخص قتل کے وقت جائے وقوع سے بہت زیادہ دور تھا۔

قسامت کا طریقہ درج ذیل ہے:

جب قسامت کی مذکورہ شرائط پوری ہوں تو اولاً مدعی فریق، مدعا علیہ فریق کی موجودگی میں پچاس قسمیں اٹھائیں گے جو ان لوگوں پر بقدر وراثت تقسیم ہوں گی اور کہیں گے کہ فلاں شخص ہی نے قتل کیا ہے۔

اگر ورثاء قسمیں اٹھانے سے انکار کر دیں یا وہ پچاس قسمیں مکمل نہ کر سکیں تو فریق ثانی (مدعا علیہ) پچاس قسمیں اٹھائیں گے بشرطیکہ فریق اول (مدعی) ان کی قسمیں لینے پر رضامند ہو۔ اگر وہ قسمیں اٹھا لیں تو بری ہو جائیں گے۔ اور اگر مدعی قسمیں لینے پر رضامند نہ ہوں تو حاکم وقت مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کرے گا جیسا کہ

---

[1] صحيح البخاري، الجزية، باب الموادعة والمصالحة مع المشركين بالمال وغيره......، حديث: 3173 و6898، وصحيح مسلم، كتاب و باب القسامة، حديث: 1669، والتلخيص الحبير: 4/39 واللفظ له.

انصار نے جب یہودیوں کی قسمیں قبول نہ کیں تو رسول اللہ ﷺ نے مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مدعا علیہ پر خون کے اثبات کی کوئی صورت نہیں رہی، لہٰذا یہ تاوان بیت المال پر پڑے گا تا کہ معصوم جان کا خون رائیگاں نہ جائے۔

◢ فقہائے کرام کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ جب قسامت کی تمام شرائط مکمل ہو جائیں، نیز مقتول کے ورثاء پچاس قسمیں اٹھائیں تو مدعا علیہ سے قصاص لیا جا سکتا ہے یا اسے صرف دیت ادا کرنا ہوگی۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اب قصاص کی شرائط پوری ہو چکی ہیں، لہٰذا قصاص لینا درست ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«يَحْلِفُ خَمْسُونَ مِنْكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَيُدْفَعُ إِلَيْكُمْ بِرُمَّتِهِ»

''تم میں سے پچاس آدمی ان میں سے کسی ایک شخص کے قاتل ہونے کی قسمیں اٹھا لیں تو وہ پوری طرح تمھارے حوالے کر دیا جائے گا۔''[1]

صحیح مسلم میں ہے: ''تمھارے سپرد کر دیا جائے گا۔''

معلوم ہوا کہ قسامت گواہی کے قائم مقام ہے۔

◢ فقہائے کرام کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص جمعہ یا طواف کعبہ کے رش میں مر گیا تو اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی، چنانچہ حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک شخص عرفہ کے میدان میں رش کی وجہ سے مر گیا۔ اس کے ورثاء سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور دیت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: اس کے قاتل کے خلاف گواہی پیش کرو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! مسلمان کا خون رائیگاں نہیں ہو سکتا۔ اگر قاتل کا علم ہو جائے تو ٹھیک ورنہ بیت المال سے دیت ادا کی جائے۔

[1] صحيح مسلم، كتاب وباب القسامة، حديث: 1669، والتلخيص الحبير: 4/39 واللفظ له.

باب 15

حدود اور تعزیرات کے مسائل

حدود کے احکام

''حدود'' حد کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ''روکنے'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حدود سے مراد اس کے حرام کردہ وہ امور ہیں جن کے ارتکاب سے اس نے منع کر دیا ہے۔ اور شرعی اصطلاح میں حدود ان مقررہ سزاؤں کو کہا جاتا ہے جو خاص امور میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے نتیجے میں دی جاتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسا کام نہ کریں۔ حدود کی مشروعیت کی دلیل کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حدود الٰہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق پر رحمت اور ارادۂ احسان ہے حتی کہ جن لوگوں پر گناہوں کے ارتکاب کے نتیجے میں حدود کا نفاذ ہو اس کا مقصد ان کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی ہونا چاہیے۔ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو اس کی اصلاح اور بہتری کی خاطر سزا دیتا ہے یا ڈاکٹر مریض کی بہتری کے لیے انتہائی کڑوی کسیلی دوائیں اس کے حلق سے نیچے اتارتا ہے یا آلات جراحی کے ذریعے سے اس کے جسم کا اپریشن کرتا ہے۔''[1]

حدود کی مشروعیت میں حکمت انسانی نفوس کو جرائم کے ارتکاب سے روکنا ہے اور انھیں پاک وصاف کرنا ہے۔ حد مقرر سزا کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے، نیز اس میں معاشرے کی مصلحت پیش نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جرائم کے مرتکب افراد کے لیے ایسی سزائیں رکھی ہیں جن کا سلیم طبائع تقاضا کرتی ہیں۔ ان کے نفاذ میں بندوں کی دنیوی اور اخروی مصلحتیں مضمر ہیں۔ کسی بھی ملک کا سیاسی نظام تب تک درست نہیں ہو سکتا جب تک جرائم سے روکنے کے لیے مجرموں کو عبرتناک سزائیں نہ دی جائیں۔ حدود کے نفاذ سے مجرم باز آ جاتا ہے اور قانون کی پابندی کرنے والا مطمئن ہو جاتا ہے۔ زمین میں عدل وانصاف کا بول بالا ہوتا ہے۔ لوگوں کی جانیں، عزتیں اور اموال محفوظ ہو جاتے ہیں۔

ان خوبیوں کا مشاہدہ ان ممالک اور معاشروں میں ہو سکتا ہے جہاں حدود الٰہی کا نفاذ ہے بلکہ اس کا کوئی کافر شخص بھی انکار نہیں کر سکتا اور جن ممالک یا معاشروں میں شرعی حدود کا نفاذ نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے وحشی اور ظالمانہ سزائیں تصور کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں ان کی ضرورت بھی نہیں رہی تو وہ ممالک اور

[1] مجموع الفتاوی: 28/329.

معاشرے عدالت الٰہیہ سے محروم ہیں۔ وہ امن وسکون کی دولت سے عاری ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس جدید اسلحہ اور جدید ٹیکنالوجی موجود ہے لیکن یہ چیزیں معاشرے میں امن وسکون قائم کرنے کا سبب نہیں ہوسکتیں حتی کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو نافذ کیا جائے کیونکہ یہی قانون انسانوں کی بھلائی کا ضامن ہے۔

یاد رہے نظام حکومت اسلحہ کے زور سے نہیں چلایا جا سکتا وہ تو اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کی حدود کے نفاذ ہی سے چل سکتا ہے۔ دور حاضر میں جدید تر سامان حرب حدود الٰہی کے نفاذ کی خاطر استعمال ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کا استعمال درست ہاتھوں سے ہو۔

تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود سے منحرف لوگ حدود الٰہی کو ظلم ووحشت کا نام دیتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل ہے۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ ظالم اور مجرم کے عمل کو وحشت وظلم نہیں کہتے، حالانکہ اسی نے امن وسکون کو برباد کیا تھا اور بے گناہوں پر زیادتی کا مرتکب ہوا تھا۔ لیکن جاہل لوگوں نے ایسے مجرموں اور ظالموں کو عبرتناک سزا دینے کے نظام کو وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب عقل ہی الٹ ہو جائے اور فطرت میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کی فکر ونظر ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے خوب کہا ہے:

قَدْ تُنْكِرُ الْعَيْنُ ضَوْءَ الشَّمْسِ مِنْ رَّمَدٍ   وَيُنْكِرُ الْفَمُ طَعْمَ الْمَاءِ مِنْ سَقَمٍ

”اندھی آنکھ سورج کی روشنی کا انکار کر دیتی ہے، منہ بیماری کی وجہ سے پانی کے ذائقے کا انکار کر دیتا ہے۔“

﴿ مجرم شخص پر حدود الٰہی کا نفاذ اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک درج ذیل شرائط موجود نہ ہوں:

① جرم کا مرتکب شخص عاقل وبالغ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبُرَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ»

”تین قسم کے آدمیوں سے قلم اُٹھالیا گیا ہے: ① سوئے ہوئے شخص سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے۔ ② بچے سے یہاں تک کہ بڑا (بالغ) ہو جائے۔ ③ اور دیوانے سے یہاں تک کہ عاقل بن جائے۔“[1]

جب یہ لوگ عبادات میں مکلّف نہیں تو ان سے حدود الٰہی کا سقوط بالاولیٰ درست ہے کیونکہ شک وشبہے کی بنیاد پر

① سنن أبي داود، الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدًّا، حديث:4401، وسنن النسائي، الطلاق، باب من لا يقع طلاقه من الأزواج، حديث:3462 و اللفظ له.

حدود کا نفاذ ختم ہو جاتا ہے۔

② مجرم جرم کے حرام ہونے کا علم رکھتا ہو، چنانچہ جو شخص کسی کام کے حرام ہونے کا علم نہ رکھتا ہو اس پر اس کے ارتکاب کی وجہ سے حد نہ لگائی جائے گی۔ سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا قول ہے:

«لَا حَدَّ إِلَّا عَلٰی مَنْ عَلِمَهُ» ''حد اسی پر نافذ ہوگی جو اس کام کے حرام ہونے کا علم رکھتا ہو۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس نقطۂ نظر کا مخالف معلوم نہیں۔ اسی لیے امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ قول عام اہل علم کا ہے۔''

جب کسی شخص میں دونوں شرطیں موجود ہوں تو جرم کے ارتکاب کے نتیجے میں اس پر حد نافذ ہوگی۔ حدود کے نفاذ کا کام مسلمانوں کا امیر یا اس کا نائب سرانجام دے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حدود کو نافذ کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین بھی حدود قائم کرتے تھے۔ بسا اوقات اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نائب بھی مقرر کیا تھا جیسا کہ ایک روایت میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ! إِلَى امْرَأَةِ هٰذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا»

''اے انیس! اس شخص کی بیوی کی طرف جاؤ اگر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلے تو اسے رجم کر دینا۔''[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کا حکم دیا تھا لیکن وہاں خود نہ گئے۔ اسی طرح ایک چور کے بارے میں فرمایا: اِذْهَبُوا بِهِ فَاقْطَعُوهُ ''اسے لے جاؤ اور اس کا ہاتھ کاٹ دو۔''[3]

اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات حدود کے فیصلے میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے، لہٰذا کوتاہی کا اندیشہ موجود ہوتا ہے، اس لیے یہ اہم ذمے داری مسلمانوں کے امیر پر ڈال دی گئی یا وہ کسی ایسے معتبر شخص پر ذمے داری ڈال دے جو عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورے کر سکے، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق سے متعلق حدود ہوں، مثلاً: زنا یا کسی انسان سے متعلق ہوں، مثلاً: حد قذف۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جن حدود اور حقوق کا تعلق کسی معین قوم کے ساتھ نہ ہو وہ حدود اللہ کہلاتی ہیں، جیسے ڈاکو، چور اور زانی وغیرہ سے متعلق حدود۔ اسی طرح مملکت کے اموال، وقف اشیاء، وصیتیں وغیرہ جو معین نہ ہوں، ان حدود کی پاسداری مملکت کے اہم امور میں سے ہے، لہٰذا حاکم کے ذمے ہے کہ ان کی جانچ پڑتال کرتا رہے اور کسی کے دعوے کے بغیر انھیں قائم کرے اور کسی کے دعوے کے بغیر ہی ان کی گواہی کا انتظام

① [ضعيف] المصنف لعبدالرزاق:7/402-405، وإرواء الغليل، حديث: 2314. ② صحيح البخاري، الوكالة، باب الوكالة في الحدود، حديث:2314،2315. ③ [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي: 8/271، ومنار السبيل، ص:674.

کرے۔ان حدود کا نفاذ ہر امیر، غریب، طاقت ور اور کمزور پر کرے......۔"[1]

▲ مسجد کے اندر حدود نہ لگائی جائیں بلکہ اس سے باہر ان کا نفاذ ہو، چنانچہ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُّسْتَقَادَ فِي الْمَسْجِدِ وَأَنْ تُنْشَدَ فِيهِ الْأَشْعَارُ وَأَنْ تُقَامَ فِيهِ الْحُدُودُ»

"رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ مسجد میں قصاص لیا جائے، (ناجائز قسم کے) اشعار پڑھے جائیں اور ان میں حدود کا نفاذ ہو۔"[2]

▲ جب کسی حد کا معاملہ حاکم کی عدالت میں پہنچ جائے تو اس کے نفاذ کو روکنے کے لیے سفارش کرنا حرام ہے۔اسی طرح حکمران کے لیے ایسی سفارش قبول کرنا بھی حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُهُ دُونَ حَدٍّ مِّنْ حُدُودِ اللهِ فَقَدْ ضَادَّ اللهَ»

"جس شخص کی سفارش حدود الٰہی کے نفاذ میں رکاوٹ بن گئی وہ اللہ تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت کر کے اس) کے مدمقابل کھڑا ہو گیا۔"[3]

ایک شخص نے چور کو معاف کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَهَلَّا كَانَ قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ؟» "میرے پاس لانے سے پہلے پہلے تو نے اسے معاف کیوں نہ کر دیا؟"[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "کسی شخص کے لائق نہیں کہ وہ سفارش یا ہدیہ وغیرہ کی وجہ سے کسی حد کو معطل کرے۔اسی طرح اس میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں، جس نے قدرت کے باوجود حد کو معطل کر دیا اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔"[5]

نیز موصوف فرماتے ہیں: "چور، زانی، شرابی اور ڈاکو وغیرہ سے بیت المال وغیرہ کے لیے مال لے کر حد کو معطل کر دینا جائز نہیں۔ایسا مال حرام اور خبیث ہوتا ہے۔اگر ایسا کام حاکم کرتا ہے تو وہ متعدد خرابیوں کو جمع کر رہا ہے۔ایک حد کو معطل کرنا اور دوسرا حرام کھانا اور تیسرا ذمے داری کو پورا نہ کرنا اور چوتھا حرام کا ارتکاب کرنا۔تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ زانی، چور، شرابی اور اسلامی حکومت کے باغی وغیرہ کو چھوڑنے کی خاطر لیا ہوا مال حرام اور خبیث ہے۔افسوس ہے کہ یہ تمام کام برملا ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے امور میں دن بدن بگاڑ پیدا ہو رہا ہے

[1] مجموع الفتاوٰی: 431/14. [2] سنن أبي داود، الحدود، باب في إقامة الحد في المسجد، حديث: 4490، ومسند أحمد:434/3. [3] سنن أبي داود، القضاء، باب في الرجل يعين على خصومة من غير أن يعلم أمرها، حديث: 3597. [4] سنن أبي داود، الحدود، باب فيمن سرق من حرز، حديث:4394، ومسند أحمد:466/6. [5] السياسة الشرعية لابن تيمية:56/1.

اور مسلمانوں کا اجتماعی قدر ووقار گرتا جارہا ہے۔''[1]

جرائم ختم نہیں ہوسکتے، معاشرہ جرائم کی شر اور نحوست سے محفوظ نہیں ہوسکتا مگر اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ان لوگوں پر حدود شرعیہ کا نفاذ ہو جو جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان سے محض مالی تاوان، جرمانہ وغیرہ وصول کر لینا یا قید کی سزا دینا ظلم ہے اور معاشرے میں شر وفساد کو بڑھانے کا سبب ہے۔

جن جنایات میں حدود کا نفاذ واجب ہوتا ہے وہ پانچ ہیں: زنا، چوری، ڈاکہ زنی، شراب پینا اور کسی بے گناہ پر تہمت زنا لگانا۔ ان کے علاوہ دیگر جنایات میں تعزیر ہے۔ آگے چل کر ہم ان کی تفصیل بیان کریں گے۔

فقہائے کرام نے کہا ہے کہ کوڑے مارنے کی سزاؤں میں سے سب سے سخت حد ''زنا کی حد'' ہے، پھر حد قذف، پھر شراب پینے کی حد، پھر تعزیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کی حد میں بہت تاکیدی کلمات کہے ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ ﴾

''ان دونوں پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمھیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہیے۔''[2]

دوسرے جرائم کی سزا میں اس سے کم کوڑے مقرر ہیں، لہٰذا زیادہ زور سے مار کر اس سزا میں اضافہ کر دینا درست نہیں۔

فقہائے کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی شخص حد لگنے کے دوران میں مر گیا تو اس کا خون رائیگاں ہوگا۔ حد لگانے والے پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا کیونکہ اس نے شرعی طریقے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر عمل کیا ہے، البتہ اگر حد لگانے والے نے مشروع طریقے سے تجاوز کیا کہ محدود (جس پر حد لگائی گئی ہے) مر گیا تو اسے اس کی دیت ادا کرنا ہوگی کیونکہ اس کی موت زیادتی کے سبب سے ہوئی ہے۔ گویا اس نے حد کے علاوہ کسی اور صورت میں اسے قتل کیا ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہمارے علم کے مطابق اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں۔''

حدزنا کا بیان

فقہائے کرام نے کہا ہے کہ زنا کی حد لگاتے وقت حکمران یا اس کے نائب کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ اسی

[1] السياسة الشرعية لابن تيمية: 1/59-61. [2] النور 24:2.

طرح اہل ایمان کی ایک جماعت کا وہاں حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾

''ان دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔''[1]

زنا ایک بڑا جرم ہے جس کا گناہ اور قباحت و شناعت بعض صورتوں میں مزید بڑھ جاتی ہے، مثلاً: خاوند والی عورت سے زنا کرنا یا محرم عورت سے زنا کرنا یا پڑوسی کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کرنا، یہ بڑے قبیح گناہوں میں سے ہے۔

▲ زنا بڑے بڑے جرائم اور معاصی میں شامل ہے کیونکہ اس سے اس نسب کا اختلاط ہو جاتا ہے جس کے سبب سے انسان کا تعارف ہوتا ہے اور جائز امور میں دوسروں کی مدد کرتا اور مدد لیتا ہے، نیز اس میں کھیتی اور نسل کی تباہی ہے۔ انھی قبیح نتائج کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زنا کی زبردست سزا مقرر کی ہے اور وہ یہ ہے کہ زنا کرنے والا اگر شادی شدہ ہو تو اسے سنگسار کیا جائے اور اگر وہ کنوارہ ہو تو اسے سو کوڑے مارے جائیں، نیز کنوارے مرد کو ایک سال کے لیے جلاوطن بھی کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اس سے ایسے امراض پیدا ہوتے ہیں جو معاشرے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے اس سے رک جانے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۝ ﴾

''خبردار! زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیونکہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ اس کی مذکورہ بالا سخت سزا مقرر فرمائی ہے۔

▲ فقہائے کرام نے زنا کی تعریف یوں ہے کہ ''فرج یا دبر میں بدکاری کا ارتکاب زنا کہلاتا ہے۔''

ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''زنا ہر اس وطی کو کہا جاتا ہے جس میں نکاح یا شبہ نکاح[3] نہ ہو یا ملک یمین (لونڈی) کا تعلق نہ ہو۔ اس تعریف پر علمائے کرام کا اتفاق ہے، البتہ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ کس چیز کو شبہ قرار دے کر حد سے بری کر دیا جائے۔''[4]

▲ اگر زانی شادی شدہ عاقل و بالغ ہے تو اسے سنگسار کیا جائے گا حتی کہ مر جائے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ خوارج کے

① النور 2:24. ② بنی إسرآءیل 32:17.

③ مثلاً: اس انداز سے نکاح کیا کہ اس میں لازمی شرائط موجود نہ تھیں یا لاعلمی کی وجہ سے اس عورت سے نکاح کر لیا جس سے نکاح کرنا جائز نہ تھا۔ (صارم)

④ بدایة المجتهد: 769/2.

علاوہ ہر زمانے میں تمام علماء کا اس مسئلے میں اتفاق رہا ہے۔

- رجم کی سزا رسول اللہ ﷺ کی کئی ایک احادیث متواترہ سے ثابت ہے جو قولی اور فعلی دونوں قسم کی ہیں۔
- رجم کا حکم قرآن مجید میں مذکور تھا، پھر اس کے الفاظ منسوخ ہو گئے اور حکم باقی ہے۔ کلمات قرآن یہ تھے:

[وَالشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ.]

''شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب زنا کریں تو ان دونوں کو سنگسار کر دو، یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''[1]

- جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رجم کی آیت قرآن مجید میں موجود تھی، پھر اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی لیکن اس کا حکم ابھی باقی ہے، نیز سنت متواترہ اور اجماع سے بھی رجم ثابت ہے تو اب اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی، البتہ خوارج کا گروہ اور ان کے موجودہ دور کے ہم خیال مصنفین اپنی خواہشات کے پجاری بن کر رجم کا انکار کر رہے ہیں اور دلائل شرعیہ اور اجماع امت کو رد کر رہے ہیں۔
- شادی شدہ شخص جس کو زنا کے ارتکاب کی وجہ سے سنگسار کیا جائے گا، اس سے مراد وہ شادی شدہ ہے جس نے اپنی بیوی سے صحیح، شرعی نکاح کے ساتھ جماع کیا ہو، اس کی بیوی خواہ مسلمہ ہو یا کتابیہ اور دونوں میاں بیوی عاقل، بالغ اور آزاد ہوں۔ اگر ایک شرط بھی نہ ہوئی تو انھیں (میاں بیوی کو محصن) شادی شدہ نہیں کہیں گے۔ شرائط درج ذیل ہیں:

① وطی فرج میں کی گئی ہو۔

② شرعی نکاح کے بعد وطی کی گئی ہو۔

③ دونوں کامل ہوں، یعنی مرد اور عورت دونوں عاقل، بالغ اور آزاد ہوں۔

- شادی شدہ کے ساتھ رجم کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد اس کو معلوم تھا کہ حرام شرم گاہوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے جبکہ شادی شدہ حرام کے ارتکاب سے مستغنی ہوتا ہے اور اپنے آپ کو زنا کی سزا سے دور رکھ سکتا ہے، لہٰذا جمیع وجوہ سے اس کا عذر جاتا رہا اور بیوی کی صورت میں (اللہ کی نعمت) اس پر کامل ہو چکی ہے تو جس کی نعمت جس قدر عظیم ہوگی اسی قدر اس کا جرم بھی زیادہ گھناؤنا ہوگا تو پھر سزا بھی سخت ہوگی۔

---

① سنن ابن ماجه، الحدود، باب الرجم، حديث: 2553، البتہ :[نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ] کے لیے دیکھیے: مسندأحمد: 132/5.

▲ اگر زنا کرنے والا غیر شادی شدہ ہو تو اس کی سزا سو کوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

''زنا کار عورت و مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔''[1]

تو گویا اس کی سزا شادی شدہ آدمی کی سزا (رجم) سے ہلکی ہے کیونکہ اس کے پاس ایک عذر ہے، اس لیے اسے رجم کرنے کے بجائے تمام بدن پر سو کوڑے مارنے کی سزا دی گئی اور اس سلسلہ میں کوئی رحم اور ترس سے کام نہ لیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾

''ان دونوں پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمھیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہیے اگر تمھیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو۔''[2]

اس آیت کے مطابق ایمان کا تقاضا ہے کہ دین میں پختگی اور استقامت ہو اور اس کے احکام کی تنفیذ میں بھرپور کوشش کی جائے۔

▲ کنوارے مرد کو سو کوڑے مارنے کے بعد ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ حکم حدیث رسول ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا اور اسے جلاوطن بھی کیا تھا۔ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے بھی زانی کو کوڑے مارے اور اسے جلاوطن کیا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِيبُ سَنَةٍ»

''کنوارہ مرد اور کنواری عورت زنا کریں تو (ان کی سزا سو) سو کوڑے ہیں اور (مرد پر) ایک سال کی جلاوطنی ہے۔''[3]

▲ اگر زنا کرنے والا غلام یا لونڈی ہو تو اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾

''جب یہ لونڈیاں نکاح میں آ جائیں، پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں تو انھیں آدھی سزا ہے اس سزا سے جو

---

[1] النور 2:24. [2] النور 2:24. [3] صحيح مسلم، الحدود، باب حد الزنى، حديث: 1690، وسنن أبي داود، الحدود، باب في الرجم، حديث: 4415، وسنن ابن ماجه، الحدود، باب حد الزنا، حديث: 2550 واللفظ له.

آزاد عورتوں کی ہے۔"[1]

ایسے معاملات میں غلام اور لونڈی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ قرآن میں جس سزا کا ذکر ہے وہ کوڑوں کی سزا ہے اگرچہ رجم کی سزا بھی قرآن میں مذکور تھی مگر اس کے لفظ منسوخ ہیں اور حکم موجود ہے۔

◄ زانی غلام کو جلاوطنی کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس میں اس کے مالک کا نقصان ہے، نیز اس کے بارے میں کوئی شرعی نص بھی وارد نہیں ہوئی، حالانکہ لونڈی کے بارے میں جب نبی ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«إِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوهَا ، ثُمَّ إِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوهَا»

"جب زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے مارو، اگر پھر زنا کرے تو پھر کوڑے مارو۔"[2]

اس میں آپ ﷺ نے جلاوطنی کا تذکرہ نہیں کیا۔

◄ وطی یا زنا میں شک وشبہ ہو تو ملزم پر حد لگانا واجب نہ ہوگا کیونکہ فرمان نبوی ہے:

«اِدْرَءُوا الْحُدُودَ عَنِ الْمُسْلِمِينَ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

"(شکوک وشبہات ہوں تو) حسب طاقت مسلمانوں پر حدود جاری نہ کرو۔"[3]

مثلاً: ایک شخص کسی عورت کو اپنی بیوی گمان کر کے صحبت کر بیٹھتا ہے یا اس نے کسی ایسے عقد و معاہدے کے ساتھ وطی کی جسے وہ جائز سمجھتا تھا، حالانکہ وہ ناجائز تھا یا اس نے ایسے نکاح کے بعد وطی کی جو نکاح مختلف فیہ تھا یا کوئی شخص زنا کی حرمت سے ناواقف تھا، مثلاً: وہ نو مسلم تھا یا دارالاسلام سے دور وہ کسی ایسی بستی میں رہتا تھا جہاں اسے زنا کی حرمت کا علم نہ ہو سکا یا کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا گیا تو اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ہمارے علم کے مطابق تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ شکوک وشبہات کی موجودگی میں حد جاری نہ ہوگی۔"

یہ شریعت اسلامی کی طرف سے سہولت وآسانی دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کسی سے جرم سرزد ہونے میں اس کا قصد وارادہ شامل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾

[1] النسآء 4:25. [2] صحيح البخاري، البيوع، باب بيع العبد الزاني، حديث: 2153. [3] [ضعيف] جامع الترمذي، الحدود، باب ما جاء في درء الحدود، حديث: 1424، وسنن ابن ماجه، الحدود، باب الستر على المؤمن ودفع الحدود بالشبهات، حديث: 2545.

''اور اس معاملے میں تم سے بھول چوک میں جو کچھ ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن تمھارے دل جس بات کا عزم کر لیں (تو وہ گناہ ہے) اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''[1]

▲ کسی شخص پر زنا کی حد قائم کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کا زنا کرنا واضح طور پر ثابت ہو۔ یہ ثبوت دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت سے حاصل ہو سکتا ہے:

① وہ شخص خود ہی چار مرتبہ اقرار و اعتراف کر لے جیسا کہ ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث میں وارد ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر چار مرتبہ زنا کا اعتراف کیا۔ اگر یہ اعتراف چار مرتبہ سے کم کافی ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اسی وقت حد نافذ کر دیتے جب اس نے پہلی مرتبہ اعتراف کر لیا تھا۔

صحت اقرار کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ وطی کی حقیقت کو وضاحت سے بیان کرے، اپنے اقرار پر قائم رہے اور اس سے رجوع بھی نہ کرے حتی کہ اس پر حد قائم ہو جائے۔ اگر اس نے زنا کرنے کی صحیح صورت اور اس کی حقیقت کو وضاحت سے بیان نہ کیا تو اس پر حد نہ لگے گی کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی مراد زنا کے علاوہ کوئی اور حرام فعل ہو جس پر زنا کی حد نہ لگتی ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے ارتکاب زنا کا اقرار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت طلب کرتے ہوئے اس سے پوچھا: ''تم نے بوسہ لیا ہو گا یا اسے چٹکی بھری ہو گی؟'' اس نے کہا: نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بار بار واقعے کی وضاحت کی اور اقرار کیا حتی کہ تمام احتمالات ختم ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد قائم کرنے کا حکم دیا۔[2]

اگر اقرار کرنے والا حد قائم ہونے سے قبل رجوع کر لے تو اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار وضاحت طلب کرنا شاید اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ رجوع کر لے، نیز جب وہ پتھر لگنے کی تکلیف کی وجہ سے بھاگا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«هَلَّا تَرَكْتُمُوهُ، لَعَلَّهُ أَنْ يَتُوبَ فَيَتُوبَ اللهُ عَلَيْهِ»

''تم نے اسے کیوں نہ جانے دیا؟ شاید وہ توبہ کر لیتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔''[3]

② کسی کے زنا پر چار آدمی گواہی دے دیں تو اس پر حد جاری ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ ''وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟''[4]

① الأحزاب 5:33. ② صحيح البخاري، الحدود، هل يقول الإمام للمقر......؟ حديث: 6824، 6825، وصحيح مسلم، الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى، حديث: (16)-1691. ③ سنن أبي داود، الحدود، باب رجم ماعز بن مالك، حديث: 4419. ④ النور 13:24.

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ﴾

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کریں۔''[1]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ﴾ ''ان پر اپنے میں سے چار گواہ طلب کرو۔''[2]

زنا میں چار آدمیوں کی شہادت اس وقت قبول ہوگی جب درج ذیل شرائط موجود ہوں:

① چاروں اشخاص ایک ہی مجلس میں شہادت دیں۔

② وہ زانی کے خلاف ایک ہی واقعے پر گواہی دیں۔

③ وہ واقعۂ زنا کو اس طرح بیان کریں کہ کسی شک وشبہے کا احتمال باقی نہ رہے کیونکہ کبھی کسی برے کام کو زنا کی طرح سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کام پر زنا والی حد نہیں لگتی، اس لیے ضروری ہے کہ وہ وضاحت سے صورت حال بیان کریں تاکہ کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔

④ شہادت دینے والے معتبر ہوں۔ اس واقعے پر عورتوں یا فاسقوں کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

⑤ ان چار افراد میں کوئی ایسا شخص شامل نہ ہو جس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی رکاوٹ ہو، مثلاً: کوئی اندھا وغیرہ ہو۔

اگر ان مذکورہ بالا شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو تو ان سب گواہوں پر حد قذف لگائی جائے گی کہ انھوں نے اس پر تہمت لگائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً ﴾

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسی (80) کوڑے لگاؤ۔''[3]

مذکورہ بالا شرائط کے مطابق گواہی مل جانے سے یا زانی کے اقرار کر لینے سے زنا کا جرم ثابت ہو جاتا ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ عورت کے حمل کے ظاہر ہونے سے زنا کا ثبوت مل جاتا ہے یا نہیں، مثلاً: ایسی عورت کا حاملہ ہونا جس کا خاوند نہ ہو یا مالک نہ ہو؟ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ایسی عورت پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ ممکن ہے اس پر جبر واکراہ ہوا ہو یا کسی شبہے کی بنیاد پر اس سے وطی کی گئی ہو۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ایسی

---

① النور 4:24. ② النسآء 15:4. ③ النور 4:24.

عورت پر حدزنا لگے گی بشرطیکہ اس نے شبہے کا دعویٰ نہ کیا ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہی مسلک خلفائے راشدین کا تھا جو اصول شرعیہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ اہل مدینہ کا مذہب بھی یہی تھا اس لیے کہ کمزور احتمالات قابل اعتنا نہیں ہوتے۔''[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی عورت کو رجم کرنے کا حکم دیا جو حاملہ ہوگئی تھی، حالانکہ اس کا کوئی خاوند تھا نہ مالک۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے جس میں قرینہ ظاہرہ پر اعتماد کیا گیا ہے۔''[2]

▲ جس طرح زنا ثابت ہونے پر حد جاری ہوگی اسی طرح قوم لوط کا عمل کرنے والے شخص پر بھی حد نافذ ہوگی کیونکہ یہ بھی ایک خبیث اور قبیح جرم ہے اور فطرت سلیمہ کے مخالف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کے بارے میں فرمایا:

﴿ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ ﴾

''(کیا) تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہاں والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو بلکہ تم تو حد ہی سے گزر گئے ہو۔''[3]

قوم لوط کے عمل کے حرام ہونے کی دلیل کتاب وسنت اور اجماع سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسا فحش اور حرام کام کرتے تھے جو ان سے پہلے دنیا کے کسی فرد نے نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ دنیا میں پوری انسانیت کے برعکس راستے پر گامزن تھے۔ نیز اس حرام فعل کے ارتکاب کی وجہ سے انھیں حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والے، زیادتی کرنے والے مجرم قرار دیا اور اس قبیح و شنیع عمل کی وجہ سے ان پر ایسا سخت عذاب نازل کیا کہ ویسا عذاب کسی پر نازل نہ ہوا تھا۔ انھیں زمین میں دھنسا دیا گیا اور ان پر پکے پتھروں کی بارش کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاعل اور مفعول دونوں پر لعنت کی ہے۔[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات یہی ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک تھا۔ اس کے بارے میں کسی کا اختلاف بھی منقول نہیں، البتہ بعض کا خیال یہ ہے کہ انھیں بستی کی سب سے بلند دیوار پر چڑھا کر دھکا دے کر گرا دیا جائے اور پھر انھیں پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے۔''[5]

---

[1] مجموع الفتاوٰی:334/28. [2] الطرق الحكمية لابن القيم، مقدمة، ص: 28. [3] الأعراف7:81,80. [4] جامع الترمذي، الحدود، باب ماجاء في حد اللوطي، حديث:1456، البتہ حدیث میں قوم لوط والے عمل پر لعنت موقوفاً وارد ہوئی ہے۔
[5] مجموع الفتاوٰی لابن تيمية:335,334/28.

ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس لیے کہ اس (عملِ قوم لوط کے مرتکب کو قتل کرنے) پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، لہٰذا اسے قتل کرنے پر تو سب متفق ہیں، البتہ قتل کرنے کے طریقے میں اختلاف کرتے ہیں۔''[1]

ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحیح یہی ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ۝ ﴾ ''اور ہم نے ان لوگوں پر کھنگر کے پتھر برسائے۔''[2]

اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسے رجم کیا جائے گا وہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ۔ امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسے قتل کیا جائے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ وَجَدْتُمُوهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ، فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ»

''اگر تم کسی کو قوم لوط کا عمل کرتا پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔''[3]

▲ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی فرج کے بجائے دُبر استعمال کرتا ہے تو وہ بھی قوم لوط جیسا کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ ﴾

''تم ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے۔ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[4]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ﴾ سے مراد ''عورت کی فرج ہے، دبر نہیں۔'' جو شخص مقرر حد سے تجاوز کرے گا وہ احکام الٰہی میں زیادتی کرنے والا ہے۔ ایسا شخص سزا کے لائق ہے۔ اگر کوئی یہ کام مسلسل کرتا ہے تو اس کی بیوی کو چاہیے کہ وہ ایسے خبیث خاوند کو چھوڑ دے کیونکہ اس صورت میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا جائز اور درست نہیں۔

حد قذف کا بیان

فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک قذف سے مراد کسی شخص پر زنا یا عملِ قوم لوط کا الزام لگانا ہے جبکہ قذف کے لغوی معنی

---

[1] المغني والشرح الكبير: 10/156. [2] الحجر15:74. [3] سنن أبي داود، الحدود، باب فيمن عَمِلَ عَمَلَ قومِ لوطٍ، حديث:4462. [4] البقرة2:222.

ہیں: ''قوت کے ساتھ پھینکنا'' پھر اسی سے یہ لفظ زنا یا عمل قوم لوط کی تہمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ قذف کا حرام ہونا کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝﴾

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسی (80) کوڑے لگاؤ اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، یہ لوگ فاسق ہیں۔''[1]

اس آیت میں دنیاوی سزا کا بیان ہے، یعنی اسی کوڑے اور اس کی شہادت کا مسترد کیا جانا، نیز اس کا فاسق، ناقص اور سافل و کمینہ ہونا بشرطیکہ وہ اپنا الزام ثابت نہ کر سکے اور جھوٹا ہو، باقی رہی اخروی سزا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر یوں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی باایمان عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اور ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں ان کا پورا پورا بدلہ حق و انصاف کے ساتھ دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے (اور وہی حق کو) ظاہر کرنے والا ہے۔''[2]

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ . . . قَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ»

''ان سات کاموں سے بچو جو انسان کو ہلاک اور برباد کرنے والے ہیں...... (ان میں سے ایک یہ ہے۔) پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کا الزام لگانا۔''[3]

اہل اسلام کا اجماع ہے کہ قذف حرام ہے، نیز انھوں نے اسے کبیرہ گناہوں میں شامل کیا ہے۔

▲ اللہ تعالیٰ نے قاذف (تہمت لگانے والے) کے لیے زبردست اور عبرتناک حد مقرر کی ہے، چنانچہ جب عاقل

---

① النور 4:24. ② النور 24:23-25. ③ صحيح البخاري، الوصايا، باب قول الله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا ...... وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝﴾ (النساء 10:4)، حديث: 2766.

بالغ، بلا جبر واکراہ کسی پاک دامن شخص پر زنا یا قوم لوط کے عمل کا الزام لگا دے گا اور وہ اس میں جھوٹا ثابت ہوا تو اس کے بدن پر اسی کوڑے مارے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً ﴾

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسی (80) کوڑے لگاؤ۔''[1]

واضح رہے جس شخص پر الزام لگایا جائے وہ مرد ہو یا عورت دونوں صورتوں میں جرم یکساں ہے۔ آیت میں عورتوں کی جو تخصیص کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت جس واقعے کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ عورت پر الزام لگانے سے متعلق تھا، نیز اس لیے کہ عورتوں پر الزام لگانا نہایت قبیح و شنیع فعل ہے۔

- قاذف، یعنی الزام لگانے والے کو سخت سزا کا مستحق اسی لیے قرار دیا گیا تاکہ مسلمانوں کی عزت کو رذیل لوگوں کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچایا جا سکے اور زبانوں کو ایسے گندے الفاظ بولنے سے محفوظ رکھا جائے جو پاکباز، مبرا لوگوں کی بے عزتی کر دیتے ہیں، نیز اسلامی معاشرے کو بے حیائی اور برائی کے جراثیم کے پھیلنے سے بچایا جا سکے۔
- حد قذف اس شخص پر جاری اور نافذ ہوگی جو ایسے شخص پر تہمت لگائے جو آزاد، مسلمان، عاقل، پاک دامن اور بالغ یا قریب البلوغ ہو اور وہ جماع کر سکتا ہو۔

امام ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اتفاق ہے کہ جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس میں پانچ اوصاف جمع ہوں تب الزام لگانے والے پر حد لگائی جائے گی۔ بلوغت، آزادی، عفت، اسلام اور وہ جسمانی طور پر جماع کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر اس میں مذکورہ اوصاف میں سے ایک وصف بھی کم ہو تو قاذف پر حد جاری نہ ہوگی۔''[2]

- ''حد قذف'' مقذوف (جس پر الزام لگایا گیا ہو) کا حق ہے اور وہ معاف کر دے تو حد قذف نافذ نہ ہوگی، لہٰذا ''حد قذف'' کا نفاذ مقذوف کے مطالبے ہی پر ہوگا۔ اگر مقذوف قاذف کو معاف کر دیتا ہے تو حد جاری نہ ہوگی، البتہ اس کے لیے تعزیر ضرور ہے تاکہ وہ دوبارہ ایسا جرم نہ کرے جو کہ نہ صرف حرام ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی لعنت اور دردناک عذاب کی دھمکی بھی دی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قاذف پر حد اسی وقت لگائی جائے گی جب مقذوف کا مطالبہ ہوگا۔''[3] اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔

- جس نے کسی غیر حاضر (غائب) شخص پر زنا کا الزام لگا دیا تو قاذف پر حد تب نافذ ہوگی جب مقذوف موقع پر

---

① النور 24:4. ② بدایة المجتهد :783/2. ③ مجموع الفتاویٰ:185/34.

موجود ہوگا اور وہ حد قذف لگانے کا مطالبہ کرے گا یا یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے اپنی غیر حاضری کے باوجود قاذف کی سزا کا مطالبہ کیا ہے۔

▲ قذف کے الفاظ کی دو قسمیں ہیں:

① واضح الفاظ جو صرف قذف ہی پر دلالت کرتے ہیں۔ اس میں قاذف سے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے کسی کو کہا جائے: ''اے زانی! اے قوم لوط کا فعل کرنے والے!

② کنایے کے الفاظ جس میں قذف کے علاوہ دوسرے فعل کا بھی امکان ہو۔ قاذف اپنے الفاظ کی جو وضاحت کرے گا وہی قبول ہوگی، جیسے کسی کو اے طوائف!، فاجرہ عورت! اے خبیث عورت! وغیرہ کہہ کر پکارنا۔ ان الفاظ کو استعمال کرنے والے سے وضاحت طلب کی جائے گی۔ اگر وہ کہے کہ طوائف سے میری مراد وہ عورت ہے جو نافرمانی کے لیے بناؤ سنگھار کرتی ہے، فاجرہ سے میری مراد خاوند کی نافرمان ہے اور خبیثہ سے میری مراد بری طبیعت والی ہے تو قاذف کی یہ وضاحت قبول کی جائے گی، محض الفاظ بولنے سے قذف کی حد نہیں لگے گی کیونکہ شکوک و شبہات ہوں تو حد نہیں لگائی جاتی۔

▲ اگر کسی نے ایک گروہ پر یا اہل شہر پر زنا کا الزام لگایا تو اس پر حد قذف جاری نہ ہوگی بلکہ اس کے لیے تعزیر ہوگی کیونکہ اس نے قطعاً جھوٹ سے کام لیا ہے۔ ایسے ہی غلط الفاظ استعمال کرنے اور غلیظ گالی دینے کی وجہ سے اس پر تعزیر ہوگی اگرچہ مقذوف کا مطالبہ نہ بھی ہو کیونکہ یہ معصیت ہے جس میں تادیب لازم ہے۔

▲ جس نے کسی نبی پر زنا کا بہتان لگایا تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا کیونکہ اگر وہ مسلمان تھا تو وہ مرتد ہو گیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی بیویوں پر قذف درحقیقت رسول اللہ ﷺ پر قذف ہے۔ ایسا قاذف مرتد کے حکم میں ہے۔''

آگے چل کر شیخ موصوف فرماتے ہیں: ''اگر قاذف رجوع کر لے اور معافی مانگ لے اور مقذوف کو ابھی خبر نہ ہو تو سوال یہ ہے کہ اس کا رجوع قبول ہوگا یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس معاملے میں مختلف افراد کا حکم مختلف ہے۔ اکثریت کی رائے ہے کہ مقذوف کو خبر ہو جائے تو رجوع درست نہیں وگرنہ صحیح ہوگا، البتہ قاذف مقذوف کے حق میں زیادہ سے زیادہ دعا و استغفار کرے۔''

اس مضمون سے واضح ہوا کہ زبان کے بہت خطرات ہیں اور زبان پر جاری ہونے والے الفاظ قابل مؤاخذہ ہوتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ»

’’کئی لوگ اپنی زبانوں پر جاری کیے ہوئے الفاظ کی وجہ سے جہنم میں الٹے ڈالے جائیں گے۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○﴾

’’(انسان) منہ سے جو لفظ بھی نکالتا ہے وہ لکھنے کے لیے اس کے پاس ایک نگران (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔‘‘[2]

انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کرے، تول کر بولے، سچی اور پکی بات کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○﴾

’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی) باتیں کیا کرو۔‘‘[3]

نشہ کرنے والے کی سزا کا بیان

مُسْکِر، أَسْکَرَ سے اسم فاعل ہے۔ مُسْکِر وہ ہے جو اپنے پینے والے کو سَکْرَان (بے ہوش) بنا دے۔ اصطلاح میں سُکْر عقل کے ’’خلط ملط ہونے کو کہتے ہیں (مسکر خمر ہو یا کوئی اور شے۔)‘‘

خمر، یعنی نشہ دینے والی اشیاء کا استعمال حرام ہے۔ اس کی دلیل کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں موجود ہے، نیز اس کے حرام ہونے پر علمائے امت کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○﴾

’’اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح پاؤ بے شک شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے

[1] جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، حديث: 2616، ومسند أحمد: 5/231. [2] ق 50:18.
[3] الأحزاب 33:70.

ذریعے سے تمھارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کرا دے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟[1]

خمر ہر اس شے کو کہتے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے، خواہ وہ کسی بھی شے سے بنی ہو۔

احادیث نبویہ میں خمر کے بارے میں حکم ہے:

«كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَّكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ» ''ہر نشہ آور شے خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

«كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ» ''جو بھی مشروب نشہ دے وہ حرام ہے۔''[3]

نیز سنن ابوداود کی روایت میں ہے:

«مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ»

''ہر وہ شے جس کی زیادہ مقدار نشہ دے اس کی معمولی مقدار بھی حرام ہے۔''[4]

اور وہ ''خمر'' (شراب) ہے۔ خمر جس شکل میں بھی ہو، انگوروں سے ماخوذ ہو یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو، حرام ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ»

''جو شے عقل کو ڈھانپ لے اس کا نام ''خمر'' ہے۔''[5] جمہور اہل لغت کا یہی قول ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحیح بات یہ ہے کہ ''حشیش'' نجس شے ہے اور وہ حرام ہے، خواہ اس سے نشہ ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ نشہ دے تو اس کے حرام ہونے میں تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ مزید برآں بعض لحاظ سے اس کے نقصانات ''خمر'' سے بڑھ کر ہیں۔ واضح رہے ''حشیش'' اور اس کے خواص کا علم چھٹی صدی میں ہوا۔''[6]

---

① المآئدة 5:90,91. ② صحيح البخاري، المغازي، باب بعث أبي موسى و معاذ إلى اليمن ...... ، حديث: 4344و6124، وصحيح مسلم، الأشربة، باب بيان أن كل مسكر خمر وأن كل خمر حرام، حديث: (75)-2003 واللفظ له. ③ صحيح البخاري، الوضوء، باب لا يجوز الوضوء بالنبيذ ولا المسكر، حديث: 242، وصحيح مسلم، الأشربة، باب بيان أن كل مسكر خمر وأن كل خمر حرام، حديث: 2001. ④ سنن أبي داود، الأشربة، باب ما جاء في السكر ، حديث: 3681. ⑤ صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ...... مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (المآئدة 5:90)، حديث: 4619. ⑥ مجموع الفتاوٰى لشيخ الإسلام ابن تيمية : 34/198 بتصرف.

▲ حشیش، ہیروئن اور دیگر اقسام کی نشہ آور اشیاء کے استعمال سے مسلمانوں کی نوجوان نسل تباہ ہو رہی ہے۔ ہمارے دشمن انھیں ایک ہتھیار کے طور پر ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ یہود اور ان کے ایجنٹ ان اشیاء کو مسلمانوں میں پھیلانے میں خاص کردار ادا کر رہے ہیں تاکہ مسلمان کمزور ہوں، نوجوان نسل برباد ہو جائے اور وہ معاشرے میں تعمیری کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اپنے دین کے لیے جہاد نہ کر سکیں اور اس قدر ناکارہ ہو جائیں کہ وہ قوم اور وطن کے فسادیوں اور دشمنوں سے مقابلہ نہ کر سکیں۔

مقام افسوس ہے کہ کافر دشمنوں کی چالوں سے صورت حال اس قدر گھمبیر ہو چکی ہے کہ نوجوانوں کی بہت بڑی مقدار نشے کی عادی ہو چکی ہے اور وہ معاشرے پر ایک بوجھ ہے یا وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی کے باقی دن کاٹ رہی ہے۔ یہ اثرات مسلمان ممالک میں نشہ آور اشیاء کے پھیلنے کی وجہ سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس جیسی تمام اشیاء سے بچائے جو انسان کی تباہی کا موجب ہیں۔ لاحول ولا قوة إلا باللّٰه.

▲ شراب (خمر) ہر حال میں حرام ہے، اس کا استعمال لذت، دوا یا پیاس بجھانے کے لیے یا کسی بھی مقصد کے لیے ہو، حرام ہے۔

▲ علاج کی خاطر شراب یا نشہ آور اشیاء کا استعمال حرام ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّهُ لَيْسَ بِدَوَاءٍ وَّلٰكِنَّهُ دَاءٌ» ”خمر دوا نہیں بلکہ داء (بیماری) ہے۔“[1]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»

”اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اس شے میں شفا نہیں رکھی جو حرام ہے۔“[2]

▲ اسی طرح اسے پیاس بجھانے کے لیے بھی استعمال کرنا حرام ہے کیونکہ اس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ پیاس کی شدت اور حرارت کو مزید بھڑکاتی ہے۔

▲ جب کوئی مسلمان نشہ آور شے ”یوڈی کلون“ یا ”الکحل“ ملا مشروب پی لے اور اسے اس کے نشہ آور ہونے کا علم بھی ہو تو اس پر حد قائم کرنا لازم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَاجْلِدُوهُ» ”جو شخص شراب وغیرہ پیے اسے کوڑے لگاؤ۔“[3]

[1] صحيح مسلم، الأشربة، باب تحريم التداوي بالخمر و بيان أنها ليست بدواء، حديث: 1984. [2] صحيح البخاري، الأشربة، باب شراب الحلواء والعسل، بعد حديث: 5613 معلقًا. جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے موصولا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے تغليق التعليق: 29/5. [3] [ضعيف] سنن أبي داود، الحدود، باب إذا تتابع في شرب الخمر: 4485.

▲ حد خمر کی مقدار اسی (80) کوڑے ہیں کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں سے شراب کی حد کے بارے میں مشورہ لیا تو سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کی کم از کم مقدار (80) کوڑے ہونی چاہیے، چنانچہ انھوں نے اسی (80) کوڑے مقرر کیے، پھر یہی حکم لکھ کر خالد اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کی طرف روانہ کیا جو ملک شام میں تھے۔[1]

اس تعزیر کی مقدار کا تعین مہاجرین وانصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ہوا تھا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، چنانچہ موصوف فرماتے ہیں: ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد کو حد قذف کے برابر قرار دیا اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تائید کی۔''[2]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شراب کی حد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے چالیس کوڑے واضح ہوتی ہے، البتہ اگر لوگ شراب پینے سے باز نہ آئیں اور انھیں روکنے کے لیے حاکم وقت سزا کو بڑھا دے تو اس کا اقدام درست ہے۔''[3]

▲ شراب وغیرہ کی حد لگانے کے لیے لازم ہے کہ مجرم خود اقرار کرے یا دو معتبر آدمیوں کی شہادت مل جائے۔

▲ علماء کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ اگر کسی شخص کے منہ سے شراب وغیرہ کی بدبو آ رہی ہو تو اس پر حد لگائی جائے گی یا نہیں؟ اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس پر حد نہیں لگائی جائے گی بلکہ تعزیر ہوگی دوسرا قول یہ ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی بشرطیکہ کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے، نیز امام مالک اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس دوسرے قول ہی کو پسند کیا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے اس شخص پر حد جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔

▲ نشہ آور اشیاء کے استعمال میں بہت سے خطرات ہیں۔ یہ ایک ایسا شیطانی ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کو انتہائی نقصان پہنچا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝﴾

''شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کرا دے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟''[4]

---

① صحیح مسلم، الحدود، باب حدالخمر، حدیث: 1706، وسنن أبي داود، الحدود، باب في حدالخمر، حدیث: 4479 ② إعلام الموقعين: 161/1. ③ مجموع الفتاوى: 336/28 بتغيير. ④ المآئدة 91:5.

خمر ام الخبائث ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں دس اشخاص پر لعنت کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:
«إِنَّ اللهَ تَعَالَى لَعَنَ الْخَمْرَ وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ وَبَايِعَهَا وَمُشْتَرِيَهَا وَآكِلَ ثَمَنِهَا»
''بے شک اللہ تعالیٰ نے شراب، اس کو کشید کرنے والے، جس کے لیے کشید کی گئی، اسے پینے والے، پلانے والے، اسے اٹھانے والے، جس کے لیے اٹھائی گئی ہو، اسے بیچنے والے، خریدنے والے اور اس کی قیمت کھانے والے (سب) پر لعنت کی ہے۔''[1]

مسلمانوں کو چاہیے کہ شراب وغیرہ نشہ آور اشیاء کی حقیقت کو سمجھیں، اس کے استعمال سے بچیں، احتیاط کریں اور دلیری کا مظاہرہ کریں اور جو شخص مسلمانوں میں اسے پھیلائے اس کا مقابلہ کریں بلکہ اسے سخت سزا دیں کیونکہ اس کے نتیجے میں ہر برائی آسان ہو جاتی ہے۔ آدمی رذالت کے گڑھے میں گر جاتا ہے اور اس سے خیر کی توقع ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے شر اور جملہ خطرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے قریب بعض لوگ شراب کو حلال سمجھیں گے اور اس کا نام بدل کر اسے پئیں گے، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے بدمعاشوں سے ہوشیار رہیں۔

تعزیر کے احکام

تعزیر کے لغوی معنی ''روکنے'' کے ہیں اور اس میں ''مدد کرنے'' اور ''ادب کرنے'' کے معنی بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ اس سے ظلم کرنے والے کو ایذا رسانی سے روکا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
﴿وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ﴾ ''(تاکہ) تم اس (نبی) کی مدد کرو اور اس کا ادب کرو۔''[2]

لہٰذا تعزیر کے معنی عزت و توقیر کرنا اور اسی طرح تعزیر کے معنی سزا دینا بھی ہیں، یعنی یہ لفظ دو متضاد معنی والے الفاظ میں سے ہے۔ فقہی اصطلاح میں تعزیر سے مراد ''ادب سکھانا'' ہے۔ اس باب میں تعزیر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سزا سے انسان ناجائز کام کرنے سے رک جاتا ہے، مزید برآں تعزیر توقیر کا سبب بھی ہے کیونکہ جب کوئی شخص سزا کے سبب نامناسب اعمال و حرکات سے باز آ جاتا ہے تو اسے پھر سے وقار اور عزت حاصل ہو جاتی ہے۔

[1] مسند أحمد: 71/2، والمستدرك للحاكم: 145,144/4، حديث: 7228 واللفظ له. [2] الفتح 9:48.

▲ دین اسلام میں تعزیر ہر اس معصیت پر واجب ہوتی ہے جس کے ارتکاب سے حد اور کفارہ لازم نہیں آتا۔ وہ کسی حرام کام کرنے کے سبب ہو یا اس سے واجبات کا ترک لازم ہو۔ تعزیر میں مظلوم کی طرف سے سزا کا مطالبہ ضروری نہیں۔ حاکم اس کے مطالبے کے بغیر بھی ظالم کو سزا دے سکتا ہے۔ تعزیر کا نفاذ یا اس میں کمی وبیشی حاکم کی صوابدید پر ہوگی کیونکہ جرائم کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، کوئی جرم بڑا ہوگا تو کوئی چھوٹا۔

▲ درست بات یہی ہے کہ تعزیر میں کوئی متعین حد بندی نہیں ہوتی لیکن جب معصیت اس قسم کی ہو جس کی شریعت نے سزا مقرر کی ہے، مثلاً: زنا اور چوری تو اس میں حد سے کم درجے کے جرم کی تعزیر حد تک نہیں پہنچے گی۔

▲ اگر کسی مصلحت کا تقاضا ہو تو تعزیر میں قتل کی سزا بھی دی جا سکتی ہے، مثلاً: جاسوس کو قتل کرنا یا ایسے شخص کو قتل کرنا جو مسلمانوں کی جماعت میں انتشار وافتراق کا سبب بن رہا ہو یا کوئی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے سوا کسی اور کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہو یا کوئی اور جرم ہو جس کا علاج قتل کیے بغیر نہ ہو سکے تو اس صورت میں تعزیر کے طور پر قتل کرنا درست ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ قول عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ اس پر سنت رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا جس نے اپنی بیوی کی لونڈی سے بیوی کی اجازت سے جماع کیا تھا۔[1]

سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرد اور ایک عورت کو سو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا تھا جو ایک ہی لحاف اوڑھے ہوئے پائے گئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ کی سخت پٹائی کی تھی (واضح رہے صبیغ ایک شخص تھا جو قرآن کے متشابہات کے بارے میں باتیں کر کے لوگوں میں دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتا تھا۔)''[2]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب فساد کو روکنا مقصود ہو اور وہ قتل ہی سے ممکن ہو تو قتل کرنا جائز ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص ایک قسم کے بگاڑ وفساد کا موجب بن رہا ہو حتی کہ مقررہ حدود کے لگانے سے بھی باز نہیں آ رہا تو اس کی سزا قتل ہی ہے، جیسے حملہ آور کو اگر قتل کیے بغیر روکنا ممکن نہ ہو تو اسے قتل کرنا جائز ہوتا ہے۔''[3]

▲ کم از کم تعزیر کی کوئی حد بندی نہیں کیونکہ جرائم کی نوعیت احوال واوقات کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، کوئی جرم شدید ہوتا ہے کوئی کم درجے کا، لہٰذا ایسے جرائم کی سزا کا تعین حاکم اپنے اجتہاد سے ضرورت اور مصلحت کے

---

① دیکھیے سنن أبي داود، الحدود، باب في الرجل يزني بجارية امرأته، حديث:4451، وجامع الترمذي، الحدود، باب ماجاء في الرجل يقع على جارية امرأته، حديث:1451. ② مجموع الفتاوى: 108/28. ③ الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، الحدود: 530/5.

مطابق کرے گا، البتہ تعزیر کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً: کسی کو مار پیٹ کی سزا دینا یا قید میں ڈالنا، تھپڑ مارنا، ڈانٹ پلانا یا سرکاری عہدے سے معزول کر دینا وغیرہ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کبھی تعزیر بے عزتی کرنے کی صورت میں بھی ہوتی ہے، مثلاً: کسی جرم کے مرتکب شخص کو کہنا: اے ظالم! یا اے زیادتی کرنے والے! یا اسے مجلس سے اٹھا دینا، یا ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔''[1]

▲ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«لَا يُجْلَدُ أَحَدٌ فَوْقَ عَشَرَةِ أَسْوَاطٍ إِلَّا فِي حَدٍّ مِّنْ حُدُودِ اللهِ»

''کسی کو دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں الا یہ کہ وہ حدود الٰہی میں سے کوئی حد پامال کرنے والا ہو۔''[2]

جن حضرات نے تعزیر کے لیے ان دس کوڑوں سے زیادہ مارنے کی اجازت دی ہے انھوں نے مذکورہ بالا دس کوڑوں والی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں معصیت کی سزا کا ذکر ہے شرعی حدود کا نہیں اس باب میں محرمات کا ارتکاب مراد ہے جس کی سزا مصلحت کے مطابق اور جرم کی مقدار کے پیش نظر ہوگی۔

▲ تعزیر میں مجرم کا کوئی عضو کاٹ دینا یا اسے زخم لگانا یا اس کی ڈاڑھی مونڈ دینا جائز نہیں کیونکہ یہ مثلہ ہے جو ممنوع ہے۔ اسی طرح تعزیر میں حرام طریقے اختیار کرنا بھی جائز نہیں، مثلاً: شراب پلانا وغیرہ۔

▲ جو شخص لوگوں کو مسلسل تکلیف دینے یا ان کے اموال کو نقصان پہنچانے میں شہرت پا چکا ہو تو اسے جیل میں بند کر دیا جائے حتی کہ وہیں مر جائے یا توبہ کر لے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایسے مجرم کو لازمی طور پر قید کیا جائے۔ اس مسئلے کے بارے میں متعدد علمائے کرام کی یہی رائے ہے، لہٰذا اس میں اختلاف کرنا جائز نہیں۔ اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی ہے کہ ظالم کے ظلم سے لوگوں کو بچایا گیا ہے۔''

امام موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں: ''نظام سلطنت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اسے احتیاط اور دانش مندی سے چلایا جائے۔ اس کے لیے ایسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو شرعی احکام کو نافذ کرنے والے ہوں، ان کی مخالفت کرنے والے نہ ہوں۔ جب کسی مملکت میں عدل و انصاف کی علامات ظاہر ہو جائیں تو سمجھو وہاں شریعت الٰہی کا اتمام ہو گیا ہے۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ ''سیاست عادلہ'' شریعت کے ارشادات اور منشا کے منافی ہے بلکہ وہ شریعت

[1] الفتاوی الكبرٰی، الاختيارات العلمية، الحدود:5/530. [2] صحيح البخاري، الحدود، باب كم التعزير و الأدب؟ حديث:6848-6850، و صحيح مسلم، الحدود، باب قدر أسواط التعزير، حديث: 1708 و اللفظ له.

کے مطابق ہے بلکہ اس کے اجزاء میں سے ایک جز ہے، اسے سیاست کا نام اس لیے دیتے ہیں کہ موجودہ دور کی یہ اصطلاح ہے ورنہ یہ شریعت ہی ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے ایک مشکوک شخص کو قید میں رکھا اور شک کی بنیاد پر ایک شخص کو سزا دی کیونکہ وہ قرائن سے مجرم ثابت ہو رہا تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ شعبدہ باز لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ''سانپ پکڑنے والا یا آگ میں داخل ہونے والا یا جو شخص اس قسم کی شعبدہ بازی کرتا ہے، قابل تعزیر ہے۔''[2]

- جو شخص کسی مسلمان کو ''مُسلا'' کہہ کر تکلیف دیتا ہے یا کسی ذمی کو کہتا ہے: حاجی صاحب! یا جو شخص کسی مزار اور عرس وغیرہ سے آنے والے کو حاجی کہتا اور سمجھتا ہے تو وہ قابل تعزیر ہے۔
- اگر کسی مدعی نے اپنے دعوے کے ذریعے سے مدعا علیہ کو تکلیف پہنچائی، پھر معلوم ہوا کہ مدعی جھوٹا تھا تو وہ تعزیر کے لائق ہے، نیز اس نے ظلم کر کے جو کچھ لیا تھا وہ شے یا اس کے عوض اسے تاوان دینا ہوگا کیونکہ وہ ظلم کا سبب بنا ہے۔

چوری کی حد کا بیان

کسی مال کا خفیہ طور پر اس طرح اٹھانا کہ مالک یا اس کے نائب کو خبر تک نہ ہو۔ اگر مال اٹھانے والا اسلامی احکام کا تابع مسلمان (یا ذمی) ہو اور وہ مال اس قدر ہو کہ مقرر نصاب تک پہنچ جائے اور وہ مال کسی محفوظ جگہ سے اٹھایا گیا ہو، یعنی شارع عام پر پڑا نہ ہو اور مالک ایسا ہو کہ اس کا مال اٹھانے والے کو اس میں اپنے استحقاق کا شبہ نہ ہو۔ یہ شرائط جمع ہوں تو یہ چوری ہوگی جس کی بنا پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو انھوں نے کیا (اور) عذاب اللہ کی طرف سے (ہے) اور اللہ قوت و حکمت والا ہے۔''[3]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

[1] إعلام الموقعین: 350,349/4 بتصرف۔ [2] الفتاوی الکبری، الاختیارات العلمیة، الحدود: 534/5 [3] المآئدة 38:5.

«تُقْطَعُ الْيَدُ فِي رُبُعِ دِينَارٍ فَصَاعِدًا»

''چور کا ہاتھ دینار کے چوتھائی حصے یا اس سے زیادہ چوری کرنے پر کاٹا جائے گا۔''[1]

مختصر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ چور کا ہاتھ وجوبی طور پر کاٹا جائے گا۔

چور انسانی معاشرے میں ایک فاسد عنصر ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا بگاڑ قوم کے جسم میں دھیرے دھیرے سرایت کرتا جائے گا، لہٰذا مناسب سزا کے ذریعے سے اسے روکنا نہایت ضروری ہے۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ نے اس کا ہاتھ کاٹنا مشروع قرار دیا ہے۔ یہ ظالم ہاتھ اس چیز کی طرف بڑھا ہے جس کی طرف بڑھنا اس کے لیے جائز نہ تھا۔ یہ ہاتھ تخریب کا سبب بنا ہے، تعمیر کا نہیں اور یہ ہاتھ اشیاء اٹھانے (چوری کرنے) والا ہے، کسی کو دینے والا نہیں۔

اب ہم قدرے تفصیل سے بتائیں گے کہ چوری کا اطلاق کب ہوتا ہے اور اس کے مرتکب کا ہاتھ کن صورتوں میں کاٹا جائے گا۔ اگر ان میں سے ایک بھی صورت نہ ہو تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، وہ صورتیں یہ ہیں:

① آدمی نے مال خفیہ طریقے سے اٹھایا ہو۔ اگر اس نے اسے خفیہ طریقے سے نہیں اٹھایا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جیسا کہ کوئی شخص ڈاکہ ڈالے اور کسی کا مال زبردستی چھین کر یا سر عام اٹھا کر لے جائے تو یہ چوری نہ ہوگی کیونکہ مال کا مالک غاصب کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا یا اس کے خلاف دوسروں سے مدد لے سکتا تھا (ڈاکے کی حد کا تذکرہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہاتھ کاٹنے کا شرعی حکم چور سے متعلق ہے، غاصب یا لوٹ مار کرنے والے سے متعلق نہیں کیونکہ چور سے مال بچانا ممکن نہیں، اس لیے کہ وہ گھروں میں نقب زنی کرتا ہے، محفوظ مقام میں ناجائز دخل اندازی کرتا ہے اور لگے ہوئے بند تالوں کو توڑتا ہے۔ اگر ایسے شخص کا ہاتھ کاٹا نہ جائے تو دیگر لوگ بھی ایک دوسرے کا مال چوری کرنے لگ جائیں گے، نقصانات بڑھ جائیں گے اور پریشانیوں میں شدت آجائے گی۔''

''الافصاح'' کے مصنف نے لکھا ہے: ''علماء کا اتفاق ہے کہ لوٹ مار اور غصب کرنے والوں کا جرم بڑا ہونے کے باوجود ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔'' ان لوگوں کو ظلم و زیادتی سے روکنے کے لیے وہ مارے جائیں، لمبی قید یا عبرت ناک سزا دی جائے۔

② ہاتھ کاٹنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کردہ مال حرمت والا اور جائز ہو۔ اگر وہ جائز مال نہیں تو قابلِ

[1] صحيح البخاري، الحدود، باب قول الله تعالى: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المآئدة 38:5)، حديث: 6790,6789.

حرمت نہیں، اس میں ہاتھ کے کاٹنے کا حکم بھی نہیں، مثلاً: لہو ولعب کے آلات، شراب، خنزیر اور مردار وغیرہ۔ اگر وہ جائز مال ہے لیکن قابل حرمت نہیں تو اس میں بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں، مثلاً: حربی کافر کا مال، ایسے شخص کے مال پر قبضہ کرنا بلکہ اسے قتل کر دینا بھی جائز ہے۔

③ چوری کردہ مال مقررہ نصاب کے برابر ہو جو اسلامی تین درہم یا اسلامی دینار کا چوتھا حصہ ہے یا اس کی قیمت کے برابر موجودہ کرنسی ہو یا چوری کردہ ایسا سامان یا چیز ہو جس کی قیمت مذکورہ نصاب کے برابر ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تُقْطَعُ الْيَدُ إِلَّا فِي رُبُعِ دِينَارٍ فَمَا فَوْقَهُ»

''دینار کے چوتھے حصے سے کم چوری میں کسی کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔''[1]

واضح رہے اس وقت (عہد نبوی میں) دینار کی چوتھائی تین درہم کے برابر تھی۔

◣ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے درج بالا نصاب مقرر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مال کی یہ مقدار ایک دن گزارنے کے لیے درمیانے درجے کی معیشت والے شخص اور جن افراد کا نان ونفقہ اس کے ذمے ہے ان کی کفالت کے لیے یہ رقم ایک وقت کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔

◣ ذرا غور کریں! جس ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار تھی وہ ہاتھ دینار کے چوتھے حصے کے بدلے میں کاٹ دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ امین تھا تو قیمتی تھا، جب وہ خیانت کا مرتکب ہوا تو بے وقعت ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ملحد لوگوں، جیسے معری وغیرہ نے چور کی سزا پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے۔

يَدٌ بِخَمْسِ مِّئِينٍ عَسْجَدٍ وُّدِيَتْ　　مَا بَالُهَا قُطِعَتْ فِي رُبُعِ دِينَارٍ

''جس ہاتھ کی قیمت (بصورت دیت) پانچ سو دینار تھی تعجب ہے کہ وہ دینار کے چوتھے حصے کے عوض کاٹ دیا گیا۔''

بعض علماء نے اس اعتراض کا یوں جواب دیا ہے:

عِزُّ الْأَمَانَةِ أَغْلَاهَا، وَأَرْخَصَهَا　　ذُلُّ الْخِيَانَةِ، فَافْهَمْ حِكْمَةَ الْبَارِي

''نادان! باری تعالیٰ کی حکمت کو سمجھ! دیانتداری کی عزت نے اسے نہایت قیمتی بنایا تھا لیکن خیانت کی رسوائی نے اسے سستا اور بے وقعت کر دیا۔''

[1] صحيح مسلم، الحدود، باب حد السرقة و نصابها، حديث: 1684.

④ جس چوری کے نتیجے میں ہاتھ کاٹا جائے گا اس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ چوری کردہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا گیا ہو، مثلاً: چوری کردہ شے کسی گھر میں، دوکان میں یا کسی محفوظ عمارت کے بند دروازوں کے پیچھے یا تالا لگے ہوئے کمرے کے اندر ہو۔ یاد رہے شے کے محفوظ کرنے کے طریقے مختلف علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اگر مال ایسی جگہ سے اٹھایا گیا جو چار دیواری میں یا کسی محفوظ جگہ میں پڑا ہوا نہ تھا تو اس کی وجہ سے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

⑤ اگر کسی کا خیال ہو کہ فلاں مال میں اس کا استحقاق ہے، پھر اسی شبہے میں وہ مال اٹھا لے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اِدْرَءُوا الْحُدُودَ عَنِ الْمُسْلِمِينَ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جہاں تک ہو سکے مسلمانوں پر شبہات کی بنا پر حدود نافذ نہ کرو۔''[1]

لہٰذا اگر بیٹا باپ کے مال سے کچھ چرا لے یا باپ بیٹے کے مال سے کچھ حصہ خفیہ طور پر لے لے تو کسی کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا کیونکہ ہر ایک کے مال میں دوسرے کا حق موجود ہے۔ یہ شبہ حد کو زائل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا دوسرے کے مال میں کوئی حق ہے تو اس مال کو بلا اجازت اٹھا لینے سے چور قرار نہیں پائے گا اور اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا لیکن یہ فعل ناجائز ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ تعزیر کے لائق ہے اور اس سے مال واپس لیا جائے گا۔

⑥ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ساتھ چوری کے ثبوت کے لیے دو معتبر آدمیوں کی شہادت کا ہونا بھی ضروری ہے جو چوری کی کیفیت اور چوری کردہ مال کی صورت حال اچھی طرح واضح کریں کہ واقعے کی سچائی میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے یا پھر مجرم خود ہی چوری کا دو مرتبہ اقرار واعتراف کر لے، چنانچہ سنن ابوداود میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا جس نے چوری کا ایک مرتبہ اعتراف کیا جبکہ چوری شدہ مال اس کے پاس نہ تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا إِخَالُكَ سَرَقْتَ؟ قَالَ: بَلٰى! فَأَعَادَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، فَأَمَرَ بِهِ فَقُطِعَ»

''میرا خیال ہے کہ تم نے چوری نہیں کی ہو گی۔ اس نے کہا: کیوں نہیں! (مجھ سے یہ کام یقیناً سرزد ہوا ہے۔) آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ اپنی اسی بات کو دہرایا تو بالآخر آپ نے حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔''[2]

① [ضعيف] جامع الترمذي، الحدود، باب ما جاء في درء الحدود، حديث: 1424، وسنن ابن ماجه، الحدود، باب الستر على المؤمن ودفع الحدود بالشبهات، حديث: 2545. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الحدود، باب في التلقين في الحد، حديث: 4380.

مجرم کا ہاتھ کاٹنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا اعتراف صاف اور واضح الفاظ میں ہو، حتی کہ اس میں کوئی شک وشبہ اور احتمال باقی نہ رہے۔ ممکن ہے اس نے جس صورت میں مال اٹھایا ہو اس کے بارے میں وہ سمجھتا ہو کہ اس سے اس کا ہاتھ کاٹنا لازمی ہے اور وہ ہاتھ کاٹنے والی صورت نہ ہو، نیز حاکم کو مذکورہ شرائط کی موجودگی یا عدم موجودگی کا علم بھی ہونا چاہیے۔

جس شخص کا مال چوری ہوا اس پر لازم ہے کہ معلوم ہونے کے بعد چور سے اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو چور کا ہاتھ کاٹنا لازمی نہ ہوگا کیونکہ وہ مال مالک کے مباح کر دینے سے ملزم پر مباح ہو جائے گا۔ جب اس سے مطالبہ ہی نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے چور کو وہ مال لے لینے کی اجازت دے دی ہے اور یہ شبہ حد کے نفاذ سے مانع ہے۔

جب مذکورہ شرائط اور تقاضے مکمل ہو جائیں تو مجرم کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: [فَاقْطَعُوا أَيْمَانَهُمَا] ''دونوں (مرد یا عورت) کے دائیں ہاتھ کاٹو۔''[1]

دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے کاٹا جائے گا کیونکہ یہی حصہ چوری کے لیے آلہ ثابت ہوا تھا، لہٰذا اس کی سزا یہی ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے۔ کلائی کے جوڑ سے کاٹنے پر اکتفا اس لیے کیا گیا ہے کہ کلمہ ''یَدٌ'' کو جب مطلق طور پر استعمال کیا جائے تو ہاتھ اسی حد تک مراد ہوتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کے بعد زخم کا مناسب علاج کیا جائے گا تاکہ خون بند ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے سبب موت واقع ہو جائے۔

ڈاکہ زنی کی حد کا بیان

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی زمین پر مسلمان اپنے باہمی مصالح اور منافع کے تبادلے، اموال میں اضافے، ایک دوسرے سے صلہ رحمی، نیکی اور تقوے میں مل کر تعاون کرنے کے لیے امن وسکون سے چلیں پھریں، بالخصوص حج کے سفر میں ایک دوسرے کی مصلحتوں کا خیال رکھیں۔ محبت و پیار سے رہیں تاکہ حج اور عمرے جیسی اہم عبادات کو بہتر انداز سے ادا کر سکیں۔

جو شخص مسلمانوں کی زندگی میں مشکلیں پیدا کرتا ہے، ان کی راہیں مسدود کرتا ہے، سفروں میں خوف و ہراس پھیلاتا ہے تو ایسے شخص کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سخت سزا (حد) مقرر کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

[1] تفسير الطبري، المآئدة 38:5، رقم: 9308.

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ○﴾

''ان کی سزا جو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں یا جلاوطن کر دیا جائے، یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت اور خواری اور آخرت میں ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔ ہاں! جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا لو تو یقین مانو کہ اللہ بہت بڑی بخشش اور رحم و کرم والا ہے۔''[1]

▪ آیت میں مذکور مُحَارِبِینْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راستوں میں ناکے لگا کر لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ صحراؤں یا شہروں میں لوگوں کے آڑے آتے ہیں۔ چوری نہیں بلکہ علی الاعلان لوگوں کا مال اٹھاتے اور چھینتے ہیں۔

▪ ایسے شخص پر حد تب لگے گی جب بقدر نصاب سرقہ مال چھین لے یا اسے محفوظ جگہ سے اٹھا لے یا کسی قافلے میں موجود آدمی سے مال چھین لے، نیز اس کی ڈاکہ زنی اس کے اقرار سے ثابت ہو یا دو قابل اعتماد آدمیوں کی گواہی مل جائے۔

▪ ڈاکہ زنی کرنے والوں کی سزا ان کے جرائم کی نوعیت کے مختلف ہونے کے سبب مختلف ہے:

① جس نے ڈاکہ زنی میں قتل کیا اور مال اٹھایا اسے لازماً قتل کیا جائے گا اور صلیب پر سر عام لٹکایا جائے گا تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ اس سے درگزر قطعاً جائز نہیں۔ علامہ ابن منذر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اس مسئلے پر علماء کا اتفاق ہے۔

② جس نے محض قتل کیا اور مال نہ اٹھایا اسے صرف قتل کیا جائے گا صلیب پر لٹکانے کی ضرورت نہیں۔

③ جس نے صرف مال اٹھایا لیکن مال کے مالک کو قتل نہیں کیا اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا اور پھر اس کا خون بند کرنے کے لیے مرہم پٹی کر کے اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

[1] المآئدة 5:33، 34.

④ جس نے صرف راستے میں خوف و ہراس پیدا کیا، اس نے قتل کیا نہ کسی کا مال چھینا، اسے علاقہ بدر کیا جائے گا اور اسے کسی جگہ دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

الغرض جرائم کے مختلف ہونے سے سزائیں بھی مختلف ہو جایا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ﴾

''ان کی سزا جو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں یا جلا وطن کر دیا جائے۔''①

سلف صالحین کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ یہ آیت ڈاکہ زنی کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''ڈاکو جب قتل کریں اور مال لوٹ لیں تو قتل کیا جائے گا اور سولی چڑھایا جائے گا، اگر صرف قتل کریں مال نہ لوٹیں تو قتل کیا جائے مگر سولی نہ دیا جائے۔ جب وہ مال چھین لیں اور قتل نہ کریں تو ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت میں کاٹ دیے جائیں۔ اور اگر صرف خوف و ہراس پیدا کریں، مال وغیرہ نہ لوٹیں تو علاقہ بدر کیا جائے گا۔''②

▲ اگر ڈاکہ زنی کرنے والوں میں سے بعض نے قتل کیا تو سب کو قتل کیا جائے گا۔ اگر کچھ افراد نے قتل کیا اور کچھ نے مال چھین لیا تو بھی سب کو قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکایا جائے گا۔

▲ اگر ڈاکو گرفتار ہونے سے قبل ہی توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے جو سزا مقرر ہے وہ معاف ہو جائے گی (یعنی علاقہ بدر کرنا یا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کا کاٹنا یا سزائے موت جو اس پر واجب تھی)، البتہ بندوں کے حقوق (جان، مال کا نقصان) معاف نہ ہوں گے الا یہ کہ جن کو معاف کرنے کا حق ہے وہ معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

''ہاں! جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا لو تو یقین مانو کہ بے شک اللہ بہت بڑی بخشش اور رحم و کرم والا ہے۔''③

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اتفاق ہے کہ ڈاکو، چور وغیرہ کا معاملہ جب قاضی کے پاس

① المآئدة 5:33. ② كتاب الأم للإمام الشافعي: 8/80. ③ المآئدة 5:34.

پہنچ جائے پھر اس کے بعد وہ توبہ کرلیں تو ان پر حد ضرور نافذ ہوگی، ساقط نہ ہوگی۔ اگر وہ توبہ کرنے میں سچے اور مخلص ہوں گے تو سزا ان کے لیے کفارہ ہوگی۔''[1]

ان کی توبہ صرف اس وقت تسلیم ہوگی جب وہ گرفتار ہونے سے پہلے پہلے توبہ کرلیں کیونکہ قرآن مجید میں یہی حکم ہے تاکہ حدود الٰہی کا معطل ہونا لازم نہ آئے کیونکہ اگر توبہ کرنے سے سزا معاف ہوجائے تو ہر مجرم سزا سے بچنے کے لیے توبہ کے الفاظ کہہ کر جان چھڑا سکتا ہے۔

جس شخص کی ذات پر قاتلانہ حملہ ہوا یا اس کی حرمت ماں، بیٹی، بہن یا بیوی پر ہتک عزت کے لیے حملہ ہوا یا کسی نے اس کے مال پر قبضہ کرنے کے لیے یا اسے تلف کرنے کے لیے اقدام کیا تو مظلوم کو دفاع کرنے کا حق حاصل ہے۔ حملہ آور آدمی ہو یا کوئی چوپایہ، البتہ وہ دفاع اس انداز سے کرے جو اس کے غالب گمان کے مطابق کم سے کم نقصان کا باعث ہو۔ اگر مظلوم شخص کو دفاع کرنے کا حق نہ دیا جائے تو اس سے اس کی جان، حرمت یا مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو ظالم لوگ دوسروں پر مسلط ہوجائیں گے۔ اگر حملہ آور کو دفاع میں قتل کرنا ناگزیر ہو تو اس کو قتل کرنا بھی درست ہے، اس میں کوئی ضمان نہ ہوگا کیونکہ اس نے شر سے بچنے کے لیے مجبورًا ایسا قدم اٹھایا ہے۔ اگر کوئی اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل ہوگیا تو وہ شہید ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أُرِيدَ مَالُهُ بِغَيْرِ حَقٍّ فَقَاتَلَ فَقُتِلَ، فَهُوَ شَهِيدٌ»

''جس شخص کا مال ناحق لینے کی کوشش کی گئی تو وہ دفاع کرتے ہوئے لڑا جس سے وہ مارا گیا تو وہ شہید ہے۔''[2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

«جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ جَاءَ رَجُلٌ يُرِيدُ أَخْذَ مَالِي؟ قَالَ: فَلَا تُعْطِهِ مَالَكَ - قَالَ أَرَأَيْتَ إِنْ قَاتَلَنِي؟ قَالَ: قَاتِلْهُ - قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ قَتَلَنِي؟ قَالَ: فَأَنْتَ شَهِيدٌ، قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ قَتَلْتُهُ؟ قَالَ: هُوَ فِي النَّارِ»

''آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا: اے اللہ کے رسول! بتائیے! اگر کوئی شخص میرا مال (ناحق) لینا چاہے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے مت دو۔ اس نے کہا: اگر وہ مجھ سے لڑے تو؟

[1] مجموع الفتاوی:300/28. [2] سنن أبي داود، السنة، باب في قتال اللصوص، حديث:4771.

آپ نے فرمایا: تو بھی اس سے لڑائی کر۔ اس نے کہا: اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟ آپ نے فرمایا: تو شہید ہو گا۔ اس نے کہا: اگر میں اسے قتل کر دوں تو؟ آپ نے فرمایا: وہ جہنم میں جائے گا۔"[1]

یاد رہے اپنی ذات یا عزت کا دفاع تب لازم ہے جب یہ دفاع کسی بڑی خرابی کا موجب نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ "اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔"[2]

اگر کسی مسلمان شخص کی ذات یا اس کی عزت پر حملہ ہو تو اس کی طرف سے دفاع کرنا یا دفاع میں تعاون کرنا لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا» "اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔"[3]

واضح رہے ظالم کے ساتھ تعاون اس کو ظلم سے روکنا ہے۔

- جب کوئی چور کسی کے گھر داخل ہو جائے تو وہ بھی حملہ آور کے حکم میں ہے جس کا مناسب اور کم نقصان دہ طریقے سے دفاع کیا جانا چاہیے۔
- جو شخص دروازے کے سوراخ سے یا کھڑکی سے یا اپنی چھت پر چڑھ کر کسی کے گھر میں دیکھے تو اسے روکا جائے۔ اگر اس نے دیکھنے والے کی آنکھ کوئی چیز مار کر پھوڑ دی تو اس پر ضمان و تاوان نہ ہو گا کیونکہ حدیث میں ہے:

«مَنِ اطَّلَعَ فِي بَيْتِ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ فَفَقَأُوا عَيْنَهُ، فَلَا دِيَةَ لَهُ وَلَا قِصَاصَ»

"جس نے کسی غیر کے گھر میں ان کی اجازت کے بغیر جھانک کر دیکھا، اگر انھوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو اس کے لیے نہ دیت ہے اور نہ قصاص۔"[4]

یہ مذکورہ شرعی احکام مسلمان کی ذات، اس کے مال کی حرمت اور اللہ کے نزدیک اس کی عزت و کرامت کے سبب ہیں۔ یہ اسلام کا عدل و انصاف ہے جس میں معاشرے کی حفاظت اور اس کی مصلحتوں کی حفاظت مقصود ہے تاکہ شہر آباد رہیں، بندوں کے لیے امن و سکون قائم رہے اور دن ہو یا رات لوگ امن و آشتی سے زمین پر چلیں پھریں۔

انسانیت کی اصلاح اس حکیمانہ شریعت کے نفاذ ہی سے ممکن ہے کیونکہ انسان کے خود ساختہ تمام قوانین اور مادی طاقتیں مطلوبہ امن کے حصول میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على من قصد أخذ مال غيره بغير حق ...... ، حديث: 140. [2] البقرة 2:195.
[3] صحيح البخاري، المظالم، باب أعن أخاك ظالمًا أو مظلومًا، حديث: 2443. [4] سنن النسائي، القسامة، باب من اقتص وأخذ حقه دون السلطان، حديث: 4864.

﴿ اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ ﴾

''کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟''[1]

باغیوں سے قتال کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ ﴾

''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسری (جماعت) پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے، لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''[2]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے باغیوں کے خلاف لڑنا اس وقت واجب قرار دیا ہے جب تک وہ صلح پر آمادہ نہ ہوں۔

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ يُّرِيدُ أَنْ يُّفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوهُ»

''جب تم ایک شخص کی امارت پر متفق ہو کر امن وسکون سے زندگی گزار رہے ہو تو پھر کوئی دوسرا شخص تمھارے پاس آئے جو تمھاری جماعت میں افتراق وانتشار پیدا کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو۔''[3]

[1] المآئدة 5:50. [2] الحجرات 49:9، 10. [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين وهو مجتمع، حديث: (60)-1852.

نیز فرمان نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ خَرَجَ عَلٰى أُمَّتِي وَهُمْ جَمِيعٌ ، فَاقْتُلُوهُ كَائِنًا مَّنْ كَانَ»

''جو شخص میری امت کے خلاف اس وقت خروج کرے جب وہ متفق ہو چکی ہو تو اس کی گردن تلوار سے اڑا دو چاہے جو بھی ہو۔''[1]

باغیوں سے قتال کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ہی رائے تھی، ان میں اختلاف نہ تھا۔

''بغاوت'' زیادتی، ظلم اور راہ حق سے ہٹ جانے کا نام ہے، لہٰذا باغی وہ لوگ ہیں جو زیادتی کرنے والے، ظالم اور راہ حق کو چھوڑنے والے ہیں اور مسلمان امراء کے احکام اور نظام کی مخالفت کرنے والے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کی ایک جماعت اور ایک امام کا ہونا ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾

''اللہ (تعالیٰ) کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُوْصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ»

''میں تمھیں اللہ سے ڈرنے اور سمع و طاعت کے بجالانے کا حکم کرتا ہوں اگرچہ تم پر کوئی حبشی غلام امیر بن جائے۔''[4]

درج بالا آیات اور احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایسے امور ہیں جو انسانی معاشرے کی اجتماعیت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں تاکہ ان کی شیرازہ بندی قائم رہے، ملک کی حفاظت اور اس کا دفاع آسان ہو اور حدود کا

---

① صحيح مسلم، الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخليفة الأول فالأول، حديث: 1844، وكتاب السنة لابن أبي عاصم، ص: 519، حديث: 1107 واللفظ له. ② آل عمرٰن 3:103. ③ النسآء 4:59. ④ سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث: 4607، وجامع الترمذي، العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدعة، حديث: 2676، علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے اس روایت کے تمام طرق دیکھے ہیں لیکن مجھے [وَإِنْ تَأَمَّرَ] کے بجائے [وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا] کے الفاظ ہی ملے ہیں جیسا کہ سنن ابوداود اور جامع ترمذی میں ہے۔

نفاذ ہو، حقوق کی ادائیگی ہو، نیکی کا حکم ہو اور برائی سے روکا جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جاننا چاہیے کہ لوگوں کے امور کی سربراہی واجبات دینیہ میں سے ایک اہم دینی فریضہ ہے بلکہ دین و دنیا کا قیام اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ بنی آدم کے مصالح، منافع اور فوائد یقیناً آپس میں مل کر رہنے ہی سے پورے ہوتے ہیں اور اجتماعیت میں امیر و سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سفر جیسے چھوٹے اور عارضی اجتماع میں بھی ایک شخص کو امیر بنانا واجب قرار دیا ہے جس سے مختلف قسم کے اجتماعات پر رئیس یا امیر بنانے کی تنبیہ ہوتی ہے۔''[1]

معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ امیر و حاکم کے بغیر درست نہیں رہ سکتے۔ اگر کوئی ظالم حکمران بن جائے تو وہ بغیر حاکم و امیر زندگی گزارنے سے بہتر ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ظالم امیر کے تحت سال گزارنا امیر کے بغیر ایک رات گزارنے سے بہتر ہے۔

▲ اگر کوئی جماعت مشتبہ امور کا غلط معنی کر کے مسلمانوں کے امیر کے خلاف خروج (بغاوت) کرتی ہے، اس کی اطاعت سے دستکش ہو جاتی ہے یا اس کی مخالفت کرتی ہے، اتحاد کی قوت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ ظالموں اور باغیوں کی جماعت ہے۔ مسلمانوں کے امیر کو چاہیے کہ اس سے مراسلت (مذاکرات) کرے اور پوچھے کہ اس سے کیا شکایت ہے اور اس کا کیا قصور ہے؟ اگر وہ کسی ظلم و زیادتی کی شکایت کریں تو وہ اس کا ازالہ کرے، اگر کوئی غلط فہمی ہو تو اسے دور کرے حتی کہ وسعتِ ظرفی اور سنجیدگی سے صلح کی پوری کوشش کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَأَصۡلِحُوا۟ بَيۡنَهُمَا﴾ ''ان (دونوں) میں میل ملاپ کرا دیا کرو۔''[2]

صلح اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ اگر باغی لوگ امیر پر ایسا کام کرنے کا الزام لگاتے ہیں جس کا کرنا شرعاً جائز نہیں تو امیر کو چاہیے کہ اس کا ازالہ کرے اور اگر اس کام کا کرنا جائز ہو تو فریق مخالف کو دلائل سے قائل کرے اور حقیقت حال کو واضح کرے۔ اگر باغی گروہ رجوع کر لے، حق کی طرف پلٹ آئے اور اطاعت امیر پر آمادہ ہو جائے تو چھوڑ دے۔ اگر وہ دلائل شرعیہ کو سن کر بھی رجوع نہ کریں تو ان سے جنگ کرنا ضروری ہے۔ اس کی رعایا کو چاہیے کہ اس سے بھرپور تعاون کریں حتی کہ ان کے شر کا خاتمہ ہو جائے اور فتنے کی آگ بجھ جائے۔

▲ باغیوں سے قتال کے وقت درج ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے:

① ان پر ایسی چیز سے حملہ نہ کیا جائے جو اجتماعی ہلاکت کا باعث ہو، مثلاً: تباہ کن میزائل یا بم نہ پھینکے جائیں۔

② ان کے بچوں، پشت پھیر کر بھاگنے والوں اور زخمیوں کو یا جو لڑنا نہیں چاہتے، قتل کرنا حرام ہے۔

① مجموع الفتاوی: 28/390. ② الحجرات 49:9.

③ اگر ان میں سے کوئی گرفتار ہو تو اسے قید میں رکھا جائے حتی کہ فتنے کی آگ بجھ جائے۔

④ ان کے اموال کو غنیمت نہ قرار دیا جائے بلکہ ان کے اموال بھی دوسرے مسلمانوں کے اموال کی طرح (قابل احترام) ہیں کیونکہ ان پر ان کی ملکیت ختم نہیں ہوئی۔ لڑائی ختم ہو جانے اور فتنے کی آگ بجھ جانے کے بعد اگر ان کا مال کسی کے قبضے میں پایا جائے تو اسے لے کر اصل مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر وہ ضائع ہو گیا تو اس کا ضمان نہ ہو گا۔ فریقین کی لڑائی میں جو مارا گیا اس کی دیت بھی نہ ہو گی۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اصحاب رسول ﷺ کے دور میں فتنوں نے سر اٹھایا تو ان کی سرکوبی کی گئی۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ کسی فتنہ باز کے قتل ہونے کی صورت میں اس کی دیت نہیں دی جائے گی اور نہ قرآنی آیات کی (غلط) تاویل کر کے ان کا مال غنیمت سمجھا جائے مگر جو مال باغیوں نے چھینا تھا اگر وہ بعینہ واپس مل گیا تو اسے لے کر مالک کو دے دیا جائے۔''[1]

◄ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں لڑائی چھڑ جائے، ان میں سے کوئی بھی امام المسلمین کی اطاعت میں نہ ہو بلکہ لڑائی کی بنیاد باہمی عصبیت ہو یا اقتدار کی خاطر جنگ ہو تو دونوں گروہ ظالم ہیں کیونکہ ہر گروہ دوسرے پر زیادتی کر رہا ہے اور کسی میں کوئی خصوصیت اور امتیاز نہیں رہا جو اس کے حق پر ہونے کی واضح علامت ہو۔ ایسی صورت میں ہر گروہ دوسرے کے نقصان کا ضامن ہو گا۔ اگر ایک گروہ امیر کے حکم سے لڑ رہا ہو تو وہ حق پر سمجھا جائے گا، دوسرا باغی قرار پائے گا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

◄ اگر کوئی گروہ خوارج کے عقائد رکھتا ہو، مثلاً: کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو کافر کہنا، مسلمانوں کی خونریزی کو جائز سمجھنا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گالیاں دینا تو وہ بھی باغی، فاسق اور خوارج ہوں گے۔ اگر وہ امیر کی اطاعت کے دائرے سے نکل جائیں گے تو ان سے قتال واجب ہو گا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خوارج کے بارے میں اہل سنت متفق ہیں کہ وہ بدعتی گروہ ہے۔ نصوص شرعیہ ان سے قتال کرنا واجب قرار دیتی ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ان سے قتال کرنے پر اتفاق تھا۔ علمائے اہل سنت کا بھی یہی مسلک ہے کہ عادل حکمرانوں کے ساتھ مل کر ان (خوارج) سے لڑائی لڑی جائے گی۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ ظالم حکمرانوں کے ساتھ مل کر بھی ان سے لڑنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض اہل علم سے منقول ہے کہ ان (ظالم حکمرانوں) کے ساتھ مل کر لڑنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح معاہدین میں سے کوئی اپنا عہد توڑے تو ان

① السنن الكبرى للبيهقي: 8/174، 175.

سے لڑنا بھی ضروری ہے اور جمہور کا یہی موقف ہے۔ امیر نیک ہو یا فاجر و فاسق، اگر وہ باغی کفار یا مرتدین یا معاہدے کو توڑنے والوں یا خوارج سے جنگ کرے تو اس کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے لڑائی لڑی جائے۔ اگر اس کی لڑائی جائز نہ ہو تو اس کے ساتھ جنگ میں شامل نہ ہوا جائے۔''[1]

اگر خوارج کے عقائد رکھنے والا گروہ امام کی اطاعت کرتا رہے اور لڑائی کرنے پر آمادہ نہ ہو تو احکام اسلام کے مطابق ان پر تعزیر ہوگی، نیز ان کے عقائد کی تردید کی جائے گی اور انھیں اپنی باطل رائے کی نشر و اشاعت کی اجازت نہ دی جائے گی۔ یہ مسلک ان حضرات کا ہے جو خوارج کو کافر نہیں کہتے جیسا کہ جمہور علماء کا موقف ہے۔ باقی رہے وہ حضرات جن کا فتویٰ ہے کہ خوارج کافر ہیں تو ان کے نزدیک خوارج سے قتال کرنا بہر حال ضروری ہے۔

ارتداد کے احکام

مُرتَد اِرتَدَّ فعل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے لغوی معنی ''لوٹ جانے والے'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ ﴾ ''اور تم اپنی پشت کے بل روگردانی نہ کرو۔''[2]

شرعی اصطلاح میں مرتد وہ شخص ہے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد اپنی مرضی سے زبان کے ذریعے سے یا دل یا عمل کے ساتھ دین اسلام کے احکام کا انکار کر دے۔ شریعت میں مرتد کے لیے دنیوی حکم بھی ہے اور اخروی حکم بھی۔ دنیوی حکم رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے:

«مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» ''جو (مسلمان) اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو۔''[3]

اس اہم حکم کے ضمن میں چند مزید احکام بھی ہیں کہ اسے قتل کرنے سے قبل اس کی بیوی کو اس سے الگ کر دیا جائے گا، نیز اسے مالی تصرفات سے بھی روک دیا جائے گا۔ اس مسئلے پر علمائے کرام کا اجماع ہے۔

باقی رہا آخرت میں حکم تو اسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کیا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴾

① منهاج السنة النبوية: 117,116/6. ② المائدة 21:5. ③ صحيح البخاري، الجهاد، باب لا يعذب بعذاب الله، حديث: 3017.

''اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اور اسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمال دنیوی اور اخروی سب غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔''[1]

▲ ارتداد اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کوئی ایسا کام کرے یا ایسی بات کہہ دے جس سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے، خواہ وہ سنجیدگی سے وہ کام کرے یا ازراہ مذاق۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ط قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ○ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ﴾

''اگر آپ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمھارے ہنسی مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟ تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو۔''[2]

اگر کسی نے جبر و اکراہ کی وجہ سے زبان سے کوئی غلط کلمہ کہہ دیا یا کوئی اسلام کے منافی کام کر دیا تو وہ مرتد شمار نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾

''جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے سوائے اس (شخص) کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو۔''[3]

▲ نواقض اسلام، جن سے ارتداد ثابت ہوتا ہے، بہت سے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا شرک ہے۔ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، مثلاً: غیر اللہ مُردوں، اولیاء اور صالحین کو فریاد رسی کے لیے پکارا یا ان کی قبروں پر کوئی جانور ذبح کیا یا ان کی رضا کے لیے نذر مانی یا مُردوں سے اپنے امور میں مدد طلب کی جیسا کہ آج کے دور میں قبر پرست لوگ کر رہے ہیں تو وہ شخص دین اسلام سے مرتد ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾

''یقیناً اللہ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔''[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطے بنا لیے جنھیں وہ پکارتا ہے، ان کے آگے سوال کا ہاتھ بڑھاتا ہے، ان پر توکل کرتا ہے تو وہ بالاجماع کافر ہے۔ اسی طرح جس نے بعض نبیوں اور رسولوں کا انکار کر دیا یا بعض کتب الٰہیہ کا انکار کیا تو وہ مرتد ہو گیا کیونکہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کی

① البقرۃ 2:217. ② التوبۃ 9:65، 66. ③ النحل 16:106. ④ النسآء 4:48.

تکذیب کر رہا ہے، اللہ کے رسولوں میں سے کسی رسول اور کتب میں سے کسی کتاب کا انکار کر رہا ہے۔ مزید برآں کسی نے فرشتوں کے وجود کا یا یوم آخرت کا انکار کیا یا اللہ تعالیٰ یا اس کے کسی رسول و نبی کو گالی دی یا نبوت کا دعویٰ کر دیا یا محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کی نبوت کو تسلیم کیا تو وہ کافر ہے کیونکہ وہ اللہ کے فرمان:

﴿ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ﴾ ''لیکن آپ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔''[1]

کو جھٹلانے والا ہے۔ اور جس نے زنا کے حرام ہونے کو تسلیم نہ کیا یا کسی ایسی شے کو حرام نہ سمجھا جس کے حرام ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے، مثلاً: خنزیر کا گوشت، شراب وغیرہ یا کسی ایسی شے کو حلال نہ سمجھا جس کی حلت پر پوری امت کا اجماع ہے، مثلاً: ذبح کردہ حلال چوپائے تو وہ شخص بھی کافر ہے۔ اسی طرح جس نے ارکان اسلام (کلمہ شہادت، نماز، روزہ ......) کا انکار کیا یا دین اسلام کا تمسخر اڑایا یا قرآن مجید کی بے حرمتی کی یا اس کا عقیدہ ہو کہ قرآن مجید مکمل طور پر محفوظ نہیں رہا بلکہ ناقص ہے تو ان تمام صورتوں میں انسان کافر ہو جاتا ہے جس کے کفر پر اجماع ہے۔''

شیخ موصوف آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''جس نے دین اسلام کے سوا کسی اور دین کا بھی اتباع کیا یا شریعت محمدی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری شریعت کو بھی قابل عمل سمجھا تو وہ شخص بھی بالاتفاق کافر ہے۔ اس کا کفر اس شخص کی طرح ہے جو کتاب اللہ کے بعض حصے پر ایمان لایا اور بعض حصے کا انکار کر دیا۔''

نیز فرماتے ہیں: ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے کسی وعدے یا وعید کا تمسخر اڑایا یا جس نے اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اپنا لینے والے کو کافر نہ سمجھا (مثلاً: نصاریٰ) یا ان کے کفر میں شک کیا یا ان کے مذہب کو صحیح مانا تو وہ بالاجماع کافر ہے۔''

نیز فرمایا: ''جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یا ان میں سے کسی ایک کو گالی دی یا اس کا دعویٰ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ معبود یا نبی تھے۔ جبریل علیہ السلام نے غلطی کی تھی تو اس کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں۔''

- جس نے شریعت اسلامیہ کے بجائے خود ساختہ قانون کو اپنا فیصل بنا لیا اور اسے اسلامی شریعت سے بہتر قانون سمجھا یا اس نے اسلام کے بجائے سوشلزم کی فکر یا عربی قومیت کو دین اسلام کا متبادل سمجھ کر اپنا لیا تو اس کے مرتد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔
- ارتداد کی اور بھی بہت سی انواع و اقسام ہیں، مثلاً: جس نے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا یا جو مشرکین کو کافر نہیں

[1] الأحزاب 40:33.

سمجھتا یا اسے ان کے کفر میں شک ہے یا ان کے مذہب کو صحیح اور درست سمجھے، مثلاً: اس کا عقیدہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت سے دوسری شریعت بڑھ کر ہے یا دین اسلام کے کسی حکم، ثواب یا عقاب سے استہزا کرے یا احکام رسول ﷺ سے بغض رکھے یا اس کا یہ عقیدہ ہو کہ بعض لوگوں کے لیے شریعت محمدی کی اتباع ضروری نہیں بلکہ اس سے خروج جائز ہے جیسا کہ غالی قسم کے صوفیاء کا عقیدۂ بد ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین اسلام کو نہ سیکھتا ہے اور نہ عمل کرتا ہے تو یہ سب ارتداد اور نواقض اسلام کے اسباب میں سے ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان تمام قسم کے نواقض میں کوئی فرق نہیں، ان کے مرتکب سے ان کا ظہور خواہ مذاق میں ہو یا قصداً یا کسی خوف کی وجہ سے ان کا اظہار کرے وہ مرتد اور کافر ہی سمجھا جائے گا سوائے مجبور و مقہور کے۔ یہ تمام نواقض انتہائی خطرناک ہیں اور لوگوں سے اکثر ان کا وقوع ہوتا رہتا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ ان سے بچے اور ان کا خطرہ اپنے لیے محسوس کرے۔ ہم اللہ کے غضب کے اسباب اور اس کے دردناک عذاب سے اس کی پناہ مانگتے ہیں۔''

یہ نواقض اسلام کے چند ایک نمونے تھے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ جانیں اور پہچانیں تاکہ ان سے بچ سکیں۔

یاد رکھیں! جو شخص شرکیہ امور سے واقفیت نہیں رکھتا، اندیشہ ہے کہ وہ اس کا ارتکاب کر بیٹھے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو شخص امور جاہلیت سے واقف نہیں ممکن ہے کہ وہ عہد اسلام میں پیدا ہونے کے باوجود دین اسلام کی ایک ایک کڑی کو ادھیڑ کر رکھ دے۔''

میرے بھائی! میرا آپ کو مشورہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراط مستقیم کے تقاضے'' کا مطالعہ کیجیے، نیز شیخ مجدد محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی کتاب اَلْمَسَائِلُ الَّتِي خَالَفَ فِيهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَهْلَ الْجَاهِلِيَة ''رسول اللہ ﷺ کا اہل جاہلیت سے اختلاف'' اور اس کی شرح کو پڑھیے جسے عراق کے معروف عالم محمود شکری آلوسی رحمہ اللہ نے تالیف کیا ہے۔

▲ جو شخص دین اسلام سے مرتد ہو جائے اسے تین دن تک توبہ کا موقع دیا جائے گا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ قتل کر دیا جائے گا کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کی ایک شخص مرتد ہو گیا تھا تو اسے توبہ کا موقع دیے بغیر قتل کر دیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے سن کر فرمایا:

«أَفَلَا حَبَسْتُمُوهُ ثَلَاثًا، وَأَطْعَمْتُمُوهُ كُلَّ يَوْمٍ رَّغِيفًا، وَاسْتَتَبْتُمُوهُ لَعَلَّهُ يَتُوبُ وَيُرَاجِعُ أَمْرَ اللهِ؟ ثُمَّ قَالَ عُمَرُ: اَللّٰهُمَّ! إِنِّي لَمْ أَحْضُرْ، وَلَمْ آمُرْ، وَلَمْ أَرْضَ إِذْ بَلَغَنِي»

”تم نے تین دن تک اسے مہلت کیوں نہیں دی؟ اسے روزانہ ایک روٹی کھانے کو دیتے اور توبہ کا موقع دیتے تو شاید وہ توبہ کر لیتا، پھر فرمایا: اے اللہ! میں اس موقع پر موجود نہ تھا اور نہ میں نے اس کا حکم دیا تھا، مجھے اب خبر ملی ہے اور میں اس کام پر راضی بھی نہیں ہوں۔“[1]

مرتد کو توبہ کے لیے مہلت دینے میں حکمت یہ ہے کہ بسا اوقات ارتداد کا سبب کوئی شبہ ہوتا ہے جو فوراً زائل نہیں ہوتا، لہٰذا حقیقت حال واضح ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ باقی رہی وجوب قتل کی دلیل تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» ”جو (مسلمان) اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو۔“[2]

- مرتد کو قتل کرنے کی ذمے داری حاکم یا اس کے نائب پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اس کا قتل اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو حاکم ہی وصول کر سکتا ہے۔
- مرتد کو قتل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جب اس نے حق کو اچھی طرح جان پہچان کر قبول کیا تو اب اس کے ترک کا مقصد زمین میں فساد پھیلانا ہے، لہٰذا اس شخص کا زندہ رہنا درست نہیں۔ وہ ایک انسانی معاشرے کا فاسد عضو ہے، لہٰذا اس کا زہر پھیلنے سے قبل ہی الگ کر دینا ضروری ہے۔
- اگر مرتد کلمۂ شہادت کا پھر سے اقرار کر لے تو اس کا رجوع ثابت ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، فَإِذَا قَالُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا»

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں (کافروں) سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا إله إلا الله کا اقرار کر لیں، جب انھوں نے لا إله إلا الله کا اقرار کر لیا تو اپنا خون اور مال محفوظ کر لیا سوائے اسلام کے حقوق کے۔“[3]

اگر کسی شخص کے ارتداد کا سبب کلمۂ شہادت کے علاوہ کسی ایسے حکم کا انکار ہے جو ضروریات دین میں سے ہے تو اس کی توبہ تب تسلیم ہو گی جب وہ کلمۂ شہادت کے ساتھ اس خاص امر کا اقرار کرے گا جس کے انکار سے اسے مرتد

① الموطأ للإمام مالك، الأقضية، باب القضاء فيمن ارتد عن الإسلام، حديث: 1479. ② صحيح البخاري، الجهاد، باب لا يُعذَّب بعذاب الله، حديث: 3017. ③ صحيح البخاري، الاعتصام، باب قول الله تعالى: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ...... ﴾ معلقاً، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله ...... ، حديث: 21.

قرار دیا گیا تھا۔

▲ مرتد کے پاس جو مال ہوگا اسے اس کے تصرفات سے روک دیا جائے گا کیونکہ اس کے ساتھ دیگر مسلمانوں کے حقوق متعلق ہیں جیسا کہ مفلس شخص کو مال کے تصرف سے روک دیا جاتا ہے (جب اس پر قرضوں کا بوجھ ہو۔) مرتد کے مال سے مسلمانوں کے قرضے ادا کیے جائیں گے۔ اسی طرح مرتد اور اس کے اہل وعیال پر اسی کا مال خرچ کیا جائے گا جب تک اسے تصرف سے روکا ہوا ہے۔ اگر مرتد دوبارہ اسلام قبول کر لے تو اس کے مالی تصرف کو بحال کر دیا جائے گا۔ اگر وہ حالت ارتداد میں مر گیا یا اسے سزا کے طور پر قتل کر دیا گیا تو اس کا مال "مال فيء" قرار دے کر بیت المال میں جمع کر لیا جائے گا کیونکہ شرعًا اس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ فرمان نبوی ہے:

«لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ»

"مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہوگا۔"[1]

اسی طرح وہ لوگ بھی اس کے وارث نہیں ہوں گے جن کا مذہب اس نے اختیار کیا ہے کیونکہ اسے اس کفریہ مذہب پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

▲ جس شخص نے اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کو گالی دی اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اس کے بارے میں علماء کی دو رائے ہیں:

① دنیاوی احکام میں اس کا رجوع قبول نہ ہوگا بلکہ اسے قتل کرنا واجب ہوگا، نہ وہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ اس کا کوئی وارث ہوگا کیونکہ اس کے اس قدر بڑے گناہ، عقیدے میں فساد اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو معمولی سمجھنے کا یہ تقاضا ہے کہ اسے بہر حال قتل کر دیا جائے۔

② اس کا رجوع قبول ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾

"آپ ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب

---

[1] صحيح البخاري، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم ......، حديث: 6764. ارتداد سے متعلقہ احکام میں سے ایک یہ ہے کہ مرتد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی، اگر عدت ختم ہونے سے پہلے توبہ کر لے تو اس کی بیوی اسے واپس مل جائے گی اور اگر عدت ختم ہو گئی اور اس نے توبہ نہ کی تو وہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی اور اس فسخ نکاح کا اعتبار اس کے ارتداد کے دن سے ہوگا۔ اسی طرح اگر ردت (ارتداد) دخول سے پہلے واقع ہو تو پھر بھی نکاح فسخ ہوگا۔

معاف کردیے جائیں گے۔''[1]

جس شخص نے بار بار ارتداد کا ارتکاب کیا، کیا اس کا رجوع قبول ہوگا یا نہیں؟ اس کے بارے میں علمائے کرام کی مختلف آراء ہیں:

① بعض کا کہنا ہے کہ دنیا میں اس کا رجوع قبول نہ ہوگا، لہٰذا اس کو لازماً مرتد کی سزا دی جائے گی اگرچہ وہ توبہ بھی کرلے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ۝ ﴾

''بے شک جن لوگوں نے ایمان قبول کر کے پھر کفر کیا، پھر ایمان لا کر پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں کہیں بڑھ گئے، اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ راہ ہدایت سمجھائے گا۔''[2]

② دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا رجوع قبول ہوگا کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَنتَهُوا يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾

''آپ ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کردیے جائیں گے۔''[3]

آیت کا یہ حکم عام ہے جو اپنے عموم کے اعتبار سے اس شخص کو بھی شامل ہے جو بار بار مرتد ہوتا ہے۔

زندیق سے مراد منافق شخص ہے جو ظاہراً مسلمان ہو لیکن باطن میں کفر چھپائے ہو۔ اس کے بارے میں بھی اہل علم کی دو رائے ہیں۔

① اس کا رجوع قبول نہ ہوگا کیونکہ اس کے الفاظ یا اعمال سے یقینی رجوع ثابت نہیں ہوتا (ممکن ہے جھوٹ موٹ رجوع کر رہا ہو) ظاہری توبہ کے بعد بھی اس کی وہی کیفیت ہوگی جو پہلے تھی، یعنی اظہار اسلام اور دل میں کفر۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا ﴾

''البتہ جن لوگوں نے (اس کام سے) توبہ کرلی اور اپنی اصلاح کرلی اور (جو بات چھپائی تھی اس کی) وضاحت کردی۔''[4]

② زندیق کا رجوع قبول ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① الأنفال 38:8. ② النسآء 137:4. ③ الأنفال 38:8. ④ البقرة 160:2.

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

''منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے، ناممکن ہے کہ آپ ان کا کوئی مددگار پائیں۔ ہاں! جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور اللہ پر کامل یقین رکھیں اور خالص اللہ ہی کے لیے دینداری کریں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں، اللہ مومنوں کو بہت بڑا اجر دے گا۔''[1]

نیز رسول اللہ ﷺ نے منافقین سے ہاتھ روک کر رکھا، یعنی سزا نہ دی کیونکہ انھوں نے اسلام کو ظاہری طور پر قبول کیا ہوا تھا۔

زندیق لوگوں میں سے حلولیہ، اباحیہ ہیں اور جو اپنے متبوع کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ترجیح دیتے ہیں یا جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ درجہ معرفت حاصل ہو جانے سے شریعت کے اوامر و نواہی ساقط ہو جاتے ہیں یا وہ کہے کہ معرفت حاصل ہو جانے پر یہود و نصاریٰ کے دین پر عمل کرنا جائز ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کا بھی یہی حکم ہے۔

▲ اہل علم میں اس مسئلے پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی باشعور بچہ جس کا مسلمان ہونا درست ہے، اسی طرح اس کا مرتد ہونا صحیح ہے کہ نہیں تو ایک قول یہ ہے کہ اس کا ارتداد ثابت ہوگا بشرطیکہ ارتداد کے کسی سبب کا مرتکب ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کا اسلام معتبر ہے اس کا ارتداد بھی شمار ہے۔ لیکن اسے فوری طور پر قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ جب وہ بالغ ہوگا تب اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا اور اس کو تین دن تک مہلت دی جائے گی۔ اگر توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی ورنہ قتل کی سزا دی جائے گی۔

▲ ایک شخص نماز کی فرضیت کا اقرار کرتا ہے لیکن سستی و کوتاہی کی وجہ سے ادا نہیں کرتا تو اس کے بارے میں بھی اہل علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ شخص بھی کافر ہے کیونکہ ارشاد نبوی ہے:

«بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»

''مسلمان بندے اور اس کے کفر کے درمیان حد فاصل ترک نماز ہے۔''[2]

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»

[1] النسآء 4:145، 146. [2] سنن أبي داود، السنة، باب في رد الإرجاء، حديث: 4678.

’’ہمارے اوران (کفار) کے درمیان عہد، نماز ہے جس نے اسے چھوڑا یقیناً اس نے کفر کیا۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○﴾

’’تمھیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نمازی نہ تھے۔‘‘[2]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ﴾

’’اب بھی اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکاۃ دیتے رہیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔‘‘[3]

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص نماز نہ پڑھے وہ ہمارا بھائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ’’اگر وہ نماز کی فرضیت کا اقرار کرلیں‘‘ بلکہ یہ فرمایا کہ ’’نماز قائم کریں۔‘‘ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنَّ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ . . . »

’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ’’گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا......‘‘[4]

اس حدیث میں بھی ’’نماز قائم کرنے‘‘ کا ذکر ہوا ہے نماز کے اقرار کرنے کا نہیں۔ آج کے اس دور میں نماز کے بارے میں نہایت سستی پائی جاتی ہے جو بہت خطرناک معاملہ ہے۔ نماز کے بارے میں سستی کا مظاہرہ کرنے والوں کو توبہ کرنی چاہیے اور خود کو جہنم سے بچانے کے لیے نماز کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نماز دین اسلام کا ایک ستون ہے۔ نماز بے حیائی، برائی اور گناہوں سے روکتی ہے۔

[1] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ماجاء فيمن ترك الصلاة، حديث : 1079، ومسند أحمد: 346/5. [2] المدّثر74:42,43. [3] التوبة 11:9. [4] صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاء كم إيمانكم، حديث: 8، و صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ودعائمه العظام، حديث: 16/ 17.

باب 16

کھانے پینے کے مسائل

کھانے کے احکام

خوراک جسم انسانی کی ایک اہم ضرورت ہے، اس خوراک کا اثر انسان کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اچھی اور پاک غذا انسان پر اچھے اثرات چھوڑتی ہے نکمی اور حرام غذا سے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو پاک صاف اشیاء کھانے کا حکم دیا ہے اور خبائث (حرام و نکمی اشیاء) سے منع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾

''اے لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں تم انھی میں سے کھاؤ (پیو۔)''[1]

نیز اللہ کا فرمان ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝﴾

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں دے رکھی ہیں کھاؤ (پیو) اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے ہو۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ''اے پیغمبرو! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''[3]

مزید فرمان الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

''آپ فرما دیجیے کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں (زینت) کو جنھیں اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟''[4]

- غذا (طعام) سے مراد وہ اشیاء ہیں جو کھانے پینے کے کام آتی ہیں۔
- کھانے والی اشیاء میں اصل ضابطہ چیز کا حلال ہونا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾

---

[1] البقرة 168:2. [2] البقرة 172:2. [3] المؤمنون 51:23. [4] الأعراف 32:7.

''(اللہ) وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔''[1]

اس آیت کے علاوہ کتاب وسنت میں بہت سی نصوص ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خوراک میں اصل ضابطہ ہر چیز کا حلال ہونا ہے الا یہ کہ جن اشیاء کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے خوراک کے لیے پاک صاف اشیاء کو حلال قرار دیا ہے تا کہ ان سے حاصل ہونے والی طاقت کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کرے نہ کہ معصیت کا ارتکاب کرے، چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾

''ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھا پی چکے ہوں۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ گناہ کے عادی شخص کے ساتھ، حلال خوراک مہیا کر کے، تعاون کرنا جائز نہیں، مثلاً: کوئی شخص کسی ایسے شخص کو گوشت اور روٹی دے جو اسے کھانے کے بعد شراب پیے اور بے حیائی کا ارتکاب بھی کرے۔ یاد رہے جس نے پاک صاف اشیاء کھائیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کیا تو وہ مذموم شخص ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝﴾ ''پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کا سوال ہوگا۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے پاک صاف اشیاء کو اس لیے مباح قرار دیا تا کہ لوگ ان سے استفادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾

''آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کچھ حلال ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ تمام پاک چیزیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں۔''[4]

▲ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی جو اشیاء حرام کی ہیں ان سے متعلق وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾

''حالانکہ اللہ نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتا دی ہے جن کو اس نے تم پر حرام کیا ہے مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جائے تو حلال ہیں۔''[5]

اگر کسی چیز کی حرمت بیان نہیں کی گئی تو وہ حلال ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

① البقرۃ 29:2. ② المآئدۃ 93:5. ③ التکاثر 8:102. ④ المآئدۃ 4:5. ⑤ الأنعام 119:6.

«إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا ، وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا ، وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا ، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا»

''اللہ تعالیٰ نے فرائض مقرر کیے ہیں انھیں ضائع مت کرو، کچھ اشیاء حرام قرار دی ہیں ان کا ارتکاب نہ کرو اور اس نے حدود متعین کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، کچھ اشیاء کے بارے میں بھولے بغیر خاموشی اختیار کی ہے، ان کے بارے میں تحقیق میں نہ پڑو۔''[1]

◢ کھانے، پینے اور پہننے کی جن اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے یا اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار نہیں دیا، انھیں حرام کہنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حرام کیا ہے وہ تفصیل سے بیان فرما دیا ہے، لہٰذا جو چیز حرام ہے اس کی حرمت کا ذکر ضرور (قرآن وحدیث میں) موجود ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جس چیز کے بارے میں اللہ نے صرفِ نظر کیا ہے اور اسے حرام قرار نہیں دیا، اسے حرام کہنا درست نہیں۔

◢ کھانے پینے کی اشیاء کے حلال اور حرام میں قاعدہ وضابطہ یہ ہے کہ وہ کھانا جو پاک صاف ہو اور اس میں ضرر نہ ہو تو وہ مباح ہے اور جو نجس ہو وہ حرام ہے، مثلاً: مردار، خون، لید، پیشاب، نشہ آور اشیاء، حشیش (بھنگ) اور گندی بدبودار اشیاء وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ﴾

''تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو......''[2]

مردار سے مراد وہ جانور ہے جس کی زندگی شرعی طریقے سے ذبح کیے بغیر ختم ہو جائے۔ اسے اس لیے حرام قرار دیا گیا کہ وہ خبیث خوراک ہے، لہٰذا اس کی تحریم شریعت کے محاسن میں شامل ہے، البتہ اگر کوئی شخص انتہائی طور پر مجبور ہو جائے کہ اس کی زندگی کی بقا کا مسئلہ ہو تو اس قدر کھا سکتا ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے۔

خون سے مراد ذبح کے وقت بہنے والا خون ہے۔ عہد جاہلیت میں اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑوں کو بھون کر کھا لیتے تھے۔ باقی رہا وہ خون جو ذبح کرنے کے بعد گوشت کے خلیوں میں یا رگوں میں باقی رہ جاتا ہے تو وہ مباح ہے حتی کہ گوشت پکڑتے وقت جو خون ہاتھ کو لگ گیا یا کپڑے سے صاف کرتے وقت جو خون لگ گیا وہ نجس (حرام) نہیں ہے۔

[1] السنن الكبرى للبيهقي : 12/10، و سنن الدارقطني: 183/4، حديث :4350 واللفظ له. [2] المآئدة 3:5.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صحیح بات یہ ہے کہ ذبح کے وقت تیزی سے بہنے والا خون حرام ہے اور جو خون گوشت کی رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ علماء کے نزدیک حرام نہیں ہے۔“[1]

▲ کھانے پینے کی وہ اشیاء بھی حلال نہیں جن میں ضرر اور نقصان کا پہلو ہو، مثلاً: زہر، شراب، حشیش، سگریٹ اور تمباکو وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ ”اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔“[2]

اس آیت کریمہ سے ہر وہ چیز حرام ثابت ہوتی ہے جس سے جسم یا عقل کو نقصان پہنچتا ہو۔

▲ حلال کھانے دو قسم کے ہیں: حیوانات اور نباتات، مثلاً: اناج، پھل وغیرہ جو چیز نقصان کا باعث نہیں وہ مباح ہے۔

حیوانات دو قسم کے ہیں:

① وہ حیوانات جو خشکی میں رہتے ہیں۔

② وہ حیوانات جو پانی میں رہتے ہیں۔

خشکی کے جانور مباح ہیں مگر ان کی کچھ اقسام ایسی ہیں جنھیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

① پالتو گدھا، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُّحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ وَأَذِنَ فِي لُحُومِ الْخَيْلِ»

”رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کے گوشت کھانے سے منع کر دیا اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کی اجازت دی۔“[3]

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس مسئلے میں اہل علم کے درمیان کسی زمانے میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔“

② خشکی کے جانوروں میں سے ان جانوروں کا گوشت بھی حرام ہے جو کچلی والے اور چیرنے پھاڑنے والے جانور ہیں، چنانچہ ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

---

① مجموع الفتاوی:21/522. ② البقرة 2:195. ③ صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث:4219، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب إباحة أكل لحم الخيل، حديث:1941 واللفظ له.

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ أَكْلِ كُلِّ ذِي نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ»

''رسول اللہ ﷺ نے کچلی والے درندوں کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔''[1]

البتہ لگڑ بھگڑ کا گوشت کھانا جائز ہے، چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِأَكْلِ الضَّبُعِ» ''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لگڑ بھگڑ کھانے کی رخصت دی ہے۔''[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کے جواز کو دلائل سے ثابت کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ''جو درندہ دو اوصاف کا حامل ہو وہ حرام ہے، یعنی اس کی کچلی ہو اور وہ حملہ آور درندوں میں شمار ہوتا ہو، جیسے شیر، بھیڑیا، تیندوا اور چیتا وغیرہ، لگڑ بھگڑ میں تو صرف ایک وصف اس کی کچلی کا ہونا ہے اس کا شمار تو حملہ آور درندوں میں ہوتا ہی نہیں۔ درندے کے حرام ہونے کی وجہ اس میں درندگی کی ایسی قوت کا ہونا ہے جو اسے کھانے والے کی طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہے، جس قسم کی خوراک کوئی کھائے گا ویسا ہی وہ اثر قبول کرے گا۔ درندگی کی جو تاثیر وقوت شیر، بھیڑیے، تیندوے اور چیتے میں ہوتی ہے وہ لگڑ بھگڑ میں نہیں پائی جاتی کہ جس کی وجہ سے دونوں قسم کے جانوروں میں برابری پائی جاتی ہو۔ لگڑ بھگڑ کو نہ لغت میں درندہ کہا گیا ہے نہ عرف میں۔''[3]

③ پرندے مباح ہیں مگر ایسے پرندے حرام ہیں جو پنجوں کے ساتھ شکار کرتے ہیں، مثلاً: عقاب، باز، شکرا وغیرہ، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ كُلِّ ذِي نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ، وَعَنْ كُلِّ ذِي مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ»

''رسول اللہ ﷺ نے کچلی والے درندوں اور پنجے سے پکڑ کر شکار کرنے والے پرندوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔''[4]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کے آثار تواتر کے ساتھ ملتے ہیں جو سب صحیح ہیں۔ اس کے بارے میں حضرت علی، ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی روایات معروف ہیں۔''[5]

---

① صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب أكل كل ذي ناب من السباع، حديث: 5530، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب تحريم أكل كل ذي ناب من السباع ...... ، حديث: 1932 واللفظ له. ② سنن أبي داود، الأطعمة، باب في أكل الضبع، حديث :3801، و جامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في الضبع يصيبها المحرم، حديث :851. ③ إعلام الموقعين : 120/2. ④ صحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب تحريم أكل كل ذي ناب من السباع ...... ، حديث: 1934. ⑤ إعلام الموقعين : 118/2.

④ جو پرندے مردار کھاتے ہیں ان کا گوشت کھانا بھی حرام ہے، مثلاً: باز، گدھ اور کوا کیونکہ یہ خبیث (گندی) غذا کھاتے ہیں۔

⑤ وہ حیوانات بھی حرام ہیں جو خبیث سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: سانپ، چوہا اور حشرات وغیرہ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سانپ اور بچھو کا کھانا حرام ہے۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔ جس شخص نے انھیں حلال سمجھتے ہوئے کھایا اسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ اگر کسی نے حرام سمجھتے ہوئے کھایا تو وہ فاسق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے والا ہے۔''[1]

⑥ کیڑے مکوڑوں کو کھانا حرام ہے کیونکہ ان کا شمار خبیث اشیاء میں ہوتا ہے۔

▲ ایسے حیوانات جو ایک حلال اور ایک حرام جانور کے ملاپ سے پیدا ہوں، ان کا کھانا بھی حرام ہے، مثلاً: خچر جو گھوڑی اور گدھے کے ملاپ کی پیداوار ہے۔ اس میں گدھے کی جانب کو ترجیح دیتے ہوئے اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

▲ بعض علماء نے خشکی کے حرام جانوروں کی چھ اقسام اجمالاً یوں بیان کی ہیں:

- وہ جانور جن کا نام لے کر حرام قرار دیا گیا ہو، مثلاً: پالتو گدھا۔
- وہ جانور جو وضع کردہ تعریف اور ضابطے میں داخل ہوں، مثلاً: وہ درندہ جس کی کچلی ہو یا وہ پرندہ جو پنجے سے شکار کرے اور کھائے۔
- جو جانور مردار کھاتے ہیں، مثلاً: گدھ اور کوا وغیرہ۔
- وہ جانور جو خبیث اور مکروہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: چوہا اور سانپ وغیرہ۔
- وہ جانور جو حلال اور حرام کے ملاپ سے پیدا ہوں، مثلاً: خچر۔
- وہ جانور جن کے بارے میں شارع علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ قتل کر دیا جائے، مثلاً: پانچ فاسق جانور سانپ، چوہا، (کاٹنے والا) کتا، بچھو، چیل یا ان کو قتل کرنے سے منع کیا ہے، مثلاً: ہدہد، ممولا اور مینڈک وغیرہ۔

▲ مذکورہ قسم کے حیوانات اور پرندوں کے سوا باقی سب حلال ہیں اصل اباحت کو دیکھتے ہوئے، مثلاً: گھوڑا، چوپائے، (گائے، اونٹ، بھیڑ، بکری) مرغی، جنگلی گدھا، ہرن، شتر مرغ اور خرگوش وغیرہ۔ ان سب کا گوشت پاک صاف اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے:

﴿قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَٰتُ﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ تمام چیزیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں۔''[2]

① مجموع الفتاوٰی: 609/11. ② المآئدۃ 4:5.

▲ اگر کسی بھیڑ، گائے اور اونٹ کی اکثر خوراک گندی اشیاء ہوں تو وہ بھی حلال جانوروں میں سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ان کا کھانا حرام ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت میں ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ أَكْلِ الْجَلَّالَةِ وَأَلْبَانِهَا»

''رسول اللہ ﷺ نے گندگی کھانے والے جانوروں کا گوشت کھانے اور ان کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی روایت یوں ہے:

«نَهٰى . . . عَنْ لُّحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ وَعَنِ الْجَلَّالَةِ عَنْ رُّكُوبِهَا وَأَكْلِ لَحْمِهَا»

''......آپ ﷺ نے پالتو گدھوں کے گوشت کھانے سے اور گندی اشیاء کھانے والے جانور پر سواری کرنے اور ان کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔''[2]

ایسے جانوروں میں خواہ چوپائے ہوں یا مرغی وغیرہ، نیز ان کا دودھ ہو یا انڈے، سب کچھ نجس ہے۔ ایسے جانور کو تین روز تک باندھ کر رکھا جائے اور صرف پاک صاف خوراک کھلائی جائے، پھر ان کا گوشت یا انڈے کھائے جائیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ جب کوئی جانور نجس چارہ کھاتا ہو تو اسے باندھ کر پاک صاف چارہ کھلایا جائے، تب اس کا دودھ اور گوشت حلال ہوگا۔ اسی طرح وہ کھیت یا پھلوں کے درخت جنھیں گندا پانی دیا جاتا ہو پاک صاف پانی دیا جائے تب ان کا کھانا حلال ہوگا کیونکہ خبیث شے پاک چیز پر اثرات چھوڑتی ہے۔''[3]

▲ پیاز، لہسن وغیرہ اشیاء جن کی بو ناپسندیدہ ہوتی ہے ان کا کھانا مکروہ ہے بالخصوص جب مسجد میں آنا ہو تو ان اشیاء سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا»

''جس شخص نے اس پودے (پیاز، لہسن وغیرہ) سے کچھ کھایا وہ مسجد میں نہ آئے۔''[4]

---

① سنن أبي داود، الأطعمة، باب النهي عن أكل الجلّالة وألبانها، حديث: 3785. ② سنن أبي داود، الأطعمة، باب في أكل لحوم الحمر الأهلية، حديث: 3811. ③ إعلام الموقعين: 15/2. ④ صحيح البخاري، الأذان، باب ما جاء في الثوم النيء والبصل والكراث، حديث: 853، وصحيح مسلم، الصلاة، باب نهي من اكل ثوماً أوبصلاً......، حديث: 564,561. البتہ صحیح بخاری میں [مُصَلَّانَا] کے بجائے [مَسْجِدَنَا] ہے۔

▲ جس شخص کو اپنی جان کا خطرہ ہو وہ اس اضطراری حالت میں اپنی زندگی بچانے کے لیے حرام شے کھا سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾

''پھر جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو، اس پر ان کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔''[1]

اسی طرح جب کوئی شخص جان بچانے کے لیے دوسرے کا کھانا کھانے پر مجبور ہو اور کھانے کا مالک اس کیفیت میں نہ ہو تو مالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے اتنی خوراک قیمتاً دے دے جس سے اس کی زندگی بچ جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر مجبور آدمی فقیر ہو تو اس پر کھانے کا معاوضہ لازم نہیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا اور ننگے کو کپڑے پہنانا فرض کفایہ ہے، جب بھوکے کو کوئی نہ کھلائے یا ننگے کو کوئی نہ پہنائے تو معین افراد پر یہ فرض عین بن جاتا ہے۔''[2]

▲ کسی مسلمان کے پاس ایک سے زائد اشیاء موجود ہوں جن کے استعمال کی اسے فی الحال ضرورت نہیں جبکہ اس کے دوسرے مسلمان بھائی کو اس کے استعمال کی شدید ضرورت ہے، نیز شے کے استعمال کرنے سے اس میں کوئی کمی یا فرق بھی نہ آتا ہو تو مالک کو چاہیے کہ اپنے بھائی کو بلاعوض اس کے استعمال کی اجازت دے دے، مثلاً: سردی سے بچنے کے لیے کسی کو عارضی طور پر چادر یا کمبل وغیرہ دینا، یا کنویں کا پانی نکالنے کے لیے رسی یا ڈول مہیا کرنا یا کھانا پکانے کے لیے کوئی برتن دینا۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ عند اللہ قابل مذمت ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝﴾ ''اور (لوگوں کو) استعمال کی معمولی چیزیں بھی دینے سے انکار کرتے ہیں۔''[3]

سیدنا ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ''ماعون وہ اشیاء ہیں جنھیں لوگ عموماً ایک دوسرے سے استعمال کے لیے مانگ لیتے ہیں، مثلاً: کلہاڑی، ہنڈیا، ڈول وغیرہ۔''[4]

▲ اگر کسی شخص کا پھلوں کے باغ کے قریب سے گزر ہو تو وہ درخت پر لگا ہوا یا گرا ہوا پھل مفت کھا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں سیدنا ابن عباس اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما کی روایات موجود ہیں۔ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ پھل کسی چار دیواری میں نہ ہو یا اس پر کسی کا پہرہ نہ ہو یا وہ درخت پر چڑھا نہ ہو یا درخت کو پتھر مار کر پھل حاصل نہ کیا ہو اور اپنے ساتھ اٹھا کر نہ لے جانے والا ہو اور نہ اس نے جمع شدہ پھل سے اٹھایا ہو الا یہ کہ انتہائی مجبوری کی حالت

[1] البقرة 2: 173. [2] الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، الأطعمة: 548/5. [3] الماعون 7:107. [4] تفسير الطبري، تفسير سورة الماعون، وتفسير ابن كثير، الماعون 7:107.

میں ایسا کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس کی شرعاً اجازت ہے۔

مسلمان پر اجنبی مسلمان کی ایک دن رات کی مہمانی کرنا واجب ہے بشرطیکہ شہر سے دور کسی گاؤں یا بستی سے اس کا گزر ہو۔ اگر شہر ہو تو مہمانی واجب نہیں کیونکہ وہاں ہوٹل وغیرہ عام ہوتے ہیں بخلاف گاؤں کے کہ وہاں ہوٹل وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوتا۔

① مذکورہ حالت میں ضیافت کے وجوب کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ، قَالُوا: وَمَا جَائِزَتُهُ يَارَسُولَ اللهِ! قَالَ: يَوْمُهُ وَلَيْلَتُهُ»

”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی مہمانی ایک دن رات کے عطیہ کے ساتھ کرے۔ انھوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے آپ ﷺ سے پوچھا اے اللہ کے رسول! مہمان کا عطیہ کتنا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دن رات۔“[1]

یہ حدیث مہمان کی مہمان نوازی کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ: [مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ......] ہیں۔ اور ایمان باللہ کو مہمان نوازی سے مشروط کرنا اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ صحیحین میں روایت ہے:

«إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَأَمَرُوا لَكُمْ لِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ فَاقْبَلُوا، فَإِنْ لَّمْ يَفْعَلُوا، فَخُذُوا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ»

”اگر تم کسی قوم کے ہاں ٹھہرو تو جو مناسب چیزیں تمھیں مہمانی کے لیے دیں اسے قبول کرو اور اگر ایسا نہ کریں تو ان سے خود ہی مہمانی کا حق لے لو۔“[2]

اس کے بارے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ واقعہ مشہور ہے جس میں ہے کہ آپ نے اپنے مہمانوں کی خدمت میں بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا۔ یہ واقعہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ضیافت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں سے ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مہمان کی خدمت میں اس کی ضرورت سے بڑھ کر شے پیش کی جانی چاہیے۔ یہ سب کچھ دین ابراہیم علیہ السلام کی اعلیٰ خوبیوں میں سے ایک خوبی تھی اور یہ عمل مکارم اخلاق میں شامل ہے۔

---

① صحيح البخاري، الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذجاره، حديث: 6019، وصحيح مسلم، اللقطة، باب الضيافة ونحوها، حديث: 48 بعد حديث: 1726 واللفظ له. ② صحيح البخاري، المظالم، باب قصاص المظلوم إذا وجد مال ظالمه، حديث: 2461، وصحيح مسلم، اللقطة، باب الضيافة ونحوها، حديث: 1727 واللفظ له.

ہمارے دین اسلام نے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ اس کی مزید تاکید فرمائی ہے اور اس کے بارے میں رغبت دلائی ہے۔ دین اسلام نے دس حقوق کا ذکر کرتے ہوئے مسافر کا بھی یہ حق بتایا کہ اس کی مہمان نوازی کی جائے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾

''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرو اور رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار ہمسائے، اجنبی ہمسائے اور پہلو کے ساتھی سے اور مسافر سے (بھی نیکی کرو)۔''[1]

نیز ارشاد ہے:

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ﴾

''لہٰذا آپ قرابت دار، مسکین اور مسافر ہر ایک کو اس کا حق دیجیے۔''[2]

مزید برآں زکاۃ کے جو آٹھ مصارف سورۂ توبہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں مسافر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں ایسا کامل دین اور حکمتوں سے بھرپور شریعت عطا فرمائی جو سراسر رحمت و رأفت ہے۔

ذبح کے احکام

خشکی میں رہنے والے جانور کے حلال ہونے کی یہ شرط ہے کہ اسے شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہو ورنہ مردار متصور ہوگا جو حرام ہے۔ بنابریں ہر مسلمان کے لیے ذبح کے شرعی احکام سے معرفت ضروری ہے۔

فقہائے کرام نے کہا ہے کہ جانور کا ذبح کرنا یا اسے نحر کرنا یہ ہے کہ اس کی شہ رگ اور کھانے کی نالی کاٹ کر خون بہایا جائے۔ اگر جانور بے قابو ہو تو اسے زخمی کر دیا جائے۔

ذکاۃ کے لغوی معنی ہیں ''کسی شے کو مکمل کرنا۔'' کیونکہ حیوان کو ذبح کرنے کا مطلب اس کا خون اچھی طرح بہا دینا ہے (حتی کہ اس کی روح نکل جائے) اس لیے اس عمل پر ذکاۃ، یعنی ذبح کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] النسآء 4:36. [2] الروم 30:38.

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ﴾

''تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو کسی ضرب سے مر گیا ہو اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو اور جو کسی کے سینگ مارنے سے مرا ہو اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو لیکن اگر اسے تم ذبح کر ڈالو تو حرام نہیں۔''[1]

یعنی جسے تم زندہ پالو پھر اسے ذبح کر کے اس کا مکمل خون بہادو۔ بعد میں یہ لفظ عام ذبح کے لیے استعمال ہونے لگا، اس کو پہلے سے کوئی چوٹ لگی ہو یا نہ لگی ہو۔

◣ جانور کو ذبح کرنا ضروری (واجب) ہے ورنہ اس کے بغیر اس جانور کا گوشت کھانا حلال نہ ہوگا کیونکہ غیر مذبوح جانور مردار متصور ہوتا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ مردار کا کھانا حرام ہے الّا یہ کہ کوئی اضطراری صورت ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ ، البتہ مچھلی، ٹڈی دل اور ہر وہ جانور جو پانی ہی میں زندگی گزارتا ہے ان کو ذبح کیے بغیر ہی کھانا جائز ہے کیونکہ پانی (سمندر) کا مرا ہوا بھی حلال قرار دیا گیا جیسا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوتُ وَالْجَرَادُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ»

''ہمارے لیے دو قسم کے مردار اور دو قسم کے خون حلال ہیں، دو مردار: مچھلی اور ٹڈی دل ہیں اور دو خون: جگر اور تلی ہیں۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے بارے میں فرمایا:

«هُوَ الطَّهُورُ مَاءُهُ، الْحِلُّ مَيْتَتُهُ» ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔''[3]

◣ ذبح کی چار شرائط ہیں جو درج ذیل ہیں:

① ذبح کرنے والا عاقل اور مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو، لہٰذا مجنون، نشے میں مدہوش اور چھوٹے غیر ممیّز بچے کا ذبح کردہ جانور حلال نہ ہوگا کیونکہ ان افراد میں عدم عقل کی وجہ سے ذبح کی نیت اور قصد نہیں ہوتا...... اسی طرح کافر، بت پرست، مجوسی یا مرتد کا ذبح کردہ جانور حلال نہیں۔ علاوہ ازیں قبر پرست لوگ جو مردوں سے مدد مانگتے

---

① المآئدة 5:3. ② سنن ابن ماجه، الأطعمة، باب الكبد و الطحال، حديث: 3314، ومسند أحمد: 97/2. ③ سنن أبي داود، الطهارة، باب الوضوء بماء البحر، حديث: 83، ومسند أحمد: 361/2.

ہیں اور قبروں پر نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، ان کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حلال نہیں کیونکہ یہ لوگ شرک کے مرتکب ہیں جو قبر پرست مشرک امت محمدیہ میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی اہل کتاب کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ (ع۔و) لیکن کتابی کافر، یعنی یہودی یا نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ ''اور اہل کتاب کا کھانا (ذبیحہ) تمھارے لیے حلال ہے۔''[1]

اس پر اہل اسلام کا اجماع ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: طَعَامُهُمْ سے مراد ان کے ''ذبیحے'' ہیں۔[2]

آیت کریمہ سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ غیر کتابی کافر کا ذبیحہ حلال نہیں ہے، اس مسئلے پر اجماع ہے۔

کتابی کافر کا ذبیحہ حلال اور دیگر کفار کا ذبیحہ حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کا عقیدہ ہے کہ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہے، نیز وہ مردار کو بھی حرام سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے انبیائے کرام کی یہی تعلیم تھی دیگر کفار بتوں کے نام پر ذبح کرتے ہیں اور مردار کو بھی حلال قرار دیتے ہیں۔

② کارآمد آلے کا ہونا۔ ذبح ہر اس آلے سے درست ہے جس کی دھار سے خون بہہ جائے، خواہ وہ لوہے کا ہو یا پتھر یا کسی اور دھات سے بنا ہو ما سوائے دانت اور ناخن کے کہ ان سے ذبح کرنا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا أَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ فَكُلْ ، لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ»

''جو شے جانور کا خون بہا دے اور اس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو تو وہ (ذبح شدہ جانور) کھا لو، البتہ وہ شے دانت اور ناخن نہ ہو۔''[3]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہڈی سے ذبح کرنا، اس لیے ممنوع ہے کہ یا تو وہ نجس ہے یا ذبح کرنے سے مومن جنوں کے لیے نجس ہو جاتی ہے۔''[4]

مکمل حدیث اس طرح ہے:

«أَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ، وَأَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَى الْحَبَشَةِ»

''(میں تمھیں ان دونوں سے متعلق بیان کرتا ہوں) دانت تو ہڈی ہے اور ناخن (کافر) حبشیوں کی چھری ہے۔''[5]

① المآئدة 5:5. ② صحيح البخاري، الذبائح و الصيد، باب ذبائح أهل الكتاب......، قبل حديث:5508. ③ صحيح البخاري، الجهاد، باب ما يكره من ذبح الإبل و الغنم في المغانم، حديث:3075. ④ إعلام الموقعين:4/142،143. ⑤ صحيح البخاري، الجهاد، باب ما يكره من ذبح الإبل و الغنم في المغانم، حديث:3075.

لہٰذا دونوں سے ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

③ حلق اور شہ رگ کا کاٹنا، یعنی جانور کے حلق کی رگوں کو کاٹ دینے سے ذبح کا حکم مکمل ہو جاتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کھانے کی نالی، حلق اور دونوں رگ جان کاٹی جائیں، چار اشیاء میں سے تین کے کاٹنے سے بھی جانور حلال ہوگا، ان تین اشیاء میں حلق شامل ہو یا نہ ہو، حلق کے سوا رگ جان کا کاٹنا زیادہ بہتر ہے اور اس سے خون زیادہ اچھی طرح بہہ جاتا ہے۔''

اونٹ میں مسنون طریقہ ''نحر'' ہے کہ اس کی گردن اور سینے کے درمیان تیز دھار نیزہ یا برچھی ماری جائے جبکہ دوسرے جانوروں کو ذبح کرنا ہی صحیح ہے۔ جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے مذکورہ مقام کا تعین اس وجہ سے ہے کہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں جسم کی تمام رگیں جمع ہوتی ہیں، ان کے کٹ جانے سے تمام جسم کا خون جلدی اور آسانی سے نکل آتا ہے۔ جانور کو جان نکلتے وقت زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی، لہٰذا اس کا سارا گوشت بہتر اور عمدہ ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ» ''جب جانور کو ذبح کرو تو اچھا طریقہ اختیار کرو۔''[2]

اگر مذکورہ مقام سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو سکے، مثلاً: شکار ہو یا اونٹ ہاتھوں سے نکل گیا ہو یا کوئی جانور کنویں میں گر گیا تو اس کے بدن کے کسی بھی حصے پر زخم لگا کر خون بہا دیا جائے تو وہ ذبیحہ شمار ہوگا جس کا کھانا حلال ہے۔

سیدنا رافع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ اونٹ بھاگ گیا۔ ایک آدمی نے اسے تیر مار کر زخمی کر دیا جس سے وہ رک گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَمَا نَدَّ عَلَيْكُمْ فَاصْنَعُوا بِهِ هٰكَذَا» ''جو جانور بھی تم پر غالب آ جائے تو اس کے ساتھ ایسا ہی کرو۔''[3]

ایسی ہی روایت حضرت علی، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔

کسی جانور کا گلا گھونٹ دیا جائے یا اسے لاٹھی ماری جائے یا بلندی سے گر جائے یا کسی دوسرے جانور نے اسے ٹکر ماری ہو یا اس کے بدن کا ایک حصہ درندہ کاٹ کر کھا گیا ہو اگر وہ زندہ ہونے کی حالت میں پا لیا گیا اور اسے ذبح کیا گیا تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ

① إعلام الموقعين : 4/143,142. ② صحيح مسلم، الصيد، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل وتحديد الشفرة، حديث: 1955. ③ صحيح البخاري، الجهاد، باب ما يكره من ذبح الإبل والغنم في المغانم، حديث: 3075، وصحيح مسلم، الأضاحي، باب جواز الذبح بكل ما أنهر الدم ...... ، حديث: 1968.

﴿ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ﴾

''تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو کسی ضرب سے مر گیا ہو اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو اور جو کسی کے سینگ مارنے سے مرا ہو اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو مگر جسے تم ذبح کر ڈالو (تو حرام نہیں۔)''[1]

④ ذبح کرنے والا بوقت ذبح بسم اللہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ﴾

''اور تم ایسے جانوروں کا گوشت مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو کیونکہ یہ (کھانا) یقیناً نافرمانی ہے۔''[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام ذبیحے کو طیب بنا دیتا ہے، ذبح کرنے والے اور ذبیحہ دونوں کے درمیان سے شیطان کو دور کر دیتا ہے ورنہ ذبح کرنے والے اور ذبیحہ کے درمیان شیطان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ وہ حیوان میں خبث کے اثرات ڈالتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ جب جانور کو ذبح کرتے تو ساتھ بسم اللہ بھی پڑھتے۔ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھی گئی تو وہ حلال نہیں، اگرچہ ذبح کرنے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔''[3]

▲ تسمیہ کے ساتھ تکبیر ''اللہ اکبر'' کہنا بھی مسنون ہے۔

ذبح کرنے کے درج ذیل آداب ہیں:

① کند آلے سے ذبح کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ نہایت تیز ہو تاکہ جانور کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ»

''تم میں ہر ایک کو چاہیے کہ (جانور کو ذبح کرتے وقت) چھری تیز رکھے اور ذبیحے کو تکلیف نہ دے۔''[4]

② ذبح کرنے کا آلہ چھری وغیرہ جانور کی آنکھوں کے سامنے تیز کرنا مکروہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

---

① المآئدة 3:5. ② الأنعام 121:6.

③ إعلام الموقعين: 152/2. اگر بھول چوک سے بسم اللہ نہ پڑھی جا سکی تو جانور حلال ہوگا کیونکہ حدیث میں ہے: [إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ] ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری امت کی خطا، بھول چوک اور جو کام کسی سے زبردستی اور مجبور کر کے کرایا جائے اسے معاف کر دیا ہے۔'' دیکھیے سنن ابن ماجه، حدیث: 2043.

④ صحيح مسلم، الصيد، باب الأمر بإحسان الذبح والقتل و تحديد الشفرة، حديث: 1955.

«أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِحَدِّ الشِّفَارِ وَأَنْ تُوَارٰى عَنِ الْبَهَائِمِ»

''رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ چھری کو تیز کیا جائے اور اسے جانوروں سے چھپا کر رکھا جائے۔''[1]

③ یہ امر بھی مکروہ ہے کہ جانور کا رخ قبلہ کی جانب نہ ہو۔

④ جانور کے ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی اس کی گردن (منکا) توڑنا یا کھال اتارنا مکروہ ہے۔

مسنون یہ ہے کہ اونٹ کو نحر کے وقت کھڑا کیا جائے اس کا اگلا بایاں پاؤں باندھ دیا جائے۔ گائے یا بکری کو بائیں جانب لٹا کر ذبح کیا جائے۔

شکار کے احکام

صَید (شکار کرنا) کا مطلب ہے حلال جانور کو شکار کرنا جو طبعی طور پر انسان سے مانوس نہیں ہوتا اور پکڑا نہیں جاتا۔ ایسے جانور کو بھی صَید یعنی شکار کہتے ہیں۔

اگر شکار انسانی ضرورت کے پیش نظر ہو تو بلا کراہت جائز ہے اور اگر ضرورت کے بجائے محض کھیل اور شغل کی خاطر ہو تو مکروہ ہے اور اگر شکار کے سبب لوگوں کے کھیتوں، فصلوں اور اموال کا نقصان ہو تو حرام ہے۔

مذکورہ پہلی صورت میں شکار کرنے کے جواز میں دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ ''ہاں! جب تم احرام اتار ڈالو تو شکار کھیل سکتے ہو۔''[2]

اور ارشاد ہے:

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾

''اور ان شکاری جانوروں کا کیا ہوا شکار (حلال ہے) جنھیں تم سدھا لیتے ہو، اللہ نے تمھیں جو سکھایا ہے اس کے مطابق تم انھیں سکھاتے ہو، چنانچہ وہ جس شکار کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں، اس پر اللہ کا نام پڑھو اور اس میں سے کھالو۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

① سنن ابن ماجه، الذبائح، باب إذا ذبحتم فأحسنوا الذبح، حديث: 3172، ومسند أحمد : 108/2. ② المآئدة 2:5. ③ المآئدة 4:5.

«إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ وَذَكَرْتَ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ فَكُلْ»

''اگر تم ''بسم اللہ'' پڑھ کر اپنا تربیت یافتہ کتا شکار پر چھوڑو تو اس کا کیا ہوا شکار کھا لو۔''[1]

◄ جب شکاری کے پاس کتے وغیرہ کے ذریعے سے شکار پہنچتا ہے تو اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں:

① جب شکار ہاتھ میں آیا تو وہ صحیح سلامت اور زندہ تھا۔ اسے شرعی طریقے سے ذبح کیا جائے گا۔ محض شکار کرنا کافی نہ ہوگا۔

② اگر شکار کرنے سے جانور مر گیا یا اس میں زندگی کی معمولی سی علامات باقی موجود ہوں تو ایسی صورت میں وہ حلال ہوگا بشرطیکہ اس میں درج ذیل شرائط ہوں:

◄ شکار کرنے والا شخص ذبح کرنے کا اہل ہو کیونکہ شکار کرنے والا ذبح کرنے والے شخص کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اہلیت کا ہونا ضروری ہے، یعنی وہ عاقل، مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہو، لہٰذا مجنون اور نشہ میں غرق آدمی کا شکار جائز نہ ہوگا کیونکہ ان میں عقل نہیں، جیسا کہ ان کا ذبح حلال نہیں۔

◄ آلہ کا ہونا، آلہ دو قسم کا ہو سکتا ہے: تیز دھار ہو جو خون بہا دے جس طرح کہ ذبح کرنے کے لیے یہ شرط ہے، البتہ ہڈی اور ناخن نہ ہو۔ شکار کرنے کا آلہ شکار کو چوڑائی کی جانب سے لگنے کے بجائے دھار یا نوک والی جانب سے لگے اور شکار کو زخمی کر دے۔ اگر شکار کے لیے آلہ نوک یا دھار والا نہیں ہے، مثلاً: پتھر، لاٹھی، جال، لوہے کا ٹکڑا وغیرہ ہو تو شکار کے مر جانے کی صورت میں حلال نہ ہوگا، البتہ بندوق سے چھوڑی ہوئی گولی کے ذریعے سے شکار جائز ہے کیونکہ اس کے لگنے میں اس قدر قوت اور تیزی ہوتی ہے کہ وہ جانور کو تیز دھار آلے سے بڑھ کر پھاڑ دیتی ہے اور خون بہا دیتی ہے۔

شکار کرنے والے جانور یا پرندے، جن کے ذریعے سے شکار کیا جاتا ہے اور انھیں شکار کرنے کی باقاعدہ تربیت دی گئی ہو تو ان کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے اگرچہ وہ مر بھی جائے۔ خواہ وہ جانور کچلی سے شکار کرنے والا ہو، جیسے کتا یا پنجے سے شکار کرنے والا ہو، جیسے باز۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ ۖ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ﴾

''اور ان شکاری جانوروں کا کیا ہوا شکار (حلال ہے) جنھیں تم سدھا لیتے ہو۔ اور اللہ نے تمھیں جو سکھایا

[1] صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب إذا أكل الكلب ......، حديث: 5483، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الصيد بالكلاب المعلمة والرمي، حديث: 1929 واللفظ له.

ہے اس کے مطابق تم انھیں سکھاتے ہو، چنانچہ وہ جس شکار کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں، اس پر اللہ کا نام پڑھو اور اس میں سے کھالو۔''[1]

شکاری جانور کی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ اسے شکار پکڑنے کے آداب سکھائے جائیں، جب اسے شکار کے پیچھے چھوڑا جائے تو وہ اس کے پیچھے بھاگ پڑے اور جب اسے شکار پر ابھارا جائے تو وہ اس کا پیچھا کرے اور جب وہ شکار پکڑ لے تو اپنے مالک کے پاس لے آئے خود نہ کھائے۔

③ جانور پر آلہ (تیر، گولی وغیرہ) شکار کی نیت سے چھوڑا جائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ وَذَكَرْتَ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ فَكُلْ»

''اگر تم ''بسم اللہ'' پڑھ کر اپنا تربیت یافتہ کتا شکار پر چھوڑو تو اس کا کیا ہوا شکار کھالو۔''[2]

معلوم ہوا کہ جانور کو چھوڑنا ذبح کے قائم مقام ہے، لہٰذا اس میں نیت ضروری ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ سے آلہ گر گیا یا بلا قصد بندوق سے گولی نکل گئی جس سے جانور مر گیا تو وہ حلال نہ ہوگا کیونکہ اس میں نیت شامل نہ تھی۔ اسی طرح اگر کتے نے خود ہی بھاگ کر شکار پکڑا جو مر گیا تو وہ حلال نہ ہوگا کیونکہ مالک نے شکار کی نیت سے نہ خود کتے کو چھوڑا اور نہ ''بسم اللہ'' پڑھی۔

(اگر کسی نے بہت سے جانور دیکھے اور) ایک جانور کو نشانہ بنا کر گولی چلا دی جس سے مقررہ جانور کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جانور مارے گئے تو سبھی حلال ہوں گے کیونکہ اس میں شکار کی نیت تھی۔

④ تیر، گولی یا شکاری جانور چھوڑتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾

''اور تم ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔''[3]

اور ارشاد ہے:

﴿فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾

''جس شکار کو وہ تمھارے لیے پکڑ کر روک رکھیں، اس پر اللہ کا نام پڑھو اور اس میں سے کھالو۔''[4]

نبی ﷺ نے فرمایا:

① المآئدة 4:5. ② صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب إذا أكل الكلب ......، حديث:5483، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الصيد بالكلاب المعلمة والرمي، حديث:1929 واللفظ له. ③ الأنعام 121:6. ④ المآئدة 4:5.

«إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ وَذَكَرْتَ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ فَكُلْ»

''اگر تم ''بسم اللہ'' پڑھ کر اپنا تربیت یافتہ کتا شکار پر چھوڑ دو تو اس کا کیا ہوا شکار کھا لو۔''①

آیات و احادیث سے یہ مفہوم بھی مترشح ہوتا ہے کہ ''بسم اللہ'' نہ پڑھنے سے شکار حلال نہ ہوگا۔

مسنون یہ ہے کہ ''بسم اللہ'' کے ساتھ ''اللہ اکبر'' کہا جائے جیسا کہ جانور ذبح کرتے وقت کہا جاتا ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

''جب آپ ﷺ جانور ذبح کرتے تو بِسمِ اللهِ وَاللهُ أَكبَرُ کہتے تھے۔''②

▲ کچھ صورتیں ایسی ہیں جن میں شکار کرنا حرام ہو جاتا ہے جو درج ذیل ہیں:

① احرام باندھنے والے شخص پر حرام ہے کہ وہ خشکی کے کسی جانور کو قتل کرے یا اس کو پکڑے یا شکار کی طرف اشارہ کرے یا راہنمائی کے ذریعے سے تعاون کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ﴾

''اے ایمان والو! (وحشی) شکار کو قتل مت کرو جب تک کہ تم حالت احرام میں ہو۔''③

② اگر محرم نے خود شکار کیا ہو یا شکار کرنے میں کسی سے تعاون کیا ہو تو اس کے لیے اس کا کھانا حرام ہے۔ اسی طرح وہ محرم بھی نہ کھائے جس کی خاطر شکار کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ ٱلْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ﴾

''اور خشکی کا شکار پکڑنا تمھارے لیے حرام کیا گیا ہے جب تک تم حالت احرام میں رہو۔''④

③ اسی طرح حرم میں شکار کرنا بالاجماع حرام ہے، خواہ محرم ہو یا عام آدمی، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، . . . لَا يُعْضَدُ شَوْكُهُ وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهُ . . . وَلَا يُخْتَلٰى خَلَاهُ»

''بے شک اس شہر کو اللہ نے اس دن سے حرمت والا بنایا ہے جس دن سے آسمان و زمین بنائے ہیں اور

① صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب إذا أكل الكلب ......، حديث:5483، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الصيد بالكلاب المعلّمة والرمي، حديث:1929 واللفظ له. ② السنن الكبرٰى للبيهقي: 9/285 مزید دیکھیے صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب التسمية على الذبيحة ومن ترك متعمدًا، حديث:5498، و صحيح مسلم، الأضاحي، باب استحباب استحسان الضحية......، حديث:1966. ③ المآئدة5:95. ④ المآئدة5:96.

اس کی یہ حرمت اللہ کے حرمت عطا کرنے کی وجہ سے ہے جو قیامت تک رہے گی......نہ اس کے کانٹے دار درخت کاٹے جائیں، نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے......اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے۔"[1]

◣ بلا وجہ کتا رکھنا حرام ہے الا یہ کہ جس صورت میں رسول اللہ ﷺ نے رخصت دی ہو اور وہ تین امور ہیں: ① شکار کے لیے ہو ② جانوروں کی نگرانی کے لیے ہو ③ یا کھیتوں کی حفاظت کی خاطر ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ أَوْ صَيْدٍ أَوْ زَرْعٍ، انْتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ»

"جس شخص نے ریوڑ، شکار اور کھیت کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے کتا رکھا اس کا اجر روزانہ ایک قیراط کم ہوگا۔"[2]

بعض لوگ اس وعید کی پروا نہیں کرتے اور مذکورہ تین اغراض کے بغیر ہی محض فخر اور کفار کی تقلید کی خاطر کتے رکھتے اور پالتے ہیں۔ اس بات کا قطعاً کوئی خیال نہیں ہوتا کہ فرمان نبوی ﷺ کے مطابق ان کا اجر دن بدن کم ہو رہا ہے، حالانکہ اگر اسے دنیا کے مال میں سے کوئی معمولی سا نقصان ہو تو اسے برداشت نہیں کرتا۔

نبی ﷺ نے خبر دی ہے:

«لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَّلَا صُورَةٌ»

"فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو۔"[3]

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے رب سے ڈرے اور گناہ کا ارتکاب کر کے خود پر ظلم نہ کرے اور خود کو ایسے کام سے بچائے جو اجر کی کمی کا باعث ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ.

---

① صحيح البخاري، الجزية، باب إثم الغادر للبر والفاجر، حديث: 3189، وصحيح مسلم، الحج، باب تحريم مكة و تحريم صيدها ...... ، حديث: 1353. ② صحيح البخاري، الحرث والمزارعة، باب اقتناء الكلب للحرث، حديث: 2323,2322، وصحيح مسلم، المساقاة، باب الأمر بقتل الكلاب و بيان نسخه ...... ، حديث: (58)-1575 واللفظ له. ③ صحيح البخاري، بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب في شراب أحد كم فليغمسه ...... ، حديث: 3322.

باب 17

قسم کھانے اور نذر ماننے کے مسائل

قسم کے احکام

قسم کو عربی میں یمین بھی کہتے ہیں جس کی جمع أیمان آتی ہے۔ قسم کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ مخصوص طریقے سے کسی کام یا حکم کو مؤکد بنانا۔ قسم کو یمین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ لغت عرب میں دائیں ہاتھ کو یمین کہا جاتا ہے۔ جب دو قسم اٹھانے والے قسم اٹھائیں تو وہ اپنے داہنے ہاتھ کو اپنے ساتھی کے داہنے ہاتھ پر مارتے ہیں، جیسے عہد و پیمان میں ہوتا ہے۔

جس قسم میں کفارہ لازم آتا ہے وہ ایسی قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام یا اس کی کسی صفت کا ذکر کر کے اٹھائی گئی ہو، مثلاً: کوئی کہے: اللہ تعالیٰ کی قسم، یا اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، جلال، عزت، رحمت یا قرآن کی قسم۔

غیر اللہ کی قسم حرام اور شرک ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ أَوْ لِيَصْمُتْ»

''جو شخص قسم اٹھانا چاہتا ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائے یا چپ رہے۔''[1]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ»

''جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا۔''[2]

اور فرمان نبوی ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِالْأَمَانَةِ فَلَيْسَ مِنَّا» ''جس نے امانت کی قسم اٹھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''[3]

ان مذکورہ روایات سے ثابت ہوا کہ غیر اللہ کی قسم اٹھانا حرام اور شرک ہے، مثلاً: کوئی کہے: نبی کی قسم، تیری زندگی کی قسم، کعبہ کی قسم، بچوں کی قسم وغیرہ۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلے میں علمائے امت کا اجماع ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، الشهادات، باب كيف يُستحلف؟ حديث: 2679، وصحيح مسلم، الأيمان، باب النهي عن الحلف بغير الله تعالى، حديث: 1646. [2] جامع الترمذي، النذور والأيمان، باب ما جاء في أن من حلف بغير الله فقد أشرك، حديث: 1535، وسنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب كراهية الحلف بالآباء، حديث: 3251. [3] سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب كراهية الحلف بالأمانة، حديث: 3253.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غیر اللہ کی قسم اٹھانا شرک (حرام) ہے۔سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم اٹھالوں تو یہ غیر اللہ کے نام کی سچی قسم سے بہتر ہے۔''[1]

شیخ موصوف فرماتے ہیں: ''سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے کلام کا یہ مطلب ہے کہ توحید کی نیکی سچ بولنے کی نیکی سے بڑھ کر ہے جیسا کہ جھوٹ بولنے کا گناہ شرک کے گناہ سے نہایت کم ہے۔''[2]

▲ جو شخص اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر توڑ دے تو اس پر کفارہ دینا لازم آ جاتا ہے، بشرطیکہ اس میں درج ذیل تین شرائط موجود ہوں:

① قسم کا انعقاد ہو، یعنی آدمی ایسے کام پر ارادے کے ساتھ قسم اٹھائے جس کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہو، نیز وہ ممکن بھی ہو۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾

''اللہ تمھاری لغو قسموں پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرماتا لیکن مؤاخذہ ان قسموں پر فرماتا ہے جو تم نے مضبوط باندھ لیں۔''[3]

قسم کا انعقاد تبھی ہوتا ہے جب کام کا تعلق زمانہ مستقبل کے ساتھ ہو نہ کہ زمانہ ماضی سے کیونکہ زمانہ ماضی سے تعلق رکھنے والے کام میں قسم پوری کرنا یا توڑنا ممکن نہیں، البتہ اگر کسی نے جان بوجھ کر زمانہ ماضی کے کسی کام پر جھوٹی قسم اٹھائی تو وہ ''یمین غموس'' ہے۔واضح رہے غموس کے معنی ''غوطہ لگانے'' کے ہیں کیونکہ ایسا شخص گناہ (کے سمندر) میں اور پھر جہنم میں غوطہ لگاتا ہے۔اس قسم میں کفارہ نہیں ہے کیونکہ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ کفارے سے معاف نہیں ہوتا، نیز یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

اگر نیت کیے بغیر قسم کے الفاظ زبان پر آ گئے، مثلاً: کسی کا تکیہ کلام ہو''ہاں! اللہ کی قسم۔'' ''نہیں! اللہ کی قسم'' وغیرہ چونکہ اس میں نیت شامل نہیں ہوتی، اس لیے یہ لغو قسم ہے اس میں کفارہ نہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾

''اللہ تمھاری لغو قسموں پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرماتا لیکن مؤاخذہ ان قسموں پر فرماتا ہے جو تم نے مضبوط باندھ لیں۔''[4]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو قسم کے بارے میں فرمایا:

---

① مجمع الزوائد: 177/4، حديث: 6899، و المصنف لابن أبي شيبة: 81/3، حديث: 12279. ② الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، الأيمان: 552/5. ③ المآئدة 89:5. ④ المآئدة 89:5.

«هُوَ كَلَامُ الرَّجُلِ فِي بَيْتِهِ كَلَّا وَاللّٰهِ! وَبَلٰى وَاللّٰهِ!»

’’آدمی گھر میں بیٹھا بات بات پر کہے: نہیں، اللہ کی قسم! کیوں نہیں اللہ کی قسم! وغیرہ۔‘‘[1]

اسی طرح ایک شخص نے خود کو سچا سمجھتے ہوئے قسم اٹھائی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بات اس طرح نہ تھی (تو یہ بھی لغو قسم ہی ہے اور اس میں کفارہ نہیں۔)

② قسم اٹھانے والا اپنی مرضی اور اختیار سے قسم اٹھائے۔ اگر اسے قسم پر مجبور کیا گیا ہو تو قسم منعقد نہ ہوگی۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«عُفِيَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»

’’اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطا، بھول چوک اور جس پر ان کو مجبور کر دیا جائے معاف کر دیا ہے۔‘‘[2]

③ قسم کو اپنے اختیار سے اور جانتے ہوئے توڑ دے۔ اگر اس نے اپنی قسم کو بھول کر توڑا یا اس سے زبردستی قسم تڑوائی گئی تو اس پر کفارہ نہیں کیونکہ یہ گناہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«عُفِيَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»

’’اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطا، بھول چوک اور جبر و اکراہ سے درگزر فرمایا ہے۔‘‘[3]

▲ اگر قسم میں کلمہ استثنا کہا گیا، مثلاً: کسی نے کہا: ’’اللہ کی قسم! میں یہ کام ضرور کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ‘‘ تو اسے کام نہ کرنے کی صورت میں کفارہ نہ پڑے گا بشرطیکہ کلمۂ استثنا قسم اٹھانے کے وقت بولا گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ حَلَفَ فَقَالَ: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمْ يَحْنَثْ»

’’جس نے قسم اٹھائی اور ساتھ ان شاء اللہ کہا تو وہ حانث نہ ہوگا۔‘‘[4]

اگر کلمۂ استثنا (ان شاء اللہ) کا مقصد استثنا نہ تھا بلکہ محض تبرک تھا یا ان شاء اللہ کا کلمہ قسم کے متصل بعد نہ بولا گیا ہو بلکہ ایک وقت گزرنے کے بعد کہا گیا تو اس کلمۂ استثنا سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا، البتہ بعض علماء کا قول ہے کہ قسم مکمل کرنے کے بعد اس نے ان شاء اللہ کہہ دیا یا مجلس میں سے کسی نے اسے کہا: ان شاء اللہ کہہ دو اور اس نے

① سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب لغو اليمين، حديث: 3254، بعد حديث: 3324. ② سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المكره والناسي، حديث: 2045 لیکن ابن ماجہ میں [عُفِيَ عَنْ أُمَّتِي] کے بجائے [إِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي] کے الفاظ ہیں۔ إرواء الغليل: 123/1، حديث: 82. ③ دیکھیے سابقہ حوالہ۔ ④ جامع الترمذي، النذور والأيمان، باب ماجاء في الإستثناء في اليمين، حديث: 1531، ومسند أحمد: 309/2 و اللفظ له.

کہہ دیا تو اس کا فائدہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہی بات درست ہے۔''

▲ قسم کو توڑنا کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی حرام اور کبھی مباح۔

① اگر کسی نے واجب کام کو چھوڑ دینے کی قسم اٹھائی تو اس پر قسم توڑ دینا اور کفارہ ادا کرنا واجب ہے، مثلاً: اگر قسم اٹھائی کہ وہ صلہ رحمی نہ کرے گا یا حرام کام کا ارتکاب کرے گا، مثلاً: شراب پیے گا تو اس پر واجب ہے کہ قسم کو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

② کبھی قسم کو توڑنا حرام ہوتا ہے، مثلاً: کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں حرام کام نہیں کرے گا یا فلاں فرض ادا کرے گا تو اس پر واجب ہے کہ قسم پوری کرے، اسے توڑنا جائز نہ ہوگا۔

③ اگر کسی نے کوئی مباح کام کرنے یا چھوڑنے کی قسم اٹھائی تو اس میں قسم کا توڑنا مباح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لَا أَحْلِفُ عَلٰى يَمِينٍ فَرَأَيْتُ غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا، إِلَّا أَتَيْتُ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، وَكَفَّرْتُ عَنْ يَّمِينِي»

''اگر میں کسی کام پر قسم اٹھالوں لیکن اس کے غیر میں بہتری ہو تو میں بہتر کام ہی کروں گا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کروں گا۔''[1]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِينٍ فَرَأٰى غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا فَلْيَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، وَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَّمِينِهِ»

''جس شخص نے کسی کام پر قسم اٹھائی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ خیر و بھلائی دوسری صورت میں ہے تو وہ خیر والی صورت اختیار کرے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے۔''[2]

▲ اگر کسی شخص نے بیوی کے سوا کسی اور مباح شے کو اپنی ذات پر حرام قرار دے دیا، مثلاً: کھانا، پینا یا لباس کا پہننا، جیسے کسی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو حلال قرار دیا ہے وہ حرام ہے۔ یا فلاں شے کا کھانا مجھ پر حرام ہے تو وہ شے حرام نہ ہوگی۔ اسے چاہیے کہ وہ اس شے کو استعمال میں لائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحيح البخاري، الأيمان والنذور، باب قول الله تعالى: ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ أَيْمَانِكُمْ﴾ (المآئدة5:89)، حديث: 6621، وصحيح مسلم، الأيمان، باب ندب من حلف يمينا فرأى غيرها خيرًا منها ......، حديث: 1649. ② صحيح مسلم، الأيمان، باب ندب من حلف يمينا فرأى غيرها خيراً منها ......، حديث: 1650.

سے فرمایا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِى مَرْضَاتَ أَزْوَٰجِكَ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ ٱللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَٰنِكُمْ ﴾

''اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے اسے آپ کیوں حرام کرتے ہیں؟ (کیا) آپ اپنی بیویوں کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اللہ نے آپ کے لیے آپ کی (ناجائز) قسمیں کھولنا فرض کر دیا ہے۔''[1]

▲ اگر کسی نے بیوی کو اپنے آپ پر حرام قرار دے دیا تو شرعی اصطلاح میں یہ ''ظہار'' ہے۔ اس میں ظہار کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ قسم کا کفارہ کافی نہ ہوگا۔[2]

▲ اس مسئلے میں یہ تنبیہ کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کے سوا کسی اور ملت کی قسم نہ اٹھائی جائے، مثلاً: اگر کسی مسلمان نے کہا: ''اگر اس نے فلاں کام کیا تو وہ یہودی ہوگا یا نصرانی ہوگا۔'' یا ''فلاں کام نہ کیا تو یہودی یا نصرانی ہوگا۔'' ایسے الفاظ نہایت ناپسندیدہ اور شدید حرام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ بِمِلَّةٍ غَيْرِ الْإِسْلَامِ كَاذِبًا مُّتَعَمِّدًا فَهُوَ كَمَا قَالَ»

''جس نے اسلام کے سوا کسی اور ملت پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی تو وہ ویسا ہی بن جائے گا جیسا اس نے کہا ہے۔''[3]

ایک اور روایت میں ہے:

«مَنْ حَلَفَ فَقَالَ: إِنِّي بَرِيءٌ مِّنَ الْإِسْلَامِ، فَإِنْ كَانَ كَاذِبًا فَهُوَ كَمَا قَالَ، وَإِنْ كَانَ صَادِقًا فَلَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الْإِسْلَامِ سَالِمًا»

''جس نے قسم اٹھائی اور کہا کہ وہ اسلام سے الگ تھلگ ہوگیا تو اگر وہ جھوٹا ہے تو وہ ویسا ہی ہوگیا جیسا کہ اس نے کہا اور اگر وہ سچا ہے تو اسلام کی جانب صحیح سالم واپس نہ لوٹے گا۔''[4]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس قسم کی بری باتوں سے محفوظ فرمائے اور ہمارے اقوال و افعال اور نیتوں کو

---

① التحریم 2,1:66.

② ظہار اور اس کے کفارے کی بحث پیچھے گزر چکی ہے۔

③ صحيح البخاري، الجنائز، باب ما جاء في قاتل النفس، حديث: 1363، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه ......، حديث: 110. ④ سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب ما جاء في الحلف بالبراءة ......، حديث: 3257.

درست رکھے، وہی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔

کفارۂ قسم کا بیان

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر فضل وکرم ہے کہ اس نے کفارہ مقرر کر کے قسم کا حل پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ﴾

''تحقیق اللہ نے تمھارے لیے قسموں کو کھول ڈالنا مقرر کیا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا، فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، وَكَفِّرْ عَنْ يَّمِينِكَ»

''جب تم کسی کام کے کرنے پر قسم اٹھاؤ اور تم دیکھو کہ اس کے علاوہ دوسرا کام بہتر ہے تو بہتر کام ہی کرو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو۔''[2]

▲ کفارۂ قسم میں اختیار اور ترتیب ہے۔ اختیار یہ ہے کہ چاہے تو دس مساکین کو کھانا کھلا دے۔ ہر مسکین کو نصف صاع کھانا دے۔ اور چاہے تو دس مساکین کو لباس پہنا دے۔ ہر مسکین کا لباس اس قدر ہو جو اسے ادائیگی نماز کے لیے کافی ہو یا چاہے تو ایسا غلام یا لونڈی آزاد کرے جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہو۔ اگر اسے ان تین اشیاء میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے رکھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کفارۂ قسم اختیار اور ترتیب کا مجموعہ ہے۔ کھانا کھلانا، لباس پہنانا اور لونڈی یا غلام آزاد کرنا، ان تینوں کاموں میں سے جو چاہے اختیار کرے، البتہ ان کاموں میں اور روزے رکھنے میں ترتیب ہے، یعنی جو شخص پہلے تین کام نہ کر سکتا ہو تو وہ تین روزے رکھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] التحريم 66:2. [2] صحيح البخاري، الأيمان والنذور، باب قول الله تعالى:﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (المآئدة 5:89)، حديث: 6622، وصحيح مسلم، الأيمان، باب ندب من حلف يميناً فرأى غيرها خيراً منها ......، حديث: 1652، وسنن أبي داود، الأيمان، باب الحنث إذا كان خيرًا، حديث: 3277 واللفظ له.

﴿ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ط فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴾

''اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہے اور جس کو مقدور نہ ہو تو (اس کے لیے) تین دن کے روزے ہیں۔''[1]

جمہور علماء نے لونڈی یا غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں اس کے مومن ہونے کی شرط عائد کی ہے۔ اسی طرح تین روزوں کے بارے میں مسلسل روزے رکھنے کی شرط مقرر کی ہے کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے:

«فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مُّتَتَابِعَاتٍ» ''پے در پے تین روزے رکھے۔''[2]

◄ کفارۂ قسم کے بارے میں اکثر لوگ مغالطے میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اختیار ہے کہ قسم کے کفارے کی جو صورت بھی ادا کر دیں گے، کافی ہوگی، لہٰذا وہ کھانا کھلانے یا لباس کی طاقت کے باوجود روزے رکھ لیتے ہیں، حالانکہ ایسی صورت میں روزے رکھنے سے کفارۂ قسم کفایت نہ کرے گا کیونکہ روزے رکھنے کا حکم تب ہے جب کوئی (قسم توڑنے والا) کھانا اور لباس دینے سے عاجز ہو۔

◄ قسم توڑنے سے پہلے کفارہ دینا بھی جائز ہے جس طرح بعد میں جائز ہے۔ اگر کفارہ پہلے دیا تو اس کی وجہ سے قسم کی تحلیل ہو جائے گی اور بعد میں دیا تو یہ قسم کا کفارہ ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«إِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا، فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، وَكَفِّرْ عَنْ يَّمِينِكَ»

''جب تم کسی کام کے کرنے پر قسم اٹھاؤ اور تم دیکھو کہ اس کے علاوہ دوسرا کام بہتر ہے تو بہتر کام ہی کرو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو۔''[3]

یہ حدیث قسم توڑنے کے بعد کفارہ دینے کے جواز پر دلیل ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

«فَكَفِّرْ عَنْ يَّمِينِكَ ثُمَّ ائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ» ''اپنی قسم کا کفارہ دے اور وہ کام کر جو بہتر ہے۔''[4]

یہ حدیث قسم توڑنے سے پہلے ہی کفارہ دینے کے جواز کی دلیل مہیا کرتی ہے۔ ان دونوں قسم کی احادیث سے کفارہ کی تقدیم و تاخیر کا جواز ہے۔

---

[1] المآئدة5:89. [2] تفسير الطبري، المآئدة5:89، حديث:9753-9756. [3] صحيح البخاري، الأيمان والنذور، باب قول الله تعالى: ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (المآئدہ5:89)، حديث:6622، وصحيح مسلم، الأيمان، باب ندب من حلف يمينا فرأى غيرها خيرًا منها ......،حديث: 1652، وسنن أبي داود، الأيمان، باب الحنث إذا كان خيرًا، حديث:3277 واللفظ له. [4] سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب الحنث إذا كان خيرًا، حديث:3278.

▲ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر قسم ڈال کر کوئی کام کرنے کو کہے تو اسے پورا کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے، چنانچہ براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَمَرَنَا النَّبِيُّ ﷺ بِسَبْعٍ ...... أَمَرَنَا بِعِيَادَةِ الْمَرِيضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَازَةِ وَتَشْمِيتِ الْعَاطِسِ وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ... وَنَصْرِ الْمَظْلُومِ وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ وَإِجَابَةِ الدَّاعِي»

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا...... مریض کی بیمار پرسی کرنے، جنازے میں شریک ہونے، چھینک مارنے والے کا جواب دینے، کوئی کسی کام کے کرنے پر قسم اٹھائے تو اس سے تعاون کرنا تاکہ اس کی قسم پوری ہو، مظلوم کی مدد کرنے، سلام کو عام کرنے اور دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرنے کا۔"①

▲ اگر کسی نے ایک ہی کام کرنے پر کفارہ ادا کرنے سے پہلے متعدد قسمیں اٹھائی ہوں تو وہ ایک ہی قسم شمار ہوگی اور ان کا کفارہ بھی ایک ہی ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے متعدد اشیاء پر ایک ہی قسم اٹھائی، مثلاً: اس نے کہا: اللہ کی قسم میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا اور نہ لباس پہنوں گا، پھر اس نے کوئی ایک کام کر لیا، مثلاً: کچھ پی لیا تو اس پر ایک ہی کفارہ ہوگا اور وہ باقی چیزوں کی قسم سے آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک ہی قسم تھی جو ختم ہو گئی۔

▲ اگر کسی نے متعدد کاموں پر متعدد قسمیں اٹھائیں، پھر توڑ دیں تو اس پر ہر قسم کا الگ الگ کفارہ ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جس نے کفارہ ادا کرنے سے قبل کئی قسمیں اٹھائیں تو اس کے بارے میں کئی روایات منقول ہیں۔ ان میں سے صحیح بات ہے کہ اگر کسی ایک کام کرنے پر قسم اٹھائی ہو تو ایک ہی کفارہ ادا کرنا ہوگا ورنہ جتنی قسمیں اٹھائے گا کفارے بھی اسی حساب سے ادا کرے گا۔"

▲ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں کام نہیں کرے گا، پھر اس نے بھول کر یا کسی کے مجبور کرنے پر وہ کام کر لیا یا اسے معلوم نہ ہوا کہ یہ کام بھی اس قسم میں شامل ہے تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی اور اس پر کفارہ واجب نہ ہوگا اور جو کام زبردستی کرایا جائے وہ کرنے والے کی طرف منسوب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾

"اے ہمارے رب! اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو تو ہمیں نہ پکڑنا۔"②

① صحيح البخاري، النكاح، باب حق إجابة الوليمة والدعوة......، حديث: 5175، وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء......، حديث: 2066. ② البقرة 2:286.

علاوہ ازیں اس امت کے افراد کے لیے خطا ونسیان اور جس کام میں کسی کو مجبور کیا گیا ہو سب میں معافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کفارۂ قسم کو بیان کر کے فرمایا:

﴿ وَاحْفَظُوٓا أَيْمَانَكُمْ ﴾ ''اور اپنی قسموں کا خیال رکھو۔''[1]

قسموں کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ قسمیں اٹھانے میں جلد بازی سے کام نہ لو یا قسموں کو توڑنے میں جلدی نہ کیا کرو یا توڑ دیا ہے تو کفارے کے بغیر نہ چھوڑو۔ قرآن مجید کی آیت کا اطلاق ان تمام صورتوں پر ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں حکم ہے کہ قسم کا لحاظ کرو اور اسے بے وقعت اور معمولی نہ سمجھو۔

اس امر پر تنبیہ کرنا نہایت ضروری ہے کہ بعض لوگ جب قسم اٹھاتے ہیں تو قسم کی مخالفت کے لیے حیلہ سازی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ قسم کی ذمے داری سے بچ گئے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس مسئلے پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''باطل حیلوں میں سے یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے قسم اٹھائی کہ وہ یہ روٹی نہ کھائے گا یا اس سال وہ فلاں گھر میں رہائش نہیں رکھے گا یا وہ فلاں کھانا نہیں کھائے گا، پھر وہ وہی روٹی کھاتا ہے مگر ایک لقمہ نہیں کھاتا یا وہ سارا سال مقررہ مکان میں رہائش رکھتا ہے مگر ایک دن کم یا سارا کھانا کھالیتا ہے مگر تھوڑا سا چھوڑ دیتا ہے تو یہ حیلہ باطل ہے۔ اس نے جب یہ کام کر لیا تو اس کی قسم ٹوٹ گئی۔ حیلہ ساز کو چاہیے کہ اس قسم کے کاموں سے خود کو بچائے۔''[2]

بعض لوگ قسم اٹھا لیتے ہیں کہ وہ فلاں کام نہیں کریں گے، پھر وہ کسی کو اپنا وکیل بنا لیتے ہیں جو وہی کام کر دے، یہ بھی حیلہ سازی ہے جو مذموم ہے، البتہ اس کی قسم تب ہی قائم رہے گی جب وہ قسم اٹھائے گا کہ وہ یہ کام خود نہیں کرے گا۔

الغرض ہر حال میں قسم کی بہت اہمیت ہے اس میں تساہل جائز نہیں اور نہ قسم کے حکم سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرنی چاہیے۔

نذر کے احکام

نذر کے لغوی معنی ''لازم کرنے'' کے ہیں جبکہ شرعی معنی ''کسی عاقل، بالغ اور مختار شخص کے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے اوپر کسی کام کو لازم کرنے'' کے ہیں۔

① المآئدة5:89. ② إعلام الموقعين:3/267.

نذر عبادات کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، لہٰذا غیر اللہ کے لیے نذر ماننا جائز نہیں۔ جس شخص نے غیر اللہ کے لیے، مثلاً: کسی قبر، فرشتے، نبی یا ولی کے لیے نذر مانی تو اس نے شرک کی ایسی قسم کا ارتکاب کیا جو دین اسلام سے خارج کرنے والی ہے کیونکہ اس نے غیر اللہ کی عبادت کی ہے۔ جو لوگ اولیاء وصالحین کی قبروں کے نام پر کچھ دینے کی نذر مانتے ہیں وہ شرک اکبر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ توبہ کریں اور اس کبیرہ گناہ سے بچیں اور اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے غضب اور جہنم سے بچ جائیں۔

▲ نذر کا اصل حکم یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے بلکہ علمائے کرام کی ایک جماعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ

«نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنِ النَّذْرِ، قَالَ: إِنَّهُ لَا يَرُدُّ شَيْئًا إِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ»

”نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نذر تقدیر کو نہیں بدلتی، البتہ اس کے ذریعے سے بخیل شخص سے کچھ مال نکلوالیا جاتا ہے۔“[1]

مکروہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نذر ماننے والا اپنے آپ پر ایک ایسی شے لازم کر لیتا ہے جو شرع میں اس پر لازم نہ تھی۔ اس بنا پر وہ خود کو مشکل میں ڈالتا ہے جبکہ ایک مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ نیکی کا کام بغیر نذر مانے ہی کرے۔

▲ نذر مان لینے کی صورت میں اسے پورا کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُهُۥ﴾

”تم جتنا کچھ خرچ کرو، یعنی خیرات کرو اور جو کچھ تم نذر مانو تو بے شک اسے اللہ بخوبی جانتا ہے۔“[2]

اللہ تعالیٰ نے نذر پوری کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُوفُونَ بِٱلنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُۥ مُسْتَطِيرًا ۝﴾

”جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی چاروں طرف پھیل جانے والی ہے۔“[3]

اور فرمایا:

﴿وَلْيُوفُوا۟ نُذُورَهُمْ﴾ ”اور انھیں چاہیے کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں۔“[4]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

---

① صحيح البخاري، القدر، باب إلقاء العبد النذر إلى القدر، حديث: 6608، وصحيح مسلم، النذر، باب النهي عن النذر وأنه لا يرد شيئًا، حديث: 1640,1639. ② البقرة 2:270. ③ الدهر 76:7. ④ الحج 22:29.

«مَنْ نَّذَرَ أَنْ يُّطِيعَ اللهَ فَلْيُطِعْهُ، وَمَنْ نَّذَرَ أَنْ يَّعْصِيَ اللهَ فَلَا يَعْصِهِ»

''جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو وہ اطاعت کرے اور جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے کام کو اپنے آپ پر لازم کرنے کی صرف چار صورتیں ہیں:

① کسی کام کا التزام صرف قسم سے کرے۔ ② کوئی شخص کام کا التزام نذر ماننے سے کرے۔ ③ قسم سے لازم کرے، نذر سے اسے مؤکد بنائے۔ ④ نذر سے لازم اور قسم سے اسے مزید پختہ کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ ﴾

''ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے مال دے گا تو ہم ضرور صدقہ وخیرات کریں گے اور پکی طرح نیکوکاروں میں ہو جائیں گے۔''[2]

ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنا عہد پورا کرے ورنہ وہ اس وعید کا مستحق ہو گا۔

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ ''چنانچہ اس کی سزا میں اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا۔''[3]

▲ فقہائے کرام نے نذر کے انعقاد کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ نذر ماننے والا عاقل، بالغ اور مختار ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتّٰى يَكْبُرَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتّٰى يَعْقِلَ»

''تین اشخاص مرفوع القلم ہیں: سویا ہوا حتی کہ بیدار ہو جائے، چھوٹا بچہ حتی کہ بالغ ہو جائے اور مجنون حتی کہ عقل مند ہو جائے۔''[4]

▲ اگر کافر شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی نذر مانی ہو تو درست ہو گی لیکن اس کو پورا کرنا تب لازم ہو گا جب وہ مسلمان ہو گا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے عہد جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ بیت اللہ میں ایک رات

① صحيح البخاري، الأيمان، باب النذر في الطاعة ...... ، حديث: 6696، وسنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب النذر في المعصية، حديث: 3289 واللفظ له. ② التوبة 9:75. ③ التوبة 9:77. ④ سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المعتوه والصغير والنائم، حديث: 2041.

کے لیے اعتکاف بیٹھوں گا تو آپ ﷺ نے فرمایا: [أَوْفِ بِنَذْرِكَ] ''اپنی نذر کو پورا کرو۔''[1]

▲ جائز نذر کی پانچ اقسام ہیں:

① نذر مطلق، مثلاً: کوئی شخص کسی کام کا نام لیے بغیر کہے: ''میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے نذر مانی۔'' ایسے شخص پر کفارۂ قسم لازم آتا ہے، خواہ مشروط ہو یا غیر مشروط، چنانچہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«كَفَّارَةُ النَّذْرِ إِذَا لَمْ يُسَمِّ كَفَّارَةُ يَمِينٍ»

''جب نذر میں کسی کام کا نام نہ لیا جائے تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔''[2]

② نذر غضب، مثلاً: کوئی کہے: ''اگر میں نے تجھ سے کلام کیا یا مجھے تیرے بارے میں خبر نہ ملی یا اگر فلاں خبر صحیح ثابت ہوئی یا فلاں خبر جھوٹ ثابت ہوئی تو میں حج کروں گا یا غلام لونڈی آزاد کروں گا۔'' اس قسم میں نذر ماننے والے کو اختیار ہے کہ وہ نذر کو پورا کرے یا اس کا کفارہ ادا کرے، چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے:

«لَا نَذْرَ فِي غَضَبٍ، وَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ الْيَمِينِ»

''غصے کی حالت میں مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا ضروری نہیں۔ اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔''[3]

③ نذر مباح، مثلاً: کسی نے نذر مانی کہ وہ ایسا کپڑا پہنے گا یا اپنے فلاں جانور پر سوار ہوگا۔ اس قسم میں بھی اسے اختیار ہے چاہے تو نذر پوری کرے اور چاہے تو کفارہ ادا کر دے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ نذر مباح ماننے والے پر کفارہ لازم نہیں آتا جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو ایک آدمی کو کھڑا دیکھا۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے کہا: یہ ابو اسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں اور سائے میں نہیں آئے گا، کسی سے بات نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مُرْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ»

''اسے حکم دو کہ بات چیت کرے، سائے میں آئے، بیٹھ جائے اور روزہ پورا کرے۔''[4]

④ نذر معصیت: ایسی نذر جس میں شریعت اسلامی کے کسی حکم کی مخالفت ہو، مثلاً: شراب پینے کی نذر، ایام حیض یا

---

① صحيح البخاري، الاعتكاف، باب الاعتكاف ليلاً، حديث: 2032. ② صحيح مسلم، النذر باب في كفارة النذر، حديث: 1645، وجامع الترمذي، النذور، باب في كفارة النذر إذا لم يسم، حديث: 1528 واللفظ له. ③ [ضعيف] مسند أحمد: 433/4، وإرواء الغليل: 211/8، حديث: 2587. ④ صحيح البخاري، الأيمان، باب النذر فيما لا ◄◄

یوم نحر (عیدوالے دن) میں روزہ رکھنے کی نذر۔ اس قسم کی نذر کو پورا کرنا ہرگز جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَّذَرَ أَنْ يَّعْصِيَ اللهَ فَلَا يَعْصِهِ»

''جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[1]

بعض اہل علم کے نزدیک ایسی نذر کا کفارہ ادا کرنا ہوگا کیونکہ گناہ کا ارتکاب کسی حال میں جائز نہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت حضرت ابن مسعود، ابن عباس، عمران بن حصین اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ اور اہل علم کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ معصیت کی نذر منعقد ہی نہیں ہوتی، لہٰذا اس میں کفارہ بھی نہیں۔ ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی رائے کو پسند کیا ہے اور فرمایا ہے: ''جس نے قبر یا قبرستان میں یا پہاڑ پر یا درخت پر چراغ جلایا یا اس کے لیے نذر مانی تو جائز نہ ہوگا اور نہ اسے پورا کیا جائے گا بلکہ وہ رقم کسی نیکی کے کام میں خرچ کی جائے گی۔''

⑤ نذر تبرر، یعنی جائز کام کرنے کی نذر ماننا جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو، مثلاً: نماز، روزے، حج وغیرہ کی نذر ماننا۔ وہ مطلق ہو، مثلاً: میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نماز ادا کروں گا یا روزے رکھوں گا، یا کسی شرط کے ساتھ ہو، مثلاً: کوئی کہے: اگر اللہ تعالیٰ نے میرے فلاں مریض کو شفا دی تو اتنی رقم اللہ کے راستے میں دوں گا یا اتنی تعداد میں نوافل ادا کروں گا۔ اگر شرط پوری ہو جائے تو نذر کو پورا کرنا لازم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ نَّذَرَ أَنْ يُّطِيعَ اللهَ فَلْيُطِعْهُ»

''جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو وہ اس کی اطاعت کرے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ ﴾ ''جو نذریں پوری کرتے ہیں۔''[3]

اور فرمان ہے: ﴿ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ﴾ ''اور وہ اپنی نذریں پوری کریں۔''[4] واللہ أعلم بالصواب.

◄◄ يملك وفي معصية، حديث: 6704. ① صحيح البخاري، الأيمان، باب النذر في الطاعة ...... ، حديث: 6696، وسنن أبي داود، الأيمان، باب النذر في المعصية، حديث: 3289 واللفظ له. ② صحيح البخاري، الأيمان، باب النذر في الطاعة، ...... ، حديث: 6696. ③ الدهر 76:7. ④ الحج 22:29.

باب 18

قضا کے مسائل

اسلام میں قضا کے احکام

قضا کے لغوی معنی ''کسی شے کو مضبوط کرنے یا کسی کام کو سرانجام دے کر فارغ ہونے'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ ''پھر اللہ نے انھیں دو دن میں سات آسمان بنا دیا۔''[1]

علاوہ ازیں اس لفظ (قضا) کے لغت عرب میں اور بھی معانی ہیں۔ قضا کے شرعی اور اصطلاحی معنی ہیں: شرعی حکم کو واضح کر کے اسے کسی پر لازم کر دینا اور جھگڑوں کا فیصلہ کرنا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قضا (منصف) کی ذمے داری قبول کرنا دینی طور پر واجب اور باعث ثواب ہے۔ یہ سب سے افضل نیکیوں میں شامل ہے۔ اس معاملے میں خرابی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اس کے ذریعے سے مال اور چودھراہٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''[2]

قضا کے احکام کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾

''آپ ان کے معاملات میں اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم (فیصلہ) کریں۔''[3]

نیز ارشاد ہے:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾

''اے داود! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنا دیا، لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو۔''[4]

''شرعی حکم واضح کرنا اور اسے نافذ کرنا اور جھگڑوں کے فیصلے کرنا۔'' خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان متعدد فیصلے کیے، نیز اسلامی سلطنت کے مختلف اطراف میں قاضی مقرر کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سلسلے کو قائم رکھا۔

شیخ موصوف رحمہ اللہ قاضی کے بارے میں مزید فرماتے ہیں: ''وہ فیصلے کے اثبات کے اعتبار سے گواہ ہوتا ہے اور امر و نہی کے اعتبار سے مفتی ہوتا ہے اور فیصلہ صادر کر کے لازم کر دینے کے اعتبار سے صاحب اقتدار کی حیثیت رکھتا ہے۔''[5]

---

① حٰمٓ السجدة 41:12. ② الفتاوی الکبرٰی، الاختیارات العلمیة، باب القضاء: 5/555. ③ المآئدة 5:49. ④ صٓ 38:26. ⑤ الفتاوی الکبرٰی، الاختیارات العلمیة، باب القضاء: 5/556.

◄ دین اسلام میں قضا کا حکم فرض کفایہ کا ہے کیونکہ اس کے بغیر لوگوں کا نظام قائم ہی نہیں رہتا، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لوگوں کے لیے حاکم کا ہونا ناگزیر ہے تا کہ ان کے حقوق ضائع نہ ہوں۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کرنے والے چند آدمیوں پر عارضی طور پر بھی لازم قرار دیا کہ وہ دوران سفر میں اپنا امیر مقرر کریں۔ اس میں تنبیہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں قضا کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔''[2]

◄ جو شخص قاضی بننے کا اہل ہو اس پر واجب ہے کہ حکومت کو اپنی خدمات پیش کرے بشرطیکہ کوئی اور شخص نہ مل رہا ہو۔ جو بھی شخص اس ذمے داری کی قوت و اہلیت رکھتا ہو اس کے لیے اس عہدے پر فائز ہونا عظیم اجر کا باعث ہے اور جو شخص اس کا حق ادا نہ کرے گا اس کے لیے انتہائی خطرناک امر ہے۔

◄ مسلمانوں کے خلیفہ پر واجب ہے کہ حالات اور ضرورت کے مطابق قاضی مقرر کرے تا کہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ اور وہ اس منصب کے لیے ایسے آدمیوں کا انتخاب کرے جو علم و تقوے میں بہتر ہوں اور اگر باصلاحیت اشخاص کا علم نہ ہو تو لوگوں سے معلوم کرے اور پوچھ لے۔

◄ قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک عدل و انصاف سے فیصلے دے۔ خلیفہ کو چاہیے کہ بیت المال سے قاضی کی اس قدر تنخواہ مقرر کرے کہ وہ ضروریات زندگی کے حصول سے بے فکر ہو جائے۔ خلفائے راشدین حکومت کے مناصب پر فائز حضرات کے لیے بیت المال سے اس قدر وظیفہ دیتے تھے جو انھیں ضروریات زندگی کے لیے کافی ہوتا تھا۔

◄ قاضی کی اہلیت اور صلاحیت کا دارومدار مختلف اوقات و حالات پر منحصر ہے کیونکہ جس معاملے میں شریعت نے حد بندی نہیں کی اس کا دارومدار موجودہ احوال اور عرف ہی پر ہوتا ہے۔

◄ اس دور میں مملکت سعودیہ کی وزارت عدل و انصاف نے ایسا نظام رائج کیا ہے کہ جس کے تحت قاضی اپنے ماتحت علاقوں میں اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور ان کے اختیارات کا بھی تعین کر دیا گیا ہے، لہٰذا ان اصول وضوابط کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس میں معاملات کی اصلاح اور اختیارات کا تعین ہے، لہٰذا وہ نظام کتاب وسنت کا مخالف نہیں ہے، اس لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

◄ ایک قاضی کا حتی الامکان نو صفات سے متصف ہونا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

① مکلّف، یعنی عاقل و بالغ ہو کیونکہ غیر مکلّف خود کسی کی سر پرستی میں ہوتا ہے، لہٰذا وہ حاکم بننے کا اہل نہیں۔

---

[1] المغني والشرح الكبير: 374/11. [2] الفتاوى الكبرىٰ، الاختيارات العلمية، باب القضاء: 555/5.

② مرد ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»

''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جنھوں نے اپنے معاملات میں عورت کو حکمران بنالیا۔''[1]

③ آزاد ہو، اس وصف کی وجہ یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کے حقوق کی ادائیگی میں ہمہ وقت مشغول ہوتا ہے۔

④ مسلمان ہو کیونکہ کسی شخص کی نیکی، دیانت وشرافت مسلم ہونے کے لیے اسلام میں داخل ہونا شرط ہے، نیز اسلامی معاشرے میں کافر کو ماتحت رکھنا اور اسے مسلمانوں والی عزت نہ دینا مطلوب ہے۔ حکمرانی یا عہدۂ قضا عزت واحترام کا سبب ہے۔

⑤ عادل ہو، یعنی صالح، شریف اور دیانت دار ہو۔ فاسق کو عہدۂ قضا دینا قطعاً جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟﴾

''اے مسلمانو! اگر تمھیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔''[2]

جب فاسق کی خبر مقبول نہیں تو اس کا فیصلہ بطریق اولیٰ غیر مقبول ہوگا۔

⑥ اس کی قوت سماعت قائم ہو کیونکہ بہرہ ہونے کی صورت میں فریقین کے بیانات نہیں سن سکے گا۔

⑦ دیکھنے کی قوت رکھتا ہو کیونکہ نابینا شخص مدعی اور مدعا علیہ میں فرق نہ کرسکے گا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو قاضی بنایا جاسکتا ہے جیسے اس کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے کیونکہ اسے صرف جھگڑا کرنے والے کی ذات کو پہچاننے میں مشکل پیش آتی ہے اور یہاں اس کی حاجت نہیں بلکہ وہ تو بیان کردہ اوصاف کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جیسے سیدنا داود علیہ السلام نے دو فرشتوں کے درمیان فیصلہ کیا تھا......''[3]

⑧ بولنے کی قوت رکھتا ہو کیونکہ گونگے شخص کے لیے بول کر فیصلہ دینا ناممکن ہے۔ باقی رہے اشارات تو تمام لوگ انھیں سمجھ نہیں پاتے۔

⑨ قاضی ایسا شخص ہو جو اجتہاد کرسکتا ہو۔ اگرچہ وہ اپنے اس مذہب میں مجتہد ہو جس میں وہ ائمہ میں سے کسی امام کی تقلید کررہا ہے تو ضروری ہے کہ مذہب میں راجح اور مرجوح قول کا علم رکھتا ہو۔

اس شق پر عہد قدیم ہی سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کے احکام معطل ہوکر رہ جاتے ہیں۔

---

① صحيح البخاري، المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرى و قيصر، حديث:4425. ② الحجرات 49:6. ③ الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب القضاء:558/5.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان شرائط کا حتی الامکان اعتبار کیا جانا چاہیے جو زیادہ علم، تجربہ اور معرفت والا ہو اس کو دوسروں پر ترجیح ہونی چاہیے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے کلام کی دلالت بھی یہی ہے کہ دو فاسقوں میں سے جو زیادہ نفع و فائدے والا اور کم خرابی والا ہو اس کو والی (سربراہ) بنانا چاہیے۔''[1]

انصاف پسند اور مذہب کی معرفت رکھنے والے مقلد کو بھی قاضی یا صاحب امر بنایا جاسکتا ہے ورنہ لوگوں کے بہت سے کام معطل رہیں گے۔

ابن قیم رحمہ اللہ مفتیوں کے طبقات ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مجتہد وہ ہے جو کتاب و سنت کا علم رکھتا ہو۔ مجتہد بعض امور میں اگر کسی کی تقلید کرے گا تو یہ عمل اس کے مجتہد ہونے کے منافی نہ ہوگا۔ ہر مجتہد اور امام نے بعض مسائل میں اپنے سے بڑے عالم کی تقلید کی ہے۔''[2]

قاضی کے اوصاف کا بیان

اس باب میں ان اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرنا مقصود ہے جن سے ایک قاضی کو متصف ہونا لازمی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قاضی میں سب سے اعلیٰ اور اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ غصے میں نہ آئے اور کسی فریق سے عناد و کینہ نہ رکھے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قاضی کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے، ان کے بغیر قاضی کا فیصلہ دینا درست نہیں، یعنی دلائل، اسباب اور شہادتوں کی معرفت اور ان کا علم کیونکہ دلیل سے اسے شرعی حکم معلوم ہوگا۔ اسباب سے اسے معلوم ہوگا کہ زیر غور مقدمے میں یہ حکم لگتا ہے یا نہیں اور گواہیوں سے اختلاف کے وقت فیصلہ کرنا ممکن ہوگا۔ اگر ان تین میں سے کسی ایک میں غلطی ہوگئی تو فیصلہ کرنے میں غلطی واقع ہوجائے گی۔''[3]

▲ قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ درشت نہ ہو لیکن ہر اعتبار سے مضبوط ہو تاکہ ظالم اس سے کوئی غلط طمع نہ رکھے، نیز وہ حلیم الطبع ہو، اسے چاہیے کہ فیصلے میں کمزوری نہ دکھائے تاکہ صاحب حق اس سے خوف نہ کھائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حکمرانی کرنے کے لیے دو چیزیں رکن کا درجہ رکھتی ہیں، یعنی قوت اور امانت، لہٰذا قاضی کو چاہیے کہ وہ حلیم ہو تاکہ کسی فریق کے بیان پر غصے میں نہ آئے کہ صحیح فیصلہ دینے کے لیے رکاوٹ

[1] الفتاوی الکبریٰ، الاختیارات العلمیة، باب القضاء: 556/6. [2] إعلام الموقعین: 186/4 بتغییر یسیر. [3] بدائع الفوائد لابن القیم: 12/4.

بن جائے، لہٰذا حلم، علم کی زینت اور اس کا حسن و جمال ہے۔ جس کی ضد جذبات میں آنا، جلد بازی کرنا اور عدم ثبات ہے۔ قاضی کو چاہیے کہ وہ حلم والا، ٹھنڈے مزاج کا حامل اور حوصلہ مند ہو تاکہ جلد بازی اور جوش کی وجہ سے اس سے ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جو اس کے لائق نہ ہو۔ وہ فطین و فہیم ہو تاکہ کوئی فریق اسے دھوکہ نہ دے سکے، وہ عفیف ہو، پاک دامن ہو، یعنی خود کو حرام کاموں سے بچانے والا ہو، صاحب بصیرت ہو اور اپنے سے پہلے قاضیوں کے فیصلوں سے آگاہ ہو۔ قاضی کی جگہ و مقام، یعنی عدالت ممکن حد تک شہر کے وسط میں ہو تاکہ تمام اہل شہر اس کے پاس آسانی سے پہنچ سکیں۔ مسجد کو جائے عدالت بنانے میں بھی کوئی حرج نہیں، چنانچہ خلفائے راشدین سیدنا عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم مسجد ہی میں لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ قاضی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین کے ساتھ بات چیت کے لہجے، الفاظ کے استعمال اور نشست گاہوں میں مساوات اور عدل و انصاف کا خیال رکھے۔ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

«قَضٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يُقْعَدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَكَمِ»

''رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو قاضی کے سامنے بٹھایا جائے۔''[1]

قاضی پر واجب ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے درمیان انھیں اپنے سامنے بٹھانے، ان کی طرف توجہ کرنے اور ان سے گفتگو کرنے میں عدل و انصاف کرے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کو امتیازی جگہ پر بٹھانا یا اس پر زیادہ توجہ دینا یا ایک فریق کے استقبال کے لیے کھڑے ہونا یا اس سے مشورہ لینا منع ہے تاکہ یہ چیز دوسرے فریق کے لیے دل شکنی کا سبب نہ بنے، نیز اس کا اثر یہ بھی ہوگا کہ جس فریق کو کم تر سمجھا گیا ہے اس کے دلائل کو کمزور سمجھا جائے گا اور اس کی زبان لڑکھڑائے گی۔ یہ کیفیت افسوسناک ہے۔''

- قاضی کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ کسی ایک فریق سے دوران مقدمہ میں سرگوشیاں کرے یا اسے مقدمہ جیتنے کے لیے دلائل سکھائے یا اس کی مہمانی کرے اور اسے دعویٰ کرنے کا طریقہ بتائے اور اس کے بارے میں کوئی سبق پڑھائے لیکن اگر مدعی دعوے میں کوئی ضروری بات چھوڑ دے تو قاضی اسے یاد دلا سکتا ہے۔
- قاضی کو چاہیے کہ مشکل حالات میں مشورے کے لیے علمائے کرام سے تعاون لے۔ اگر مقدمے کی مکمل صورت حال سمجھ میں آجائے تو فیصلہ دے دے وگرنہ صورت حال واضح ہونے تک فیصلہ مؤخر رکھے۔
- قاضی کے لیے حرام ہے کہ وہ غصے کی حالت میں فیصلہ دے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[1] [ضعیف] سنن أبي داود، القضاء، باب كيف يجلس الخصمان، حديث:3588، و مسند أحمد:4/4.

«لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ»

''کوئی حاکم غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ دے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ غصے کی حالت میں انسان کے دل و دماغ پر دباؤ اور کھچاؤ ہوتا ہے، نیز غصے کی کیفیت کمال فہم کے لیے مانع ہے۔ غصے سے نظر انصاف دھندلا جاتی ہے، علم و حلم کی راہ گم ہو جاتی ہے۔

▲ غصے کی کیفیت پر قیاس کرتے ہوئے اس حالت کا بھی یہی حکم ہے۔ جب قاضی ذہنی انتشار اور تناؤ میں ہو، اسے سخت بھوک یا پیاس لگی ہو، وہ شدید غم سے دوچار ہو، اکتاہٹ یا اونگھ میں ہو، سردی یا گرمی کی شدت نے اسے پریشان کر رکھا ہو یا قضائے حاجت کی ضرورت محسوس کر رہا ہو تو یہ سب صورتیں ایسی ہیں جو قاضی کے ذہن کو مشغول رکھ کر اسے کسی مثبت نتیجے تک پہنچنے سے روک دیتی ہیں، لہٰذا یہ غصے ہی کا حکم رکھتی ہیں۔

▲ قاضی کے لیے رشوت قبول کرنا حرام ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ»

''رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور رشوت لینے والے (دونوں) پر لعنت کی ہے۔''[2]

▲ رشوت دو طرح کی ہوتی ہے:

① جو کسی ایک فریق سے وصول کی جائے تاکہ اس کے حق میں باطل اور ناجائز طور پر فیصلہ دیا جا سکے۔

② کسی فریق کو اس کا جائز حق دینے کے لیے اس سے رشوت کا مطالبہ کرنا۔ دونوں صورتوں میں رشوت کا مطالبہ ظلم عظیم ہے۔

▲ قاضی کے لیے حرام ہے کہ وہ اس شخص کا تحفہ قبول کرے جو اسے عہدۂ قضا پر فائز ہونے سے قبل تحفے نہیں دیا کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«هَدَايَا الْعُمَّالِ غُلُولٌ» ''حکومت کے کارندوں کا تحائف قبول کرنا خیانت ہے۔''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص سے تحفہ قبول کرنا جس کی تحفے تحائف دینا عادت نہیں، یہ چیز اس کے حق میں فیصلہ دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

▲ قاضی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بازار سے اشیاء کی خرید و فروخت خود کرے کیونکہ اس طریقے سے دوکاندار

① صحيح البخاري، الأحكام، باب هل يقضي القاضي أويفتي وهو غضبان؟ حديث: 7158، وصحيح مسلم، الأقضية، باب كراهة قضاء القاضي وهو غضبان، حديث: 1717. ② جامع الترمذي، الأحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، حديث: 1337. ③ مسند أحمد: 5/425.

لوگ اسے اشیاء رعایت دے کر محبت و پیار پیدا کر سکتے ہیں جو آگے چل کر ناجائز مفاد کے حصول کا سبب بن سکتا ہے، البتہ قاضی کو چاہیے کہ اپنے کسی ایسے وکیل کے ذریعے سے خرید و فروخت کرے جس سے عام لوگ واقف نہ ہوں۔

◄ قاضی اپنا فیصلہ خود نہ کرے اور نہ اس کے بارے میں فیصلہ دے جس سے متعلق خود قاضی کو گواہی شرعاً قبول نہ ہو، مثلاً: والد، اولاد، بیوی وغیرہ کیونکہ اس موقع پر جانبداری کا امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنے دشمن کا فیصلہ نہ کرے کیونکہ ان احوال میں اس پر تہمت والزام لگنے کا امکان ہوتا ہے بلکہ ایسے مقدمات کسی دوسرے قاضی کی طرف منتقل کر دے۔ روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا فیصلہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کروایا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک عراقی شخص کے خلاف دعویٰ قاضی شریح کی عدالت میں دائر کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے کروایا۔

◄ قاضی کے لیے مستحب یہ ہے کہ ان لوگوں کے معاملات پہلے طے کرے جن کے حالات فیصلہ جلدی دینے کا تقاضا کرتے ہیں، مثلاً: قیدیوں، یتیموں اور ذہنی معذوروں کے معاملات، پھر ان اوقاف اور وصیتوں کا فیصلہ کرے جن کا کوئی ذمے دار نہ ہو۔

◄ اگر قاضی کا فیصلہ کتاب وسنت کے احکام کے مخالف ہو یا اجماع قطعی کے خلاف ہو تو وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

◄ قاضی کے ان آداب پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں قاضی کے عادل ہونے کی کتنی اہمیت ہے اور اسلام میں قضا کے منصب کو اتنا بلند مقام دیا گیا ہے کہ دنیا کے نظام اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ ﴾

”کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟“[1]

اللہ ستیاناس کرے ان لوگوں کا جو اس ربانی فیصلے سے اعراض کر کے شیطانی قانون کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت بالکل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بیان ہوئی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ ﴾

[1] المائدة 5:50.

''کیا آپ نے ان کی طرف نظر نہیں ڈالی جنھوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے ناشکری کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا، یعنی دوزخ میں جس میں یہ سب جائیں گے جو بدترین ٹھکانا ہے۔''[1]

فیصلہ کرنے کے طریقے کا بیان

جب قاضی کی عدالت میں دونوں فریق حاضر ہوں تو وہ انھیں اپنے سامنے بٹھائے اور پوچھے کہ تم میں سے مدعی کون ہے؟ یا قاضی انتظار کرے حتی کہ مدعی خود ہی گفتگو شروع کر دے۔ جب ایک شخص دعویٰ کرے تو قاضی غور سے اس کا دعویٰ سنے۔ جب مدعی درست طریقے سے اپنا دعویٰ پیش کر لے تو قاضی کو چاہیے کہ مدعا علیہ سے سوال کرے کہ اس دعویٰ کے بارے میں تمھارا کیا موقف ہے؟ اگر مدعا علیہ دعویٰ کو سچ اور درست تسلیم کرے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ دعوے کی سچائی کی بنیاد پر مدعی کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اگر مدعا علیہ دعوے کے درست ہونے کا انکار کر دے تو قاضی مدعی سے گواہ طلب کرے تا کہ مدعی اپنے دعوے کو سچ ثابت کر سکے اور قاضی اس گواہی کی روشنی میں فیصلہ کر سکے۔ اگر مدعی گواہ پیش کر دے تو قاضی اس کی گواہی سنے۔ اگر گواہ قابل قبول ہو تو مدعی کے حق میں فیصلہ دے دے۔

▲ قاضی محض اپنے علم اور ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ نہ دے کیونکہ اس سے اس پر جانبداری برتنے کی تہمت لگنے کا اندیشہ ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ غلط فیصلے دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے کہ قاضی غلط فیصلہ دے کر کہے گا: میں نے اپنی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ دیا ہے۔''

آگے چل کر امام موصوف فرماتے ہیں: ''سیدنا ابوبکر، عمر، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ رضی اللہ عنہم ایسا کرنے سے منع کرتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ان کے اس فیصلے کا مخالف نہیں تھا۔ قاضیوں کے سردار سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کے بارے میں علم یقینی رکھتے تھے کہ ان کا خون اور مال مباح ہے لیکن ان کے معاملات میں اپنے علم کے ساتھ فیصلہ نہ کرتے تھے بلکہ دلائل اور شہادتوں کو بنیاد بناتے تھے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کے بندوں کے ہاں ہر قسم کی تہمت بلکہ شک وشبے سے بالاتر تھی۔''[2]

امام موصوف مزید لکھتے ہیں: ''البتہ قاضی کے لیے جائز ہے کہ وہ فیصلہ دیتے وقت ان معلومات اور اخبار کو بنیاد

---

[1] إبراهيم 14:28، 29. [2] إعلام الموقعين: 3/129، والطرق الحكمة لابن القيم، ص: 263، 264.

بنالے جو متواتر اور مشہور ومعروف ہوں جس میں قاضی کے ساتھ اور لوگ بھی شریک ہیں کیونکہ یہ بھی ایسے واضح شواہد اور قرائن ہیں کہ قاضی پر کسی قسم کی تہمت نہیں لگ سکتی اور اس کی بنیاد پر فیصلہ دلیل کے ساتھ فیصلہ ہے۔''[1]

اگر مدعی نے کہا: میرے پاس کوئی گواہ نہیں ہے تو قاضی اسے بتائے کہ فریق ثانی (مدعا علیہ) کے ذمے قسم ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں روایت ہے:

«جَاءَ رَجُلٌ مِّنْ حَضْرَمَوْتَ وَرَجُلٌ مِّنْ كِنْدَةَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّ هٰذَا قَدْ غَلَبَنِي عَلٰى أَرْضٍ لِّي كَانَتْ لِأَبِي، فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: هِيَ أَرْضِي فِي يَدِي، أَزْرَعُهَا لَيْسَ لَهُ فِيهَا حَقٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِلْحَضْرَمِيِّ: أَلَكَ بَيِّنَةٌ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: فَلَكَ يَمِينُهُ»

''نبی ﷺ کے پاس دو آدمی اپنا جھگڑا لے کر آئے ایک حضرمی تھا، دوسرا کندی۔ حضرمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری زمین پر اس نے قبضہ کر رکھا ہے جو کہ میرے باپ کی تھی۔ کندی نے کہا: وہ زمین میری ہے اور میرے قبضے میں ہے، میں اس پر کاشت کرتا ہوں، اس کا اس میں کوئی حق نہیں۔ نبی ﷺ نے حضرمی کو کہا: کیا تیرے پاس کوئی گواہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لیے کندی کی قسم ہے، یعنی کندی قسم اٹھائے گا۔''[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس روایت سے یہ قاعدہ وضابطہ نکلتا ہے کہ قسم اٹھانے کی ذمے داری مدعا علیہ پر ہے بشرطیکہ مدعی اپنے دعوے کے حق میں کوئی مضبوط دلیل پیش نہ کر سکے۔''[3]

جب مدعی فریق مخالف (مدعا علیہ) سے قسم کا مطالبہ کرے تو قاضی کو چاہیے کہ اس سے قسم لے۔ جب وہ قسم اٹھائے گا تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ جاری کرے گا اور اسے جانے دے گا، البتہ مدعا علیہ کی قسم کو درست تب تسلیم کیا جائے گا جب اس کی قسم صاف اور واضح الفاظ کے ساتھ ہوگی اور مدعی کے مطالبے پر ہوگی کیونکہ جس چیز سے متعلق قسم اٹھانی ہے اس سے مدعی کا حق متعلق ہے، لہٰذا اس کے مطالبے کے بغیر قسم درست نہ ہوگی۔

اگر مدعا علیہ قسم اٹھانے سے انکار کر دے تو اس بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیا جائے گا کیونکہ مدعا علیہ کا قسم سے انکار مدعی کے سچا ہونے کی دلیل ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔ ان میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ جب مدعا علیہ قسم اٹھانے سے انکار کر دے گا تو مدعی کو قسم اٹھانا ہوگی۔

[1] الطرق الحكمية لابن القيم، ص:265-267. [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب وعيد من اقتطع حق مسلم بيمين فاجرة بالنار، حديث: 139. [3] الطرق الحكمية لابن القيم، ص: 178.

▲ جب مدعا علیہ قسم اٹھائے گا تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دے گا۔ اگر فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد مدعی اپنے دعویٰ کی سچائی پر گواہ ڈھونڈ لایا تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ اگر مدعی نے پہلے یہ کہا تھا کہ میرے پاس گواہ نہیں تو اب اس کا گواہ قابل قبول نہ ہو گا کیونکہ وہ اپنے پہلے بیان میں جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اور اگر اس نے پہلے ایسا نہیں کہا تھا تو اس کی گواہی قابل سماعت ہو گی اور مضبوط ہونے کی صورت میں قاضی اپنے سابقہ فیصلے میں نظر ثانی کر کے اس کے حق میں فیصلہ دے گا۔

▲ مدعا علیہ کے قسم اٹھانے سے مدعی کا حق ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ قسم لینے سے دعویٰ غلط ثابت نہیں ہو گا۔ یہ قسم صرف جھگڑا ختم کرنے کے لیے ہے اس سے حقدار کا حق ختم نہیں ہو جاتا۔

اسی طرح اگر مدعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ میرا کوئی گواہ ہے۔ بعد میں اسے گواہ مل گیا تو گواہی سنی جائے گی اور اس کی روشنی میں فیصلہ دیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے پہلے بیان سے منحرف نہیں ہوا۔ واللہ أعلم.

صحتِ دعویٰ کی شرائط

کسی دعویٰ کے صحیح ہونے کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ وہ واضح اور متعین ہو، مثلاً: اگر وہ میت پر قرض سے متعلق ہو تو دعوے میں موت کا ذکر کیا جائے۔ قرض کی نوعیت اور مقدار کی تفصیل بیان کی جائے اور وہ تمام معلومات دی جائیں جن سے دعوے کی صورت حال واضح ہو کیونکہ قاضی کے فیصلے کا دار و مدار اسی تحریر پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«فَإِنَّمَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا عَلٰى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ»

''میں تمھارے درمیان ان بیانات پر فیصلہ دوں گا جو سنوں گا۔''[1]

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ دعویٰ کو واضح صورت میں پیش کرنا لازمی ہے۔ تاکہ قاضی کے سامنے حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

▲ صحت دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز سے متعلق ہو وہ شے معلوم اور متعین ہو، مجہول شے نہ ہو تاکہ جب دعویٰ ثابت ہو جائے تو اس شے کو لازم کیا جا سکے، البتہ بعض مواقع پر مجہول شے کا دعویٰ درست تسلیم ہو گا، مثلاً:

[1] صحيح البخاري، الحيل، باب: 10، حديث: 6967، وصحيح مسلم، الأقضية، باب بيان أن حكم الحاكم لا يغير الباطن، حديث: 1713، وسنن النسائي، آداب القضاة، باب ما يقطع القضاء، حديث: 5424 واللفظ له.

اپنے مال میں سے کچھ حصے کی یا اس کے غلاموں میں سے کسی غلام کی وصیت کرنا جسے حق مہر وغیرہ بنایا جائے۔

- دعوے کا واضح اور صریح ہونا ضروری ہے۔ دعوے میں یہ کافی نہ ہوگا کہ ''فلاں کے پاس میری فلاں چیز ہے۔'' بلکہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ میں اس کو لینے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اور جس شے کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ موجود ہو، لہٰذا ایسے قرض کے مطالبے کا دعویٰ نہیں ہوسکتا جس کی ادائیگی کے لیے باہمی طے شدہ مدت ابھی باقی ہے کیونکہ مقرر وقت سے قبل اس کا مطالبہ کرنا درست نہیں اور نہ اس بنیاد پر مدعا علیہ پر کوئی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔
- صحتِ دعویٰ کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اس کے جھوٹ ہونے کا واضح قرینہ نہ پایا جائے، مثلاً: کسی شخص کے خلاف کوئی دعویٰ کرے کہ اس فلاں شخص نے بیس سال قبل قتل کیا تھا یا چوری کی تھی، حالانکہ مدعا علیہ کی عمر بیس سال سے بھی کم ہو کیونکہ عقل اس دعویٰ کو سچ تسلیم نہیں کرتی، اس لیے اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔
- اگر کسی نے بیع یا اجارے کے کسی معاہدے کا دعویٰ کیا تو صحت دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ بیان میں ان شرائط کا تذکرہ بھی ہو جن کے تحت معاہدہ ہوا تھا کیونکہ لوگ معاہدات میں مختلف شرائط عائد کر دیتے ہیں اور بسا اوقات کسی شرط کی وجہ سے قاضی کے نزدیک معاہدہ صحیح نہیں ہوتا۔
- اگر کسی نے وراثت کے حصول کا دعویٰ کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وراثت کا سبب بیان کرے کیونکہ اسباب میراث متعدد ہیں،[1] لہٰذا تعیین ضروری ہے۔
- صحتِ دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز سے متعلق دعویٰ ہو وہ متعین ہو، نیز وہ چیز اسی مجلس میں یا اس شہر میں موجود ہوتا کہ اس کے بارے میں کوئی مغالطہ نہ ہو۔ اگر وہ شے (دور یا) غائب ہوتو اس کے اوصاف اور علامات کا تذکرہ ضروری ہے جس سے وہ دوسری اشیاء سے ممتاز ہو جائے۔
- گواہ کے قابل قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نیک اور دیانتدار شخص ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ ﴾ ''اور آپس میں دو عادل شخصوں کو گواہ کرلو۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ﴾ ''......جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کرلو۔''[3]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا ﴾

[1] بنیادی اسباب میراث تین ہیں: نسب، نکاح اور ولاء۔ ہر ایک کی تفصیل وراثت کے ابواب میں گزر چکی ہے۔ (صارم)

[2] الطلاق 2:65. [3] البقرۃ 2:282.

''اے مسلمانو! اگر تمھیں کوئی فاسق خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔''[1]

فقہائے کرام میں اس بات پر اختلاف ہے کہ کیا وصف عدالت ظاہری اور باطنی طور پر ہو یا ظاہری طور پر کافی ہے۔اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ان میں سے راجح قول یہی ہے کہ ظاہری عدالت ہی کا اعتبار ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی شخص کی شہادت کو قبول کیا تھا۔اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:[اَلْمُسْلِمُونَ عُدُولٌ] ''تمام مسلمان عادل ہیں۔''[2]

▲ قاضی پر لازم ہے کہ وہ عادل شخص کی گواہی کی بنا پر فیصلہ صادر کر دے،البتہ اگر اس کے خلاف مواد موجود ہو تو جائز نہیں۔

▲ اگر قاضی کو کسی گواہ کے عادل ہونے کا علم نہ ہو تو وہ کسی ایسے معتبر شخص سے معلومات حاصل کرے جو اس کے ساتھ رہنے یا کوئی معاملہ کرنے یا اس کے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے خبر رکھتا ہو۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ایک شخص نے کسی کے بارے میں تعریفی کلمات کہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: کیا تم اس کے پڑوسی ہو؟ اس نے کہا: نہیں، پھر پوچھا: کیا تم نے اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، پھر امیر المومنین نے پوچھا: تم نے اس سے درہم و دینار کا لین دین کیا ہے؟ تو اس نے کہا: نہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔

▲ اگر گواہ کے بارے میں تحقیق کرتے وقت بعض لوگ اسے قابل اعتماد قرار دیں اور بعض نا قابل اعتماد تو اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی کیونکہ تعریف کرنے والے کی نسبت تنقید کرنے والے کی معلومات گہری اور وزنی ہوتی ہیں۔ تعریف کرنے والے کی نظر ظاہری حالات پر ہوتی ہے جبکہ تنقید کرنے والے کی نگاہ انسان کے مخفی حالات پر بھی ہوتی ہے۔تنقید کرنے والا ایک خامی یا برے وصف کی موجودگی ظاہر کرتا ہے جبکہ تعریف کرنے والا صرف خامیوں کی نفی کرتا ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے۔

▲ اگر مدعا علیہ اکیلا ہی گواہ کی تعریف کرے یا اسے سچا کہہ دے تو گواہ کے قابل اعتماد ہونے کے لیے یہ بھی کافی ہے کیونکہ گواہ کو قابل اعتماد سمجھنا مدعی کے حق کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے،اس لیے اس کے اقرار کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیا جائے گا۔

▲ جب قاضی کو مدعی کے گواہ کے قابل اعتماد ہونے کا علم ہو تو وہ اس کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔اب تحقیق کی ضرورت نہیں۔اسی طرح اگر اسے گواہ کے قابل اعتماد ہونے کا علم نہ ہو تو اس کی بنیاد پر فیصلہ نہیں دے سکتا۔اگر

[1] الحجرات 6:49. [2] السنن الکبریٰ للبیہقي : 155/10.

اسے گواہوں پر شک ہو تو ان سے پوچھے کہ انھیں یہ معلومات کب اور کیسے حاصل ہوئیں؟

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قاضی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر دو آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص نے چوری کی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ان پر شک ہوا تو فرمایا: ''تم دونوں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دو۔ یہ سن کر وہ بھاگ گئے۔''[1]

اگر فریق مخالف نے گواہوں کو ناقابل اعتبار قرار دیا تو اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ ان کے ناقابل اعتبار ہونے کا ثبوت پیش کرے کیونکہ حدیث میں ہے:

«اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي» ''گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے۔''[2]

لہٰذا اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ اگر اس نے اپنی جرح کے حق میں گواہ پیش نہ کیے تو فیصلہ اس کے خلاف دے دیا جائے گا کیونکہ جرح کے حق میں مذکورہ مدت میں گواہ پیش نہ کر سکنا اس کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے۔

▲ اگر قاضی کو گواہوں کے حالات زندگی کے بارے میں علم وخبر نہ ہو تو وہ مدعی سے اس کے بارے میں تزکیہ طلب کرے تاکہ ان کا عادل اور دیانت دار ہونا ثابت ہو اور ان کی شہادت پر فیصلہ دیا جائے۔ کسی شخص کے تزکیے کے لیے دو آدمیوں کی شہادت شرط ہے۔ بعض کے نزدیک ایک آدمی کی شہادت تزکیہ کافی ہے۔

▲ اگر ایک فریق عدالت سے غائب ہے اور وہ اس قدر مسافت پر ہے جس سے نماز قصر کرنے کا حکم ہے تو قاضی اس کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے بشرطیکہ دلائل اس کے خلاف جا رہے ہوں، چنانچہ حدیث میں ہے: ''ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان رضی اللہ عنہ کچھ زیادہ ہی کفایت شعار ہیں وہ مجھے نان ونفقہ کے لیے اس قدر نہیں دیتے جو مجھے اور میری اولاد کے لیے کافی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو ان کی غیر حاضری میں اس قدر مال لے سکتی ہے جو تجھے اور تیری اولاد کو کفایت کر جائے۔''[3]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ غیر حاضر شخص کے خلاف فیصلہ دیا جا سکتا ہے، پھر جب وہ حاضر ہوگا تو اس کی دلیل سنی جائے گی کیونکہ اب رکاوٹ ختم ہو گئی ہے۔

▲ جب یہ فیصلہ دے دیا جائے کہ حق فلاں شخص کا ہے تو اس سے یہ دعویٰ ختم نہیں ہو سکتا کہ صاحب حق کو اس کی

---

[1] الطرق الحكمة لابن القيم، ص: 68و99،100. [2] جامع الترمذي، الأحكام، باب ما جاء في أن البينة على المدعي ......، حديث:1341. [3] صحيح البخاري، النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل ......، حديث:5364، وصحيح مسلم، الأقضية، باب قضية هند، حديث: 1714.

ادائیگی کی جائے یا یہ کہ مدعا علیہ اس سے بری الذمہ ہو چکا ہے یا کوئی اور صورت پیش آ چکی ہے جس سے حق ختم ہو گیا ہے۔

▲ غیر حاضر شخص کے خلاف فیصلہ دینے میں یہ شرط ہے کہ وہ قاضی کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو۔ اگر وہ اس کے دائرۂ اختیار کی حدود میں ہو اور وہاں کوئی فیصلہ کرنے والا (نائب قاضی) موجود نہ ہو تو قاضی کسی ایسے شخص کے نام تحریری آرڈر جاری کرے جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر سکے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی بھی شخص کے لیے ان میں صلح کروانے کا حکم جاری کرے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو مدعی سے کہے کہ اپنا دعویٰ ثابت کرو۔ اگر وہ ثابت کر دے تو مدعا علیہ کو حاضر کیا جائے گا، خواہ وہ کتنی ہی دور ہو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے: ''علمائے مدینہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ غیر موجود کے خلاف فیصلہ دے دیتے ہیں۔'' اور فرمایا: ''یہ موقف اچھا ہے۔''

علامہ زرکشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام احمد رحمہ اللہ دعویٰ سننے اور گواہی سننے کو غلط نہیں سمجھتے تھے۔'' پھر علمائے مدینہ اور علمائے عراق کے اقوال بیان فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس مسئلے پر دونوں شہروں کے علماء میں اتفاق ہے۔

▲ غیر مکلّف کے خلاف بھی دعوے کی سماعت ہو گی اور فیصلہ دیا جائے گا۔ اس کی دلیل ہند رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ مکلّف ہو جائے تو اس کے خلاف دلائل و شہود پیش کر سکتا ہے۔

حصے داروں میں تقسیم کا بیان

حصے داروں میں تقسیم کا مسئلہ کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ﴾

''اور انھیں خبر دے دیں کہ بے شک پانی ان کے (اور اونٹنی کے) درمیان تقسیم شدہ ہے۔''[1]

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ ﴾

[1] القمر 28:54.

''اور جب تقسیم کے وقت قرابت دار اور یتیم اور مسکین آ جائیں تو تم اس میں سے تھوڑا بہت انھیں بھی دے دو اور ان سے (نرمی سے) بات کرو۔''①

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلشُّفْعَةُ فِيمَا لَمْ يُقْسَمْ» ''حق شفعہ اس چیز میں ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو۔''②

علاوہ ازیں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس مسئلے پر اجماع کا ہونا متعدد علماء سے منقول ہے۔ مزید برآں انسان کی ضرورت اس مسئلے کی متقاضی ہے کیونکہ جن لوگوں کا حق ایک مشترک چیز سے متعلق ہے اس کی وصولی تقسیم کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

تقسیم کا مطلب ہے، ایک مشترک چیز میں جس شخص کا جو حصہ ہے اسے الگ الگ کر دینا۔ تقسیم کی دو قسمیں ہیں: ① رضامندی کی تقسیم ② زبردستی کی تقسیم۔

رضامندی کی تقسیم: ایسی تقسیم جس میں تمام شرکاء کا متفق ہونا ضروری ہو ان کی رضامندی کے بغیر تقسیم جائز نہ ہوگی۔ ایسی تقسیم میں بعض دفعہ کسی کو تھوڑا بہت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کسی کو مشترک چیز میں اس کے حصے کے بدلے میں معاوضہ لینا یا دینا پڑتا ہے۔ ایسی تقسیم عموماً وہاں ہوتی ہے جہاں چھوٹے مکان یا تنگ دکانیں ہوں یا ایسی زمین جس کے حصے عمارت یا درختوں کی وجہ سے مختلف ہوں یا ایک حصے دار کسی خاص حصے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہو۔

ایسی مشترک شے کی تقسیم میں تمام شرکاء کا اتفاق اور ان کی رضامندی لازمی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ۔''③

روایت کے عمومی الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جس تقسیم میں تھوڑا بہت نقصان برداشت کرنا پڑے اس میں تمام شرکاء کی رضامندی ضروری ہے۔

یہ تقسیم ایسی بیع کے حکم میں ہے جس میں شے کو کسی عیب کی وجہ سے واپس کر دیا جاتا ہے اور جس میں خیار مجلس یا شرط وغیرہ بھی داخل ہو۔ اگر کوئی تقسیم کو قبول نہ کرے تو اس پر زبردستی بھی نہیں کی جاسکتی، البتہ اگر کوئی ایک شریک

---

① النسآء 4:8. ② ذكره البخاري في ترجمة الباب، كتاب الشفعة، باب الشفعة في مالم يقسم......و موارد الظمآن (ابن حبان): 4/39,38، حديث: 1152. ③ مسند أحمد 1/313، و سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، حديث: 2340.

مشترک شے کو بیچنے کا مطالبہ کرے تو اس شے میں شریک دوسرے شخص کو بھی شے کی فروخت پر آمادہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی انکار کر دے تو قاضی اس شے کو خود فروخت کرے گا اور اس کی قیمت دونوں میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم کرے گا۔

تقسیم کے نتیجے میں کسی کو ہونے والے نقصان سے مراد یہ ہے کہ تقسیم کی صورت میں قیمت کم ہو جائے، خواہ تقسیم کرنے کے بعد وہ اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں، لہٰذا اگر تقسیم کے بعد وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو یہ نقصان معتبر نہ ہوگا۔

زبردستی کی تقسیم: یہ ایسی قسم ہے جس میں تقسیم سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا اور نہ کسی کو کوئی معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ اس قسم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قاضی رکاوٹ بننے والے شریک کو زبردستی کر کے بھی منوا سکتا ہے، بشرطیکہ اس تقسیم سے متعلق تمام شرائط موجود ہوں۔ ایسی تقسیم وہاں ہوتی ہے، جہاں علاقے، باغ، بڑے گھر، وسیع زمین، کھلی دکانیں یا ایک جنس کی ناپ اور وزن والی اشیاء کی تقسیم کا مسئلہ ہو۔

اس تقسیم میں رکاوٹ بننے والے کو مجبور کرنے کے لیے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے: ① شرکاء کی ملکیت قانونی طور پر ثابت ہو۔ ② اسے یہ علم ہو کہ اس تقسیم میں کسی کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ③ اسے یہ بھی علم ہو کہ مشترک شے کمی بیشی کے بغیر حصص کے مطابق تقسیم ہو جائے گی۔

جب یہ مذکورہ بالا شرائط موجود ہوں، نیز شرکاء میں سے کسی ایک کا تقسیم کرنے کا مطالبہ ہو تو دوسرے شریک کو تقسیم پر مجبور کیا جائے گا اگرچہ وہ اپنے شریک کے ساتھ تقسیم کرنے میں رکاوٹ ڈالے کیونکہ تقسیم شراکت کے نقصان کو ختم کر دیتی ہے اور ہر ایک اپنے حصے میں مختار ہو جاتا ہے کہ اس سے جس طرح چاہے فائدہ اٹھائے، مثلاً: زمین میں پودے لگائے یا اس میں کوئی عمارت تعمیر کرے وغیرہ اور یہ صورت شراکت کی بقا میں ممکن نہ تھی۔

اگر مشترک چیز کا ایک شریک نابالغ یا غیر عاقل ہے تو اس کا ولی اس کی طرف سے نائب ہوگا۔ اگر کوئی شریک غیر حاضر ہو تو خود قاضی اس کا نائب ہوگا۔

درحقیقت یہ تقسیم ہر شریک کو اس کا حق ادا کرنے کی آسان صورت ہے۔ اور یہ سابق قسم کی طرح ''بیع'' کے حکم میں بھی نہیں بلکہ بیع کے احکام سے مختلف ہے۔

شرکاء مشترک شے کو خود بھی تقسیم کر سکتے ہیں یا کسی سے تقسیم کروا سکتے ہیں یا قاضی سے کسی تقسیم کرنے والے شخص کی تقرری کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

حصص کی برابر تقسیم کے لیے ضروری ہے کہ ان کے برابر اجزاء بنا لیے جائیں بشرطیکہ ایسا کرنا ممکن ہو، مثلاً: ایک جنس کی ناپ یا وزن والی شے ہو۔ اگر اس شے کے برابر اجزاء نہ بن سکیں تو مکمل شے کی جو قیمت ہو اسے حصص کے مطابق تقسیم کر دیا جائے، مثلاً: اس انداز سے کہ ادنیٰ درجے کی چیز کا حصہ بڑا بنایا جائے اور اعلیٰ چیز کا حصہ چھوٹا کہ دونوں حصوں کی قیمت برابر ہو۔ اگر یہ دونوں طریقے ممکن نہ ہوں تو اعلیٰ چیز لینے والا ادنیٰ چیز لینے والے کو اتنی رقم ادا کرے جس قدر اس کو حاصل ہونے والی چیز کی قیمت اس کے اصل حصے سے زیادہ ہے۔

جب شرکاء تقسیم یا قرعے پر رضامند ہو جائیں تب تقسیم ضروری ہے۔ تقسیم کرنے والا حاکم کے قائم مقام ہوگا۔ اگر قرعہ ہو تو وہ حاکم کے حکم کا درجہ رکھتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک قرعے کا تعلق ہے تو وہ کنکریوں کے ساتھ کریں یا کاغذ پر نام لکھ کر، ہر صورت جائز ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کاغذ کے ٹکڑے پر ایک شراکت دار کا نام لکھ کر قرعہ ڈالا جائے اور یوں ہر ایک کا حصہ معلوم کر لیا جائے۔

اگر ایک شریک دوسرے کو اختیار دے دے تو باہمی رضامندی سے شے کی تقسیم ہوگی خواہ شرکاء ایک جگہ جمع نہ بھی ہوں۔

اگر دو آدمیوں نے مشترک شے باہمی رضامندی سے تقسیم کر لی اور پھر اپنی رضامندی پر گواہ بھی مقرر کر لیے تو اس کے بعد کسی نے تقسیم کے غلط ہونے کا اعتراض یا دعویٰ کیا تو اس کا دعویٰ قابل التفات نہ ہوگا کیونکہ جس صورت سے شے تقسیم ہوئی ہر ایک اس پر رضامندی کا اظہار کر چکا ہے (بلکہ اس پر گواہ بھی مقرر کر چکا ہے،) لہٰذا اگر اس نے معاہدۂ تقسیم میں شریک ساتھی کو کچھ زیادہ شے دینے کا وعدہ کیا ہے تو وہ حصہ اسے دینا ہوگا (کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔)

اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ حاکم کے مقرر کردہ شخص نے یا جس کو دونوں شریکوں نے تقسیم کے لیے مقرر کیا تھا اس نے تقسیم میں غلطی کی ہے تو اس کا دعویٰ دلیل کے ساتھ قبول کیا جائے گا وگرنہ دعوے کا انکار کرنے والا فریق قسم اٹھائے گا کیونکہ غلطی کا نہ ہونا ہی بنیادی بات ہے۔ اگر مدعی تقسیم کے غلط ہونے کی دلیل پیش کر دے تو دلیل قبول کرتے ہوئے سابقہ تقسیم ختم کر دی جائے کیونکہ اس کی خاموشی کی بنیاد تقسیم کرنے والے کے ظاہری حال پر تھی۔ جب دلیل سے ظاہر ہو گیا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے تو اسے اپنی غلطی کی اصلاح کا حق حاصل ہے۔

دو شریکوں میں سے ہر ایک نے ایک شے کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور دونوں نے اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے قسمیں اٹھا لیں تو تقسیم ختم ہو جائے گی کیونکہ مذکورہ چیز ان دونوں کے سوا کسی کی ملکیت نہیں، نہ ان میں ترجیح

کی کوئی وجہ ہے۔

اگر لاعلمی سے کسی کو ایسا حصہ مل گیا جس میں عیب تھا تو اسے اختیار ہوگا کہ وہ تقسیم کو فسخ قرار دے یا کچھ معاوضہ لے کر تقسیم کو قائم رکھے کیونکہ عیب کا ظہور نقص ہے، لہٰذا اسے مشتری کی طرح اختیار ہوگا۔

دعویٰ اور دلیل کا بیان

''دعویٰ'' کے لغوی معنی ''طلب کرنے اور تمنا کرنے'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ۝ ﴾ ''اوران کے لیے ہوگا جو کچھ وہ طلب (اور تمنا) کریں گے۔''[1]

فقہاء کی اصطلاح میں دعویٰ یہ ہے کہ انسان ایک ایسی چیز کے استحقاق کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرے جو کسی کے قبضے میں ہے یا اس کے ذمے ہے۔

بَيِّنَةُ (دلیل) کے لغوی معنی ''واضح علامت'' کے ہیں۔ اور اصطلاح میں دلیل وہ ہے جو حق اور سچ کو واضح کر دے وہ گواہوں کی صورت میں ہو یا قسم کی صورت میں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شرع میں بَيِّنَةُ اس چیز کا نام ہے جو حق کو واضح اور نمایاں کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے حق و سچ کی ایسی علامات اور نشانیاں مقرر کی ہیں جن سے وہ صاف طور پر نمایاں اور ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس نے ان علامات و نشانات کو مکمل طور پر گرا دیا اس نے شریعت کے بہت سے احکام کو معطل کر دیا اور بہت سے حقوق ضائع کر دیے۔''[2]

- مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ مدعی وہ ہے کہ اگر وہ چپ ہو جائے، یعنی دعوے سے دست بردار ہو جائے تو اس کے ذمے کچھ نہ ہوگا کیونکہ وہ شے کو حاصل کرنے والا ہے۔ اور مدعا علیہ وہ ہے کہ اگر وہ چپ ہو جائے تو فیصلہ اس کے خلاف ہوگا کیونکہ شے اس سے طلب کی جا رہی ہے۔ اس کی خاموشی اس بات کا اقرار ہے کہ وہ کوئی شے دینے کا پابند ہے۔
- صحت دعویٰ یا انکارِ دعویٰ کی ایک شرط یہ ہے کہ مدعی یا منکرِ دعویٰ مکلّف ہو، یعنی عاقل و بالغ اور آزاد ہو۔
- اگر ایک شے کی ملکیت کے بارے میں دو آدمی دعویٰ کریں تو وہ شے جس کے قبضے میں ہے اسے ملے گی بشرطیکہ

---

[1] یٰسٓ 57:36 [2] الطرق الحكمة لابن القيم، ص: 386,384,67.

وہ قسم بھی اٹھائے۔

- جس کے ہاتھ میں شے ہو اسے ''داخل'' کہتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں شے نہ ہو اسے ''خارج'' کہتے ہیں۔
- اگر دونوں میں سے ہر ایک اپنے حق میں اس شے کی ملکیت کی دلیل یا گواہ پیش کر دے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا جس کے قبضے میں وہ چیز نہیں کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ، لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَّأَمْوَالَهُمْ، وَلٰكِنَّ الْيَمِينَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ»

''اگر محض دعوے کی بنیاد پر لوگوں کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے تو بہت سے لوگ آدمیوں کے خونوں اور اموال میں دعوے کرنے لگیں گے، البتہ مدعا علیہ کے ذمے قسم ہے۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے:

«اَلْبَيِّنَةُ عَلٰى مَنِ ادَّعٰى وَالْيَمِينُ عَلٰى مَنْ أَنْكَرَ»

''گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے اور قسم اس پر ہے جو دعوے کا انکار کرے۔''[2]

درج بالا دونوں روایات سے ثابت ہوا کہ گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے اگر وہ پیش کر دے گا تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا۔ قسم اٹھانے کی ذمے داری اس شخص پر ہے جو دعوے کا انکار کر رہا ہے۔ مدعا علیہ قسم تب اٹھائے گا جب مدعی دلیل وشہادت پیش نہ کر سکے۔

اکثر اہل علم کی اس مسئلے میں یہ رائے ہے کہ شے اسے ملے گی جس کے قبضے میں ہے، جس کو ''داخل'' کہا جاتا ہے۔ اور حدیث اس بات پر محمول ہوگی کہ جس کے ہاتھ میں وہ شے ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو ورنہ جس کے قبضے میں وہ شے ہے اور اس کے پاس دلیل (گواہی) بھی ہے تو وہی زیادہ حقدار ہے کہ شے اس کے پاس رہے۔ اس کے بارے میں جمہور کا مسلک درست معلوم ہوتا ہے۔

- اگر وہ شے جس کے بارے میں دونوں فریق دعویٰ رکھتے ہوں کسی ایک کے قبضے میں نہیں اور ظاہری حالات بھی کسی کے حق میں نہیں جو فیصلہ کرنے میں معاون ہوں، نہ کسی کے پاس دلیل وشہادت ہے تو دونوں اس بات پر قسم اٹھائیں گے کہ دوسرے کا اس میں کوئی حق نہیں۔ تب وہ شے دونوں میں برابر تقسیم کر دی جائے گی کیونکہ دعوے میں دونوں برابر ہیں، نیز کسی کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے قرینہ بھی نہیں، البتہ اگر ظاہری قرائن وشواہد کسی کے حق

---

[1] صحیح مسلم، الأقضية، باب اليمين على المدعى عليه، حديث: 1711، ومسند أحمد: 342/1و351و363. [2] سنن الدارقطني: 111/3و217/4، حديث: 3165و4462، وإرواء الغليل: 279/8، حديث: 2661.

میں ہوں تو ان پر عمل ہوگا۔

اگر خاوند اور بیوی کے درمیان گھر کے سامان کے بارے میں جھگڑا ہو جائے تو جو شے مرد کے لائق ہو وہ اسے ملے گی اور جو شے عورت کے استعمال کی ہو وہ عورت کو ملے گی اور جو شے دونوں کے استعمال کی ہو وہ دونوں میں برابر برابر حصوں میں تقسیم ہوگی۔

گواہی کا بیان

شہادت (گواہی) مشاہدہ سے مشتق ہے، اس لیے شاہد (گواہ) وہ شخص ہوتا ہے جو اس چیز کے بارے میں خبر دیتا ہے جس کا اس نے مشاہدہ کیا ہوتا ہے اور جان گیا ہوتا ہے۔

ادائیگیِ شہادت کے وقت گواہ کا یہ کلمات کہنا: ''میں گواہی دیتا ہوں۔'' ضروری ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں علماء کی دو رائے ہیں۔ حنابلہ کا موقف یہی ہے کہ ''شہادت'' کے لفظ کہنے لازمی ہیں۔ ائمہ کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ لفظ ''شہادت'' کہنا ضروری نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے دوسرے موقف کی تائید میں ایک روایت منقول ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہما اللہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم رحمہما اللہ فرماتے ہیں: ''گواہی میں کسی مخصوص الفاظ کا کہنا قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے اور نہ صحابۂ کرام اور تابعین عظام سے منقول ہے، لہٰذا گواہی دینے والا کوئی بھی ایسے کلمات بول سکتا ہے جن سے گواہی کا مدعا حاصل ہوتا ہو، مثلاً: گواہ کہے کہ میں نے ایسا کام ہوتے دیکھا یا ایسی ایسی باتیں خود سنی تھیں وغیرہ۔''[1]

▲ حقوق العباد میں گواہی کو نبھانے کی ذمے داری فرض کفایہ ہے، لہٰذا اگر اس قدر گواہ مل جائیں جو کفایت کر جائیں اور مقصد حاصل ہو جائے تو دوسرے لوگ گناہ گار نہ ہوں گے لیکن اگر کسی خاص شخص کے علاوہ گواہ موجود نہ ہوں تو اس کا گواہ بننا فرض عین ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ﴾ ''اور گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔''[2]

یعنی جب ان کو گواہ بننے کے لیے بلایا جائے تو ان پر حاضر ہونا ضروری ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ

[1] الفتاوی الکبرٰی، الاختیارات العلمیة، ص: 578، والطرق الحکمیة لابن القیم، ص: 387. [2] البقرة 2:282.

آیت کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس سے مراد گواہی اٹھانا اور حاکم (قاضی) کے سامنے اسے ثابت کرنا ہے۔'' اور لوگوں کے حقوق و معاہدات کا ثبوت اس کی ضرورت کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا گواہی اٹھانا اور دینا اسی طرح فرض ہے جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے۔

▲ بوقت ضرورت ادائیگی شہادت اس شخص پر فرض عین ہے جس نے اس ذمے داری کو قبول کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ﴾

''اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپا لے وہ گناہ گار دل والا ہے۔''[1]

آیت کے معنی ہیں کہ جب تمھیں گواہی کے قیام کے لیے بلایا جائے تو نہ اسے چھپاؤ اور نہ خیانت کرو۔ آیت کے الفاظ: ﴿ آثِمٌ قَلْبُهُ ﴾ کے معنی ''فَاجِرٌ قَلْبُهُ''، یعنی اس کا دل گناہ گار ہے۔ اور یہ دلوں کے مسخ ہونے سے متعلق سخت وعید ہے۔ آیت میں دل کو خاص کیا ہے کیونکہ شہادت کا علم اسی جگہ ہوتا ہے۔ آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نے گواہی اٹھائی ہوئی ہے اس پر فرض ہے کہ وہ اسے ادا کرے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''گواہی دینے کی ذمے داری اٹھانا اور اسے ادا کرنا ایک حق ہے جس کے ترک سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔''

نیز فرماتے ہیں: ''قیاس کا تقاضا ہے کہ اگر گواہ کی گواہی چھپانے کی وجہ سے صاحب حق کو نقصان پہنچے تو گواہ کے ذمے تاوان ہوگا۔''

▲ گواہی کی ذمے داری اٹھانے اور اسے نبھانے والے کا یہ حق ہے کہ اسے کسی قسم کی تکلیف یا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اگر گواہ کو گواہی دینے کی صورت میں جانی یا مالی نقصان یا بے عزتی کا اندیشہ ہو تو اس پر گواہی دینا واجب نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ﴾ ''اور (یاد رکھو کہ) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو۔''[2]

نیز حدیث میں ہے:

«لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ» ''نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان دو۔''[3]

▲ گواہ پر لازم ہے کہ وہ علم و یقین کی بنیاد پر گواہی دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① البقرة 283:2. ② البقرة 282:2. ③ سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، حديث: 2340.

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ ''اور جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو۔''[1]

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ ﴾

''ہاں (مستحق شفاعت وہ ہیں) جو حق بات کا اقرار کریں اور انھیں علم بھی ہو۔''[2]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گواہی دینے کے بارے میں سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم سورج کو دیکھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کسی واقعے کو اس طرح صاف وشفاف دیکھو تو گواہی دینا ورنہ چھوڑ دینا۔''[3] امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی سند قابل اعتماد نہیں۔''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے لیکن دوسرے دلائل سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔''

◣ علم درج ذیل امور میں سے کسی ایک سے حاصل ہوتا ہے:

① قوت سماعت سے، یعنی آواز اور کلام سن کر۔

② قوت بصارت سے کہ آدمی واقعے کو آنکھوں سے دیکھ لے۔

③ گواہ نے ایک واقعے کو اس قدر آدمیوں سے سنا کہ یقین کی حد تک علم ہو گیا، مثلاً: نسب یا موت کا ثبوت، البتہ کسی واقعے کی صرف مشہوری کی بنا پر گواہی دینا درست نہیں حتی کہ یقینی علم حاصل ہو جائے۔

◣ کسی کی گواہی تب قبول ہو گی جب اس میں چھ شرائط موجود ہوں:

① بلوغت: بچوں کی گواہی قبول نہ ہو گی الا یہ کہ وہ معاملہ بچوں ہی کا ہو۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہائے مدینہ رحمہم اللہ کا عمل یہی رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر جرح کے معاملے میں بچوں کی گواہی قبول کرتے تھے کیونکہ ایسے معاملات میں بڑے افراد عام طور پر موجود نہیں ہوتے۔ اگر بچوں کی گواہی قبول نہ ہو تو بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے، البتہ بچوں کی گواہی قبول کرنے کے لیے چند ایک شرائط ہیں جو درج ذیل ہیں: ① معاملہ بچوں کا ہو۔ ② وہ اس قدر تعداد میں ہوں کہ ان کی خبر پر یقین ہو جائے۔ ③ متفرق ہونے سے پہلے پہلے گواہی دیں۔ ④ ان کا بیان ایک جیسا ہو۔ ان بچوں کی گواہی سے جو علم ظنی حاصل ہو گا وہ دو آدمیوں کی گواہی سے حاصل ہونے والے علم ظنی سے بہت زیادہ قوی ہو گا، لہٰذا اس کو نہ رد کیا جا سکتا ہے نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔''[4]

---

① بنی إسرآء یل 36:17. ② الزخرف 86:43. ③ المستدرك للحاكم : 110/4، حديث:7045، والكامل في الضعفاء لابن عدي :429/7 في ترجمة محمد بن سليمان بن مشمول. ④ إعلام الموقعين:102/1.

② عقل: مجنون، پاگل کی شہادت قبول نہ ہوگی، البتہ جس شخص کو پاگل پن یا مرگی کے دورے پڑتے ہوں، اس کی گواہی تب قبول ہوگی جب واقعے کو دیکھتے وقت یا گواہی دیتے وقت دورے کی حالت میں نہ ہو۔

③ کلام: گونگے شخص کی شہادت قبول نہ ہوگی اگر چہ اس کے اشارے سمجھ میں آ بھی جائیں کیونکہ شہادت میں یقین پر اعتبار ہوتا ہے اور وہ اشاروں سے حاصل نہیں ہوتا، البتہ گونگے شخص کا اشارہ ان معاملات میں کفایت کرے گا جن کا تعلق اس کی ذات سے ہے، مثلاً: نکاح، طلاق وغیرہ کیونکہ اس معاملے میں مجبوری ہے، البتہ اگر گونگا شخص تحریری صورت میں شہادت پیش کرے تو قابل اعتبار ہوگی کیونکہ تحریر زبان کے الفاظ پر دلالت کرتی ہے۔

④ اسلام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ ''اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کر لو۔''[1]

کافر کی گواہی صرف حالت سفر میں کی گئی وصیت پر قبول ہوگی بشرطیکہ وہاں کوئی مسلمان موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ﴾

''اے ایمان والو! اگر تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو وصیت کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے دو صاحب عدل گواہ بنا لو اور اگر تم حالت سفر میں ہو اور تمھیں موت آ لے تو غیر قوم کے بھی دو (غیر مسلموں کو) گواہ بنا سکتے ہو۔''[2]

⑤ حافظہ: غیر عاقل اور کثرت سے نسیان کا شکار ہونے والے شخص کی شہادت قبول نہ ہوگی کیونکہ اس کے بیان سے نہ یقین حاصل ہوتا ہے نہ ظن غالب۔ اس کے غلط ہونے کا احتمال موجود ہوتا ہے، البتہ جسے کبھی کبھار نسیان واقع ہوتا ہو اس کی شہادت قبول ہوگی کیونکہ اس سے شاید ہی کوئی محفوظ ہو۔

⑥ عدالت: عدالت کے لغوی معنی ''سیدھا اور درست ہونے'' کے ہیں اور یہ ظلم وعدوان کی ضد ہے۔ اور شرعی معنی یہ ہیں کہ ''آدمی کے دینی امور یکساں و درست ہوں اور اس کے اقوال و افعال میں اعتدال ہو۔'' گواہ میں وصف عدالت کی شرط کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ﴾ ''جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو۔''[3]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

① الطلاق 2:65. ② المآئدة 106:5. ③ البقرة 282:5.

﴿ وَ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ ''اور آپس میں دو عادل شخصوں کو گواہ بنالو۔''[1]

جمہور علماء کی رائے کے مطابق عدالت یہ ہے کہ مسلمان دین کے واجبات و مستحبات کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور محرمات اور مکروہات سے اجتناب کرتا ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فقہائے کرام اس پر متفق ہیں کہ جھوٹے کی گواہی رد کر دی جائے گی۔ اور عدل کا معیار ہر زمانے، علاقے اور معاشرے (ماحول) کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ہر قوم میں عادل کو گواہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہی آدمی کسی دوسرے علاقے میں ہو تو ان کے عدل کا معیار اور ہوگا، لہٰذا اسی طرح لوگوں میں فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر گواہوں میں یہ شرط ضروری قرار دی جائے کہ وہ واجبات کی ادائیگی کرنے والے ہوں اور حرام کا ارتکاب کرنے والے نہ ہوں، جس طرح صحابۂ کرام تھے تو گواہیاں ختم ہو جائیں یا مشکل ہو جائیں گی۔'' نیز فرماتے ہیں: ''جو صدق و سچائی کے ساتھ معروف ہوں تو ضرورت کے پیش نظر ان کی گواہی قبول کرنے کے لائق ہے، اگرچہ وہ حدود کی پابندی کرنے والے نہ ہوں، جیسے قید خانے میں، دیہاتی حوادثات میں یا ایسی بستی میں جہاں کوئی عادل نہ ہو۔''[2]

▲ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ عدالت میں دو شرطوں کا اعتبار ہوتا ہے:

① ادائے فرض، یعنی پانچ فرض نمازوں اور جمعہ کے علاوہ سنن مؤکدہ کا اہتمام کرنا، لہٰذا جو شخص سنن مؤکدہ اور وتر کا اہتمام نہیں کرتا اس کی شہادت قبول نہ ہوگی۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو آدمی سنن پر ہمیشگی نہ کرے وہ برا شخص ہے کیونکہ ان کے مسلسل ترک کی وجہ سے وہ سنت سے اعراض کرنے والا، معیوب اور قابل ملامت ہے۔'' جس طرح فرائض کی ادائیگی اس پر لازم ہے اسی طرح وہ محارم سے اجتناب کرے، یعنی کبیرہ گناہوں سے بچے اور صغیرہ گناہوں پر مداومت نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے پاک دامن مرد اور عورت پر زنا کا الزام لگانے والے کی شہادت کو مردود قرار دیا ہے، لہٰذا کبیرہ گناہوں کے مرتکب شخص کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کبیرہ گناہ وہ ہے جس کی شرعی سزا دنیا میں مقرر ہے یا قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آخرت میں فلاں سزا ملے گی، مثلاً: سود خوری، جھوٹی گواہی دینا، زنا کرنا، چوری کرنا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنا وغیرہ۔ یہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔ اسی طرح فاسق شخص کی شہادت بھی قبول نہ ہوگی۔

② مُروت اور شرافت، یعنی ایسے کام کرنا جو انسان کے لیے زینت و جمال کا باعث ہوں، مثلاً: سخاوت، حسن

---

① الطلاق 65:2. ② منهاج السنة النبوية:62/1، والفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، الشهادات:574/5.

اخلاق اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کرنا اور خود کو ایسے رذیل اور ذلیل کاموں سے بچانا جو انسان کی عزت کو داغدار کر دیتے ہیں، مثلاً: فحش گانے بولنا، لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹی مزاحیہ باتیں سنانا وغیرہ۔ (اس میں آج کل کے ڈرامے وغیرہ بھی شامل ہیں اور گانا تو آج کل ''فن'' شمار ہونے لگا ہے جس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایسے لوگوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔)

جب کسی میں شہادت دینے کے موانع موجود نہ رہیں، یعنی بچہ بالغ ہو جائے، مجنون بات سمجھنے لگے اور عقل مند ہو جائے، کافر مسلمان ہو جائے، فاسق توبہ کر لے تو ہر ایک کی شہادت قبول ہوگی کیونکہ گواہی کی قبولیت میں اب رکاوٹ نہیں رہی بشرطیکہ دیگر تمام شرائط بھی موجود ہوں۔

- باپ، دادا، پردادا وغیرہ کے حق میں شہادت قبول نہ ہوگی جیسا کہ بیٹے، پوتے اور پرپوتے کے حق میں شہادت قبول نہیں ہوتی کیونکہ اس صورت میں قوت قرابت کے سبب تہمت اور الزام لگنے کا اندیشہ موجود ہے۔
- بھائی کی بھائی کے حق میں شہادت یا دوست کی دوست کے حق میں شہادت قبول ہوگی کیونکہ دلائل شرعیہ میں عموم ہے، نیز یہ تہمت کا مقام نہیں ہے۔
- خاوند اور بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں شہادت قبول نہ ہوگی کیونکہ ہر ایک دوسرے کے مال سے استفادہ کرتا ہے، نیز دونوں میں ایک مضبوط تعلق ہونے کی وجہ سے ہر ایک پر جانبداری کا الزام لگ سکتا ہے، البتہ ان تمام رشتے داروں کی شہادت اس وقت قبول ہوگی جب ایک دوسرے کے خلاف گواہی دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ﴾

''(اے ایمان والو!) عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودئ مولا کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو کہ وہ خود تمھارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے۔''[1]

لہٰذا اگر کسی نے اپنے باپ، بیٹے، بیوی یا خاوند کے خلاف گواہی دی تو اسے قبول کیا جائے گا۔

- جس شخص کو گواہی کے نتیجے میں فائدہ پہنچتا ہو یا وہ کسی نقصان سے محفوظ ہوتا ہو تو اس کی گواہی بھی قبول نہ ہوگی۔
- اگر دو آدمیوں کی باہم گہری دشمنی ہے تو ایک کی دوسرے کے خلاف شہادت قبول نہ ہوگی کیونکہ ممکن ہے کوئی باطل شہادت کے ذریعے سے دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے

[1] النسآء 4:135۔

ہے۔

باہمی دشمنی جاننے کا معیار یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کا دکھ درد دیکھ کر خوش اور اس کا سکھ اور خوشی دیکھ کر پریشان ہو۔ واضح رہے یہاں دشمنی سے مراد دنیوی دشمنی ہے، دینی دشمنی نہیں کیونکہ دینی دشمنی شہادت کے قبول ہونے میں مانع نہیں، لہٰذا مسلمان شخص کی گواہی کافر کے خلاف قبول ہوگی جس طرح موحد کی گواہی بدعتی کے خلاف قبول ہوگی۔

▲ جو شخص اپنے قبیلے کی حمایت میں متعصب ہے، اس قبیلے والوں کے حق میں اس کی گواہی قبول نہ ہوگی کیونکہ اس میں تہمت لگنے کا اندیشہ موجود ہے۔

▲ گواہوں کی تعداد کا نصاب مختلف واقعات میں مختلف ہے:

① زنا اور قوم لوط کے عمل کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ﴾ ''وہ اس پر چار گواہ کیوں نہیں لائے؟''[1]

ایسے معاملات میں چونکہ پردہ پوشی کا حکم ہے، اس لیے نصاب شہادت میں سختی کی گئی ہے۔

② اگر کوئی شخص مالداری میں مشہور ومعروف تھا اب اسے محتاج اور فقیر ثابت کیا جا رہا ہے تو اس میں تین آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی کیونکہ حدیث میں ہے:

«حَتَّى يَقُولَ ثَلَاثَةٌ مِّنْ ذَوِي الْحِجَا مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ»

''یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین اشخاص گواہی دیں کہ فلاں کو فقر وفاقہ کی نوبت آگئی ہے۔''[2]

③ زنا کے سوا باقی حدود، جیسے حد قذف، شراب نوشی، چوری، ڈاکہ زنی اور قصاص میں دو آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی۔ ان امور میں عورتوں کی شہادت قبول نہ ہوگی۔

④ جس کام کے کرنے میں سزا یا کفارہ نہ ہو یا معاملہ مال سے تعلق نہ رکھتا ہو اور نہ اس سے مقصود حصول مال ہو، نیز مردوں ہی کو اس سے عموماً واسطہ پڑتا ہو، مثلاً: نکاح، طلاق اور رجوع وغیرہ تو ان امور میں دو مردوں کی شہادت کافی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم رحمہ اللہ نے رجوع پر عورتوں کی گواہی قبول کرنے کو درست کہا ہے کیونکہ ان کا رجوع کے وقت حاضر ہونا کسی دوسرے معاہدے وغیرہ کی تحریر کے وقت حاضری سے آسان ہے۔[3]

[1] النور 24:13. [2] صحيح مسلم، الزكاة، باب من تحل له المسألة، حديث: 1044. [3] إعلام الموقعين: 98/1.

⑤ مال یا جس معاملے میں مال مقصود ہو، مثلاً: بیع، ادھار یا اجارہ وغیرہ تو اس میں دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ ﴾

''اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کرلو۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک آدمی اور دو عورتوں کی گواہی قبول ہوگی۔ اسی طرح جو امور مالی معاملات سے ملحق ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے، مثلاً: بیع، ادھار، بیع خیار، رہن، معین فرد کے حق میں وصیت کرنا، ہبہ، وقف، مالی ضمان، مال کا ضیاع، مجہول النسب شخص کے غلام ہونے کا دعویٰ کرنا اور تعیین مہر یا خلع میں معاوضے کا تعین وغیرہ۔''[2]

مالی معاملات میں عورت کی شہادت قبول کرنے میں یہ حکمت ہے کہ ایسے معاملات کثرت سے وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، مردوں اور عورتوں کو اس سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے ثبوت میں وسعت رکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شریعت کے متعدد احکام میں مرد کے مقابلے میں عورت کا نصف حصہ مقرر کیا، مثلاً: گواہی کے معاملے میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں مقرر کی ہیں۔ اسی طرح میراث اور دیت میں اس کا حصہ مرد سے نصف ہے اور عقیقے میں بھی بچی کے لیے ایک بکری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت یوں بیان کی ہے:

﴿ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ﴾ ''اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔''[3]

آیت کریمہ عورت کے ضعف عقل پر واضح دلیل ہے، لہٰذا ایک عورت ایک مرد کے قائم مقام نہ ہوگی۔ عورت کی گواہی کلیتاً ختم کرنے میں بہت سے حقوق کا ضیاع ہوسکتا ہے، اس لیے عورت کے ساتھ ایک اور عورت مقرر کر دی گئی تاکہ بھول کا علاج ہو جائے۔ اس طرح دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے قائم مقام قرار پائی۔

⑥ مالی معاملات میں یا جہاں مال مقصود ہو ایک آدمی کی گواہی اور مدعی کی قسم کے ساتھ بھی فیصلہ کرنا شرعاً درست

[1] البقرة 2:282. [2] إعلام الموقعين:1/97. [3] البقرة 2:282.

ہے کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضٰى بِالْيَمِينِ مَعَ الشَّاهِدِ»

''آپ ﷺ نے (مدعی کی) قسم اور ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ دیا۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امت مسلمہ میں یہ سنت (طریقہ) جاری ہے کہ قسم اور ایک گواہ سے فیصلہ ہوگا۔''[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ مذکورہ بالا روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''یہ حدیث اس حدیث کے معارض نہیں ہے جس میں ہے کہ ''قسم مدعا علیہ پر ہے'' کیونکہ مقصود یہ ہے کہ جب مدعی کے پاس صرف دعویٰ ہو دلیل نہ ہو تو محض دعویٰ کی وجہ سے اس کے حق میں فیصلہ نہ ہوگا، البتہ جب اس کی جانب گواہی یا کسی غیر واضح ثبوت وغیرہ کی وجہ سے راجح قرار پائی تو فیصلہ مدعی کے حق میں محض دعوے سے نہیں ہوا بلکہ اس کی جانب کو قسم اور گواہ وغیرہ سے اہمیت اور ترجیح ملی......''[3]

⑦ وہ امور جن کی مردوں کو عموماً خبر نہیں ہوتی، مثلاً: عورت کے وہ عیوب جو اس کے قابل ستر جسم کے حصے پر ہوں یا عورت کا کنواری ہونا، نیز حیض، ولادت، رضاع اور نومولود بچے کا زندہ یا مردہ پیدا ہونا، ایسے امور میں ایک معتبر اور متقی عورت کی گواہی قبول ہوگی کیونکہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَجَازَ شَهَادَةَ الْقَابِلَةِ»

''رسول اللہ ﷺ نے اکیلی دایہ کی شہادت کو قابل قبول قرار دیا۔''[4]

اگرچہ اس روایت کی سند میں کمزوری ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے رضاعت کے مسئلے میں ایک عورت کی گواہی کو قبول کیا ہے (جیسا کہ صحیح بخاری میں عقبہ بن حارث کا قصہ مذکور ہے۔)[5]

قاضی کا دوسرے قاضی کی طرف خط

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک قاضی کو دوسرے قاضی کی طرف خط لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ایک آدمی کا حق

① صحيح مسلم، الأقضية، باب وجوب الحكم بشاهد ويمين، حديث: 1712، وسنن أبي داود، القضاء، باب القضاء باليمين والشاهد، حديث: 3610 واللفظ له. ② المغني والشرح الكبير : 13/12. ③ إعلام الموقعين: 106/1. ④ [ضعيف] سنن الدار قطني : 232/4، حديث: 4511، والسنن الكبرى للبيهقي : 151/10. ⑤ صحيح البخاري، العلم، باب الرحلة في المسئلة النازلة و تعليم أهله، حديث: 88.

اگر دوسرے شہر میں ہو، اس کے پاس اسے ثابت کرنے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لیے یہی طریقہ ہے کہ اس شہر کے قاضی کے پاس اپنا حق ثابت کرے اور اس مقصد کے لیے تحریری درخواست بھیجے تاکہ عدالتی کاروائی مکمل کی جا سکے کیونکہ گواہوں کو سفر کروا کر حاضر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی گواہ ایک شہر میں معروف ہو اور دوسرے شہر میں اسے کوئی جانتا نہ ہو۔ اس صورت میں ایک قاضی کے دوسرے قاضی سے خط کتابت کیے بغیر حق ثابت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اگر قاضی دوسرے قاضی کو خط لکھے تو اس کے قبول ہونے پر امت مسلمہ کا اجماع ہے تاکہ حقوق کا اثبات اور اس کا نفاذ ہو سکے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کی طرف خط لکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی، قیصر اور کسریٰ کی طرف خطوط لکھے تھے جس میں انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمّال اور اہل کاروں کی طرف خطوط لکھتے تھے جن میں انھیں حالات کے مطابق ہدایات دیتے تھے۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ تحریری طور پر بھیجی ہوئی ہدایات و معلومات پر عمل کرنا اور فیصلے میں اسے اہمیت دینا شرعاً درست ہے۔

وہ خط قبول ہوگا جو کسی آدمی کے حق سے متعلق ہے۔ حدود اللہ سے متعلق کوئی مکتوب قبول نہ ہوگا، مثلاً: زنا یا شراب کی حد وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق اللہ میں ممکن حد تک پردہ پوشی مقصود ہے اور محض شک وشبہ کی بنا پر حدود نافذ نہ ہوں گی۔

قاضی کا قاضی کی طرف خط دو قسم کا ہوتا ہے:

① قاضی اپنا فیصلہ تحریر کر کے دوسرے قاضی کی طرف بھیجتا ہے تاکہ وہ اسے نافذ کرے۔ ایسا خط قبول ہوگا، اگرچہ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم کا فیصلہ ہر حال میں نافذ کرنا ضروری ہے ورنہ احکامات معطل ہوں گے اور تنازعات بڑھیں گے۔

② قاضی دوسرے قاضی کی طرف ایسی بات لکھے جو اس کے ہاں متحقق اور ثابت شدہ ہو تاکہ دوسرا قاضی اس کی روشنی میں فیصلے دے۔ اس قسم کی تحریر تب قبول ہوگی جب دونوں قاضیوں کے درمیان کم از کم اس قدر مسافت ہو جس قدر نمازِ قصر کے لیے مقرر ہے کیونکہ مکتوب الیہ کی طرف گواہی منتقل کرنا قرب مسافت کی صورت میں جائز نہیں۔

ثابت شدہ امر کی اطلاع دوسرے قاضی کو دینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لکھے: ''میرے نزدیک یہ بات متحقق اور ثابت ہے کہ فلاں شخص کا فلاں پر یہ یہ حق ہے۔''

یاد رہے کہ اس قسم کی تحریر فیصلہ قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ یہ ایک چیز کے تحقق کی اطلاع ہے (جس کی روشنی میں دوسرا قاضی اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مکتوب الیہ (قاضی) غیر معین بھی ہوسکتا ہے، مثلاً: قاضی کہے: میری یہ تحریر بلاتعیین مسلمانوں کے ان تمام قاضیوں کی طرف ہے جن کو یہ خط پہنچے، لہٰذا یہ تحریر جس قاضی تک پہنچ جائے اسے قبول کرنا ایسے ہی ضروری ہے جیسے کسی معین قاضی کی طرف لکھی گئی تحریر۔''

قاضی کا خط قاضی کے لیے تب قبول ہوگا جب لکھنے والا اپنی تحریر پر دو عادل گواہوں کی شہادت ثبت کرے گا۔ اس کے بارے میں علماء کی دوسری رائے یہ ہے کہ ایک قاضی کے لیے دوسرے قاضی کی تحریر پر عمل کرنا تب جائز ہے جب وہ لکھنے والے قاضی کا انداز تحریر پہچانتا ہو، اس صورت میں گواہوں کی ضرورت نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے یہی منقول ہے۔ اس دور میں گواہوں کے بجائے قاضی کی تحریر کے نیچے اس کے دستخط اور عدالت کی مہر لگا دی جائے تو کافی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اجماع ہے کہ تحریر پر اعتماد کر کے کاروائی کرنا درست ہے۔ خلفائے راشدین بھی اس پر عمل کرتے رہے۔ علم کے میدان میں تحریر کا ذریعہ ہمیشہ سے قابل اعتماد رہا ہے۔ اس پر عمل چھوڑ دیا جائے تو شریعت کے بہت سے احکام معطل ہو کر رہ جائیں۔''[1]

شہادت پر شہادت شہادت پر شہادت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کہے: ''میری فلاں گواہی پر گواہ رہو یا گواہ رہو کہ میں فلاں فلاں بات کی گواہی دیتا ہوں وغیرہ۔'' اس میں نیابت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ فقہ میں اصلی گواہ کو ''شاہد الاصل'' اور اس کے نائب کو ''شاہد الفرع'' کہا جاتا ہے۔

علامہ ابوعبید رحمہ اللہ نے مالی امور میں گواہی پر گواہی کے جواز پر حجاز اور عراق کے علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو قبول نہ کیا جائے تو وہ گواہیاں کالعدم ہو جائیں گی جو وقف کے بارے میں ہوں اور انھیں حاکم کے پاس ثابت کرنے میں تاخیر ہو جائے یا اس کے گواہ فوت ہو گئے ہوں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کا نقصان ہوگا اور بہت مشقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے شاہد الاصل کی طرح گواہی پر گواہی کو بھی قبول کرنا ضروری ہے۔

گواہی پر گواہی کے قبول ہونے کے لیے چند ایک شرائط یہ ہیں:

① شاہد الاصل اپنے شاہد الفرع کو اس کی اجازت دے کیونکہ شاہد الفرع کا عمل نیابت کے حکم میں ہے اور نیابت اصل کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہوتی۔

① إعلام الموقعين: 2/127.

② یہ شہادت ایسی صورت میں ہو جس میں قاضی کی تحریر دوسرے قاضی کے لیے مقبول ہوتی ہے، یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو نہ کہ حقوق اللہ سے متعلق۔

③ شہادۃ الفرع وہاں قبول ہوگی جہاں شہادۃ الاصل کا پیش کرنا مشکل ہو اور یہ مشکل موت، مرض، طویل مسافت کے سفر (جس میں نماز قصر کی جاسکتی ہو) یا بادشاہ کے خوف وغیرہ کی صورت میں ہوسکتی ہے۔

④ شاہد الاصل کا عذر مقدمے کا فیصلہ ہو جانے تک قائم رہے۔

⑤ شاہد الاصل اور شاہد الفرع دونوں فیصلہ ہونے تک عدالت (تقویٰ و نیکی) پر برقرار ہوں۔

⑥ شاہد الفرع کو شاہد الاصل نے متعین کیا ہو جس کی طرف سے وہ گواہی دے رہا ہے۔

گواہوں کا رجوع: گواہوں کے گواہی سے رجوع کر لینے کی صورت میں درج ذیل تین باتیں قابل غور ہیں:

① اگر مالی امور سے متعلق فیصلہ مل جانے کے بعد گواہ رجوع کر لیں تو فیصلہ متاثر نہ ہوگا کیونکہ اس کے تقاضے پورے ہو چکے ہیں، لہٰذا فیصلہ نافذ ہوگا، البتہ گواہوں کے ذمے تاوان ہوگا کیونکہ وہ قصوروار ثابت ہوئے ہیں کہ انھوں نے صاحب حق کے بجائے دوسرے شخص کو مال کا مالک بنانے کی کوشش کی۔

② اگر قاضی ایک گواہ اور مدعی کی قسم سے کوئی فیصلہ دے، پھر گواہ رجوع کر لے تو سارے مال کا تاوان اکیلے گواہ پر ہوگا کیونکہ دعوے میں وہ حجت تھا۔ باقی رہی قسم تو وہ ایک فریق کے قول کے درجے میں تھی اور فریق کا قول محض فیصلہ کرنے میں قبول نہیں ہوتا بلکہ وہ فیصلے کے لیے ایک شرط تھا۔

③ اگر قاضی کے فیصلہ دینے سے قبل ہی گواہ رجوع کر لیں تو کی گئی کاروائی کالعدم ہو جائے گی۔ اب نہ (اس گواہی کے مطابق) فیصلہ ہوگا نہ کسی پر تاوان۔ واللہ أعلم.

دعوے میں قسم اٹھانے کا بیان

قسم بھی فیصلہ کرنے کے طریقوں میں شامل ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْيَمِينُ عَلٰى مَنْ أَنْكَرَ» ''......اور قسم اس پر ہے جو (دعوے کا) انکار کرے۔''[1]

قسم منکرِ دعویٰ (مدعا علیہ) کی طرف سے ہوتی ہے بشرطیکہ مدعی کے پاس دلیل نہ ہو۔ قسم جھگڑے کو ختم کر دے

---

① سنن الدار قطني: 3/111و4/217، حديث:3165و4462.

گی، یعنی قسم اٹھانے سے اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا لیکن قسم اٹھا کر اگر کسی نے شے پر ناحق قبضہ کر لیا تو وہ شے جائز نہ ہوگی۔ اگر مدعی نے مدعا علیہ کی قسم کے بعد گواہ پیش کر دیے تو گواہوں کی گواہی سنی جائے گی اور ان کی بنیاد پر اس کے حق میں فیصلہ بھی ہوگا۔ اسی طرح اگر مدعا علیہ نے قسم اٹھا لینے کے بعد رجوع کر لیا اور لیا ہوا مال واپس کر دیا تو اس کا یہ عمل قبول ہوگا اور مدعی کے لیے اسے وصول کرنا جائز ہوگا۔

- قسم حقوق العباد کے دعوے کے ساتھ مخصوص ہے۔ باقی رہے حقوق اللہ تو اس میں قسم نہیں لی جائے گی، مثلاً: عبادات اور حدود وغیرہ، لہٰذا اگر ایک آدمی نے کہا: میں نے زکاۃ ادا کر دی ہے یا میرے ذمے کفارہ یا نذر نہیں ہے تو اس سے قسم نہیں لی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی پر جنایت کی وجہ سے حد جاری ہو سکتی ہے لیکن وہ اس کا انکار کر رہا ہے تو اس سے قسم کا مطالبہ نہ ہوگا کیونکہ اسے چھپانا مستحب ہے، نیز اگر اس نے کسی حد کا اقرار کر کے، پھر رجوع کر لیا تو اس کا رجوع قبول ہوگا اور اسے چھوڑ دیا جائے گا، لہٰذا اقرار نہ کرنے کی صورت میں اس سے بالاولیٰ قسم کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔
- حقوق العباد کے دعوے میں قسم کی اہمیت اور اس کا اعتبار تب ہوگا جب مدعی گواہ پیش نہ کر سکے، پھر قاضی مدعا علیہ کو قسم اٹھانے کا حکم دے۔ اس طرح مدعا علیہ کی قسم مدعی کے جواب میں ہوگی۔
- قسم کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قاضی کی مجلس میں ہو۔
- قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ہو، غیر اللہ کی قسم شرک ہے۔
- قسم میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کافی ہے۔ اگر کسی نے کہا: ''اللہ کی قسم'' تو یہ کافی ہے کیونکہ یہ قسم کتاب اللہ میں وارد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ﴾ ''ان لوگوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں۔''[1]

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ ﴾ ''پھر وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ ﴾ ''چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے۔''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، اس کا اطلاق اس کے سوا کسی دوسرے پر نہیں ہوتا۔

① الأنعام 109:6. ② المآئدة 107:5. ③ النور 6:24.

▲ قسم میں تاکیدی الفاظ صرف ان معاملات میں استعمال کیے جائیں گے جن کی بہت زیادہ اہمیت ہے، مثلاً: ایسا جرم جس سے قصاص، دیت یا کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنا واجب نہیں ہوتا، اس صورت میں قاضی تاکیدی الفاظ کے ساتھ قسم کھانے کا حکم دے سکتا ہے، مثلاً: ''اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو پوشیدہ اور ظاہر معاملات سے باخبر ہے جو مؤاخذہ کر سکتا ہے، غالب ہے، جو نفع نقصان کا مالک ہے، جو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی پوشیدہ باتوں سے باخبر ہے۔''

▲ اگر مدعی فریق ایک سے زیادہ افراد پر مشتمل ہو مدعا علیہ ایک آدمی ہو تو مدعا علیہ ہر مدعی کے لیے الگ الگ قسم اٹھائے گا کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا حق ہے الا یہ کہ اگر وہ ایک قسم لینے پر رضامند ہو جائیں تو کافی ہو گی کیونکہ تمام مدعی افراد اپنے حق (مطالبۂ قسم) سے خود ہی دستبردار ہوئے ہیں۔

اِقرار کے احکام

اِقرار ''کسی کے حق کا اعتراف کرنے'' کا نام ہے جو کہ مَقَرٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں: ''مکان'' گویا کہ اقرار کرنے والا حق کو اس کی جگہ پر رکھ دیتا ہے۔

اقرار یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کے حق کے بارے میں مبنی بر حقیقت خبر دینا ہے، مزید نئے حق کا اثبات اقرار نہیں کہلاتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تحقیقی بات یہ ہے کہ اگر مخبر ایسے حق کی خبر دے جسے اس نے ادا کرنا ہے تو یہ اقرار ہے اور اگر ایسے حق کی خبر دے جو اس نے دوسرے سے لینا ہے تو وہ مدعی ہے اور اگر ایسے حق کے بارے میں خبر دے جو کسی نے کسی اور شخص سے لینا ہے (اگر اس کے پاس وہ حق بطور امانت تھا) تو اسے مخبر کہیں گے ورنہ وہ گواہ کہلائے گا، لہٰذا قاضی، وکیل، کاتب، یعنی منشی اور وَصِیّ (وصیت کرنے والا) یہ تمام حضرات اپنی اپنی ذمے داری کو ادا کرنے کی وجہ سے امانت دار ہیں، لہٰذا وکیل وغیرہ اپنے منصب سے معزول ہونے کے بعد جو خبر دیں وہ اقرار نہیں، عام خبر ہے۔ اقرار کسی نئی ذمے داری کا نام نہیں بلکہ جو چیز یا صورت حال پہلے سے موجود ہے اسی کا اظہار اور اطلاع ہے۔''[1]

[1] الفتاوی الکبری، الاختیارات العلمیة، الإقرار: 5/581.

صحتِ اقرار کے لیے یہ شرط ہے کہ اقرار کرنے والا عاقل و بالغ ہو، لہٰذا بچے، مجنون اور سوئے ہوئے شخص کا اقرار معتبر نہ ہوگا، البتہ اگر بچے کو تجارت میں لین دین کی محدود اجازت ہے تو محدود حد تک اس کا اقرار بھی معتبر ہوگا۔

اقرار کرنے والے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ حالت اختیار میں اقرار کرے، لہٰذا زبردستی کا اقرار معتبر نہ ہوگا۔

صحتِ اقرار کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اقرار کرنے والا ایسا شخص نہ ہو جسے مالی تصرف سے روک دیا گیا ہو، لہٰذا نادان اور بے وقوف کسی مال کا اقرار کریں تو وہ معتبر نہ ہوگا۔

یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایسی شے کا اقرار نہ کرے جو دوسرے کے ہاتھ میں ہو یا دوسرے کی سرپرستی میں ہو، جیسے کسی اجنبی شخص نے کسی بچے کے ذمے کسی چیز کا اقرار کیا یا ایک شخص کے زیر انتظام وقف کے بارے میں دوسرا آدمی اقرار کرے کہ اس وقف کی چیز کے ذمے فلاں فلاں ادائیگی ہے تو یہ اقرار معتبر نہ ہوگا۔

اگر اقرار کرنے والے نے دعویٰ کیا کہ اسے اقرار کرنے پر مجبور کیا گیا تھا، اس نے اپنی مرضی سے اقرار نہ کیا تھا تو اس کی بات قبول کی جائے گی بشرطیکہ اس کے دعوے کی سچائی پر کوئی قرینہ یا گواہ موجود ہو۔

اگر کوئی مریض اپنے مال کے بارے میں ایسے شخص کے لیے اقرار کرے جو اس کا شرعاً وارث نہیں تو اس کا اقرار درست تسلیم ہوگا کیونکہ اس صورت میں اس پر کسی تہمت کا اندیشہ نہیں، نیز حالت مرض میں انسان اپنے لیے محتاط ہوتا ہے اس سے ایسی توقع کم ہی ہوتی ہے۔

اگر کسی انسان نے ایک شے کا دعویٰ کیا جس کی دوسرے فریق (مدعا علیہ) نے تصدیق کر دی تو اس کی تصدیق درست تسلیم ہوگی اور اسے اقرار سمجھا جائے گا۔ کشف الخفاء میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [لَا عُذْرَ لِمَنْ أَقَرَّ] ''جس نے اقرار کر لیا اس کا کوئی عذر باقی نہ رہا۔''[1]

جس لفظ سے بھی اقرار کا مفہوم ادا ہو جائے وہی صحیح ہے، مثلاً: مدعا علیہ کہے: ''تم نے سچ کہا'' یا ''ہاں'' کہہ دے یا کہے: ''میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔''

اقرار میں نصف یا اس سے کم کا استثنا درست ہے۔ اگر کسی نے کہا: ''میرے ذمے فلاں کے دس روپے ہیں مگر پانچ'' تو اس پر پانچ روپے لازم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں استثنا وارد ہوا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ﴾

[1] كشف الخفاء للعجلوني :2/493.

''(اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا)، چنانچہ وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔''[1]

نصف سے اکثر کے استثنا کو علماء کی کثیر تعداد نے جائز قرار دیا ہے۔

- اقرار میں استثنا کی صحت کے لیے اس کا الفاظ میں متصل ہونا شرط ہے۔ اگر اس نے کہا: ''میں نے اس کے سو روپے دینے ہیں۔'' پھر وہ اس قدر خاموش رہا کہ اس وقفہ میں کوئی بات کرنا ممکن تھی (لیکن نہ کی)، پھر کچھ دیر کے بعد کہا: ''کھوٹے'' یا ''ادھار'' تو اس کے ذمے سو روپے کھرے اور نقد ہوں گے۔ خاموشی کے بعد اس نے جو کہا وہ قابل التفات نہ ہوگا کیونکہ یہ حیلہ کر کے ایک ایسے حق کو ختم کر رہا ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم ہے۔
- اگر کسی نے ایک شے بیچ دی یا ہبہ کر دی یا لونڈی، غلام کو آزاد کر دیا اور پھر اقرار کرتے ہوئے کہا: یہ شے دوسرے آدمی کی تھی تو اس کی بات قبول نہ ہوگی۔ اور اگر بیع کا معاملہ ہے تو وہ فسخ نہ ہوگی کیونکہ یہ اقرار کسی اور کے بارے میں ہے، البتہ اس پر ضروری ہوگا کہ جس کے حق کا اقرار کیا تھا، اس کا نقصان پورا کرے کیونکہ اس کے تصرف کی وجہ سے وہ مال مالک کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔
- مجمل شے کا اقرار کرنا درست ہے، یعنی جس میں اقرار کرنے والے کے نزدیک دو یا زیادہ اشیاء میں سے کوئی بھی مراد لیے جانے کا امکان ہو، مثلاً: جب کسی انسان نے کہا: ''میں نے فلاں شخص کو کوئی شے ادا کرنی ہے۔'' تو اس کا اقرار درست ہوگا، البتہ اقرار کرنے والے کو اقرار کی وضاحت کرنے کا کہا جائے گا تاکہ اس کی ادائیگی اس کے ذمے لازم قرار دی جا سکے۔ اگر وہ انکار کر دے تو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک اقرار کی وضاحت نہ کر دے۔ یہ اس کی ذمے داری ہے۔ اگر اس نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کسی چیز کا اقرار کیا ہے تو اسے قسم اٹھانے کو کہا جائے گا اور اس پر کم از کم جرمانہ عائد ہوگا۔ اگر وہ وضاحت سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کے وارثوں سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ مال چھوڑ کر مرا ہو کیونکہ احتمال ہے کہ اس نے جو اقرار کیا تھا وہ مال نہ ہو۔
- اگر کسی نے کہا: میں نے فلاں شخص کے ایک ہزار روپے سے کم دینے ہیں تو استثنا کی مقدار نصف سے کم سمجھی جائے گی۔
- اگر کسی نے کہا: اس دیوار سے لے کر اس دیوار تک فلاں کی زمین ہے تو اس اقرار میں دیواریں شامل نہیں

[1] العنكبوت 14:29.

ہوں گی کیونکہ اس نے درمیانی جگہ کا اقرار کیا ہے۔

▲ اگر کسی نے اقرار کیا کہ یہ درخت فلاں کے ہیں تو اس کے اقرار کا اطلاق اس زمین پر نہیں ہو گا جہاں درخت نہیں ہیں، لہٰذا اگر یہ درخت ختم ہو جائیں تو وہاں وہ نئے درخت لگانے کا حقدار نہ ہو گا۔ اور زمین کا مالک ان درختوں کو اکھاڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ اس نے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے (مثلاً: زمین کے مالک کی اجازت سے) لگائے ہوں گے، البتہ اگر اس نے اقرار میں باغ کا نام لیا تو اس اقرار میں درخت، عمارت اور زمین سب اشیاء شامل ہوں گی کیونکہ باغ کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے۔

▲ اگر کسی نے کہا: میرے ذمے فلاں شخص کی کھجوریں ہیں جو تھیلی میں ہیں یا چھری ہے جو کور میں ہے یا کپڑا ہے جو رومال میں بندھا ہوا ہے تو یہ کھجوروں، چھری اور کپڑے کا اقرار ہو گا تھیلی، کور اور رومال کا نہیں۔ اسی طرح کسی بھی چیز کا اقرار کرتے وقت اس کا دوسری چیز میں ہونے کا ذکر کیا جائے تو وہ صرف پہلی چیز کا اقرار ہو گا کیونکہ ظرف اور مظروف کا ایک ہی شخص کی ملکیت ہونا ضروری نہیں اور احتمال کے ساتھ اقرار لازم نہیں ہوتا۔

▲ اگر کسی نے کہا: ''یہ شے میرے اور فلاں شخص کے درمیان مشترک ہے۔'' تو شریک کا حصہ معلوم کرنے کے لیے اقرار کرنے والے سے رجوع کیا جائے گا۔ بعض کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شے دونوں میں نصف نصف ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ مطلق شراکت کا اقرار دونوں شریکوں میں شے کے برابر برابر ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

﴿ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ ﴾ ''یہ سب ایک تہائی حصے میں شریک ہوں گے۔''[1]

▲ جس شخص کے ذمے کسی کا کوئی حق ہے تو اس کا اقرار اور ادائیگی کا بندوبست اسی وقت واجب ہو جاتا ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ ﴾

''(اے ایمان والو!) عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودئ مولا کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمھارے اپنے خلاف ہو۔''[2]

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُۥ بِالْعَدْلِ ﴾

[1] النسآء 4:12. [2] النسآء 4:135.

''اور جس کے ذمے حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ نہ گھٹائے، ہاں! جس شخص کے ذمے حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوا دے۔''[1]

شیخ ابن قدامہ رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الکافی'' میں لکھتے ہیں:

''آیت میں وارد کلمہ ''املال'' اقرار کے معنی میں ہے اور اقرار کے سبب فیصلہ دینا واجب ہے کیونکہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«وَاغْدُ يَاأُنَيسُ! إِلَى امْرَأَةِ هٰذَا ، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا»

''اے انیس! علی الصبح اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اسے رجم کر دینا۔''[2]

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ اور بنو غامد قبیلے کی عورت کو ان کے اقرار کرنے کے سبب رجم کروایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اقرار کے سبب حکم اور فیصلہ صادر ہوگا۔ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ جب گواہی کی بنیاد پر فیصلہ دینا واجب ہے تو اقرار کی بنیاد پر فیصلہ دینا بالاولیٰ واجب ہے کیونکہ گواہی کی نسبت اقرار میں کذب بیانی کا امکان کم ہوتا ہے۔

اللہ رب العالمین کا بے حد شکر ہے کہ یہ مختصر کتاب مکمل ہوئی، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر اس کتاب میں کوئی نقص یا خطا واقع ہوئی ہو تو معاف کر دے۔ اور اسے ہمارے لیے اور قارئین کرام کے لیے نفع مند بنائے اور ہم سب کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔ آمین!

[1] البقرة 2:282. [2] صحيح البخاري، الوكالة، باب الوكالة في الحدود، حديث:2315,2314.